سسپنس ڈائجسٹ
مدیراعلیٰ عذرا رسول

جلد47 • شمارہ 03 مارچ 2017 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Medora
Perfumed Talc
Cherish
Joy
Passion
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

انشائیہ

جون ایلیا

ایک نعرہ

میں ایک مشہور شاہراہ کی طرف مڑتا ہوں۔ کچھ دور جا کر دائیں طرف ایک دیوار پر مجھے ایک نعرہ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ میں اسے پڑھتا ہوں، دوبارہ پڑھتا ہوں اور چلتے چلتے رک جاتا ہوں۔ مجھے ایک عجیب روحانی فرحت محسوس ہوتی ہے اور میں اطمینان کا گہرا سانس لیتا ہوں۔ یہ نعرہ شہر کی دیواروں پر لکھے ہوئے تمام نعروں سے جدا ہے۔

یہ دور فتنہ انگیزیوں اور خوں ریزیوں کا دور ہے۔ اگر دیواریں ذی روح ہوتیں تو وہ اپنے سینوں پر لکھے ہوئے زہریلے نعروں کے اثر سے ہلاک ہو جاتیں۔ آپ دیواروں پر لکھے ہوئے نعروں کو پڑھتے چلے جایئے اور خوف اور خدشات سے کمزور پڑتے چلے جایئے۔ آپ کو کوئی بھی ایسا نعرہ نظر نہیں آئے گا جو دل میں ایک خوش گوار کیفیت پیدا کرتا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم دردمندی، امن پسندی اور خرسندی کے اتنے بیری کیوں ہو گئے ہیں۔ ہمیں تباہی اور تباہ کاری کے شوق نے اتنا سنگ دل اور سفاک کیوں بنا دیا؟

انسان میں زندگی کی خواہش کے ساتھ موت کی خواہش بھی پائی جاتی ہے، خودکشی اور خودکشی کا رجحان اس کی بہت سادہ اور عام فہم علامت ہے۔ نفرت، بغض، غیظ و غضب اور درشت خوئی، موت کی خواہش کی پیچیدہ علامتیں ہیں۔ افراد کی طرح اقوام میں بھی موت کی خواہش پائی جاتی ہے اور بہت سے افراد ہی خودکشی نہیں کرتے، بعض قومیں بھی اقدامِ خودکشی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مگر زندگی کی خواہش موت کی خواہش پر غالب رہتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو نوعِ انسانی کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔

ہم نے جن نعروں کا ذکر کیا، وہ زندگی کے جذبے کو کمزور کرتے ہیں اور موت کے رجحان کو تقویت پہنچاتے ہیں، چاہے وہ اپنی موت کا رجحان ہو یا اپنے حریف کو ہلاک کرنے کا رجحان۔ ان نعروں میں ایک دوسرے کے لیے زہر بھرا جاتا ہے۔ وہ ذہنوں کو مسموم کرنے کے سوا اور کوئی فرض انجام نہیں دیتے۔ انہوں نے مرگ و ہلاکت کی فضا پیدا کر دی ہے۔ سیاسی نفرت انگیزی، لسانی نفرت انگیزی اور مذہبی نفرت انگیزی، ان کا حاصل کیا ہے؟ ہلاکت، ہلاکت اور صرف ہلاکت۔ اگر ان نعروں میں سے کوئی ایک نعرہ بھی پوری طرح کامیابی حاصل کر لے، معاشرے میں دہشت ناک تباہی پھیل جائے۔

وہ جنھوں نے یہ نعرے رقم کیے ہیں اگر تباہی اور تباہ کاری کے ہرکارے نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔ اگر یہ اس ملک کو میدانِ کارزار بنا دینا نہیں چاہتے تو پھر اور کیا چاہتے ہیں؟ یہ لوگ اشتعال اور اشتعال انگیزی کے موکل ہیں۔ ان کی کارگزاری کے باعث بے دلی، بے کیفی، بیزاری، خوف، خدشات اور عدم تحفظ کے احساس کی حالت ہماری زندگی کا روزمرہ معمول بن گئی ہے۔ جسے ذہنی سکون کہتے ہیں وہ جنس نایاب ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا کسی توانا سے توانا معاشرے کے اعصاب بھی اس کیفیت کو زیادہ دن برداشت کر سکتے ہیں؟

جن باتوں سے زندگی میں زندہ دلی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ باتیں خواب ہو کر رہ گئی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ہم میں اذیت پسندی اور اذیت رسانی کی اس قدر ہوس آخر کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ کیا زندگی اور زندگی کو توانائی بخشنے والے جذبات اپنی ساری کشش کھو بیٹھے ہیں؟ کیا ہم خوشی اور خوش دلی سے اتنے بیزار ہو چکے ہیں کہ اب گویا یکسانی کی کیفیت دور کرنے کے لیے لذتِ الم کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔

قوموں کی زندگی میں کمال کے دور کے بعد زوال کا دور آتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک عمومی رجحان ہے لیکن ہماری زندگی میں تو کمال کا دور آیا ہی نہیں۔ پھر یہ مسلسل زوال پذیری کی حالت ہمارا مقسوم کیوں قرار پائی ہے؟ یہ بات بار بار سوچنے کی بات ہے اور ہم میں سے ہر شخص کے سوچنے کی بات ہے۔

یہ حقیقت پورے ہوش گوش کے ساتھ سن لی جائے کہ تاریخ افراد اور اقوام کے ناز اور نخرے اٹھانے کی عادی نہیں رہی۔ جب بھی اس کے قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو خلاف ورزی کرنے والے چاہے اپنے وقت کے عالی شان کج کلاہ ہوں یا عظیم الشان قومیں اور قبیلے...... تاریخ انہیں روندتی ہوئی گزر گئی ہے۔ ہمیں تاریخ کے مزاج سے ہم آہنگی پیدا کرنی پڑے گی۔

عجیب صورت حال ہے۔ ہم میں سے جو بھی گروہ ہے وہ آپے سے باہر ہے۔ جسے دیکھیے وہ دوسرے کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلنے کو مذہبی فریضہ اور سیاسی ضابطہ خیال کرتے ہیں۔ ہر گروہ کو توڑنے کی باتیں کرنے کی لت پڑ گئی ہے۔ جوڑنے کی باتیں کرنے والا کوئی نہیں۔ کیا یہ زندگی گزارنے کے طور ہیں؟ اگر تمہارا یہی وتیرہ رہا تو یقین کرو کہ تم اپنے وجود کا جواز کھو بیٹھو گے، تمہارے طور مجرمانہ ہیں اور تمہارے طریقے مفسدانہ، بعض قومیں اتنی گئی گزری ہوتی ہیں کہ ان پر غصہ نہیں رحم آتا ہے۔ کیا تم انہی قوموں میں سے تو نہیں ہو؟ میں تمہیں ان قوموں میں شمار کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے وہ بہت ہمت شکن ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ افسوس ناک ترین ہے۔

ہاں تو دیواروں کے فتنہ انگیز نوشتوں کو چھیل ڈالو، ورنہ تم کھرچ ڈالے جاؤ گے۔ ایک دوسرے کے لیے معقول لہجہ اختیار کرو۔ دلیل اور برہان کے ساتھ بات کرنا سیکھو۔

میں نے ایک دیوار پر جو نعرہ دیکھا تھا وہ کچھ یوں تھا۔
”فرقہ پرستی کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالو“

☆☆☆

آپ کا خط

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

مارچ 2017ء کا شمارہ...... اپنی پوری بہار کے ساتھ اپنے دیوانوں کے شوق کی تسکین کا سامان لیے حاضر ہے۔ ہر بار سوچتے ہیں کہ کچھ نیا ہو مگر لکھتے ہوئے ہر موضوع پرانا لگتا ہے جیسے کہ آج کل بلدیاتی اداروں میں اختیارات اور بجٹ کی جنگ جاری ہے جس میں معصوم عوام کا حشر بُرا کیا جا رہا ہے اور اختیارات کی اس رسّا کشی نے پاک سرزمین کا نقشہ ہی بدل ڈالا ہے۔ بلدیاتی اداروں کی ناقص کارکردگی نے جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر اور ابلتے گٹر، ندی نالوں نے کراچی کے گلی کوچوں کو تعفن زدہ کر دیا ہے۔ گزرگاہیں نہ صرف بچے بوڑھے بلکہ نمازیوں کے لیے بھی ایک آزمائش بن گئی ہیں مگر...... افسوس کون سوچے کہ عوام پر کب کب، کیا کیا گزر جاتی ہے۔ وزرا کے تمام ارادے اور وعدے بھی اسی غلاظت کے ڈھیر میں کہیں دفن ہو گئے ہیں۔ کراچی پاکستان کا دل ہے اور اس دل میں اتنا نفاق اور منافقت رچ بس گئی ہے کہ ہر شریان میں گویا ایک درد پنہاں ہے۔ بس اپنے اپنے ظرف کی بات ہے جس طرح آج کل امریکا میں ڈونلڈ ٹرمپ نے مسلمانوں پر اپنے ملک کے دروازے بند کر کے اپنی تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے اور یہ کوئی حیران کن خبر نہیں کہ امریکا ”اسلامی دہشت گردی“ کی اصطلاح استعمال کر کے نئی حکمتِ عملی کے تحت مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ ایک نسل پرست انسان ہے جو ”اسلامی دہشت گردی“ کے قید خانے میں مسلمانوں کی آزادی کو قید کر کے باقی دنیا سے انہیں کاٹ دینا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت جو انتہائی پُرامن ہے ان کے لیے دہشت گردی کی اصطلاح استعمال کرنا بہت افسوس ناک، قابلِ مذمت اور بیمار سوچ کی عکاس ہے...... جبکہ عالمی سطح پر نگاہ ڈالی جائے تو دہشت گردی کی کارروائیوں میں دیگر اقوام کا ہاتھ بھی نمایاں ہے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہودی دہشت گردی کی وجہ سے آج تک فلسطین کا مسئلہ حل نہ ہو سکا اور جو دہشت گردی مقبوضہ کشمیر میں ہو رہی ہے اسے کیا نام دیا جائے گا جبکہ مقبوضہ کشمیر کی صورتِ حال سے ساری دنیا واقف ہے۔ ایسے میں ٹرمپ جیسے لوگ جانے کسے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ دہشت گردی کو صرف اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ جب تک عالمی سطح پر اس لعنت کو جڑ سے نہیں اکھاڑا جائے گا شدت پسندی اور انتہا پسندی کا خاتمہ ممکن نہیں ہوگا۔ صدر ٹرمپ صرف امریکا کو ہی دہشت گردی سے محفوظ کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ پوری دنیا کو اس عذاب سے نجات دلائیں۔ لیکن انہوں نے اب تک جو بھی فیصلے کیے ہیں ان سے مسلم دنیا ہی نہیں بلکہ عالمی رائے عامہ بھی بدگمان ہوئی ہے جس نے ایک اضطرابی کیفیت پیدا کر دی ہے اور جناب اس اضطراب سے فرار کے لیے ہم تو رخ کرتے ہیں اپنے پیارے اور مخلص دوستوں کی محفل کا۔

✠ **بلقیس خان**، واہ کینٹ سے تبصرہ کر رہی ہیں ”طاہرہ گلزار کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوں۔ اب یہ تو طاہرہ ہی کو پتا ہوگا کہ پکار جن ساتھیوں کی بڑی ہے، اس لسٹ میں ہمارا شمار بھی ہوتا ہے یا...... سرورق کی معصومہ سر پر دوپٹا لیتے ہوئے، بے دھڑک گھومنے والیوں کو شرم دلاتے ہوئے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ پچھلے کئی سرورق شاہکار رہے۔ خصوصاً سسپنس ڈائجسٹ کا ٹائٹل یادگار تھا۔ پھر دوستوں کے خط ڈھونڈتے ہوئے انتقال پُرملال پر نظر پڑ گئی۔ یہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو اچھا لگے، وہ چھن جاتا ہے۔ نہ بھولنے یا دکھ دے کر جانے والے کاشف زبیر کے بعد یہ دوسرا قلبی جھٹکا ہے جو سلیم فاروقی کی اچانک رحلت نے دیا ہے۔ فضا شاہ کا تبصرہ خوب صورت تھا۔ مبارک ہو دیگر دوستوں کے تبصروں میں صرف طاہرہ گلزار، عبدالجبار رومی اور محمد صفدر معاویہ کے تبصرے ہی پڑھ سکی ہوں جو ہمیشہ کی طرح خوب تر تھے دیگر ساتھی پریشان نہ ہوں، ٹائم ملتے ہی ان کے خط پڑھوں گی بھی اور داد بھی دوں گی۔ سجاد خان! ہم نے آپ کو یاد رکھا ہے، وہ تو کبھی ہم خود کٹ جاتے ہیں اور کبھی ادارے کی قینچی کاٹ کر رکھ دیتی ہے ذکرِ دوستاں کو۔ نادر سیال! جب آپ جیل میں تھے تو باقاعدگی سے لکھتے تھے، آزاد ہوئے تو منہ موڑ لیا۔ قدرت اللہ نیازی! دیرینہ دوستوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ادارہ محترم! کسی کے تبصرے کو پسندیدگی کی سند عطا ہوتی ہے اور کسی کے تبصرے کو دلچسپ جانا چاہتا ہے۔ ہمیں بھی دو لفظ کبھی عنایت کر دیں نا......“ (بے شک آپ کا تبصرہ بھی تمام تر لوازمات سے بھرپور ہوتا ہے) اب ذکر ہو جائے شیشم محل کا۔ پچھلے ماہ قسط کے اختتام نے ہی دل میں وسوسے اور اندیشے ڈال دیے تھے۔ ڈر تھا کہ کہیں فاروق کی طرح سر کی چوٹ رمن دادا کو کمزور نہ کر دے۔ یہ تو سوچا ہی نہ تھا کہ ظالم اتنا ظلم کریں گے اور وہ مردار مجو تو شیطان کا بھی باپ نکلا۔ کاش رمن دادا کا چاقو راٹھور کی انتڑیاں بھی باہر نکال لاتا۔ رمن دادا کیا مردوں کی شان سے جیے اور کیا بہادروں کی آن سے فانی جہان سے گزر رے۔ آپ جہاں بھی ہیں اللہ تعالیٰ آپ پر اپنے فضل و کرم کی بارش کرے۔ حویلی میں بلوائیوں کا نشانہ بننے والے بے گناہوں پر دل آزردہ ہے۔ انسان درندہ کیوں بن جاتا ہے۔ رگھو کے ساتھ ظلم ہوا اس نے بگڑے نوابوں سے بدلہ لیا تو اچھا کیا مگر عالیہ، آصف خان اور سرور ی وغیرہ کا کیا قصور تھا۔ مظلوم انتقام کی آگ میں خود بھی ظالم بن جاتے ہیں۔ باتدبیر مغل شہزادے کی عبرت اثر تحریر ہے۔ ذیشان ڈاکٹر ہو کر بدخصلت رہا شہلا جیسی بدفطرت عورتیں اس سے برے انجام کی مستحق ہوتی ہیں اور اصل انجام تو آدمی کا مرنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ باتدبیر میاں انوار جیسے بڈھوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اس عمر میں شادی نہیں توبہ تلا کرتے ہیں۔ ممنوع عادت راحیل انجم کی لکھی گئی تحریر میں بیوی کی دولت پر عیش کرنے والے بے وفا قاتل شوہر کا یہی حشر ہونا چاہیے۔ قتل کی لکیر اثر انگیز تحریر تھی۔ شفقت قاتل ہو کر بھی قابلِ رحم تھا۔ اصل مجرم تو گلو تھا۔ ملک صفدر کی نسلی امتیاز کی زاہدہ کینہ پرور عورت تھی۔

محبت میں ناکامی کا بدلہ اس طرح لیا کہ توجیح مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر شر اور خیر کی مقدار برابر رکھی ہے بس جو شر کے سامنے کمزور پڑ جائیں، وہ زاہدہ کی شکل میں انسانیت کو نقصان دیتے ہیں اس سوچ کا حسب نسب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض عالی نسب کہلانے والے ایسی خطا کاریاں کر جاتے ہیں کہ شیطان شرما جائے اور بعض کم نسل کہلانے والے ایسی وفاداری دکھاتے ہیں کہ آدمیت اترائی پھرے۔ قتل کی لکیر، فنگر پرنٹ گزارہ تھیں۔ نایاب سودا کی ابتدا میں لکھا ہے۔ وہ ایک خوب صورت دن تھا۔ بارش کے قطرے پورچ کی چھت سے ٹکرا کر جلترنگ جیسی آواز پیدا کر رہے تھے۔ بخدا جب بھی کسی کہانی قصے میں بارش کا تذکرہ ہو تو بے حد لطف آتا ہے، چاہے پیش منظر میں آگ برساتا جون ہی کیوں نہ ہو کہ بارش، پھول، پرندے اچھے لگتے ہیں۔ عکس منظر امام کی حسب سابق یادگار کہانی ہے جو ہمیں خوش امیدی دلاتی ہے۔ اللہ ان کا بھلا کرے، آزمائشوں کے اس کڑے دور میں وہ ہمیں خوش امیدی اور خوش گمانی کے تحفے دیتے رہتے ہیں۔ آخری صفحات پر چھپر چھاؤں زبیر سلیمانی کی اچھی کاوش ہے۔ جمال انا پرست شخص ہے۔ بیوی سے روٹھی محبوبہ والے ناز چاہتا ہے۔ یہ تحریر ان لڑکیوں کے لیے نصیحت آمیز ہے جو خاموش طبع شوہروں کا صبر آزماتی ہیں اور نہیں جانتیں کہ اندرونِ خانہ طلاق یا دوسری شادی کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ حضرت محبوب سبحانی غوث پاکؒ کی حیاتِ مبارکہ پر پوری کتاب پڑھ چکی ہوں۔ اس دفعہ دوسرا حصہ پڑھا۔ روح سرشار ہو گئی۔ اللہ کے راست بازوں کی واہ کیا بات ہے۔ ماروی اور تاریخی کہانی رہ گئی۔ والدہ کی طویل بیماری اور خاندان میں ہونے والی اموات نے خاصا مصروف رکھا ہے۔ اشعار بھی اچھے لگتے ہیں جو زیادہ اچھے لگیں ان پر نشان لگا دیتی ہوں۔ اس دفعہ جن کے اشعار پر نشان لگایا۔ محمد خواجہ، قدرت اللہ نیازی، ہادیہ اور بابا ایمان، ظفر اقبال ظفر، عبدالجبار، رمضان پاشا، مدحت، جنید احمد ملک، سرفراز احمد، ثاقب کمال، محمود اختر اور حمیرا رشید ہیں۔ کترنیں سبھی اچھی تھیں۔'' (اللہ آپ کی والدہ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے، آمین)

✠ زرین آفریدی، بینش صدیقی، حیدر آباد سے تشریف لائی ہیں ''فروری ڈائجسٹ سسپنس 18 تاریخ کو ملا۔ اپنے تبصرے نہ پا کر منہ اور آنکھیں کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کم از کم عزت مآب لوگوں (ردی کی ٹوکری) میں شمار ہو جاتا (اگر آپ کا خط موصول ہوتا تو لازمی محفل کی زینت بنتا) بہرحال ٹائٹل بہت خوب صورت تھا، حسینہ کا انداز دلربا خوب رہا۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب بازیافت میں کمال کر رہے ہیں اور ہم ان کی فیروز مندیوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ ہم انسان سائنس اور اس کی ترقیوں پر تو مہارت حاصل کرتے گئے۔ یہ سچ ہے انسان کی دانست تو بڑھی، پر دانش کم ہو گئی۔ اداریہ، نئے سال سے کافی طویل اور مثبت انداز لیے ہوئے ہے۔ بہت اچھا لگا۔ (بہت شکریہ) پیارے دوستوں کی محفل میں داخل ہوئے تو لاہور کی فضا شاہ کو کرسیِ صدارت پر پایا۔ کافی دنوں بعد بہت شاندار اور بامقصد تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ مبارک باد فضا شاہ۔ ادریس احمد خان بھی بہترین تبصرے کے ساتھ دوم رہے۔ طاہرہ گلزار جی تین تبصروں کی جگہ گھیرے ہوئے نظر آئیں۔ بابر عباس بھائی کو بیٹے کی مبارک باد۔ ہماری دو ماہ کی غیر حاضری کی وجہ عمرے کی سعادت حاصل کرنا تھی۔ اکیس دن کا وزٹ تھا جس میں مقدس مقامات سے فیض یاب ہوئے۔ واپسی پر مہمانوں کی آمد اور دعوتوں سے فرصت ہی نہ ملی اور نہ سسپنس پڑھ سکے (ماشاء اللہ...... اللہ آپ کو مبارک کرے اور خوشیوں سے نوازے) جنوری فروری کے سسپنس ڈائجسٹ اکٹھے ریڈ کیے۔ الیاس سیتا پوری کی ہر تاریخی کہانی بہت ہی شاندار ہوتی ہے۔ ہم خود اپنے آپ کو تاریخ کا حصہ سمجھ لیتے ہیں۔ کہانی کا ہر زاویے سے خیال رکھتے ہیں۔ شام وسحر نے تو ہمیں اپنے سحر میں لے لیا۔ ویلڈن سر جی۔ باتدبیر، طاہر جاوید مغل صاحب کمال است، عورتیں تو ہوتی ہی خزانہ ہیں۔ شہلا جیسی عورت خراب نیت سے اپنے آپ کو سجاتی رہی، اس کا تو یہی انجام ہونا تھا۔ ممنوع عادت، راحیل انجم نئے لکھاری ہیں مگر اسٹوری اچھی رہی۔ عادتوں سے ہی انسان کی پہچان وشناخت ہوتی ہے، جس طرح گیبریل اور بریجیٹ کی جوتوں سے پہچان ہوئی۔ حضرت محبوب سبحانی غوث پاکؒ کے ایمان افروز واقعات سے دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔ جزائے خیر ضیا تسنیم بلگرامی۔ ماروی میں عالی کی جگہ دانش نے لے لی۔ داستان میں دلچسپی کے سارے لوازمات ہیں۔ شیش محل میں اسما قادری صاحبہ نے ربن دادا کی موت کی جو منظر نگاری کی تو رو رو کر میں نے ڈائجسٹ کے ورق بھگو دیے۔ ربن دادا بھی اس اسٹوری کا ہیرو تھا، پھر فاروق دادا کی فیلنگز وخیالات ایسے شاندار اور غضب ناک انداز لیے ہوئے تھے کہ اسماجی کے ہاتھ چومنے کا دل چاہا۔ تنویر ریاض کی شکست بھی کافی متاثر کر گئی۔ مسٹر کروکیٹ اپنے دوست تھامس ہارجو کو الزام سے بری تو کر چکا، خود اس کی ساس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ آخری صفحات پر محمد زبیر سلیمانی، چھپر چھاؤں کی صورت ایک اچھی سبق آمیز کہانی دے گئے۔ یہ سچ ہے کہ شادی شدہ زندگی کی گاڑی توازن مانگتی ہے۔ جو جوڑے ازدواجی زندگی کی باریکیاں سمجھ جاتے ہیں، وہ کامیاب اور خوش وخرم زندگی گزارتے ہیں۔ بہاولپور کے زمیندار کریم داد کی پُرمغز نصیحت نے جمال کو فیصلہ کرنے میں مدد دی، ادھر حنا کو بھی بھابی کے آنے کے بعد والدین کے گھر شادی شدہ لڑکی کی حیثیت معلوم ہو گئی۔ ساتھ ماں کی بھی عقل ٹھکانے آ گئی۔ قتل کی لکیر، آصفیہ ضیا احمد، عمدہ کاوش ہے۔ معصومہ بیچاری بدمعاشوں کی شرارت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ شفقت شریفانہ زندگی گزارنے کے باوجود قتل کر بیٹھا۔ منظر امام صاحب کی عکس بھی اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ مجموعی طور پر فروری کا سسپنس ڈائجسٹ بیسٹ رہا۔ سردیوں اور بارشوں کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ شکریہ اسٹاف ڈائجسٹ۔ کترنیں ساری کی ساری اے ون تھیں، سگار اور پٹواری اور کتے والی تو لاجواب رہیں۔ محفل شعر وسخن کی کیا بات ہے۔ پڑھ کر ہماری ذوقِ شاعری کی تسکین ہوتی ہے۔'' (اتنے پیار اور پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ''سسپنس 2017ء مل گیا، تازہ شمارے کا ''گیٹ اپ'' بہت عمدہ تھا۔

فہرست سادہ مگر پُروقار تھی۔ انشائیہ حسب معمول گنگلک تھا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والی محترمہ فضا شاہ کو مبارکباد۔ موصوفہ کا تبصرہ بھی جاندار تھا، فضا شاہ آپ کا شکریہ کہ میری غلطی کی نشاندہی کی۔ معروف و مشہور قلم کار سلیم فاروقی کی رحلت کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ مرحوم نے ہمیں بہت اچھی اچھی کہانیاں پڑھنے کو دیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین اور اب تازہ شمارے پر تبصرہ۔ ممنوع عادت نامکمل نظر آنے والی کہانی بالکل مکمل اور بھرپور تھی، کہانی میں لطف آگیا۔ باتدبیر الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ جنون نے کام کیا۔ شیش محل کی یہ قسط بڑی پھڑک دار تھی، یہ کہانی ایک طویل عرصے تک یاد رہے گی۔ یہی تعریف ماروی کے لیے بھی ہے۔ شکست یہ ایک ایسی کہانی تھی کہ درمیان میں وقفہ کرنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ نسلی امتیاز بہت ہی الجھن والا کیس تھا، پھر بھی ملک صاحب نے آخرکار معما حل کر ہی لیا، کہانی مزیدار تھی۔ قتل کی لکیر طبع زاد کہانیوں میں اول نمبر پر رہی۔ فنگر پرنٹ بہت ہی دلچسپ کہانی تھی۔ نایاب سودا، ثمر عباس نے پچھلے ماہ کی کسر پوری کردی۔ کہانی نے بہت ہی لطف بہم پہنچایا۔ غوث پاک یہ تو ہے ہی تاریک دلوں کو منور کرنے والا قصہ۔ دھوپ میں بیٹھ کر علی اختر کی دھوپ پڑھنے میں بڑا مزہ آیا۔ عکس، منظر امام نے اپنے ہنسنے ہنسانے کے ٹریک سے ہٹ کر سنجیدہ اور رومانی کہانی ہمیں پڑھنے کو دی، کہانی میں لطف آگیا۔ چھپر چھاؤں ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اشعار کی محفل میں دونوں خواجہ صاحبان کے اشعار دل کو لگے۔ قدرت اللہ نیازی کا قطعہ بھی من کو بھایا۔ ماہا ایمان اور عبدالجبار رومی کے اشعار بھی قابلِ داد تھے۔“

✵غلام یٰسین نوناری، مظفر گڑھ سے چلے آرہے ہیں ”ایک طویل عرصے بعد محفلِ یاراں میں شرکت کرنے کی جسارت کی ہے (خوش آمدید...... مگر اتنی دیر کیسے ہوئی؟) سرورق اس بار واقعی خوب صورت ہے۔ انکل ذاکر کو بے حد مبارکباد۔ سب سے پہلے ماروی کا مطالعہ کیا۔ نواب مرحوم کا نام غائب تھا، گویا ماروی کی باگیں نئے مصنف کے ہاتھ میں جا پہنچیں۔ مراد علی منگی بیمار ہوگیا۔ خلیس ایک بالکل نیا کردار متعارف کروایا گیا جو کہ ابلیس صفت ثابت ہو رہا ہے۔ شیش محل پڑھی۔ آہ...... نواب سلیم اللہ کی حویلی اجڑ گئی۔ فاروق کی اصل گم ہوگئی۔ ربن دادا کی موت نے رلا دیا۔ ربن دادا یعنی رب نواز کی راجدھانی اجڑ گئی اور اڈے سے منسلک سب افراد بکھر گئے۔ جولیٹ جو جانے کتنی مشکلوں سے آغا سے ملنے پہنچی مگر آغا وہاں سے نکل چکا تھا...... افسوس۔ طاہر جاوید مغل کی مختصر تحریر باتدبیر، چاندنی راتوں کے فسوں میں حسن و دلکشی کا شکار ہونے والوں کی دلچسپ کتھا۔ دولت کے حصول کے لیے حدود کراس کرنے والے برے انجام سے ہی دوچار ہوا کرتے ہیں۔ ممنوع عادت میں بریجیٹ اپنی ایک مخصوص عادت کی وجہ سے قانون کے شکنجے میں پھنس گئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی زیست کے اہم گوشوں سے روشناس کروایا۔ منظر امام کی تحریر عکس محبت کے دو مختلف پہلو سے جذبات میں مبتلا کردینے والی دلچسپ کہانی تھی...... علی اختر کی تحریر دھوپ، مزہ دے گئی۔ قتل کی لکیر، چھپر چھاؤں اور شام و سحر بلاشبہ نمبر ون اسٹوریز تھیں۔ محفلِ یاراں میں فضا شاہ، لاہور صدارت کی کرسی پر براجمان تھیں۔ فضا شاہ کا دلچسپ تبصرہ پڑھ کر مجھے کراچی کے رضوان تنولی کریزڈی یاد آئے جو کبھی سسپنس میں بھرپور شرکت کیا کرتے تھے اور کستوری سے محفل کو مہکا دیتے۔ پشاور سے قابلِ احترام محترمہ طاہرہ گلزار کا دس مرلے کا خط ایک کپ چائے کے ساتھ نوش کیا...... کیجیے، آپ نے پکارا ہم چلے آئے۔ باقی دوستوں نے بھی اچھی کاوشیں کیں۔“

✵سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے محفل میں شرکت کررہے ہیں ”اداسیوں میں لپٹی رم جھم برستی بارش میں سسپنس سے ملاقات ہوئی۔ کچھ الجھنوں کی بنا پر محفل سے دور رہے اور سب دوست ہمیں بھول گئے لیکن ہم نے سوچا اب ان کو اپنی یاد دلا دینی چاہیے۔ موسم کی مناسبت سے سجا سرورق خوب صورت ترین تھا۔ حسینہ کی نگاہیں کسی کی تلاش میں تھیں ’اداسیوں میں ڈوبی حسینہ اپنی اپنی سی لگی۔ جون ایلیا سائنس کی باتیں کرتے نظر آئے۔ فضا شاہ کا خوب صورت تبصرہ سراہے جانے کے لائق تھا۔ ادریس احمد خان کا مختصر تبصرہ اچھا لگا۔ طاہرہ گلزار اپنے مخصوص انداز میں براجمان تھیں‘ ویسے شکوہ ہے آپ نے بھی ہمیں یاد نہ رکھا۔ صادق معاویہ میں دسمبر کی چھٹیوں میں رحیم یار خان آیا تھا۔ آپ کے والد کی وفات پر بہت افسوس ہوا، اللہ آپ کو صبر دے۔ آمین۔ عبدالجبار رومی، رمضان پاشا، محمد خواجہ اور باقی دوستوں کے تبصرے بہترین رہے۔ بابر عباس کو دوبارہ یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی، پرانے دوست بھی واپس آجائیں۔ سید محی الدین اشفاق کہاں غائب ہیں۔ ہمیشہ کی طرح کہانیوں کا آغاز شیش محل سے کیا۔ ارے یہ کیا اس مرتبہ تو کہانی نے یکدم رنگ بدلا ہے۔ ربن دادا کی موت نے ہوش اڑا دیے۔ نواب صاحب کی حویلی پر حملہ اور خواتین کی موت پر بہت دکھ ہوا لیکن انہوں نے اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کی۔ جولیٹ اور فاروق کے ملنے کا سبب پھر ختم۔ چاند بانو کدھر غائب ہوگئی، اب جانے فاروق کا کیا ہوگا۔ اس مرتبہ کہانی نے یکدم رنگ بدلا ہے۔ آصف اور جولیٹ کی جوڑی نہیں بنی چاہیے، وہ صرف فاروق کے ساتھ اچھی لگے گی۔ ماروی کا اختتام قریب ہے۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر لاجواب، باتدبیر کے ساتھ چھائے رہے۔ انسان کبھی کبھی اس گڑھے میں خود گر جاتا ہے جو وہ دوسروں کے لیے کھودتا ہے۔ ذیشان اور شہلا نے جو سوچا وہ پورا نہ ہوسکا۔ آخری صفحات پر ازدواجی زندگی کے تلخ حقائق سمجھاتے ہوئے زبیر سلیمانی براجمان تھے، خوب لکھا انہوں نے۔ ویسے حنا کی غلطی مجھے کم نظر آئی، زیادہ ترجمال پر غصہ آیا۔ اچھی سبق آموز تحریر تھی۔ شام و سحر زبردست تھی تو ملک صفدر حیات نسلی امتیاز کے ساتھ اچھے رہے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ فروری میں میری سالگرہ ہے۔ بہت پیارے بھائی آصف مطیب کو سلام۔ نشور ہادی کی تحریر کا مجھے انتظار ہوتا ہے۔“ (ارے پھر تو آپ کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد...... نشور ہادی کی تحریر کے لیے آپ کا انتظار ختم ہوا گویا)

✵اشفاق شاہین، لاہور سے محفل میں شرکت کررہے ہیں ”پرچہ اس بار بھی بروقت ہی مل گیا۔ سرورق بھی خوب رہا۔ سائنس کے موضوع پر جون ایلیا کے دانش مندانہ خیالات توجہ طلب تھے۔ اپنی محفل میں پہنچے۔ گزشتہ ماہ میرا خط پہنچنے کے باوجود شامل نہ ہو پایا۔ اتنا صدمہ

ہوا کہ پچھلے ماہ خط ہی نہ لکھ پایا، کچھ صدمہ تھا کچھ والدہ کی بیماری کی وجہ سے اسپتال کے چکر، جس کا اب تک افسوس، آئندہ پہلے کی سی باقاعدگی سے لکھنے کی کوشش کروں گا۔ (ہمیں آپ کی یہی اپنایت چاہیے) لاہور سے فضا شاہ کرسی صدارت پر براجمان تھیں، دلچسپ تبصرے کے ساتھ گڈ۔ باقی تمام دوستوں کے خطوط بھی بہترین تھے۔ الیاس سیتاپوری تاریخی کہانی شام وسحر لے کر آئے۔ معلومات سے بھرپور تاریخ کے کئی گوشوں سے آگاہی ہوئی۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ طاہر جاوید مغل با تدبیر لے کر آئے، بہت خوب رہی اور طاہر صاحب آخری صفحات پر کوئی یادگاری تحریر لے کر آئیں نا۔ شیش محل اس بار تو ایکشن سے بھرپور تھی لیکن ربن دادا کی موت نے افسردہ کر دیا۔ وہ تو ناول کا جاندار ترین کردار تھا، نواب خاندان بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ جولیٹ کی قسمت جو بچ گئی اب ونکھو فاروق کی مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا ہے جولیٹ کی تلاش، اس کا انتقام اور اب ربن دادا کا انتقام اور اب تو جولیٹ بھی سمجھ گئی ہے کہ فاروق اسی نواب خاندان کا سپوت ہے۔ کہانی دلچسپ مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ ملک صفدر حیات کی نسلی امتیاز بھی خوب رہی، بھولا کا کردار بہت اچھا لگا اور زاہدہ کا کردار کمینگی سے بھرپور۔ ماروی کا نام اگر دیوتا ہی رکھ دیا جائے تو...... کیونکہ پرانی ماروی والی کوئی بات نئی ماروی میں نظر نہیں آ رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی غوث پاکؒ کے ایمان افروز واقعات لے کر آئے۔ ایسے واقعات پڑھ کر عجیب سی طمانیت روح میں اتر جاتی ہے اور آخری صفحات کی کہانی محمد زبیر سلیمانی کی چھپر چھاؤں زبردست۔ شروع شروع میں غصہ بھی آیا کہ جمال کوئی انتہائی قدم کیوں نہیں اٹھا لیتا لیکن بہرحال بزرگوں کی باتیں اور تجربات اپنی جگہ اور ہوا بھی وہی۔ انجام بہرحال بہت خوب رہا۔ محفل شعر و سخن میں انتخاب بھی بہترین تھا۔"

✠ **محمد صفدر معاویہ، خانیوال** سے تبصرہ کر رہے ہیں "سرورق پر بیٹھی ماڈل شاید کسی کے انتظار میں ہے اور اسے اپنے محبوب کا شدت سے انتظار ہے کہ جناب بہار بھی تو آنے والی ہے۔ اللہ پاک ہم سب کی زندگیوں میں بہار ہی بہار لائے۔ آمین۔ بازیافت انشائیہ میں جون ایلیا جی کہتے ہیں کہ سارا رونا انسان کے حیوانی رویوں کا ہے، بالکل بجا فرماتے ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا میں نے پہلے بھی ایک دفعہ کہا تھا کہ اس ملک میں ذہانت کی کمی نہیں لیکن وہ ذہانت کو مثبت کاموں میں لگاتے نہیں اور جو ایسا کرنا چاہتا ہے اپنے ملک کے لیے کچھ بہتر اس کو کام کرنے ہی نہیں دیا جاتا۔ آخر وہ مجبور ہو کر بیرون ممالک میں جا کر ان کو اپنی ذہانت سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ باقی رہی تعلیم کی بات تو اب پچیس فیصد لوگ ہوں گے جو دل سے پڑھتے ہیں، باقی پچھتر فیصد وقت گزاری مجبوری میں اسکول کا رخ کرتے ہیں۔ پھر اساتذہ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں بس تنخواہ ملتی رہے طالب علم جائے بھاڑ میں۔ اگر اس ملک کو روشن مستقبل کی طرف لے کر جانا ہے تو میرے خیال میں پڑھی لکھی ماں ہی پڑھا ہوا معاشرہ دے سکتی ہے (مگر ماں جو ایسے ہی اسکولوں اور ایسے ہی اساتذہ کے زیرِ تعلیم رہی ہو وہ کیا کرے گی؟) اسمبلی میں بیٹھے سب ہی ملکی چور ہیں۔ اپنی محفل میں آئے تو لاہور سے بہن فضا شاہ کو خوب صورت اور بہترین تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ بہت بہت مبارک ہو جی۔ آپ کی بات بجا ہے کہ ہم ہی ان کو اسمبلی میں پہنچاتے ہیں اور پھر ان کا رونا بھی روتے ہیں۔ وزارت عظمیٰ ادریس احمد خان کے حصے میں آئی۔ وہ بھی اچھے تبصرے کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ صادق معاویہ اللہ پاک آپ کے والد کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ نصیب فرمائے اور آپ کو صبر جمیل اور اجرِ عظیم عطا کرے۔ ذیشان خان ہم آپ کو سسپنس کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ شروعات شیش محل سے کی۔ یہ کیا ربن دادا اس دنیا کو چھوڑ چلا، ناقابلِ یقین بہرحال موت برحق ہے۔ اسٹوری کی جان تو ربن دادا تھا۔ آخر تک دادا نے دیدہ دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ دادا کی موت سے جہاں اڈے کے سارے لڑکے یتیم ہو گئے۔ وہیں کئی گھروں کا سہارا چھن گیا۔ بہرحال اب فاروق بدلہ لے گا دوسری طرف نوابوں کی حویلی میں بلوائیوں نے تباہی مچا دی۔ جولیٹ کی قسمت اس کو بچا کر لے گئی تو وہیں اسد اللہ بھی بچ گئے۔ اگلی قسط امید ہے بہت ہی زبردست ہو گی۔ پھر ماروی پڑھی جو پہلے کی نسبت اب سکون سے چل رہی ہے۔ کوئی خاص معرکہ نہیں پڑا ابھی تک، باقی سب شیطانی طاقتیں اکٹھی ہو گئی ہیں خیر کے خلاف اور حق والوں کی مدد کے لیے اللہ کافی ہے۔ سسپنس کے اولین صفحات پر الیاس سیتاپوری شام وسحر لے کر آئے۔ اباقہ اور اس کے بیٹوں پر گزرے تاریخی واقعات ارغون نے تکودار احمد خان کا سر قلم کر کے حکومت سنبھال لی۔ جوینی کی بات ٹھیک تھی، اس نے صحیح فیصلے غلط وقت پر کیے۔ یہ سب کچھ اگر وہ بعد میں ظاہر کرتا تو شاید کہ وہ زندہ رہتا پر قسمت۔ طاہر جاوید مغل با تدبیر لے کر آئے۔ بے شک انسان تدبیر تو بنا سکتا ہے پر تقدیر نہیں انسان کچھ سوچتا، رب تعالیٰ کچھ کرتا ہے جیسے کہ ذیشان اور شہلا کے ساتھ ہوا۔ تدبیر تو انہوں نے بنائی پر میاں انوار تو بچ گیا پر بنگالی تقدیر بن کر شہلا کی جان لے گیا۔ کسی کا برا سوچنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ راحیل انجم ممنوع عادت کی صورت میں مختصر تحریر لے کر آئے۔ کرٹ بلٹزر اور گرل فرینڈ بریجیٹ کو کس طرح ننگر نے آؤٹ کر دیا۔ جوتے کے بغیر گاڑی چلانا مروا گیا دونوں کو۔ تنویر ریاض کے قلم سے شکست آئی کر وکیٹ نے اپنے دوست ٹومی کو بچا لیا پر خود ماریا کی الجھن میں پھنس گیا۔ پہلے ہی دو مردوں کی بے وفائی نے اس کو تیسرے کے ساتھ شادی سے باز رکھا۔ ملک صفدر حیات نسلی امتیاز کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ملک صاحب کا ایک اور کامیاب کیس مشتاق کے بڑے پلاننگ سے کیے گئے قتل پر بھولا آرام سے فٹ آتا تھا پر جبرو اور زاہدہ کو اپنے انجام تک پہنچنا تھا۔ قتل کی لکیر آصف ضیا احمد کے قلم سے شفقت کو اس کی جلد بازی نے مروا دیا۔ پہلے کفیل اور گلو نے اس کو بے وقوف بنایا پھر جب وہ اچھا انسان بنا تو گلو نے جمن کے ذریعے اس کو غصہ دلا کر اس کے ہاتھوں بیوی کو مروا دیا۔ محفل شعر و سخن بھی بہت اچھی رہی۔ سلیم انور کی فنگر پرنٹ میں ڈاکٹر بڑی صفائی سے قتل کر کے بھی نہ بچ سکا۔ ثمر عباس کی نایاب سودا نارمل رہی۔ غوث پاکؒ کا باقی حصہ پڑھا، دل کو سکون سا ہوا۔ اللہ ہمیں نیک لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنے اور نیک کام کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔ علی اختر کے قلم سے بہترین تحریر دھوپ آئی۔ میں حیران ہوں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ابھی تک بیٹیاں ونی کی جاتی ہیں۔ منظر امام عکس لے کر آئے۔ زمیندار

فیاض نے سہیل فاروقی کو اپنی نواسی کو پڑھانے کا کہہ کر اپنا کچھ دکھ ہلکا کر دیا۔ محمد زبیر سلیمانی چھپر چھاؤں کے ساتھ آئے۔ انتہائی خوب صورت تحریر، بے شک سچ ہے کہ عورت کا ہر مقام رحمت ہے چاہے وہ ماں ہو، بہن ہو، بیوی ہو یا بیٹی ہو پھر اس پر جو کچھ فرض کر دیا گیا ہے، اسلامی حساب سے اس کو نبھا ہے بغیر وہ کچھ بھی نہیں۔ حنا کے گھر کو اصل میں اس کی ماں نے برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ جمال کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ نہ سمجھی پر جب دھکے لگے تو اس کی عقل ٹھکانے آ گئی کہ عورت کے لیے شوہر کا گھر ہی سب سے بڑی پناہ گاہ ہے۔ غلطی کسی سے نہیں ہوتی، موقع دینا چاہیے ایک دوسرے کو اور در گزر کرنا چاہیے۔ اس طرح زندگی کی گاڑی چل سکتی ہے۔ کترنیں بھی بہت ہی اچھی رہیں۔ فروری کا سسپنس بھی بہت ہی عمدہ رہا۔“

✠ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں ”سرورق بھی دیدہ زیب تھا اور زبان حال سے اپنا آپ منوا رہا تھا جس میں بلاتمہید ذاکر صاحب کی صناعی کا زیادہ عمل دخل تھا۔ انشائیہ بھی حسب روایت بہت خوب رہا۔ خطوط کی محفل میں فضا شاہ نئی نظر آئیں، مبارکباد۔ تبصرہ پسند آیا۔ طاہرہ گلزار نے بھی تبصرہ بھرپور انداز میں کیا۔ آگے بڑھ کر الیاس سیتاپوری کے ساتھ تاریخ کی بھول بھلیوں میں کھو گئے کیونکہ ان کا انداز جداگانہ ہے جو بلاشبہ قاری کو مبہوت کر دیتا ہے۔ اس کے بعد طاہر جاوید مغل کی باتدبیر میں بہت لطف آیا اور کیوں نہ آتا کہ تحریر مغل صاحب کی تھی۔ ممنوع عادت میں عادت کی وجہ سے بر بجیٹ پھنس گئی۔ منصوبے کو خوب بنایا تھا مگر ہر انسان عادت سے مجبور ہوتا ہے۔ شیش محل پڑھتے وقت وہی مزہ آیا ہے جو پہلی قسط سے اپنے سحر میں جکڑے ہوئے ہے۔ کہانی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بہت خوب اسما قادری، تنویر ریاض کی شکست بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ قتل کی لکیر بھی اچھی تحریر تھی۔ فنگر پرنٹ ایک چھوٹے سے نکتے نے ساری حقیقت آشکار کر دی۔ عقلمند ہو اور سونے پر سہاگا بندہ جاسوس بھی ہو تو مجرم کسی طور نہیں بچ سکتا۔ نایاب سودا نے بھی متاثر کیا۔ غوث پاکؒ کی دوسری اور آخری قسط پڑھ کر دل نور کی روشنی سے معمور ہوا۔ غوث پاکؒ کی پوری زندگی انسانوں کے لیے راہِ حیات ہے۔ رہتی دنیا تک ان کا نام جگمگاتا رہے گا۔ دھوپ میں ایک لڑکی نے معاشرے کو تن تنہا للکارا اور سرخرو ہوئی۔ آخری دونوں تحریریں عکس اور چھپر چھاؤں بہترین کہانیاں تھیں۔ کترنوں نے بھی خوب مزہ دیا۔ محفل شعر و سخن میں منتخب اشعار نے بھی اپنا آپ منوایا۔ اللہ تعالیٰ سلیم فاروقی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔“

✠ بابر عباس، فضل عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں سے محفل میں شریک ہیں ”رب کائنات سے امید کرتا ہوں جو ارض و سماں کا مالک و مختار ہے کہ آپ اور سسپنس کے دیگر اراکین خیریت سے ہوں گے۔ سرورق دیکھ کر آنکھوں میں موجود اداسی خزاں کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ شاید صنف نازک میری بات سے ایگری نہ کریں۔ جون ایلیا صاحب کے بازیافت نے ہمیں بازیافت کر دیا۔ سرجی یہاں بھلا کون اپنا چلن صحیح کرے، کون قبلہ درست کرے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی ٹانگ ثواب سمجھ کے کھینچ رہا ہے۔ سرجی آپ کی عرق ریز باتیں پڑھ کر سر دھن کر دھمال ڈالتا ہوا اپنی خوب صورت محفل میں پہنچا تو ٹارچ لے کر اپنے خط کو تلاش کرنے لگا۔ بڑی تگ و دو کے بعد خط کو تلاش کیا تو خط کی حالت دیکھ کر دل خون خون ہو گیا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا (ارے رے رے ایسا بھی کیا ہو گیا تھا جناب) خیر اس بار فضا شاہ نے رانا بشیر احمد ایاز خان صاحب کی ٹانگ کھینچتے ہوئے ایک ماہ کے لیے کرسی پر قبضہ گروپ بن کر قبضہ جما لیا اور ساتھ ہی ساتھ کہہ رہی ہیں کر لو جو کرنا ہے۔ بی بی یہ جو کرسی صدارت پر بیٹھنے کا حق حاصل کیا ہے نا یہ سب سرجی کی مہربانی ہے۔ زیادہ پھول کر کپا ہونے کی ضرورت نہیں۔ رمضان پاشا بھائی کوئی کسی کو محفل سے نہیں نکلواتا بندہ خود چھوڑتا ہے۔ سرجی سسپنس اور جاسوسی کا ایک اور معتبر اور بڑا نام سلیم فاروقی صاحب نئے سال کا پہلا مہینا جنوری ہم سے ایک اور نام چھین کر لے گیا۔ سلیم فاروقی صاحب کو جب جب پڑھا تب تب مزہ آیا۔ سلیم فاروقی صاحب کا اپنا ایک نام تھا اوپر تلے بڑے بڑے نام ہم سے جدا ہو گئے۔ خدا سلیم فاروقی صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ واہ عبداللہ بدلی شریف صاحب واہ بھایا زبردست، کیا مختصری حاضری دی ہے۔ دل خوش کر دیا، اس شریفانہ طریقے سے آتے رہا کریں۔ ذاکر صاحب تو بڑے کھلے دل کے مالک ہیں وہ کسی کی بات کا برا نہیں مانتے میں نے کبھی بھی ان کے بنائے ہوئے سرورق کی تعریف نہیں کی حالانکہ عرصہ دراز سے سسپنس اور جاسوسی پڑھ رہا ہوں حالانکہ وہ ایک زبردست آرٹسٹ ہیں۔ ہر سرورق ان کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آخر میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ محی الدین نواب، کاشف زبیر صاحب، مختار آزاد صاحب اور سلیم فاروقی صاحب کی کہانیاں کبھی کبھی نشرِ مکرر کے طور پر شائع کر دیا کریں۔ اس طرح نئے قارئین کو بھی ان کی تحریروں کے ذریعے پتا چلتا رہے گا کہ وہ کس پائے کے رائٹر تھے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی۔ سب سے پہلے نواب صاحب کی سسپنس کے لیے آخری سوغات ماروی پڑھی جو اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ نواب صاحب زندہ ہوتے تو شاید ماروی کا اتنی جلدی اختتام نہ ہوتا۔ لحاتی توقف کے بعد سانس لینے کے لیے رکا تو سامنے حسب معمول حسام بٹ ملک صفدر حیات کے ساتھ نسلی امتیاز لیے کھڑے تھے۔ وہی حسام بٹ کا مخصوص انداز وہی ملک صاحب کی چابکدستی اور پھرتی۔ آخر جبر د پکڑا گیا۔ طاہر جاوید مغل صاحب جب بھی آئے بردست آئے۔ چاہے وہ ان کی کوئی مختصر کہانی، چاہے ان کی کوئی سلسلے وار کہانی، وہ قارئین کو اپنے لفظوں کے ذریعے جکڑنا جانتے ہیں۔ باتدبیر بھی مغل اعظم کی ایک خوب صورت اور معیاری تحریر تھی۔ اس بار آخری صفحات کی ذمے داری اپنے محمد زبیر سلیمانی صاحب نے اٹھا رکھی تھی۔ سسپنس کے آخری صفحات کی پاسداری کرتے ہوئے محمد زبیر سلیمانی صاحب نے ہمیں ایک پیاری سی کہانی پڑھنے کو دی۔ اس کو کہتے ہیں گھر گھر کی کہانی ونڈرفل سلیمانی صاحب۔ الیاس سیتاپوری صاحب کے تو بھلا کیا ہی کہنے۔ تاریخ کے ذریعے کہانی میں جان ڈال دیتے ہیں۔ شام و سحر ان کی ایک یادگار

تحریر ہے۔ ممنوع عادت، راحیل انجم، شکست تنویر ریاض، قتل کی لکیر آصفہ ضیا احمد، فنگر پرنٹ سلیم انور، نایاب سودا ثمر عباس، دھوپ علی اختر اور منظر امام صاحب کی عکس۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحب کی تو کیا ہی بات ہے۔ ہر ماہ اپنی تحریروں کے ذریعے ہمارے ایمان کو تازہ کرتے ہیں۔" (آپ کے زریں خیالات کی ہم تہ دل سے قدر کرتے ہیں مگر آپ کی طرح دیگر قارئین کے لیے بھی گنجائش نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ قینچی کی دھار تھوڑی تیز رکھی جائے...... امید ہے کہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی)

✠ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی، لاہور سے تشریف لائے ہیں "سسپنس کے ٹائٹل پر خوب صورت لڑکی محوِ انتظار اچھی لگی، خوب صورت آنچل کے جیسی چھپر چھاؤں میں اپنی ذات کو سمیٹ لو، دوسروں کی کڑوی کسیلی باتوں کو برداشت کر لو یقیناً آپ کے حق میں بہتر ہی ہوگا اور ایک وقت آئے گا جب زندگی خوب صورت ہو جائے گی۔ بالکل حنا اور جمال کی طرح۔ ایک سال کی جدائی میں حنا کو بھی اپنے گھر کا احساس ہوا اور جمال کو بھی ایسا مرشد ملا کہ اس کی زندگی بنا گیا۔ محمد زبیر سلیمانی کی خوب صورت کہانی چھپر چھاؤں بہت اچھی لگی۔ جون ایلیا کی بازیافت خوب رہی، سائنس تو اپنی جگہ پھلتی پھولتی جا رہی ہے' لے دے کہ بات انسان کی دانست و دانش پہ ہی آتی ہے۔ بس یہی کافی ہے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانک لے۔ شاید ضمیر ہی انسان کو جھنجوڑ ڈالے کہ جب سائنس اپنے نکتے واصول پر کام کرتی ہے اور تیرے لیے نئے نئے دروا کرتی ہے تو پھر تو کیوں اپنی لائن سے بھٹک جاتا ہے؟ ملکی حالات پہ چوٹ کرتا بھرپور اداریہ دل کو بھا گیا، جیسے فضا شاہ کا تبصرہ بھی سب پہ چھا گیا۔ بہت عمدہ۔ ادریس احمد کا تبصرہ پورا پورا رہا جبکہ طاہرہ گلزار کا بھرپور اور بامعنی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ صادق معاویہ بھائی اللہ آپ کے والد کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ بابر عباس بھائی آپ کو ننھے فضل عباس کے آنے کی بہت بہت مبارک ہو۔ ذیشان خان کو بھرپور ویلکم کرتے ہیں۔ شام ہوتی ہے تو اس کے بعد سحر بھی ہوتی ہے۔ منگول قول کا عروج و زوال بھی خوب رہا جس میں عروج کو فوقیت رہی کیونکہ یہ نڈر قوم صرف آگے بڑھنا جانتی ہے اور جب منگولیت کی شام سے اسلام کی سحر طلوع ہوتی ہے تو یہی منگول نامور سلطان پیدا کرتے ہیں۔ خیر شام وسحر تاریخی کہانی بہت عمدہ رہی۔ شہلا نے بوڑھے انوار کے لیے تدبیر کی تو بنگالی کے آگے خود حشر سامانی لیے تدبیر بن گئی۔ بے چاری جان سے ہی گئی۔ کسی کے لیے کنواں کھودو گے تو خود گرو گے۔ باتدبیر بھی عبرت اثر رہی۔ آخر بن دادا کے ساتھ انہونی ہو ہی گئی۔ بے چارہ اکیلا درجن بھر لوگوں سے لڑتا ہوا جان کی بازی ہار گیا اور پھر بن کا اڈا بھی بکھر گیا، جولیٹ کی قسمت اچھی تھی جو بلوے سے بچ گئی اور ولدار آغا جولیٹ سے بچ گیا لیکن اب فاروق کے ہاتھوں ان کے دشمن نہیں بچنے والے شیش محل نے اس دفعہ بہت رنجیدہ کیا۔ نسلی امتیاز بھی اپنی جگہ درست ہے جو سارے فساد کی جڑ ٹھہری لیکن اگر زاہدہ کو جو مل گیا تھا اسی پہ قناعت کرتی اور مزید شر نہ پھیلاتی تو سب ٹھیک رہتا لیکن اسے بھی فتنہ پھیلانے کی سزا مل گئی اور مشتاق باجوہ کا قاتل بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ پہلے راشدہ محبت کے روپ میں تھی جو سہیل فاروقی کو مل نہ سکی اب بیٹی کے روپ میں' سوا سے نیلماں کو قبول کرنا ہی پڑا اور سب سے بڑھ کر فیاض نے ناظم کو جانتے بوجھتے قبول کیا تھا جو بڑی بات ہے۔ عکس نے بھی بہت عمدہ تاثر پیدا کیا۔ ماروی کا مراد تو فی الحال بستر مرگ پر ہے۔ عالی پہلے ہی یہ دنیا چھوڑ گیا۔ اب اکیلی ماروی اور دانش ہی دشمنوں کے دماغ کو الٹ پلٹ کرنے میں لگے ہیں جبکہ دشمن ارض اسلام پر چڑھ دوڑنے کو ہے۔ دیکھیں ماروی آگے کیا رنگ دکھاتی ہے۔ شفو کے ہاتھ میں واقعی قتل کی دو لکیریں تھیں۔ گلو نے مجرمانہ کھیل کھیلا تو وہ بھی اس کی بھینٹ چڑھ گیا اور معصومہ بے گناہ ہی ماری گئی۔ جب شفو پوچھتا تھا کہ ماں بیٹی کہاں غائب رہتی ہیں تو بھی بتا دیتیں تو یوں سب کچھ نہ اجڑتا۔ برادرِ من زندگی کے بعد بھاری سفر درپیش ہے اس کی تیاری رکھو، لوگو! تم اپنے دل کے دربان بن جاؤ اور دل کی خواہشوں کو زیادہ نہ بڑھاؤ۔ کسی سے محبت ونفرت میں عجلت سے کام نہ لو بلکہ قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھ لو، حلال روزی کی تلاش میں رہو۔ حضرت محبوب غوث سبحانیؒ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات اعلیٰ درجے کی تھیں۔ بے شک آپ کا ہر قدم ہر ولی کی گردن پر تھا دلوں کو منور کرتی تحریر لفظ بہ لفظ دل میں اترتی جاتی ہے۔ آپؒ کے ایمان افروز واقعات پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ محفل شعر وسخن سے ظفر اقبال ظفر، ہادیہ ایمان، ماہا ایمان اور محمود اختر کے شعر اچھے لگے۔"

✠ محمد شہباز ناز، گجر کالونی، سرگودھا سے چلے آ رہے ہیں "بڑی بے چینی کے ساتھ وقت گزرا اور سسپنس سے ملنے کا موقع ملا۔ سسپنس ہاتھ میں آتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ ٹائٹل گرل ہاتھ میں دوپٹا لیے ایسے پوز دے رہی تھی جیسے بڑھیا کسی کو دور سے آتا دیکھ کر کرتی ہے۔ سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ بہت ہی پیارے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ شیش محل پڑھی۔ اسما قادری صاحبہ نے تو اس بار کمال کر دیا۔ بہت مزہ آیا پڑھ کر۔ علی اختر کی کہانی دھوپ پڑھی جس میں ناہید بیچاری اپنے باپ کو بچانے کے لیے ونی ہو گئی تھی جب وہ جوان ہوئی تو اس کو پتا چلا کہ باپ کی سزا وہ بھگت رہی ہے۔ اس کے بعد منظر امام صاحب کی کہانی عکس پڑھی ہر بار کی طرح اس بار بھی شاندار کہانی تھی۔ آصفہ ضیا احمد کی کہانی قتل کی لکیر پڑھی۔ وہ کہتے ہیں نا مجرم چاہے جتنا بھی چالاک ہو، قانون سے بچ نہیں سکتا، اچھی تحریر تھی۔ ثمر عباس کی کہانی نایاب سودا پڑھی۔ عمدہ تحریر تھی۔ ملک صفدر حیات کی کہانی نسلی امتیاز پڑھی۔ صفدر صاحب اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ہر بار کامیاب ہوتے ہیں۔ سبق آمیز کہانی تھی۔ الیاس سیتا پوری کی کہانی شام وسحر پڑھی۔ کیا عمدہ لکھتے ہیں جواب نہیں ہے ان کا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے رائٹر کاشف زبیر کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس محفل کو آباد وشاد رکھے اور اس ادارے کو مزید ترقی نصیب فرمائے۔ آمین۔"

✠ زاہد احمد، شادمان ٹاؤن، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "لیجیے جناب فروری کا شمارہ خلافِ توقع 16 تاریخ کو ہی ہمیں مل گیا۔ ٹائٹل گرل پر نظر پڑی تو ایسا لگا کہ کسی نٹ کھٹ الھڑ دوشیزہ کو جو کہ بے خیالی میں تھی کسی نے اچانک چھیڑ دیا ہو۔ انشائیہ میں ایلیا صاحب فرما رہے ہیں

کہ سائنس نے جتنی بھی ترقی کی ہے، اس میں انسان نے نہ انسانوں کو فائدہ پہنچایا ہے، نہ ہی خود اپنی حالت بدلی ہے، بلکہ مغربی دنیا کا انسان سائنسی ترقی کرکے انسان سے حیوان بن گیا ہے اور اس نے سائنسی ایجادات سے تیسری دنیا کے غریب ملکوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ اداریہ میں تعلیم کے حوالے سے ووکیشنل اداروں کے قیام کی تعریف کی گئی ہے لیکن بات یہ ہے کہ مختلف ٹیکسوں کی مد میں جو عوام کا خون چوسا جاتا ہے اور عوام کا پیسا عوام پر ہی نہیں لگتا بلکہ وزیروں سفیروں اور طبقۂ اشرافیہ کو قرضوں اور بھاری بھرکم مشاہروں کی صورت میں نوازا جاتا ہے۔ بہرحال محفل میں پہنچے تو فضا شاہ کرسیٔ صدارت پر براجمان تھیں، بہت ہی عمدہ تبصرہ ہے بھئی جب ہی تو کرسیٔ صدارت ملی ہے۔ تمام سلسلوں اور کاوشوں کو پھلانگتے ہوئے ہم محبوب سبحانی حضرت غوث پاکؒ کے دربار میں پہنچے اور آپ کے ایمان افروز واقعات پڑھے۔ آپ تو تمام ولیوں کے سردار ہیں۔ بہرحال آپ کے دربار میں روح کو اک نئی تازگی اور قرار ملا۔ شیش محل میں داخل ہوئے، ارے یہ کیا...... ہمیں عبدالجبار رومی کا خدشہ یاد آیا کہ ربن دادا کے ساتھ کچھ انہونی ہونے والی ہے۔ واقعی انہونی ہوگئی۔ مظلوموں کا دادرسا اور بہت اونچے پائے کا دادا واقعی اپنی شان آپ ایک بزدل ہندو سے سینے پر گولی کھا کر شہید ہوا اور جس نے پیٹھ نہیں دکھائی۔ فاروق بھائی تم ان گیدڑوں اور دادا کے قاتلوں کو چن چن کے کتے کی بھیانک موت مارنا ورنہ دادا کی روح تڑپتی رہے گی۔ باقی کہانی لگتا ہے پاکستان کراچی میں ظہور پذیر ہوگی۔ ماروی پڑھتے ہیں تو ہمیں یہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم دیوتا دوبارہ پڑھ رہے ہیں۔ رمضان بھائی اگر کوئی چیز پسند نہ آئے تو یہی کہا کریں بھئی آئندہ بنانا تو اس سے بھی اچھی بنانا۔ کسی کا دل توڑنا اچھی بات نہیں۔ سلیم فاروقی صاحب کے انتقال پر بہت افسوس ہوا ہم سب اہل محفل مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ شام وسحر، منگول ایک جاہل وحشی قوم جس نے دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکمرانی کی مگر جب یہ سونامی مسلمانوں سے ٹکرایا تو مسلمانوں ہی میں گم ہوگیا آج شاید کوئی بھی منگول صفحۂ ہستی پر نہیں ہوگا، نسلی امتیاز میں ملک صاحب نے مشتاق باجوہ کے قتل کا معما بہت تدبیر اور جاں فشانی سے حل فرمایا۔ زاہدہ جیسی کینہ پرور عورتیں وہ بھی خطرناک حد تک کوئی چیز نہیں ملی تو اس کو صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا۔ نہ جانے کون سی بھیانک سزا کی مستحق ہیں۔ باتدبیر میں باتدبیر کا نام بدل کر دل چاہ رہا ہے الٹی ہوگئی تدبیر رکھ دوں، شہلا تو اپنے انجام کو پہنچ گئی لیکن ذیشان پھر بھی بچ گیا۔ مغل صاحب ایسی چھوٹی کاوشیں آپ جیسے بڑے شاہکار رائٹر پر جچتی نہیں ہیں۔ کچھ رومانس پر بڑا لکھیں، شکست میں ہار جو کی دشمن ٹینا کی ماں ماریا ہی نکلی۔ قتل کی لکیر میں باقی تو سب صحیح تھا لیکن ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ گلو اور کفیل کے لیے شنوسو نے کا انڈا دینے والی مرغی تھی اور گلو بھی بہت عقلمند تھا۔ فنگر پرنٹ میں مغرب کی ترقی یافتہ پولیس بہت تیز ہے اور ڈاکٹر گورڈن جیسے خجو مجرموں کو تو وہ لوگ مشکل سے ہی دیکھ کر پہچان لیتے ہیں۔ دھوپ میں پیر نکے شاہ نے واقعی اللہ تعالیٰ سے کہہ کر ناہید کا مسئلہ حل کرا دیا، عکس میں بے چارے سہیل فاروقی کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی لیکن قدرت نے ادھیڑ عمری میں اس زیادتی کی تلافی اس صورت میں کی کہ اس کی محبوبہ کی بیٹی نیلماں بیٹی کی صورت میں اسے مل گئی۔ چھپر چھاؤں میں جمال بندہ کچھ سمجھ نہیں آیا اور کچھ سائیکو بھی تھا شادی کے بعد بچے وغیرہ وقت پر ہو جائیں تو میاں بیوی کی توجہ بٹ جاتی ہے لیکن ان کے یہاں ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بھئی آپ الگ ہی رہ رہے ہو تو سسرال کے قریب گھر لے لو یا سسرال میں پورشن کرائے پر لے کر رہو۔ کچھ دوستوں میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلو کہ بیوی کی کمی محسوس نہ ہو۔ بہرحال قصوروار بیوی بھی ہے اور حنا واپس سسرال آگئی اور راضی نامہ ہوگیا لیکن جمال جیسے بندے کو حنا سے ایشوز ہی رہیں گے۔ باقی اشعار اور کترنیں بھی اچھی تھیں۔"

✠ پائندہ خان، سلیمان خیل، شیخوپورہ سے جنوری کے شمارے پر دلچسپ تبصرے کے ساتھ محفل میں شریک ہیں" دو، تین بک اسٹال کے چکر لگانے کے بعد سسپنس ملا تو انتظار کی کوفت ختم ہوگئی۔ سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا 'نیا سال' تو سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ نیا سال آتا ہے پھر گزر جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا ہمیں ادراک ہے کہ بے مقصد اور لایعنی خواہشات کی تکمیل کے بجائے اگر ہم انسانیت کی بھلائی اور نیکی میں ایک لمحہ بھی گزاریں تو ہم کو یہی لمحہ انسانیت کی معراج کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے، سال تو دور کی بات ہے۔ خیر اس کے بعد خطوط کی محفل میں پہنچے تو ساتھیوں کے جاندار تبصرے پڑھ کر خوشی ہوئی۔ الیاس سیتاپوری کی آخری معرکہ پڑھی۔ سیتاپوری صاحب کی کہانی جب بھی پڑھتا ہوں تو اس کا اثر بڑی دیر تک محسوس کرتا ہوں۔ بعض دفعہ تو دوبارہ بھی پڑھنے لگتا ہوں۔ اس دفعہ تردی کا کردار سامنے آیا ہے۔ اس نے روشنک کو حاصل کرنے کے لیے مسلمان بادشاہ کی جان لینی چاہی۔ انسان زن اور زر کے لیے وفاداریاں تبدیل کرنے اور گھٹیا حرکات سے بھی باز نہیں آتا۔ ہلاکو خان جیسے انسانیت کے قاتل اور فرعون کے لیے خدا نے بھی برقائی خان اور بیبرس کی شکل میں موسیٰ پیدا کردیے تھے۔ اس کے بعد ضیا تسنیم بلگرامی کی غوث پاک پڑھی۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا بات ہے حضور غوث پاک، قطب ربانی، محبوب سبحانی، شہباز لامکانی کی۔ آپ کا تذکرہ مبارک پڑھا تو روح کی اتھاہ گہرائیوں میں سرشاری کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے کہ بقیہ واقعات بھی پڑھوں تو دل ودماغ منور ہو جائیں۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی نظر فریب لاجواب تھی۔ کمبخت کامران نے نادرہ کی محبت کا خون کردیا اور خود بھی اس کے ہاتھوں قتل ہوکر گناہوں کا بوجھ بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ نادرہ بے چاری دکھوں کے ساتھ دارِفانی سے کوچ کرگئی۔ یہ ایک عبرت اثر کہانی تھی۔ 'اپ ڈیٹ' میں زمان کے دل میں شازی کی محبت کی یادیں پھانس بن کر اتر گئیں۔ میرے ایک دوست کے ساتھ بھی کچھ اس طرح کا معاملہ ہوا ہے جس کو میں صفحۂ قرطاس پر رقم کرکے سرگزشت میں بھیجوں گا انشاء اللہ۔ محبت تو روحوں کی تطہیر کرتی ہے۔ آخری لمحہ کاشف زبیر مرحوم کی بہترین تحریر ہے۔ عالیہ اپنی پاک دامنی کے ساتھ دنیا سے کوچ کرگئی اور بالآخر گل پور کے قبرستان میں دفن ہوئی جہاں اپنے بچپن میں باپ کے ساتھ گئی تھی۔ والدین کی تربیت کی وجہ سے عالیہ نے اپنی معصومیت پر آنچ نہیں آنے دی اور اپنی پاک دامنی پر جان بھی قربان کردی۔ میں کیا کروں، میں جارج اور

منٹگمری دونوں کا پلان ایک جیسا تھا لیکن منٹگمری نے پہل کر کے جارج پر پریشانی طاری کر دی۔ دلچسپ کہانی ہے۔ ڈونگ ڈیانگ فونگ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی بہترین تحریر ہے۔ امریکیوں نے ویت نام میں مظالم کی جو انتہا کر دی، اس پر بڈھارٹی کا ضمیر اسے مسلسل کچوکے لگا رہا ہے۔ انہوں نے وہاں جو خون کی ہولی کھیلی اور عورتوں کی عصمت دری کی، وہ درندگی کی انتہا ہے۔ باقی سسپنس زیرِ مطالعہ ہے۔ ماروی اور شیش محل سب سے آخر میں پڑھتا ہوں اس لیے تبصرہ نہیں ہو سکا۔“

✠ مہتاب احمد، حیدر آباد سے تبصرہ کر رہے ہیں ”اس ماہ کا سسپنس پوری آب و تاب کے ساتھ ملا۔ فہرست پر نظر دوڑائی پھر خطوط کی محفل میں پہنچے جہاں تمام لوگ اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ خیر محفل کی گفتگو سے لطف اندوز ہو کر سب سے پہلے شیش محل میں جا پہنچے۔ یہ قسط ایکشن سے بھرپور بڑی ہنگامہ خیز رہی۔ ربن دادا کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا گیا اور لگتا ہے کہ فاروق ربن دادا کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے سراپا انتقام بن چکا ہے۔ یقیناً وہ دادا کے قاتلوں کو عبرتناک انجام سے دوچار کرے گا۔ ادھر جولیٹ حویلی سے دلدار آغا کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی اور اس کا حویلی سے نکلنا اس کی زندگی کی ضمانت بن گیا۔ کیونکہ حویلی پر بلوائیوں نے حملہ کر کے تمام لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صرف صفی اللہ اور آپا بیگم بچ گئے اور اسد اللہ تو پہلے ہی فاروق کی تلاش میں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ بہرحال قسط بہت جاندار تھی۔ اس کے بعد تاریخی کہانی پڑھی۔ الیاس سیتاپوری نے منگول قوم کے بارے میں کتنی تفصیل سے لکھا ہے اور کہانی پڑھتے ہوئے کہیں بوریت کا احساس تک نہیں ہوا۔ یہی مصنف کی خوبی ہوتی ہے کہ پڑھنے والا کہیں بیزاری کا شکار نہ ہو۔ ویلڈن۔ ملک صفدر حیات کی نسلی امتیاز ہمیں گزارے لائق لگی۔ چھوٹی کہانیوں میں نمبر ون مغل صاحب کی باتدبیر رہی۔ شہلا اور ذیشان کی منصوبہ بندی بہت مضبوط تھی مگر کاتب تقدیر نے شہلا کے لیے کچھ اور ہی لکھ دیا تھا۔ شہلا خود لقمۂ اجل بن گئی۔ تنویر ریاض کی شکست اچھی کہانی تھی۔ آصفہ ضیا احمد کی قتل کی لکیر بہتر کہانی تھی۔ شنو کے ہاتھ میں قتل کی لکیر تھی اور بابا کی بات سچ ثابت ہوئی اور اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی دنیا برباد کر لی۔ تاہم اس کے ہاتھ میں قتل کی ایک نہیں دو لکیریں تھیں۔ ماروی پڑھی۔ لگتا ہے ماروی اب اپنے انجام تک پہنچ رہی ہے۔ کہانی میں ہر موڑ پر ایکشن اور سسپنس نظر آتا ہے۔ نایاب سودا ہمیں گزارے لائق لگی۔ تصوف میں غوث پاکؒ کے ایمان افروز واقعات پڑھنے کو ملے۔ بہت مزہ آیا۔ علی اختر کی دھوپ اچھی کہانی تھا۔ منظر امام کی عکس نے آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ قدرے مختلف اچھی تحریر تھی۔ دیر تک گم صم بیٹھے رہے۔ محمد زبیر سلیمانی کی چھپر چھاؤں کوئی خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ بہرحال مجموعی طور پر کہانیوں کا انتخاب اچھا تھا۔ ایک گزارش ہے کہ سلسلہ وار کہانیوں میں مغل صاحب کی کوئی کہانی شروع کریں۔ میرے خیال سے کافی قارئین کو ان کی تحریر کا انتظار رہتا ہے۔“

✠ ناہید یوسف، اسلام آباد سے شاملِ محفل ہیں ”سسپنس ملا تو لگا کہ اب وقت اچھا گزرے گا کیونکہ گھر پر اکیلے بیٹھے بیٹھے بوریت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے میں سسپنس بہترین رفیق ثابت ہوتا ہے۔ اس کی کہانیاں لاجواب ہوتی ہیں خصوصاً ماروی ہم بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ماروی کے کرداروں کی حرکات و سکنات اور ایکشن گو کہ خیال لگتا ہے مگر یقین جانیے پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔ مرحوم نواب صاحب نے کہانی پر گرفت کمزور نہیں ہونے دی۔ شروع سے یہ کہانی اپنے جوبن پر ہے۔ دوسری تحریر جس کا ہمیں شدت سے انتظار رہتا ہے وہ ہے مغل صاحب کی۔ مغل صاحب کیا خوب لکھتے ہیں اور ان کے پاس لفظوں کا جیسے خزانہ ہے۔ ہر لفظ موتی کی طرح اپنی جگہ فٹ نظر آتا ہے اور ان کی کہانی کا ٹائیک بھی بہت جاندار ہوتا ہے۔ ہمارے خیال سے ان سے سلسلہ وار کہانی لکھوانی چاہیے۔ کافی عرصہ ہو گیا انہوں نے سسپنس میں بڑی کہانی نہیں لکھی۔ باتدبیر مغل صاحب کی بہترین کہانی تھی۔ منظر امام صاحب کے کیا کہنے۔ ان کی تحریر دل کو چھوتی ہے۔ جب بھی سنجیدہ موضوع پر لکھتے ہیں یقین مانیے ہم دل سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ ان کی کہانی میں جو درد اور رشتے کی جھلک دکھائی جاتی ہے وہ دل کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی ہم نہیں پڑھتے جانے کیوں، یہ نہیں پتا۔ شیش محل تو ہر دفعہ بہت تیز ہوتی جا رہی ہے۔ افسوس کہ ربن دادا کا جاندار کردار اب پڑھنے کو نہیں ملے گا مگر اسما قادری نے کہانی خوب لکھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کہانی کا ٹیمپو اسی طرح برقرار رکھ پاتی ہیں کہ نہیں۔ بہرحال ابھی تک کہانی بہت اچھی جا رہی ہے۔ میرے خیال سے مصنفہ کو اب جولیٹ اور فاروق کا ملاپ کرا دینا چاہیے کیونکہ کافی اقساط گزر چکیں ان دو کرداروں کو الگ ہوئے۔ خیر یہ تو رائٹر بہتر سمجھ سکتا ہے۔ شکست تنویر ریاض کی اچھی کہانی تھی، پڑھ کر مزہ آیا۔ سلیم انور کی فنگر پرنٹ بھی خوب کہانی تھی۔ قاتل کی بوکھلاہٹ نے اسے پکڑوا دیا ورنہ شاید وہ بچ جاتا۔ الیاس سیتاپوری کی شام و سحر اچھی تاریخی کہانی تھی۔ واقعات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا۔ آصفہ ضیا احمد شاید نیا نام ہے۔ مگر کہانی بہترین تھی۔ شنو کی ہاتھ کی لکیر نے آخر اس سے قتل کروا ہی دیا۔ ثمر عباس کی نایاب سودا بہتر لگی۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ ہمارا خط شاملِ محفل کیا جائے گا اور محفل کے لوگ ہمیں خندہ پیشانی سے ویلکم کہیں گے۔ اصل میں مصروفیت کے باعث مستقل تبصرہ نہیں کر پاتے تاہم دل کرتا ہے کہ تبصرہ لکھیں۔ خیر کوشش کریں گے باقاعدگی سے لکھنے کی۔ بشرطیکہ ہمارا تبصرہ شاملِ محفل بھی ہو۔ ادارے کے کہنہ مشق قلم کار سلیم فاروقی کے انتقال کا دکھ ہوا۔ اللہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کے درجات بلند کرے۔ (آمین)“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

صادق معاویہ، خان پور۔ دوست محمد خان، چارسدہ روڈ، پشاور۔ فاروق احمد قریشی، نامعلوم مقام۔ آسیہ جہانگیر، میرپور خاص۔ اطہر حسین، کراچی۔ ثاقب جمال، کراچی۔ حرا احمد، سکھر۔ کمال احمد، ملتان۔ شہلا شاکر، حیدر آباد۔ نازیہ منصور، بہاولپور۔ صبا سحر، کراچی۔ حرا امین، کوئٹہ۔ اسلم خان، پشاور۔

منگول جیسی وحشی قوم خانہ بدوشی کی حالت میں دنیا کو زیر کرتی چلی گئی لیکن... جب ان کی وحشی جبلت تمدن کے ہاتھوں مسخر ہونے لگی تو انہیں بھی گھوڑوں کی پشت سے اترنا پڑا۔ جسے ختم کرنا ان کا مقصد تھا اسی اسلام نے ان کے دلوں کو فتح کرلیا تھا۔ دنیا میں ایک قانون تو پوری صداقت کے ساتھ رائج ہے کہ طاقتور غالب اور کمزور مغلوب ہوتا ہے۔ جب مسلمان کمزور تھے تو طاقتور اور ذہین وحشی ان پر غالب آگئے اور جب وحشی کمزور اور کم عقل ہوئے تو طاقتور مسلمانوں نے انہیں زیر کرلیا۔ زیرِنظر کہانی کے مرکزی کردار کیخاتو خان کو بھی مسلمان ہونے کے جرم میں قتل کردیا گیا اور پھر قتل کرنے کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر ارغون کے بیٹے غازان خان کے عہد میں یہ حکومت واپس اپنے سابقہ خاندان میں چلی گئی۔ تاریخ کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ جس ارغون خان نے مسلمان ہونے کے جرم میں اپنے بھائی نکودار احمد کو قتل کیا تھا اور جو مرتے دم تک اسلام کے خلاف کام کرتا رہا، بعد میں نہ صرف اسی کا بیٹا غازان خان مسلمان ہوگیا اور تاریخ میں سلطان محمود غازان کے نام سے بڑی شہرت حاصل کی بلکہ اس کے عہد میں منگولوں کی اکثریت نے بھی اسلام قبول کرلیا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

عمرِ جاوداں کی تلاش

الیاس سیتاپوری

منگول امراء شاہی افراد اور منگول عسا کر نے متفقہ طور پر ارغون کو ایل خان بنا دیا۔ ارغون نے سعد اللہ یہودی کو اپنا وزیر بنا لیا۔ ارغون اور سعد اللہ یہودی نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سر جوڑ کر مشورے کیے۔ ارغون نرمی اور مروت سے کام لینا چاہتا تھا مگر سعد اللہ یہودی انتہا پسند تھا۔ آس پاس کی مسجدوں سے ہونے والی اذان سعد اللہ یہودی کے دل و دماغ پر ضربیں لگاتی تھی۔ وہ اس آواز کو بند کر دینے کی فکر میں تھا لیکن کسی طرح بس نہیں چل رہا تھا لیکن ارغون خان کے برسرِ اقتدار آتے ہی اس کے انتقامی خواب پورے ہونے لگے۔ مسلمانوں کو غدار اور ملک دشمن قرار دیا گیا اور یہی جواز ان کے قتل کا سبب بن گیا۔ ارغون کے حکم سے مسلم کشی عام ہوگئی۔ مسلمان علما کو بطورِ خاص ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا گیا۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور بیماروں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ بستیوں کے گلی کوچے مسلمانوں کی لاشوں سے پٹ گئے۔ ان میں کے بعض مسلمان جیالے بھی تھے اور ہوشیار اور چالاک بھی۔ انہوں نے اپنا دین تو نہیں بدلا مگر ارغون کی تلوار سے بچنے کے لیے جنگلوں اور غاروں میں روپوش ہوگئے۔ یہ منگولوں سے محفوظ پانچوں وقت کی نمازوں میں یہی دعا مانگتے رہتے کہ خدایا کافروں سے نجات دلا اور ارغون کے دل میں اسلام ڈال دے۔

سعد اللہ یہودی شمس الدین جوینی کو بھی قتل کر دینا چاہتا تھا مگر ارغون نے ایسا نہیں ہونے دیا، اس نے کہا۔ ”میں نے جوینی کو پناہ دی ہے اس لیے میں اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

ارغون کا بھائی کیخاتو خان مقتولوں کی بستیوں میں گیا۔ وہاں لاشیں سڑ رہی تھیں اور ہر طرف تعفن پھیلا ہوا تھا۔ کیخاتو خان افسردہ اور مضمحل کچھ دیر کھڑا اس مرقع عبرت کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ ان لاشوں کو گڑھے کھود کھود کر دفن کر دیا جائے۔

مخبروں نے یہ خبر ارغون اور سعد اللہ یہودی تک پہنچا دی۔ غاصب ایل خان اور سعد اللہ یہودی نے عطر اور خوشبویات میں بڑے بڑے رومال بسا کر اپنے منہ پر چڑھا لیے اور مسلمان مقتولوں کی بستی میں پہنچ گئے۔ ارغون نے اپنے بھائی کیخاتو خان سے پوچھا۔ ”یہ تو کیا کر رہا ہے؟“

کیخاتو خان ذرا بھی نہیں گھبرایا، جواب دیا۔ ”میں متعفن لاشوں کو گڑھوں میں ڈلوا کر انہیں بند کروا رہا ہوں۔“

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ”لیکن اس طرح ہمارا مقصد تو......“

ارغون نے اس کی بات کاٹ دی، بولا۔ ”حالانکہ ہمارا تو یہ مقصد تھا کہ ان ظالموں کی لاشیں کتے بلیوں کے حوالے کر دی جائیں۔“

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ”خان محترم! کتے بلیاں جتنی لاشیں کھا سکتے تھے کھا چکے، اب جو لاشیں سڑ رہی ہیں ان سے بیماریاں پھیل جائیں گی۔ میں نے اسی خیال سے انہیں دفن کرانے کا کام شروع کیا۔“

ارغون اور سعد اللہ یہودی مُردوں کی بستی میں گھومنے لگے، ان کے ساتھ ساتھ منگول سپاہ کا دستہ بھی حرکت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بایدو خان بھی یہیں پہنچ گیا۔ سعد اللہ یہودی نے ایک پانچ چھ سالہ بچے کو اوندھے منہ پڑے دیکھا، اس کے شانے میں ترکش پھنسا ہوا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے تیر قرینے سے لگے تھے اور چھوٹی سی کمان سینے کے نیچے دبی تھی۔ سعد اللہ یہودی نے ارغون خان کو یہ لاش بطورِ خاص دکھائی، بولا۔ ”محترم ایل خان! آپ نے اس پانچ چھ سالہ بچے کی لاش ملاحظہ فرمائی۔ یہ بچہ مرنے سے پہلے ہمارے کسی آدمی کو تیر کا نشانہ بنانا چاہتا تھا، اس کے پیچھے سے کسی نے اس کا کام تمام کر دیا۔“

ارغون خان نے بچے کی لاش کو غور سے دیکھا اور منہ پھیر کر سعد اللہ یہودی کو جواب دیا۔ ”لیکن بچہ تھا بہت بہادر، اس نے سینے کے بجائے پشت پر مار کھائی ہے۔“

کیخاتو خان بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ خوشبویات میں ڈوبا ہوا ایک رومال کیخاتو خان کے چہرے پر باندھ دیا گیا۔ وہ لاشوں کو پھلانگتے اور جمے ہوئے خون سے گزرتے ہوئے ایک ایسی عورت کی لاش کے پاس جا کھڑے ہوئے جس کے سینے سے ایک بچہ چمٹا ہوا تھا اور کسی شقی القلب منگول کا نیزہ ان دونوں کے سینوں کے باہر نکل گیا تھا۔ گویا دونوں سیخ کے کباب کی طرح سیخ میں پرو دیے گئے تھے۔

کیخاتو خان نے کہا۔ ”محترم ایل خان! اتنی سفاکی بھی مناسب نہیں جبکہ مسلمان فاتح دوسری قوموں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے۔“

ارغون نے جواب دیا۔ ”شہزادہ کیخاتو خان! ہم ان دونوں پر اپنے دو نیزے کیوں ضائع کرتے؟“

اس پر دونوں کو ہنسی آگئی اور فضا قہقہوں سے گونج اٹھی۔

سعد اللہ یہودی ایک نوجوان کی لاش کو بغور دیکھنے لگا، اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے تھے۔ اس نے ارغون کو بطورِ خاص مخاطب کیا۔ ”خان محترم! اس نوجوان کو ملاحظہ

فرمائیں۔ اس کے دونوں ہاتھ غائب ہیں، غالباً کوئی کتا کھا گیا ہوگا۔''

کیخاتو خان کو یہ چہرہ کسی شناسا سا لگا، بولا۔''میرا خیال ہے بھائی تکودار اس پر بہت مہربان تھے کیونکہ میں نے اس نوجوان کو ان کے پاس کئی بار دیکھا تھا۔''

ارغون نے ازراہِ مذاق کہا۔''تب پھر جاودانی نیلے آسمان کے اس پار تکودار اور یہ نوجوان دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ رہے ہوں گے۔''

ایک بار پھر لوگوں کے قہقہوں سے فضا گونج گئی۔

ارغون اور سعداللہ یہودی کچھ دیر مقتولوں کے عبرت ناک حال اور آثار سے لطف اندوز ہوتے رہے، بایدو خان خلافِ معمول چپ تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا، وہ اتفاقاً کسی لاش سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا مگر گرا نہیں، سنبھل کے رہ گیا۔ وہ ٹھوکر لگنے والی لاش سے مخاطب ہوا۔''کیوں بھائی! میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم درپئے آزار ہو۔''

کیخاتو خان کو یہ ساری باتیں گراں گزر رہی تھیں۔ خوشبو میں بسے ہوئے رومال بھی کئی دن کی سڑی لاشوں کے تعفن پر قابو نہ پا سکے اور ان سب کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ارغون کو اپنے بھائی کیخاتو خان پر رحم آرہا تھا جو بہت کم بولتا تھا، اس نے پوچھا۔''کیخاتو خان! تو خوش کیوں نہیں ہے؟''

کیخاتو خان نے افسردگی سے جواب دیا۔''میں سوچتا ہوں اگر بھائی تکودار اپنے آباؤ اجداد کے دین اور رسوم سے منحرف نہ ہوتے تو ان کا یہ حشر کیوں ہوتا اور اس کے علاوہ میں کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں۔''

ارغون نے بے چینی سے پوچھا۔''اور کیا؟ مثلاً؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔''چنگیز خان سے لے کر والد اباقہ خان تک ہر ایک نے آپس میں اتحاد اور یکجہتی کی تلقین کی، اپنی اولاد سے اتفاق اور پیار و محبت کے وعدے لیے لیکن افسوس کہ ہم نے ان کا خیال نہیں کیا۔''

ارغون کو کیخاتو خان پر کچھ شبہ سا گزرا، پوچھا۔''کیا بات ہے؟ اس طرح تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

کیخاتو خان نے سعداللہ یہودی کی طرف دیکھا جو بظاہر دونوں بھائیوں کی باتوں سے بے نیاز اپنے حال میں مگن ساتھ ساتھ چل رہا تھا مگر حقیقتاً اس کے دونوں کان ان کی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔

کیخاتو خان نے جواب دیا۔''برادرِ محترم! میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اپنے بھائی تکودار کو قتل کر کے اور اپنی مسلمان رعایا کو ذبح کر کے آپ نے حاصل کیا کیا؟ اب ہم لوگ قراقرم بھی واپس نہیں جا سکتے، کیونکہ ہمارا خاقان قراقرم کے بجائے چین کے شہر شانگ تو میں آرام کر رہا ہے۔ اب ہم سب کو یہیں، انہی زمینوں میں رہنا ہے، پھر کیوں نہ ہم سب مل جل کر رہتے، اتحاد و یگانگت اختیار کر لیتے۔ جوجی خان کا خانوادہ مسلمان ہو چکا۔ ہمارے آس پاس مسلمانوں کی حکومت ہے، ہمیں ان سے بھی رواداری اور محبت سے پیش آنا چاہیے۔ اگر ہم اپنوں کو ماردیں گے تو ہمارا ساتھ کون دے گا؟''

ارغون کا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا اسے کچھ سوچتے دیکھا تو سعداللہ یہودی کو فکر لاحق ہوگئی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ارغون کے قریب لے آیا۔ ارغون نے ازراہِ مذاق مسکراتے ہوئے کہا۔''تو کیوں پریشان ہو رہا ہے سعداللہ؟''

سعداللہ نے جواب دیا۔''جب تک ولی نعمت حکمراں ہیں، سعداللہ یہودی کسی سے کیوں ڈرے گا؟''

محل میں پہنچنے کے بعد ارغون کیخاتو خان کو تخلیہ میں لے گیا اور اس کو اجازت دی کہ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہے، فی الفور کہہ دے۔

کیخاتو خان نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔''میں جو چاہوں کہہ دوں...... کیا سچ؟''

ارغون نے جواب دیا۔''میں نے تجھ کو اجازت جو دی۔''

کیخاتو خان نے پوچھا۔''کیا آپ یہ گوارا کرلیں گے کہ حکومت بایدو خان کے خاندان میں چلی جائے؟''

ارغون نے جواب دیا۔''نہیں، اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تو نے یہ سوال کیوں کیا؟''

کیخاتو خان نے کہا۔''بایدو خان سپہ سالارِ اعلیٰ بننا چاہتا ہے اور اب آپ خود یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حکومت کدھر جا رہی ہے؟''

ارغون نے کہا۔''بایدو خان نے سپہ سالاری کی خواہش تو کی تھی مگر میں نے انکار کر دیا کہ اس پر میرے بھائی کیخاتو خان کا حق ہے۔''

کیخاتو خان ارغون کی زبان سے یہی سننا چاہتا تھا، خوشامدانہ عرض کیا۔''برادرِ محترم! آپ تو خود سمجھ دار ہیں، شاید اسی لیے......''

ارغون نے خشک میووں سے اپنے بھائی کی خاطر مدارات کی اور اس کو بتاتا رہا کہ اس نے تکودار کو کیوں قتل کیا۔ اس نے اس قتل کے جواز میں بڑی موثر تقریر کر ڈالی لیکن کیخاتو خان غیر جذباتی بنا بیٹھا سنتا رہا۔

ارغون جب بولتے بولتے اچانک چپ ہو گیا تو کیخا تو خان کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے سر اوپر جو اٹھایا تو دیکھا ارغون ہانپ رہا ہے اور اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

ارغون نے تالی بجا کر دو خدمت گار خواتین کو بلا لیا اور انہیں حکم دیا کہ سانس کی دوا لائی جائے۔ جب وہ دونوں چلی گئیں تو ارغون نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی صحت کے بارے میں بہت فکرمند رہتا ہوں، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں بہت دنوں، بہت سالوں تک لیکن صحت جواب دے رہی ہے۔'' پھر اچانک سوال کیا۔ ''کیخا تو خان! میں نے سنا ہے کہ تو بھی بہت عقلمند ہے۔''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''اگر میں عقلمند ہوتا تو دونوں بھائیوں میں صلح کرا دیتا۔ تکودار کے قتل کے بعد میں عقلمندی کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہوں، میں عقلمند ہوتا تو کسی بھی طرح بھائی تکودار مرحوم کو بچا لیتا۔''

ارغون نے برا سا منہ بنایا۔ ''کیخا تو خان! میرے بھائی تو تکودار کا نام نہ لیا کر۔ مجھے اس نام سے چڑ ہے۔''

کیخا تو خان نے اجازت چاہی مگر نہیں ملی۔ ارغون خان ایک بار پھر اپنے مرض کا ذکر لے بیٹھا، بولا۔ ''کیخا تو خان! میں اپنی زندگی کی طرف سے بہت اداس رہتا ہوں۔ تو مجھے مشورہ دے کہ میں کس طبیب کو پکڑوں، کس حکیم سے رجوع کروں؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''میں نے سنا ہے کہ یونان میں بہت عقلمند طبیب ہوتے ہیں، ان کے بعد مصر کا نام لیا جاتا ہے۔''

ارغون خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ مضطربانہ بولا۔ ''ہاں، ہاں... چند نام اور؟''

کیخا تو خان نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک ملک اور ہے، آپ اگر کہیں تو اس کا نام بھی بتا دوں؟''

ارغون کھڑا ہو گیا اور اس نے جلدی جلدی ٹہلنا شروع کر دیا، بولا۔ ''ہاں، ہاں، بولتا کیوں نہیں، وہ تیسرا ملک؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''وہ تیسرا ملک ہندوستان ہے۔ اس ملک کے بارے میں، میں نے یہ سن رکھا ہے کہ وہاں عقل و دانش کی کوئی کمی نہیں۔ ان کے حکیم جو وید کہلاتے ہیں، ایسے ایسے نسخے رکھتے ہیں کہ چاہیں تو بوڑھے کو جوان بنا دیں اور مرے ہوئے میں جان ڈال دیں۔''

ارغون اپنے بھائی سے لپٹ گیا۔ ''تو بس پھر ہندوستان ہی رہا۔ کیخا تو میرے بھائی! میں تجھ کو اپنی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ بنا دینا چاہتا ہوں۔ تو ہندوستان کے کسی نامی گرامی طبیب کو بلوا لے۔ یہ مت سوچ کہ وہ اپنے آنے کی قیمت کیا لے گا۔ قیمت اس کو اس کی امید اور توقع سے زیادہ دوں گا۔''

کیخا تو خان نے کہا۔ ''شاید اس وید کی جستجو میں مجھے ہندوستان کا سفر خود کرنا پڑے۔''

ارغون نے خوشی سے جواب دیا۔ ''اس سے بہتر کیا ہوگا؟ خوب! خوب!''

کیخا تو خان محل سے نکل کر اپنے قصر میں چلا گیا، اسے مسلمانوں کی بربادی کا بڑا دکھ تھا۔ ارغون پر سعد اللہ یہودی کا اثر تھا اور یہ یہودی مسلمانوں سے بہت چڑتا تھا۔ سعد اللہ یہودی جو چاہتا تھا، وہی کر گزرتا تھا۔ مسلمانوں کے اثرات بالکل زائل ہو چکے تھے اور اب ان کی جگہ عیسائیوں کے چہرے نظر آنے لگے تھے۔ ارغون کا بیٹا جون ہر وقت عیسائیوں میں گھرا رہتا تھا۔ وہ جون کو بتا رہے تھے کہ منگولوں کا اصل مذہب آسمان پرستی ہے مگر انہیں اپنے آبائی دین کے علاوہ اگر کوئی مذہب پسند آیا ہے تو وہ دین مسیحی ہے۔ خود ہلاکو خان جو جون کا دادا تھا، ہمیشہ عیسائیوں کا احترام کرتا رہا اور جون کی دادی دوقوز خاتون نے تو مرتے دم تک مسیحی دین کو اپنائے رکھا۔ وہ جب تک زندہ رہی اس کا سرخ چیپل اس کے خیمے سے ملحق رہتا۔ لکڑی کی اس عبادت گاہ میں وہ بڑے خلوص اور انہماک سے اپنے آسمانی باپ کی عبادت کیا کرتی تھی۔

کیخا تو خان کی ان سب پر نظریں تھیں اور چونکہ وہ خود اپنے مرحوم بھائی تکودار کی طرح اسلام پر مائل تھا، اس لیے یہودیوں اور عیسائیوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ کبھی کبھی جوینی کے پاس چلا جاتا اور سازشی یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف باتیں کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا۔ جوینی کو کیخا تو خان کی آمد اور اس کی اس قسم کی باتوں سے پریشانی ہوتی تھی لیکن وہ منع بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ تکودار کے بعد کیخا تو خان ہی کے دم سے امید کی شمع روشن تھی۔ اس نے کیخا تو خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''کیخا تو خان! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، خاموش رہو اور حالات پر گہری نظر رکھو پھر جب مناسب وقت آ جائے تو جو چاہنا کر گزرنا۔''

کیخا تو خان نے کہا۔ ''جوینی محترم! آپ کچھ کیجیے۔ خدا کے لیے کچھ کیجیے ورنہ ارغون کے ہاتھوں ایک اور بغداد تباہ ہوگا۔''

جوینی نے جواب دیا۔ ''وقت آنے دو کیخا تو خان!

لوہے کو گرم ہو جانے دو۔ جب یہ گرم ہو جائے گا تو میں خود تمہیں مطلع کر دوں گا لیکن خدا کے لیے تم یہاں مت آؤ جاؤ۔''

کیخاتو خان نے اکڑ کے جواب دیا۔ ''مجھے یہاں آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔''

جوینی نے پوچھا۔ ''سپہ سالارِ اعلیٰ کون بنا؟''

کیخاتو خان مسکرانے لگا۔ ''شاید میں سپہ سالارِ اعلیٰ بنا دیا جاؤں۔''

جوینی کی باچھیں کھل گئیں، بولا۔ ''اگر خوش قسمتی سے یہ موقع مل گیا تو سمجھ لو کہ سب کچھ دوبارہ مل گیا...... اور دیکھو، خبردار جو کسی کو تمہاری بابت یہ شبہ بھی گزرے کہ تم مسلمان ہو یا مسلمانوں کی طرف مائل ہو۔''

کیخاتو خان بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دیا، بولا۔ ''کبھی کبھی تو میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ارغون کو قتل کر دوں لیکن ارغون کے قتل سے بات وہیں کی وہیں رہے گی اور کوئی دوسرا ارغون برسرِاقتدار آ جائے گا۔''

جوینی نے کھڑکی سے باہر دیکھا، وہاں بالکل سناٹا تھا مگر دو ڈھائی سو قدم دور بکائن کے چند درختوں کے سائے میں کچھ لوگ کھڑے دکھائی دیے۔ بظاہر یہ مسافر معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے گھوڑے بکائن کی شاخوں سے بندھے کھڑے تھے۔ ان کی دُمیں گھڑی گھڑی ہل رہی تھیں۔

کیخاتو خان نے بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر جوینی نے اسے روک دیا۔ ''دور رہو، کھڑکی سے دور رہو اور بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''میں یہاں سے چلا تو جاؤں گا مگر آپ نے کھڑکی کے باہر کیا دیکھا؟ کچھ مجھے بھی تو بتائیے۔''

جوینی نے کھڑکی کو بند کر دیا، بولا۔ ''بکائن کے درختوں تلے چند مسافر سستا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ مسافر نہ ہوں۔ سعد اللہ یہودی کے آدمی ہوں اور ہم دونوں کی نگرانی کر رہے ہوں۔''

کیخاتو خان جوینی کے گھر سے نکلا اور سیدھا بکائن کے درختوں کی طرف چل دیا۔ درختوں کے نیچے پہنچنے پر کیخاتو خان نے ان سب کو پہچان لیا۔ یہ کل تین تھے۔ دو یہودی جو سعد اللہ کے ملازم تھے اور ایک مسیحی جو جون کا دوست تھا۔ کیخاتو خان نے ان سے پوچھا۔ ''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

ایک یہودی نوجوان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہم یہاں سیر کر رہے ہیں۔ کیوں جناب! آپ کو اس پر کوئی اعتراض؟''

کیخاتو خان جزبز ہو کر رہ گیا۔ جون کے دوست نے ہنس کر پوچھا۔ ''ہم تو یہاں سیر کر رہے ہیں اور آپ یہاں کیا کر رہے تھے؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔''

وہ ان تینوں کو ہنستا مسکراتا چھوڑ کر اپنے قصر کی طرف چلا گیا۔ اس نے اپنے قصر کے دروازے کے سامنے سے مہ وشوں کی ایک جماعت جاتے دیکھی۔ اس کو ارغون کے محل کا داروغہ جانوروں کے ریوڑ کی طرح لیے جا رہا تھا۔ کیخاتو خان کو ارغون خان پر رحم آ رہا تھا جو اپنی صحت اور زندگی کی طرف سے بہت فکرمند تھا مگر عورتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ یہ ساری عورتیں ارغون خان کے شبستان میں جا رہی تھیں۔

رات کے پچھلے پہر کیخاتو خان کو شاہی محل میں طلب کر لیا گیا۔ جب وہ میدان سے گزر کر محل کی طرف جا رہا تھا تو اس نے منگول سپاہ کو الاؤ کے آس پاس چہلیں کرتے دیکھا۔ یہ آگ تاپ رہے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ الاؤ کے پاس دوڑتے بھاگتے منگولوں کے سائے متحرک تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں کیونکہ ان کے مترنم قہقہے کانوں میں رس گھول رہے تھے اور دلوں میں طوفان اٹھا رہے تھے۔ جذبات میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

وہاں سے گزرنے کے بعد ہر چیز سوئی سوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ محل میں داخل ہونے کے بعد دربانوں نے کیخاتو خان کے احترام میں کھڑے ہونا اور سر جھکانا شروع کر دیا۔ وہ شہزادے کیخاتو خان کو اس لیے عزت و احترام دے رہے تھے کہ انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ کل کیخاتو خان ہی برسرِاقتدار آ جائے۔

ارغون کیخاتو خان سے سرد مہری سے پیش آیا۔ اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ''تیرا جوینی سے کیا رشتہ ہے؟''

کیخاتو خان سمجھ گیا کہ مخبروں نے اس کی تفصیلی خبر ارغون تک پہنچا دی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں کبھی کبھی جوینی کے پاس اس لیے چلا جاتا ہوں کہ اس کی حرکات و سکنات سے باخبر رہوں۔''

ارغون نے پوچھا۔ ''تو وہاں سے کیا خبر لائے؟''

کیخاتو خان ارغون کے سوالوں سے پریشان ہو رہا تھا، جواب دیا۔ ''وہ بڑی مایوسی کے دن گزار رہا ہے۔''

ارغون نے پوچھا۔ ''شراب پیو گے؟''

کیخاتو خان ذہنی طور پر مسلمان ہو چکا تھا اور شراب کو

بُرا سمجھتا تھا مگر ارغون سے مصلحتاً انکار نہیں کرسکا، بولا۔ ''ضرور پیوں گا۔''

ارغون نے دور کھڑی ہوئی ایک خوب صورت لڑکی کو پاس بلایا اور حکم دیا۔ ''شہزادہ کیخا تو خان کو شراب پلائی جائے۔''

شراب بلوری جاروں میں بھری ہوئی میز پر رکھی تھی۔ اس کے پاس ہی آلاتِ مے کشی رکھے ہوئے تھے۔ کنیز نے بلوری جام میں شراب انڈیلی اور اسے بڑے انداز سے کیخا تو خان کی خدمت میں پیش کردیا۔ جام کو پیش کرتے ہوئے وہ دوزانو ہوگئی تھی۔ گویا اس منظر سے پورے جسم میں کیف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ کیخا تو خان نے ہوش میں آتے ہوئے خوب صورت کنیز کے چہرے پر نظر ڈالی، وہ مسکرا رہی تھی۔

ارغون کی نظریں کیخا تو خان کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے شہزادے کو جام ہاتھ میں لیتے خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر مسکراتے اور جام کو ہونٹوں سے لگاتے دیکھا تو کسی قدر مطمئن ہوگیا۔

کیخا تو خان نے عام منگولوں کے انداز میں شراب پی اور کنیز کو کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا، بولا۔ ''برادر محترم! گستاخی معاف! اب میں برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر اجازت ہو تو میں ملحقہ کمرے میں چلا جاؤں۔''

ارغون مسکرایا لیکن پھر سنجیدگی سے تنبیہہ کی۔ ''کیخا تو خان! ہوش میں آ۔ میں نے تجھے یہاں کسی مقصد سے بلایا ہے۔''

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کنیز کو کیخا تو خان کی آغوش سے جدا کیا اور کنیز کے رخسار پر ایک ہلکی سی چپت لگا کر رخصت کردیا۔

کیخا تو خان نشے میں رونے لگا۔ ''بھائی ارغون! یہ آپ نے کیا کیا؟''

ارغون نے کہا۔ ''اس وقت میں بھائی ارغون نہیں، ایل خان ہوں۔ میں نے کل تک یہ فیصلہ کیا تھا کہ تجھ کو منگول عساکر کا سپہ سالار اعلیٰ بنا دوں گا مگر آج میں تذبذب میں ہوں۔ میں جوینی غدار سے تعلق رکھنے والے کو اتنا عظیم منصب نہیں دے سکتا۔''

کیخا تو خان نے ایک بار پھر تردید کی۔ ''میرا جوینی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

ارغون نے کیخا تو خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''شہزادے! تو میرا چھوٹا بھائی ہے، میرے بعد تو ہی ایل خان ہوگا۔ اگر میں کسی وجہ سے تجھے قتل کردوں گا تو حکومت میرے خاندان سے نکل کر بایدو خان کے خاندان میں چلی جائے گی لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

کیخا تو خان احمق بنا ہوا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت مخبوط الحواس دیوانہ۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے بڑے بھائی ارغون کی صورت دیکھ رہا تھا۔

ارغون اسے سمجھائے چلا جارہا تھا۔ ''اگر تو اپنا آبائی دین چھوڑنا ہی چاہتا ہے تو عیسائی بن جا کیونکہ میری ماں بھی مسیحی تھی۔ مسیحی بے ضرر ہیں۔ ان سے ہمیں کبھی بھی نقصان نہیں پہنچا مگر مسلمان، اسلام، اصل خطرہ یہی لوگ ہیں۔ یہ سخت جان لوگ جب بھی موقع پاتے ہیں ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ مصر میں ہمارا مشہور جنرل قطبوغا مارا گیا، ہمیں اس کا انتقام لینا ہے۔''

لیکن کیخا تو خان کو گویا کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا اس نے ارغون کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔

ارغون نے سوچا۔ اس کا ہوش میں آنا ضروری ہے ورنہ ہر بات فضول ہے۔ ارغون نے کیخا تو خان کو خوش کرنے کے لیے خوب صورت کنیز اس کے حوالے کردی اور کہا۔ ''جا شہزادے عیش کر..... تو بھی کیا یاد کرے گا۔''

لیکن شہزادہ کیخا تو خان اتنا بدمست ہورہا تھا کہ دوسرے کمرے تک خود نہیں جاسکتا تھا اس لیے ارغون نے ایک دوسری کنیز کو حکم دیا کہ شہزادے کو ملحقہ کمرے میں پہنچا دیا جائے۔

کنیز نے شہزادے کیخا تو خان کو ملحقہ کمرے میں پہنچا دیا مگر اس کمرے میں وہ کنیز نہیں تھی، جس کی تلاش میں وہ یہاں اس کمرے میں آیا تھا، اس سے وہ محروم رہا۔

کیخا تو خان اس کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر لیٹ کر سو گیا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو خود کو اس کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک خدمت گار خاتون کیخا تو خان کے چاروں طرف پھر کے اس کا جائزہ لیتی رہی اور آخر میں اس نے کیخا تو خان کو ارغون کے روبرو پہنچا دیا۔ رات والی خوب صورت کنیز ارغون کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

ارغون نے کیخا تو خان کو رات کی باتیں یاد دلائیں اور کہا۔ ''رات تو اتنی پی گیا تھا کہ تجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا اور نشے میں ہی تو نے میری اس کنیز کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اسی وجہ سے میں تجھ سے باتیں بھی نہیں کرسکا۔''

کیخا تو خان بظاہر شرمندہ تھا مگر اندر ہی اندر اپنی کامیاب شرارت پر خوش ہورہا تھا۔

ارغون نے کہا۔ ''شہزادے کیخا تو خان! رات میں

نے یہ فیصلہ کرلیا کہ تو یہیں میرے قریب ہی رہے گا۔ فی الحال ایل خان اور جملہ افواج کا سپہ سالار میں خود رہوں گا۔ بعد میں کسی مناسب موقع پر سپہ سالاری کا منصب تیرے حوالے کردیا جائے گا۔"

کیخاتو خان نے پوچھا۔"برادر محترم! کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟"

ارغون نے جواب دیا۔"میں تجھ پر اعتبار نہ کرتا تو اتنی باتیں کیوں کرتا؟ سپہ سالاری کی پیش کش کیوں کرتا؟ تو میرا ولی عہد بھی تو ہے اور میری خواہش ہے کہ تو اپنی زندگی کروفر سے گزارے۔" اس کے بعد خوب صورت کنیز کی طرف اشارہ کرکے کہا۔"میں نے اپنی یہ خوب صورت کنیز تیرے حوالے کردی۔ اب تو اس کا مالک ہے، اس کے علاوہ دو غلام بھی تجھے دیے گئے جو تیری خدمت بھی کریں گے اور ہر وقت سائے کی طرح تیرے ساتھ رہیں گے تاکہ تجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔"

کیخاتو خان نے بظاہر تو خوشی کا اظہار کیا اور ارغون کا شکریہ بھی ادا کیا مگر اندر سے اس کا سکھ چین برباد ہو چکا تھا۔

کنیز اسی وقت شہزادے کے حوالے کردی گئی اور دونوں غلاموں کی بابت یہ کہا گیا کہ وہ محل کے باہر حوالے کر دیے جائیں گے۔

کیخاتو خان اپنے بھائی ارغون کے سامنے کم سے کم بول رہا تھا۔ محض اس لیے کہ کہیں اس کی کوئی بات پکڑی نہ جائے اور اس کی الٹی سیدھی وضاحتوں میں خوامخواہ الجھ کررہ جائے۔

ارغون نے اسے ایک تلوار بھی مرحمت کی۔ جس وقت وہ اپنے ہاتھ سے تلوار کیخاتو خان کو دے رہا تھا تو اس کے دونوں ہاتھ رعشے سے کپکپا رہے تھے۔ کیخاتو خان کی نظریں اسی ہاتھ پر جم کررہ گئیں۔ ارغون بھی اس بات کو محسوس کررہا تھا۔ اس نے کہا۔"شہزادے کیخاتو خان! اپنی اس پیشکش کو بھلا نہ دینا جو ہندوستانی ویدوں سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی ایسے وید کو ہندوستان سے ضرور تلاش کرواکے لانا ہے جس کے پاس انسانی زندگی کو طویل العمری بخشنے کا نسخہ پایا جاتا ہے اور جو بڑھاپے کو جوانی میں بدل سکتا ہو۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔"آپ کا یہ کام سعداللہ یہودی سے بہتر کوئی بھی نہیں کرسکے گا، یہاں تک کہ جب میں اس اہم کام کے پیش نظر خود کو ٹٹولتا ہوں تو اپنے آپ کو بیکار محض پاتا ہوں لیکن سعداللہ یہودی یہ کام خوب اچھی طرح کرسکتا ہے۔"

ارغون نے فکرمند لہجے میں کہا۔"لیکن سعداللہ تو میرا مشیر، میرا وزیر ہے۔ میں صلاح مشورے کس سے کیا کروں گا؟ میں سعداللہ کو جدا نہیں کرسکتا۔"

کیخاتو خان نے منہ بنایا اور سیدھا سادہ مشورہ دے دیا۔"میں ایک بار پھر اس کام کے لیے سعداللہ یہودی کا نام لوں گا۔"

ارغون خان چلتے چلاتے کیخاتو خان سے ادب واحترام سے پیش آیا۔

محل کے باہر دونوں غلام گویا اس کا انتظار کررہے تھے۔ وہ کنیز اور دونوں غلاموں کے ساتھ اپنے قصر میں پہنچا تو کنیز نے پوچھا۔"شہزادے! کیا واقعی ہندوستان کے طبیب انسان کی عمر میں اضافہ کرسکتے ہیں اور بوڑھوں کو جوان کرسکتے ہیں؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔"بی بی! اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے اور میں ایسے لوگوں کو تلاش کرکے کم ازکم ایک بار اپنے بھائی ارغون کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔ میں ارغون بھائی کو خوش وخرم اور بڑھاپے کی دہلیز سے بہت دور دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کنیز نے منہ بنایا اور ارغون کی مخالفت کرنے لگی، بولی۔"خان! آپ شاید یقین نہیں کریں گے کہ میں نے ارغون سے زیادہ برا آدمی نہیں دیکھا۔ وہ خان ہے مگر کم عقل، وہ ہمیشہ سعداللہ ہی کی بات مانتا ہے۔ حالانکہ آپ اس کے بھائی بھی ہیں اور تحمل پسند سردار بھی۔"

کیخاتو خان نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ موضوع کو بدلتے ہوئے پوچھا۔"تیرا نام کیا ہے؟ میں نے تیرا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

کنیز نے جواب دیا۔"بندی کو زرافشاں کہتے ہیں۔"

کیخاتو خان نے اسے اپنے قصر کے تمام حصے دکھلا دیے اور کہا۔"یہاں تو آرام سے پڑی رہ۔ یہاں تجھے کوئی تنگ کرنے والا نہیں ملے گا۔"

کنیز زرافشاں نے جواب دیا۔"محترم شہزادے! میں یہاں کونے میں پڑی رہنے کے لیے نہیں آئی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں آپ پر عاشق ہوچکی ہوں اور اب میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

کیخاتو خان کو ہنسی آگئی، بولا۔"لیکن زرافشاں، میں تجھ سے عشق نہیں کرسکتا کیونکہ میرے ننھے سے دل نے کسی اور ہی کو پسند کرلیا ہے۔"

زرافشاں کے دل پر آرا سا چل گیا۔

ادھر سے فرصت پاکے وہ دونوں غلاموں کے پاس

پہنچا اور کہا۔ ''ہاں جناب! تو اب تعارف ہو جانا چاہیے۔''
ایک غلام نے کہا۔ ''آقائے من! ہم غلاموں کا تعارف ہی کیا، ہمارا بس اتنا ہی تعارف کافی ہے کہ ہم اپنے آقا کے غلام ہیں۔''
کیخاتو خان نے کہا۔ ''نہیں، یہ تعارف کافی نہیں ہے.....تم دونوں کا نام؟''
ایک نے جواب دیا۔ ''بندے کو فرامرز کہتے ہیں۔''
دوسرے نے کہا۔ ''اور غلام کو اینال کہتے ہیں۔''
کیخاتو خان نے دونوں سے اپنا تعارف کرایا۔ ''اور مجھے کیخاتو خان کہتے ہیں۔ میں ایل خان ارغون کا چھوٹا بھائی اور ہلاکو کا پوتا ہوں۔ سننے میں آیا ہے کہ میں منگول افواج کا سپہ سالار اعلیٰ بننے والا ہوں لیکن ابھی صرف شہزادہ ہوں۔''
فرامرز نے کہا۔ ''لیکن آپ کے تعارف کی ضرورت ہی نہیں، آپ کو تو سبھی اچھی طرح جانتے ہیں۔''
اینال نے عرض کیا۔ ''آپ اپنا تعارف کرا کے ہمیں خوامخواہ شرمندہ کر رہے ہیں۔''
کیخاتو خان نے کہا۔ ''میں اپنے سارے کام خود کرتا ہوں۔ غلام اپنے کام کرتے ہیں پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ.....تم دونوں کو میرے قصر میں کیا کام کرنا ہوں گے؟''
دونوں نے یکے بعد دیگرے جواب دیا۔ ''امارت کے جو چند لوازم تسلیم کیے جاتے ہیں، ان میں ایک غلام اور کنیزیں بھی ہیں۔''
کیخاتو خان نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں اور خوب جانتا ہوں مگر میں امارت سے اکتایا ہوا انسان ہوں۔''
اسی دوران کیخاتو خان نے ایک برقع پوش خاتون کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ نقاب سیاہ تھی مگر اس پر زرد پھول بنے ہوئے تھے جو انتہائی بدمذاقی کی دلیل تھی۔ دربانوں نے ان خاتون کو روکنا چاہا مگر وہ نہیں رکیں، درانہ گھسی چلی آئیں۔
اس کی آواز میں کرختگی تھی۔ کیخاتو خان نے جب یہ دیکھا کہ یہ خاتون کسی کے روکے نہیں رکیں گی تو اس نے دربانوں کو مزاحمت سے روک دیا اور کہا۔ ''دوستو کو مت روکو۔ مجبوروں اور فریادوں کو بھی میرے پاس تک آنے دو۔''
جب دربانوں نے اس عورت کو قصر کے اندر چلا جانے دیا، تو فرامرز اور اینال ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔
کیخاتو خان نے اس نقاب پوش خاتون کو قصر کے اندر لے جا کر پوچھا۔ ''ہاں خاتون! اب آپ فرمائیں کہ آپ میرے پاس کیوں تشریف لائیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''
اس عورت نے اپنے چہرے پر سے آہستہ آہستہ نقاب سرکائی۔ کیخاتو خان کو ایسا لگا گویا چاند بدلی سے نکل رہا ہے، بے داغ نورانی چہرہ۔ کیخاتو خان لڑکھڑا گیا۔ اس نے اتنا حسین چہرہ اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہنا کچھ چاہتا تھا اور الفاظ کچھ نکل رہے تھے۔
عورت نے کہنا شروع کیا۔ ''شہزادے! میں ایک مسلمان خاتون ہوں اور مجھ پر اور میرے خاندان پر تیرے بھائی ارغون نے بڑا ظلم ڈھا رکھا ہے۔ میں نے تیری بابت یہ سن رکھا ہے کہ تو مسلمانوں کا ہمدرد ہے، بہی خواہ ہے۔ اب میں اسی ہمدردی اور بہی خواہی کا امتحان لینے آئی ہوں۔''
کیخاتو خان نے پوچھا۔ ''تو کہاں رہتی ہے اور تیرے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے؟''
''میں بحیرۂ خزر کے جنوب میں مغربی ساحل کے شہر موغان سے آئی ہوں۔ میں نے یہ سفر کتنی مصیبتوں اور دشواریوں سے کیا ہے، کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ میرا خاندان برباد کر دیا گیا، میرے مرد ہلاک اور بچے ذبح کر دیے گئے۔ جوان عورتوں کو اغوا اور بوڑھیوں کو قتل کر دیا گیا۔ میری ایک چھوٹی بہن تھی تہمینہ۔ یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی۔ اس کو موذیوں نے اٹھا لیا اور اتفاق سے اس کی بابت یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایل خان کے وزیر سعداللہ یہودی کے قبضے میں ہے۔''
کیخاتو خان نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ ''خاتون! شاید آپ نہیں جانتیں کہ میں شہزادہ ہونے کے باوجود سعداللہ یہودی سے کمزور انسان ہوں۔''
عورت نے کہا۔ ''مجھ کو لوگوں نے یہ بتایا تھا کہ شہزادہ کیخاتو خان اسلام کی طرف مائل اور مسلمانوں کی مدد کر دیتا ہے۔ بس اسی امید اور توقع کے سہارے یہاں تک آئی ہوں۔'' عورت رو رہی تھی اور اس کی آواز میں گلوگرفتگی پائی جاتی تھی۔
کیخاتو خان سوچ میں پڑ گیا، بولا۔ ''تو نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے خاتون! سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تیری کس طرح مدد کروں؟''
عورت نے اپنے دونوں پاؤں کیخاتو خان کے سامنے کر دیے۔ اس کے دونوں تلوؤں میں چھالے پڑے ہوئے تھے اور جو چھالے پھوٹ گئے تھے، ان میں سے پانی رس رہا تھا، وہ بولی۔ ''یہاں تک پہنچنے میں، میں نے جو

صعوبتیں جھیلی ہیں، ان کا خیال ضرور کرتا۔''
کیخاتو خان نے پوچھا۔ ''تو ٹھہری کہاں ہے؟''
عورت نے جواب دیا۔ ''کہیں بھی نہیں۔ سیدھی تیرے پاس چلی آرہی ہوں۔''
کیخاتو خان نے کہا۔ ''اچھا، پہلے میں تیری رہائش کا بندوبست کردوں، اس کے بعد کچھ سوچوں گا، کچھ کروں گا۔''
کیخاتو خان اس عورت کو قصر کے آخری کنارے والے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے کے باہر ایک پرفضا باغ تھا۔ کیخاتو خان یہاں کھڑکیوں کے پاس کھڑے ہوکر باغ کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اس کمرے میں ضروریات اور آرائش کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ آبنوسی منقش سنگار میز جس میں ایک بڑا شیشہ جڑا ہوا تھا، دو کھڑکیوں کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے کئی گلدانوں میں موسمی پھول سجے ہوئے تھے۔ سنگار میز کے پاس چھوٹی چھوٹی چوکیاں رکھی تھیں، ان چوکیوں کے چاروں کنارے منقش تھے اور ہنرمندوں نے چھوٹے چھوٹے پتوں میں چھپے ہوئے پھول بنا کر اپنے فنی کمال کا زبردست مظاہرہ کیا تھا۔ بالکل آخری کونے میں ایک ریشمی ڈور تھی جس پر نہایت قیمتی شالیں، چادریں اور دوسرے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔
کیخاتو خان نے اس اجنبی عورت کو اس کمرے میں پہنچا دیا اور کہا۔ ''تو یہاں رہ سکتی ہے، جب تک چاہے۔ یہاں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز مہیا کردی جائے گی۔''
عورت نے اپنی نقاب اچانک اتار دی اور وہ کیخاتو خان کی طرف مڑ کر کھڑی ہوگئی۔ کیخاتو خان اسے دیکھ کر بدحواس ہوگیا۔ اتنی حسین عورت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ لمحوں کے لیے یہ تشویش بھی پیدا ہوئی کہ اگر اس کو ارغون نے کسی طرح دیکھ لیا تو وہ زبردستی حاصل کرلے گا۔
کیخاتو خان نے پوچھا۔ ''تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟''
لڑکی نے کہا۔ ''مار دیے گئے۔''
کیخاتو خان نے افسوس کیا، بولا۔ ''افسوس کہ مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں، میں شامل نہیں تھا۔''
لڑکی آزردہ ہورہی تھی۔ وہ کمرے کے سامان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر کیخاتو خان کو دیکھنے لگی، پوچھا۔ ''کیا تو شہزادہ ہے؟''
کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں شہزادہ ہوں اور میرا نام کیخاتو خان ہے۔''
لڑکی نے پیشانی پر غصے اور نفرت کی سلوٹیں ڈالیں اور منہ پھیر کر کہنے لگی۔ ''جب تو شہزادہ ہے تو مسلمانوں کے قتلِ عام میں تو کیوں نہیں شامل تھا۔ یہ بہیمانہ کام تیرے خاندان ہی کے ایما سے ہوا ہے۔ تم حکمرانوں کی خواہش، ایما اور حکم پر۔''
کیخاتو خان نے ایک بار پھر صفائی پیش کی۔ ''جیسا کہ شاید تو بھی جانتی ہے کہ میرا دل اسلام پر مائل ہے اور یہ بات ایک تو ہی کیا، سارا زمانہ جانتا ہے۔ تو میرے پاس کیوں آئی ہے؟ محض اس لیے کہ میں سعد اللہ یہودی کے خلاف تیری مدد کرسکوں گا، تیری بہن تہمینہ کو اس سے آزادی دلاسکوں گا۔ پھر میں مسلمانوں کے قتلِ عام کرنے والوں میں کیوں شامل کیا جاؤں۔''
کیخاتو خان نے محسوس کیا کہ لڑکی رو رہی ہے۔ وہ اس کے قریب چلا گیا، پوچھا۔ ''کیا تو رو رہی ہے؟''
لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیخاتو خان کچھ دیر خاموش رہا اور لڑکی کے رونے یا نہ رونے کا اندازہ لگاتا رہا وہ بدستور منہ پھیرے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''کیا تو رو رہی ہے؟''
لڑکی نے جواب تو نہیں دیا، اپنا چہرہ کیخاتو خان کے سامنے کردیا۔ اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے اور پلکوں کی جڑوں میں آنسو یوں جمع تھے جیسے ننھے منے پودوں کی روشوں میں پانی۔ اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرے خاندان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کے نتیجے میں، میں زندگی بھر روتی رہوں گی۔''
کیخاتو خان نے الگنی پر سے ایک باریک کپڑا کھینچ لیا اور اسے لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لڑکی! آنسو پونچھ لے۔ جو کچھ ہوا، اس کو اپنی قسمت سمجھ کر برداشت کرلے۔''
لڑکی برہم ہوگئی اور کپڑا نہیں لیا، بولی۔ ''یہ میری قسمت نہیں تھی۔ تیرے خاندان نے ہم مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں اس میں ہماری بدقسمتی سے زیادہ تیرے خاندان کے مستقبل کی بدقسمتی پنہاں ہے۔ خدا تیرے خاندان کو معاف نہیں کرے گا۔''
کیخاتو خان بے بس ہورہا تھا، پژمردگی سے بولا۔ ''لڑکی! تو خوب بددعا دیتی رہ لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے ظلم اور بربریت میں کسی طرح بھی شامل نہیں تھا۔''
کیخاتو خان نے سوچا اس لڑکی کے پاس مزید رکنا اس کے زخمی دل پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہوگا، بولا۔

"خاتون! میں جارہا ہوں۔ میں نے تجھے پناہ دی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ تیری بہن تہمینہ بھی تجھے مل جائے مگر میں اس سلسلے میں وقت اور مدت کا تعین نہیں کرسکتا۔"

لڑکی نے کہا۔ "مجھے یہاں کتنے دن رہنا ہوگا؟"

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ "کچھ پتا نہیں لیکن تو یہاں جتنے دن بھی رہے گی، آزادی سے رہے گی۔ ادھر تیرے پاس چند کنیزیں تو ضرور آتی جاتی رہیں گی لیکن ادھر کسی مرد کو نہیں آنے دیا جائے گا۔ اگر تجھ کو میری آمدورفت بھی گوارا نہ ہو تو میں بھی ادھر نہیں آؤں گا۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ کچھ ٹھہر کر دوبارہ کہنے لگا۔ "میں یہ بھی... جانتا ہوں کہ میرا خاندان تیرے بارے میں بہت متجسس رہے گا اور وہ لوگ تیرے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہیں گے لیکن میں ان سب کی پروا کیے بغیر تیری مدد کروں گا۔"

لڑکی بھی بڑی دلیر اور بے باک تھی، بولی۔ "تیری یہ نیکیاں تیری اور تیرے خاندان کی بخشش کا سبب بن جائیں گی۔"

کیخا تو خان نے جاتے جاتے پوچھا۔ "کیا تجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ تیری بہن تہمینہ سعد اللہ یہودی کے پاس ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "خوب اچھی طرح۔ میری بہن تہمینہ کو جن لوگوں نے سعد اللہ یہودی کے گھر میں دیکھا ہے، وہ سچے لوگ ہیں۔"

کیخا تو خان نے کہا۔ "ان لوگوں کے نام؟ وہ تجھے کہاں ملے تھے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں ان کے نام نہیں جانتی۔ میری بہن تہمینہ تقریباً میری ہم شکل ہے۔ جو عورتیں سعد اللہ یہودی کے گھر آتی جاتی ہیں، وہ یہی کہتی ہیں کہ انہوں نے بالکل میری ہم شکل لڑکی سعد اللہ یہودی کے محل میں بھی دیکھی ہے۔"

کیخا تو خان بہت دل برداشتہ ہوتا جارہا تھا۔ تکان اور مایوسی اس کے چہرے سے عیاں تھی، بولا۔ "خاتون! میں وعدہ تو نہیں کرتا کہ تیری بہن تہمینہ کو سعد اللہ یہودی سے دلوادوں گا کیونکہ وہ یہودی مجھ سے زیادہ طاقتور ہے اور بااثر بھی لیکن میں یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ اس جنگ میں، میں اپنا سب کچھ گنوا کر بھی تجھ کو مایوس نہیں ہونے دوں گا۔"

کیخا تو خان جانے سے پہلے لڑکی کا نام ضرور جان لینا چاہتا تھا، وہ نام پوچھنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ لڑکی نے کہا۔ "شاید تو میرا نام جاننا چاہتا ہے؟"

کیخا تو خان نے کہا۔ "جس کو اپنا مہمان بنایا ہے، اس کا نام تو معلوم ہی ہونا چاہیے۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میرا نام رفیعہ ہے۔"

کیخا تو خان نے ابھی تک تو صرف اتنا ہی سوچا تھا کہ وہ اپنے دین دار مرحوم بھائی نکودار کا ارغون سے انتقام کس طرح لے لیکن اس لڑکی رفیعہ نے اچانک آکر کچھ اور بھی سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ جس کمرے میں رفیعہ رہ رہی تھی، بقیہ قصر اور اس کے کمرے کے درمیان ایک مضبوط حد قائم کردی۔ رفیعہ کی خدمت کے لیے وعدے کے مطابق دو کنیزیں مقرر کردیں اور انہیں یہ تاکید کردی کہ وہ ایک معینہ مدت کے لیے ہی کمرے کی ہو رہیں۔ کیخا تو خان یہ نہیں چاہتا تھا کہ رفیعہ کو خاندان کے لوگ دیکھیں اور اس کا ذکر ارغون تک پہنچ جائے۔

ایک دن وہ علی الصباح اس پڑاؤ کی طرف چلا گیا جہاں دنیا بھر کے تاجروں کے قافلے آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ یہاں سے ایک طرف تو ترکی کا راستہ کھلا ہوا تھا اور تجار دوسرے ملکوں کا مال تبریز اور مراغہ میں فروخت کر کے یہاں سے نیا مال خرید کر ترکی روانہ ہوجاتے تھے۔ پڑاؤ سے دوسرا راستہ خراسان کو جاتا تھا۔ اس شاہراہ کے تجار خراسان اور ہرات کے راستے کابل میں داخل ہوجاتے تھے اور کابل سے ہندوستان چلے جاتے تھے۔ کچھ کاشغر کی طرف مڑ جاتے تھے اور وہاں سے چین چلے جاتے تھے۔ دوسرے کئی راستے اصفہان، موصل اور بغداد کو چلے جاتے تھے۔ انہی میں ایک شاہراہ درۂ بولان تک چلی گئی تھی اور تاجر درۂ بولان کو عبور کر کے بلوچستان میں داخل ہوجاتے تھے۔ یہ شاہراہ بڑی دشوار گزار تھی۔ یہیں سے بعض تاجر اصفہان اور اہواز کو پیچھے چھوڑتے ہوئے خلیج فارس کے ساحل پر جانکلتے تھے اور پھر دخانی جہازوں میں بیٹھ کر سندھ کی بندرگاہ لہاری بندر، ٹھٹھہ (دیبل) اور اس سے آگے بھڑوچ، کچھ، کاٹھیاواڑ، گوا اور بھٹکل تک پہنچ جاتے تھے۔ کیخا تو خان کو انہی تاجروں کی تلاش تھی جو اپنی تجارت کے سلسلے میں ہندوستان تک دھاوے مارتے تھے۔ اسے پڑاؤ پر وہ قافلہ مل گیا جس کے چند تاجر ہندوستان جارہے تھے۔ اس نے ان سے الگ الگ فرداً فرداً ملاقات کی اور کہا۔ "تم ملکوں ملکوں سے انواع واقسام کا سامان تو لاتے ہی ہو لیکن مجھے ہندوستان کی ایک ایسی چیز درکار ہے جس کی بابت تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ اگر تم وہ فرمائشی چیز میرے لیے لے آئے تو میں اس کی منہ مانگی قیمت ادا کروں گا۔"

تاجروں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایل خانی شہزادہ، ہندوستان کی کس چیز کی فرمائش کررہا تھا اور اس کی منہ مانگی

قیمت ادا کرنے کا وعدہ کررہا تھا۔ سارے تاجر اس فرمائش کو جاننے کے لیے بے قرار تھے۔ ایک یونانی تاجر نے کہا۔ ''گو کہ میں تجارت کے سلسلے میں کبھی ہندوستان نہیں گیا لیکن اگر منافع کا سودا ہے تو ضرور چلا جاؤں گا۔''

ترکی تاجر نے کہا۔ ''میں کئی بار دیبل جا چکا ہوں۔ آپ اس چیز کا نام بتائیں، میں معمولی منافع پر بھی فراہم کرسکتا ہوں۔''

ان میں ایک ہندوستانی تاجر بھی تھا، اس نے کہا۔ ''محترم خان! میں تو بذاتِ خود ہندوستانی ہوں اور دیبل سے گوا اور بھٹکل تک آتا جاتا ہوں۔ آپ چیز کا نام بتائیں، میں ضرور فراہم کردوں گا۔ ہاں، اس کے نفع کا تعین اسی وقت ہوجانا چاہیے۔''

کیخا تو خان کی نظرِ انتخاب اسی ہندوستانی تاجر پر پڑی۔ وہ اس تاجر کو اپنے ساتھ قصر تک لے آیا اور اس کی بڑی خاطر مدارات کی، بعد میں کہا۔ ''ہندی تاجر! مجھے ایک ایسا ہندو عالم درکار ہے جو اپنے دور کا بے مثل عالم اور باکمال طبیب بھی ہو۔ ہندوستانی طبیب کو غالباً وید کہتے ہیں، مجھے ایسا وید درکار ہے جو انسانی عمر کو حسبِ منشا طول دینے کا راز جانتا ہو اور اس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بوڑھے کو دوبارہ جوان کس طرح کیا جائے۔''

ہندوستانی تاجر بوکھلا سا گیا۔ اسے کیخا تو خان کچھ پاگل سا لگا، پوچھا۔ ''کیا ہمارے ہندوستان میں ایسے وید پائے جاتے ہیں؟ کیا ہمارا ہندوستانی وید انسان کی طبعی عمر میں اضافہ اور بڑھاپے کو جوانی بخش سکتا ہے؟''

کیخا تو خان کو اس ہندوستانی تاجر پر غصہ بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی، ڈپٹ کر بولا۔ ''تو کیسا ہندوستانی تاجر ہے کہ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہندوستان میں کیسی کیسی نادر و نایاب کتابیں، اعلیٰ سے اعلیٰ نسخے اور معجز اثر جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں اور وہاں کے عالم اور وید قدرت کے ان سربستہ رازوں سے اچھی طرح واقف ہیں کہ زندگی کے ماہ و سال میں اضافہ کس طرح کیا جائے اور...... ضعیف العمری کو جواں سالی میں کس طرح تبدیل کردیا جائے۔''

ہندوستانی تاجر سہما ہوا تھا، اس نے سوچا کہ اگر اس وحشی منگول کو مایوس کردیا گیا تو شاید جان ہی لے لے۔ اس لیے اس نے کیخا تو خان کو تسلی دی، بولا۔ ''خان محترم! میں نے ہندوستان کے باکمال حضرات کا نام تو ضرور سنا ہے لیکن کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اب آپ فرماتے ہیں تو میں انہیں دیکھ بھی لوں گا اور ان نادر شخصیات میں سے کسی کو اپنے ساتھ لے بھی آؤں گا۔''

کیخا تو خان خوش ہوگیا، کہا۔ ''لیکن یہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے، میرا بھائی ارغون جو ہم سب کا ایل خان ہے، اس عظیم اور بے مثل عالم اور وید کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اتفاق کی بات کہ میں نے اپنے بڑے بھائی سے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ میں اس کی یہ مشکل حل کردوں گا۔''

ہندوستانی تاجر نے پوچھا۔ ''اور اس عظیم انسانی کارنامے کا انعام کیا ملے گا مجھے؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''میں تیرا دامن اور تیرا منہ اشرفیوں سے بھر دوں گا۔ جتنی اشرفیاں تیرے دامن اور منہ میں آجائیں گی، وہ ساری کی ساری تیری ہوں گی۔''

ہندوستانی تاجر بہت خوش تھا، اس کا رُواں رُواں خوش تھا، انتہائی تکلف سے پوچھا۔ ''اور خان محترم! اس عظیم الشان خدمت کا صلہ کیا ملے گا ہمیں؟''

کیخا تو خان نے کہا۔ ''ہندی تاجر! کیا تو بدحواس ہوگیا ہے؟ یہ تیرا حال کیا ہورہا ہے؟ تو اس کی اجرت ابھی ابھی مجھ سے پوچھ چکا ہے اور میں بتا چکا ہوں پھر یہ بار بار اجرت اور محنتانہ کی بات کیوں کرتا ہے؟''

ہندوستانی تاجر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''خان محترم! کچھ نہ کچھ بیعانہ تو آپ نے دے ہی دیا ہوتا۔ آخر جانے آنے میں خرچہ تو کافی آجائے گا۔''

کیخا تو خان نے پوچھا۔ ''یہ رقم تجھے میں دوں گا اور یہ بیعانہ کیا چیز ہوتی ہے؟''

ہندوستانی تاجر نے عرض کیا۔ ''قبلہ و کعبہ! ہم تاجر لوگ جب کسی چیز کو خریدتے یا بیچتے ہیں تو پہلے بھاؤ طے کرتے ہیں اور اگر بھاؤ طے پاجاتا ہے اور اس چیز کی پوری قیمت فوراً نہیں دینی ہوتی ہے تو کچھ رقم دے کر سودے کو پکا کرلیتے ہیں، بس یہی جزوی رقم کاروباری اصطلاح میں بیعانہ کہلاتی ہے۔''

کیخا تو خان نے پوچھا۔ ''تب پھر میں بیعانہ میں کتنی رقم دے دوں؟''

ہندوستانی تاجر نے جواب دیا۔ ''سو پچاس سونے کی اشرفیاں۔''

کیخا تو خان نے پچاس اشرفیاں اسی وقت دے دیں اور پوچھا۔ ''اب یہ بات تجھے بھی بتانا ہوگی کہ میرا یہ کام کتنی مدت میں ہوجائے گا؟''

ہندوستانی تاجر نے جواب دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ ایک سال میں ہوسکتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ صرف چھ

ماہ میں یہ کام ہوجائے۔''

جب ہندوستانی تاجر پڑاؤ پر واپس آیا تو دوسرے تاجر اس سے اس چیز کا نام دریافت کرنے لگے جو کیخاتو خان اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرکے بھی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن ہندوستانی تاجر بھی کائیاں تھا۔ وہ ہر ایک کی بات ٹال گیا اور چپ چاپ اپنے خیمے میں منہ چھپا کے پڑ رہا۔

☆☆☆

کیخاتو خان ادھر سے فارغ ہوکر اپنے بھائی ارغون کے پاس پہنچ گیا۔ وہ تہمینہ کو حاصل کرکے رفیعہ کے حوالے کردینا چاہتا تھا اور تہمینہ کس طرح حاصل کی جائے گی، یہ ترکیب سمجھ میں آچکی تھی۔ جب وہ ارغون کے پاس پہنچا، اس وقت ارغون کھیل تماشوں سے دل بہلا رہا تھا۔ اس کے سامنے خاصا طویل اور عریض اکھاڑا تھا۔ اس اکھاڑے کو موٹے موٹے رسوں سے گھیر دیا گیا تھا۔ ارغون نے اپنے چھوٹے بھائی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

کیخاتو خان نے رک رک کر کہا۔ ''برادر محترم! آج میں آپ کے لیے ایک اہم خبر لایا ہوں۔''

ارغون کی بے چینی بڑھنے لگی، پوچھا۔ ''ہاں تو وہ اہم اور خوشیوں سے لبریز خبر کیا ہے، ذرا میں بھی تو سنوں۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''برادر محترم! آپ ہمیشہ اپنی عمر اور بڑھاپے سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ میں نے آپ کے ان دونوں دکھوں کا حل تلاش کرلیا ہے۔''

ارغون کو غصہ آگیا، بولا۔ ''او احمق! اب تمہید ختم کر اور کام کی باتیں کرکے میرا تجسس دور کر۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''میں نے ایک ایسا شخص پالیا ہے جو ہندوستان سے اس عالم اور محقق کو اپنے ساتھ لے آئے گا جس کے پاس ہر قسم کی جڑی بوٹیاں اس کے سامنے خود اپنے خواص بتاتی ہیں۔ یہ عالم، یہ وید عنقریب آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائے گا۔''

ارغون بے ساختہ اٹھا اور کیخاتو خان کو سینے سے لگالیا، بولا۔ ''کیخاتو! تو میرا بھائی ہے۔ میری فکر تجھے نہیں تو اور کس کو ہوگی۔''

اتنے میں اکھاڑا آباد ہوگیا اور ایک برہنہ شخص کو اکھاڑے کے بیچوں بیچ میں کھڑا کردیا گیا۔

اکھاڑے کے باہر چاروں طرف شاہی لوگوں نے جگہیں گھیر رکھی تھیں۔ ان شاہی خانوادوں میں ان کے آس پاس امراء اور فوجی سرداروں کے خاندان تھے۔ وہ ان میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تہمینہ کو تلاش کرنے لگا مگر وہ کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ سعداللہ یہودی ذرا دور سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ برداشت نہیں کرسکا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر کیخاتو خان کے پاس پہنچ گیا۔ اس طرح کیخاتو خان سے بات شروع کی جیسے ارغون کو سنانا چاہ رہا تھا، اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا...... ''شہزادے! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اکھاڑے کے بعد ہم سب اپنی اپنی بیویوں اور عورتوں کو آپ کی خدمت میں پیش کردیں گے، آپ ان کا جی بھر کر دیدار کرلیجیے گا۔ پھر اس کے بعد آپ کو یہ زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی کہ بھری محفل میں انہیں دیکھنے میں زحمت ہو جیسی کہ اس وقت پیش آرہی ہے۔''

ارغون سعداللہ یہودی سے ناراض ہوگیا، بولا۔ ''او یہودی! کیخاتو خان میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میرے بعد یہی اس حکومت کا مالک و مختار ہوگا، تو اس طرح اپنے آقاؤں سے بات کرتا ہے؟''

سعداللہ یہودی لاجواب ہوگیا تھا۔ جب وہ ارغون کی باتوں کا جواب... نہیں دے سکا تو خوشامد پر اتر آیا، آہستہ آہستہ کیخاتو خان کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔ ''حضور والا! میں شہزادہ کیخاتو خان کی دل و جان سے عزت کرتا ہوں اور میری یہ خواہش ہے کہ انہیں جو لڑکی یا عورت پسند آجائے، بخوشی اپنے ساتھ لے جائیں اور اس سے لطف حاصل کریں۔''

کیخاتو خان نے دل میں سوچا کہ اس شخص کو کون شکست دے سکتا ہے۔

اکھاڑے میں کھڑے ہوئے آدمی کے سامنے ایک چیتا چھوڑ دیا گیا۔ چیتے نے اکھاڑے میں داخل ہوتے ہی آدمی پر حملہ کردیا۔ آدمی نے پھرتی سے جھک کر چیتے کا داؤ خالی جانے دیا۔ تماشائیوں نے تالیاں بجائیں۔

چیتا ایک بار پھر سنبھلا اور کچھ دیر کھڑا اس آدمی کی شکل دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ آدمی چیتے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے گھورے جارہا تھا پھر چیتا اچانک اپنی جگہ سے جست لگا کے آدمی کے سر پر پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں آدمی اپنے ہوش و حواس مجتمع کرچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھری تھی۔ چیتا جیسے ہی اس آدمی کے سر پر پہنچا، آدمی نے جھک کر چیتے کا پیٹ چاک کردیا۔

ہر طرف سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ارغون اپنی جگہ سے اچھل اچھل کر اس جیالے کو داد دے رہا تھا۔ اس نے ازراہِ مذاق کیخاتو خان سے پوچھا۔ ''کیا تو اس جیسی بہادری دکھا سکتا ہے؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''برادر محترم! یہ آدمی اگر چیتے کے ہاتھوں مارا جاتا تو اس کے خاندان کو تو شاید کچھ تکلیف پہنچ جاتی لیکن اس کی موت سے ملک اور قوم کو کوئی نقصان نہ پہنچتا، برخلاف اس کے اگر اس کی جگہ میں ہوتا اور چیتے کا شکار ہوجاتا تو کیخاتو خان کی موت سے شاہی خاندان کا چراغ ہی گل ہوجاتا۔''

ارغون کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ اسی دوران کیخاتو خان کو غافل دیکھ کر سعداللہ یہودی نے ارغون سے پوچھا۔ ''محترم ایل خان! میں شہزادے کی باتوں کا مفہوم نہیں پاسکا۔ شہزادے کی موت سے شاہی خاندان کا چراغ کیونکر گل ہوجاتا؟''

ارغون نے جواب دیا۔ ''کیخاتو خان میرا بھائی بھی ہے اور ولی عہد بھی، اگر یہ مرجائے تو میرے بعد بارِ حکومت کون اٹھائے گا؟ میرے بیٹے؟ میرے بیٹوں سے چالاک اور بہادر بایدو خان ہے، اس طرح یہ حکومت بایدو خان کے خاندان میں چلی جاتی اور اس طرح شاہی خاندان سے ہمارا خاندان اور ہمارا نام نکل جاتا۔''

سعداللہ یہودی کیخاتو خان کے معاملے میں ایک دم محتاط ہوگیا، اب وہ کیخاتو خان کا ہمدرد اور بہی خواہ بن گیا۔

ارغون نے حکم دیا کہ اکھاڑے میں پہلوانوں کو اتارا جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ کئی کئی پہلوان اکھاڑے میں اتار دیے گئے اور ان پہلوانوں نے آپس میں ایک ایسا مقابلہ شروع کردیا جو کہیں ختم نہیں ہوتا تھا۔ انہیں مقابلے میں ہر قسم کے داؤ اور ہتھیار استعمال کرنے کی اجازت تھی لیکن اکھاڑے میں انہیں نہتا اتارا گیا تھا۔ اس مقابلے میں کوئی کسی کا حریف نہیں تھا بلکہ ہر پہلوان کسی بھی پہلوان سے لڑ سکتا تھا۔ ایسی بے قاعدہ کشتیاں اور وحشیانہ مقابلے جو پہلے کہیں نہیں منعقد ہوئے ہوں گے۔ پہلوانوں میں ایرانی، ترکی اور منگول پہلوان تھے۔ ایک گنجا پہلوان تھا جو سب پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں سر اور جسم کے مختلف اعضا یکساں کام کر رہے تھے۔ وہ ہر ایک کی پٹائی کر رہا تھا۔ اس نے جس پہلوان کو اوپر اٹھا کر دور پھینک دیا، وہ دوبارہ نہیں اٹھ سکا اور ان بے حال اور بے دم پہلوانوں کے سروں پر مکوں کی ضربیں لگا لگا کر بے ہوش کردیا گیا۔

ان مقابلوں سے ارغون کو بڑی خوشی ہوئی، بے اختیار بول اٹھا۔ ''ہم منگول آج بھی ناقابل فتح ہیں، ہمیں شکست نہیں دی جاسکتی۔''

کیخاتو خان نے تائید کی۔ ''بیشک ہم بہادر ہوتے کے باوجود بزدلی کے کام کرتے پھر رہے ہیں۔''

ارغون نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

کیخاتو خان نے اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ایک طاقتور ترین آدمی اگر کسی بچے سے زور آزمائی کرے یا اسے ہلاک کردے تو اس طاقتور کو دنیا کیا کہے گی؟''

ارغون نے جواب دیا۔ ''بزدل، پاگل، احمق۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''مسلم رعایا اور ان کے کمزور بچوں کو ہماری طاقتور فوجوں نے نہایت سفاکی سے ہلاک کردیا، اسے کیا کہا جائے گا؟''

ارغون نے جواب دیا۔ ''کیخاتو خان! افسوس کہ نکودار کی طرح تو بھی مسلمانوں کی حمایت کرتا رہتا ہے۔ میری محبت اور خلوص کو حاصل کرنے کے لیے تجھے اس سے دستبردار ہونا پڑے گا۔''

کیخاتو خان دلیلیں دینے لگا۔ ''ہم مسلمانوں کو قتل کرکے انہیں دنیا سے نیست و نابود نہیں کرسکتے۔ جب یہ طے ہے کہ ہمیں ان کے ساتھ رہنا ہے، ان پر حکومت کرنا ہے، ان کی ہنرمندی اور کاریگری سے فائدہ اٹھانا ہے تو ان کے خلاف یہ انتقامی اور ظالمانہ کارروائی کیوں؟''

ارغون کچھ کچھ قائل ہوچکا تھا، بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ مسلمانوں کا جتنا قتلِ عام ہوچکا ہے اس کے بعد اب نہیں ہوگا یہ میرا وعدہ ہے۔''

کیخاتو خان اس کے بعد جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اس کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

سعداللہ یہودی ان دونوں کی محبت اور یگانگت سے پریشان ہورہا تھا۔ ان دونوں کے سامنے دست بستہ ہوکے عرض کیا۔ ''کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس وقت آپ دونوں اکھاڑے کی تفریحات سے لطف اندوز ہوں اور ادھر سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کام کی باتیں کریں۔''

ارغون نے اس تجویز کو پسند کیا اور حکم دیا کہ اکھاڑے کی تفریحات کا دوبارہ آغاز کیا جائے۔

☆☆☆

کیخاتو خان رات کے پچھلے پہر اپنے قصر میں داخل ہوا تو اس کی ایک کنیز نے اسے سرگوشی میں بتایا۔ ''رفیعہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

کیخاتو خان بہت تھکا ہوا تھا، بولا۔ ''میں صبح اس سے مل لوں گا۔''

کنیز نے ملاقات پر اصرار کیا۔ ''لیکن وہ اسی وقت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

کیخاتو خان اسی وقت رفیعہ کے پاس چلا گیا۔ اس نے دروازے کی آڑ سے رفیعہ کو گنگناتے سن لیا۔ وہ اپنی بدقسمتی اور دشمنوں کی سفاکی کو بڑے درد سے اشعار میں بیان کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ خاموش ہوگئی تو کیخاتو خان نے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دی۔ اس دستک کا فوری جواب تو نہیں ملا۔ بس دروازہ کھل گیا۔ رفیعہ اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر پریشان سی ہوگئی۔

کیخاتو خان نے کہا۔ ''اگر مجھے تیری طرف سے یہ پیغام نہ ملا ہوتا کہ میں تجھ سے فوراً ہی ملاقات کروں تو شاید میں اس وقت تیرے پاس نہ آتا۔''

رفیعہ نے اسے اندر بلا لیا۔

کیخاتو خان نے ہنس کر پوچھا۔ ''رفیعہ! ایک بات تو بتا۔''

رفیعہ نے کہا۔ ''پوچھو۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''تو نے رات کے پچھلے پہر مجھے اپنی خواب گاہ میں بلا لیا ہے، کیا تو مجھ سے خوفزدہ نہیں ہوگئی؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''میں آگ کے جس سمندر کو عبور کر کے یہاں تک پہنچی ہوں، اس نے میرے اعصاب کو فولادی کر دیا ہے۔ اب میں کسی بات سے بھی نہیں ڈرتی۔''

کیخاتو خان نے دیکھا، رفیعہ نے جو لباس پہن رکھا تھا، وہ بہت زیادہ عریاں تھا۔ اس کی دونوں رانیں کھلی ہوئی تھیں اور سینے پر کرتے کے بٹن ندارد تھے۔ سیاہ بالوں کو دونوں شانوں پر بکھیر رکھا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ کمرے کی اندرونی کھڑکی پر ٹکا دیا تھا جس سے اس کی کھلی ہوئی بغل صاف نظر آرہی تھی۔ کیخاتو خان کو اپنی طبیعت پر قابو پانا مشکل ہوگیا اور رفیعہ مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

کیخاتو خان نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''مجھے تو نے کیوں بلوایا تھا؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''یہ جاننے کے لیے کہ میری بہن کا کچھ پتا چلا؟ میں کب تک تیری مہمان رہوں گی اور حرام کے کھانے کھاتی رہوں گی؟''

کیخاتو خان ہنس دیا۔ ''بس اتنی سی بات جاننے کے لیے مجھے اتنی رات کو زحمت دی؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ میرے سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ اگر یہ کام تیرے بس کا نہیں تو مجھ کو یہاں سے رخصت کر دے، میں خود تلاش کر لوں گی اسے۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔''

اب کیخاتو خان بھی سنجیدہ ہوگیا۔ ''خاتون! یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا تو سمجھ رہی ہے۔ سعداللہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ تہمینہ کو اس کے محل سے برآمد کرنا بڑا دشوار ہے اور یہ کام میرا بڑا بھائی ارغون ہی کر سکتا ہے۔''

رفیعہ نے ضد کی۔ ''تب پھر میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''کہاں چلی جاؤ گی؟''

''جہاں جی چاہے گا۔ میں جس کام سے یہاں آئی ہوں، اگر وہی پورا نہ ہو تو پھر خواہ مخواہ مہمان بنے رہنے کا فائدہ؟''

کیخاتو خان نے اسے ایک بار پھر سمجھانا چاہا۔ ''خاتون! تو میری بات کیوں نہیں سمجھ رہی۔ یہ بھیڑیوں کی بستی ہے، تو جیسے ہی اس قصر سے نکلے گی بھیڑیے تیری تکابوٹی کر دیں گے۔''

رفیعہ نے کہا۔ ''تب پھر تو مجھ پر یہ احسان کر کہ تو مجھے یہاں کے سب سے بڑے بھیڑیے تک پہنچا دے۔''

کیخاتو خان نے حیرت سے پوچھا۔ ''یعنی میں تجھے اپنے بڑے بھائی ارغون تک پہنچا دوں؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں یہی چاہتی ہوں کیونکہ میں اس جابر اور ظالم انسان کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

کیخاتو خان ٹکٹکی باندھے رفیعہ کو دیکھ رہا تھا۔ ''تجھے اس کا انجام بھی معلوم ہے؟''

رفیعہ نے پوچھا۔ ''کس کا انجام؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''ارغون سے ملاقات کا انجام، اس کو قریب سے دیکھنے کا انجام۔''

رفیعہ نے سر جھکا لیا، بولی۔ ''جانتی ہوں، یہاں کے سب سے بڑے بھیڑیے سے ملاقات کا جو نتیجہ نکلے گا اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

کیخاتو خان رفیعہ سے خفا ہو چکا تھا، تیوریوں پر بل پڑ گئے، وہ کہہ رہا تھا۔ ''نہیں واقف ہے تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ تو بھائی ارغون سے ذرا بھی واقف نہیں۔ وہ تجھے دیکھتے ہی اپنے محل میں ڈال لے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا تو نہیں جانتی۔''

''میں خوب جانتی ہوں، میں اس سے نہیں ڈرتی۔''

کیخاتو خان کو غصہ آرہا تھا کہ یہ لڑکی اس کی باتیں کیوں نہیں سمجھ رہی، بولا۔ ''جب تو ارغون کے محل میں داخل ہو جائے گی تو اس کے بعد نہ تو، تو اپنی بہن تہمینہ کو سعداللہ

سے آزادی دلاسکے گی اور نہ تو جیتے جی رہائی پائے گی۔''

لیکن رفیعہ شاہی محل میں جانے کے لیے بہت بے چین ہورہی تھی، زچ ہو کر بولی۔ ''تو میری بات نہیں سمجھ سکے گا منگول عساکر کے سپہ سالارِ اعلیٰ اور عصرِ حاضر کے خان!''

رفیعہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ ''اب میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ بہر قیمت میں تیرے ارغون خان سے مل کر رہوں گی اور جو کام تو نہیں کرسکا، وہ میں کر کے دکھادوں گی۔''

کیخا تو خان...... رفیعہ کی ضد کے آگے سپر انداز ہوتا جارہا تھا۔ ''رفیعہ! شاید میں تجھ کو نہیں سمجھ سکا۔ سچ بتا کیا تو وہی ہے جو بتایا تھا؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''میں وہی ہوں لیکن غصے اور اشتعال نے مجھے اپنے حواس میں نہیں رکھا۔ میں پاگل ہو رہی ہوں۔''

کیخا تو خان کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''بہتر ہے اگر تیری یہی خواہش ہے کہ تو ارغون تک پہنچ جائے تو تیرا یہ کام ہوجائے گا۔''

وہ جانے لگا مگر رفیعہ نے اسے روک لیا، بولی۔ ''کہاں چلے؟ مجھے کچھ اور باتیں بھی معلوم کرنی ہیں تجھ سے۔''

کیخا تو خان بہت زیادہ دل برداشتہ ہورہا تھا۔ اس کو رفیعہ حد سے زیادہ لالچی اور خود غرض نظر آرہی تھی۔ رفیعہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کچھ دیکھنے، کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کیخا تو خان نے کہا۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ تو نے ارغون کے پاس جانے کا فیصلہ غلط کیا ہے تو شاید تو یہ کہے کہ ایسی کوئی بات نہیں لیکن میں بار بار یہی کہوں گا کہ تو اب جو کچھ کرنے والی ہے، غلط ہے۔''

رفیعہ نے مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا۔ ''میں نے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا، ہمیشہ بروقت اور صحیح فیصلے کیے ہیں۔ اسی طرح میرا یہ فیصلہ بھی درست ہوگا کیونکہ مجھے اپنے فیصلے کی درستی اور صداقت پر یقین ہے۔''

کیخا تو خان نے اجنبی انداز میں مختصر جواب دیا۔ ''بہرحال میں کل سے پرسوں تک تجھے ارغون کے محل میں پہنچادوں گا۔ آگے جو کچھ ہوگا، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

کیخا تو خان کو کچھ پتا نہیں تھا کہ رفیعہ اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ شاید اس کو کیخا تو خان پر رحم آرہا تھا۔

جب کیخا تو خان جانے لگا تو رفیعہ نے اسے روک لیا۔ ''ذرا سنتا تو!''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''خاتون! اب کل بات ہوگی۔''

رفیعہ نے شوخی سے کہا۔ ''کل نہیں۔ میں تو آج ہی اور اسی وقت بات کروں گی۔''

کیخا تو خان رک گیا مگر مڑا نہیں۔ دور ہی سے پوچھا۔ ''تجھ کو مجھ سے کیا بات کرنا ہے، جلدی کر۔''

رفیعہ نے شوخی سے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''کیا تو ناراض ہوگیا ہے مجھ سے؟''

کیخا تو خان قہقہے کی آواز پر گھوم گیا۔ رفیعہ کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب وہ پہلی جیسی یا پہلی والی رفیعہ نہیں نظر آرہی تھی۔ رفیعہ نے ہنس کر پوچھا۔ ''شہزادے! تجھ سے ایک بات پوچھوں، تو جواب دے گا؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''ضرور پوچھ۔ میں جواب بھی دوں گا۔''

رفیعہ نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی۔ ''کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''خاتون! مجھے کیا۔ تو یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جا یا دو چار دن کے لیے جا، میرا تجھ سے کیا رشتہ؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''شہزادے! ایسی بات نہ کیا کر۔ اگر ہم میں کوئی رشتہ نہ تھا تو، تو نے اپنے قصر کا یہ حصہ رہنے کو کیوں دیا۔ میری جلی کٹی باتیں تو کیوں سن اور برداشت کر رہا ہے اور تجھے اس بات سے تکلیف کیوں پہنچ رہی ہے کہ میں ارغون کے پاس جانا اور اس کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔''

کیخا تو خان اچانک برس پڑا۔ ''لڑکی! میں تجھے نہیں سمجھ سکا۔ میں تجھ کو ارغون کے پاس کیوں پہنچا دوں۔ وہ بھیڑیا ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا بھیڑیا۔ اپنے نفس اور ہوس کا غلام۔ وہ اپنی ماں ترمہ شیریں تک کو بخشنے پر تیار نہ تھا۔ میں تجھ کو اس درندے کے پاس پہنچادوں؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''میں تیرے بڑے بھائی ارغون کے پاس جاؤں گی ضرور مگر تجھ کو ناراض کر کے نہیں اور یہ بھی وعدہ کرتی ہوں کہ تیرے پاس واپس بھی آجاؤں گی۔''

کیخا تو خان نے حسرت اور افسوس سے کہا۔ ''تو اپنی مرضی سے جا تو سکتی ہے مگر اپنی مرضی سے واپس نہیں آسکتی۔''

رفیعہ نے اس کی بات سنی ان سنی کردی، پوچھا۔ ''تو، تو کب تک ملائے گا اپنے بڑے بھائی ارغون سے؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''کل یا پرسوں تک۔''

رفیعہ نے کہا۔ ''میں تیرا انتظار کروں گی۔''

کیخا تو خان نے کہا۔ ''اور جب تو یہاں سے چلی جائے گی تو میں تیرا انتظار بالکل نہیں کروں گا۔''

رفیعہ بجھ سی گئی، بولی۔ ''اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔''

کیخا تو خان وہاں سے چلا گیا۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا لیکن اگر وہ مڑ کر دیکھتا تو اسے ایک ایسا منظر دکھائی دیتا جس کا وہ اپنے دل میں متمنی رہا ہوگا۔ رفیعہ حسرت و یاس سے اسے ٹکٹکی باندھے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظر آتا رہا۔

☆☆☆

کیخا تو خان اپنے بھائی ارغون سے الجھ رہا تھا کہ آخر وہ اب تک اس کو سپہ سالارِ اعلیٰ کیوں نہیں بنا سکا اور ارغون ہنس ہنس کر جواب دے رہا تھا کہ اس کے لیے ابھی کچھ دن اور صبر کرنا ہوگا۔ ''کیخا تو! صبر کر، بس چند دن صبر کر۔''

کیخا تو خان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی زبان کھولی۔ ''برادرِ محترم! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں یہ انکشاف کروں گا کہ آپ کے سعد اللہ یہودی نے بڑی گڑبڑ پھیلا رکھی ہے، وہ نہ تو حکومت کے وقار کو دیکھتا ہے نہ اپنی عزت و آبرو کو۔ پچھلے دنوں موغان کی ایک بستی کو لوٹ کر سعد اللہ نے اسے ویران کر دیا۔ بہتوں کو قتل اور ہلاک کرنے کے بعد وہاں کی ایک حسین ترین تہمینہ نامی لڑکی کو اپنے گھر لے کر چلا گیا......''

ارغون کا نشہ ہرن ہو گیا، بولا۔ ''تو نے کیا کہا؟ اس نے ایک حسین ترین لڑکی کو اپنے گھر میں ڈال لیا؟ کیوں؟ کس کی اجازت سے؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''اس کے سارے کام ایسے ہی ہوتے ہیں برادرِ محترم! سعد اللہ آپ کے نام پر حکومت کر رہا ہے۔ آپ جس چیز سے اس کو......''

ارغون نے اسی وقت حکم دیا۔ ''سعد اللہ یہودی کو اسی وقت حاضر کیا جائے۔''

کیخا تو خان وہیں بیٹھا رہا۔ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ وہ سعد اللہ یہودی کو ذلیل ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔

ارغون نے نہایت لطف آمیز لب و لہجے میں کہنا شروع کر دیا۔ ''میرے بھائی کیخا تو خان! حکومت بڑا دشوار کام ہے۔ حکمران کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے آس پاس انتہائی احتیاط کے باوجود خود غرض اور خوشامدی جمع ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو اگر زخمی کیا جا سکتا ہے تو خوشامد کے ہتھیار سے۔ سعد اللہ اور اس جیسے کئی دوسروں نے ہمیشہ خوشامد کے سہارے غلط سلط کام کیے اور بچ گئے۔ سعد اللہ بھی یہی کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی تہمینہ بہت حسین اور یکتا ہوگی۔ اس کو سعد اللہ کے جھونپڑے میں نہیں میرے محل میں ہونا چاہیے۔ سعد اللہ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔''

کیخا تو خان نے رک رک کر کہا۔ ''برادرِ محترم! اس لڑکی کو سعد اللہ کے گھر سے نکال کر شاہی محل میں داخل کر دینا، کیا یہ مناسب ہوگا؟''

ارغون نے ہنس کر طنز کیا۔ ''تب پھر کیا اس کو تیرے حوالے کر دیا جائے؟''

کیخا تو خان ڈر گیا، گھبرا گیا، بولا۔ ''نہیں، میرا یہ مقصد ہرگز نہیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو اگر آزاد کر دیا جائے تو مناسب رہے گا۔''

ارغون نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس کو آزاد کر دیا جائے؟ مگر کیوں؟ تو نے تو اس کی بابت ابھی یہ بتایا تھا کہ اس کا سارا خاندان مارا گیا۔ جب اس کا کوئی خاندان ہی نہیں رہ گیا تو وہ یہاں سے نکل کر جائے گی کہاں؟ اگر تیری نیت ہو تو اسے رکھ لے یہ اور بات ہے۔''

کیخا تو خان پھر گھبرا گیا۔ ''میری یہ منشا ہرگز نہیں برادرِ محترم! میں اس کو لے کر کیا کروں گا؟''

ارغون نے کہا۔ ''تب پھر اسے شاہی محل سے اعلیٰ اور اچھی جگہ نہیں مل سکتی۔''

کیخا تو خان نے عرض کیا۔ ''لیکن مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اس کا ایک عزیز اب بھی موجود ہے، وہ زندہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ تہمینہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔''

ارغون نے پوچھا۔ ''یہ تہمینہ کون ہے؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''یہ اس لڑکی کا نام ہے، جسے آپ سعد اللہ یہودی سے حاصل فرمائیں گے۔''

ارغون نے بڑا پُرمعنی اور چبھتا ہوا سوال کیا۔ ''تو تجھے اس کا نام بھی معلوم ہے؟ خوب!''

کیخا تو خان اور زیادہ گھبرا گیا۔ ''اس لڑکی کا نام تہمینہ ہے یا کچھ اور، یہ میں نہیں جانتا لیکن اس کے خاندان کا جو شخص اس لڑکی کے لیے میرے پاس آیا تھا اس نے اس کا نام تہمینہ ہی بتایا تھا۔''

ارغون نے پوچھا۔ ''میری کنیز زرافشاں اور دونوں غلاموں کا کیا حال ہے؟''

کیخا تو خان نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

''دونوں ہی ٹھیک ہیں بلکہ تینوں ہی۔ ان کا دم غنیمت ہے۔ میری بڑی خدمت کرتے ہیں۔''

ارغون نے ہنس کر کہا۔ ''بیشک ان کا دم غنیمت ہے تینوں بہت کام کے ہیں۔''

کافی دیر بعد سعداللہ یہودی بھی آ گیا۔ اس نے دونوں بھائیوں کو یکجا جو دیکھا تو بڑی خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ ''میری ہر وقت خدا سے یہی دعا رہتی ہے کہ خدا اس اتحاد کو قائم و دائم رکھے۔''

ارغون نے درشت لہجے میں کہا۔ ''سعداللہ! ہمیں تجھ سے ایسی امید نہیں تھی۔''

سعداللہ نے گویا ارغون کی بات سنی ہی نہیں، بولا۔ ''حضور کی خفگی اور شکایات اپنی جگہ، اس وقت میں نذرانے میں ایک نہایت قیمتی چیز لایا ہوں۔ اگر حضورِ والا اسے قبول فرمالیں گے تو یہ میرے لیے بڑے اعزاز اور فخر کی بات ہوگی۔''

ارغون نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے کہاں تک چلنا ہوگا؟''

سعداللہ نے جواب دیا۔ ''اسی محل کے بیرونی حصے میں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی۔''

جب ارغون ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا تو سعداللہ نے کیخا تو کو مخاطب کیا۔ ''اور جنابِ والا آپ بھی۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔''

ارغون نے اپنے بھائی کیخا تو خان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہاں ہاں تو بھی چل۔''

راستے میں انہیں وہ خدمت گار ملے جو تھوڑی دیر پہلے سعداللہ کو بلانے گئے تھے، انہوں نے ارغون کو مطلع کیا۔ ''سعداللہ گھر پر نہیں ہیں۔''

ارغون کو ہنسی آ گئی۔ اس نے سعداللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سعداللہ اگر گھر پر نہیں ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، سعداللہ میرے سامنے موجود ہے۔''

سعداللہ نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! میرا خیال ہے یہ میرے بعد گھر پہنچے ہوں گے، مجھے تو یہ راستے میں بھی نہیں ملے کہیں......''

کچھ دیر بعد سعداللہ نے ارغون اور کیخا تو خان کو اس کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں ملاقات کے لیے آنے والوں کو بٹھا دیا جاتا تھا۔

ارغون نے دیکھا یہاں ایک نہایت حسین لڑکی بیٹھی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ شاندار لباس میں ملبوس اور زیورات سے آراستہ۔ ارغون اور کیخا تو خان کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ بھی نہ آسکا۔

ارغون نے پوچھا۔ ''سعداللہ! یہ کون ہے؟''

سعداللہ نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! مجھ کو یہ حسین لڑکی موغان کی مسلم بستی سے ملی تھی۔ اس وقت یہ بہت کمزور تھی، میں اس کو اسی وقت حضور کی نذر کرنا چاہتا تھا مگر پھر یہ سوچ کر کہ پہلے کھلا پلا کر اس کی صحت بنا دوں، اس کے بعد حضور کی نذر کروں، اپنے گھر لیے چلا گیا۔ اب یہ اس لائق ہے کہ اسے حضور کے حوالے کر دیا جائے۔''

ارغون کیخا تو خان کی شکل دیکھنے لگا۔ ارغون نے اس لڑکی کو محل میں بھیج دیا۔ کیخا تو خان نے تہمینہ کو دیکھا تو اس کو یوں لگا گویا رفیعہ کچھ کمسن ہو کر آ گئی ہے۔

ارغون نے سعداللہ سے کہا۔ ''آج تو بچ گیا، بال بال بچ گیا۔ میں تو حیران تھا کہ تجھ سے یہ خیانت ہوئی کس طرح؟''

سعداللہ نے پوچھا۔ ''میں حضور کا مطلب نہیں سمجھا، یعنی؟ خیانت...... کیسی خیانت؟ اور وہ بھی مجھ سے؟''

کیخا تو خان شرمندہ ہو چکا تھا۔ وہ ارغون اور سعداللہ کو باتیں کرتا چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ارغون نے اپنے بھائی پر ایک اچٹتی سی سرسری نظر ڈالی اور سعداللہ سے کہا۔ ''سعداللہ! ذرا دیکھنا تو یہ بھائی کیخا تو خان کو کیا ہو گیا؟''

سعداللہ کیخا تو خان کے پاس جا کھڑا ہوا اور کچھ دیر اس کی حالت کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میں آپ کا احترام کرتا ہوں لیکن آپ نے مجھ پر وار کر دیا۔ اب تو آپ قائل ہو گئے ہوں گے کہ مجھ میں دفاع کی صلاحیت ہے؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''میں نے تجھ پر کوئی وار نہیں کیا۔''

سعداللہ نے پوچھا۔ ''پھر یہ چکر سا کیوں آ گیا؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''اس کا کوئی خاص سبب نہیں، بس یوں ہی۔''

سعداللہ نے کہا۔ ''میں اب بھی آپ کا احترام کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اپنے بھرم اور احترام کو قائم رکھیں گے۔''

کیخا تو خان کو سعداللہ یہودی پر غصہ تو بہت آ رہا تھا مگر وہ اس کی چالاکیوں اور عیاریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا پھر بھی اس نے تلخی سے جواب دیا۔ ''سعداللہ! ہم آپس میں نااتفاقیوں کا شکار ہو چکے ہیں اور ہمیں یہ متعدی بیماری تہذیب و تمدن سے ملی ہے۔ جب تک ہم تمدن سے دور رہے ہم میں اتفاق و اتحاد برقرار رہا۔ میرے بھائی کا دل و دماغ تو بن چکا ہے اور وہ مجھ سے زیادہ تیری عزت کرتا

ہے لیکن سعداللہ تو بھی یاد رکھ کہ یہ آگ کا کھیل ہے۔ یہ آگ تیرا دامن پکڑ سکتی ہے اور جب تیرا دامن جل جائے گا تو تیرا سب کچھ جل جائے گا۔"

سعداللہ نے جواب دیا۔ "میں آگ سے نہیں ڈرتا۔ جب آگ سے کھیلوں گا تو جلوں گا بھی لیکن جب میں جلنے لگوں گا تو اس آگ میں دوسروں کو بھی کھینچ لوں گا، میں تنہا نہیں جلوں گا۔"

کیخا تو خان لاجواب ہو چکا تھا۔

ارغون خان نے دور سے پوچھا۔ "یہ تم دونوں کن باتوں میں لگ گئے؟"

سعداللہ نے کیخا تو خان سے کہا۔ "شہزادے! بہتر یہی ہے کہ ان باتوں کو یہیں ختم کر دیا جائے۔" اس کے بعد ارغون خان کو جواب دیا۔ "خانِ محترم! شہزادے کو چکر سا آ گیا تھا لیکن اب حالت بہتر ہے۔"

کیخا تو خان نے کہا۔ "سعداللہ جو ہوا سو ہوا، میں دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں، میری تیری لڑائی ختم لیکن تجھ کو بھی مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ تو بھی آئندہ میری مخالفت نہیں کرے گا۔"

سعداللہ ہنسنے لگا، بولا۔ "شہزادے! آپ کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ میں آپ کی مخالفت کرتا ہوں۔ آپ سوچیے تو سہی کہ آپ کی مخالفت سے مجھے حاصل کیا ہوگا؟"

چونکہ اب مزید باتوں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا اس لیے دونوں مسکراتے ہوئے ارغون کے پاس چلے آئے۔ سعداللہ یہودی نے کیخا تو خان کے لیے ارغون سے سفارش کی۔ "خانِ محترم! شہزادے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے انہیں شاہی طبیب کو دکھایا جائے تو بہتر ہے۔"

لیکن کیخا تو خان نے طبیب کو دکھانے سے انکار کیا، کہا۔ "اب میں ٹھیک ہوں بس ذرا چکر سا آ گیا تھا۔"

ارغون خان مسکرایا۔ "یہ چکر کون سی بیماری ہے؟ تو کمزور بھی نہیں ہے کہ چکر آئیں اور میں سوچتا ہوں کہ منگولوں کے عساکر کے سپہ سالارِ اعلیٰ کو اگر چکر آنے لگے تو اس کے عساکر کا کیا حال ہوگا۔"

کیخا تو خان بہت کھسیایا ہوا تھا۔ سعداللہ نے شہزادے کی طرف سے جواب دیا۔ "خانِ محترم! اب میں شہزادے کی طرف سے یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ انہیں آئندہ چکر نہیں آئیں گے۔"

ارغون نے اپنے بھائی کیخا تو خان کی پیٹھ تھپتھپائی، بولا۔ "سعداللہ بہت عقلمند ہے، اس کی عقل سے تو بھی فائدے اٹھا سکتا ہے۔ تو اس سے ملتا جلتا رہ، فائدے میں رہے گا۔"

کیخا تو خان نے کھسیاہٹ سے جواب دیا۔ "میں نے سعداللہ سے دوستی کر لی ہے، اس سے فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔"

کیخا تو خان اپنے بھائی ارغون کے پاس اس وقت تک موجود رہا جب تک سعداللہ یہودی چلا نہیں گیا۔ سعداللہ کے جاتے ہی ارغون خان نے کہا۔ "کیخا تو! سعداللہ نے محض اس لیے اس لڑکی کو اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ اس وقت وہ بہت کمزور تھی اور جب وہ کھا پی کر صحت مند ہو گئی تو اسے میرے حوالے کر دیا۔"

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ "لیکن میں سعداللہ کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتا، اس کو اس واقعے کی خبر مل گئی تھی اسی لیے وہ تہمینہ کو لے کر حاضر ہو گیا۔"

ارغون نے بڑی معنی خیز بات کی، بولا۔ "سعداللہ کی طرح ایک شخص اور ہے جس نے ایک ایسی ہی چیز اپنے گھر میں چھپا رکھی ہے میں کس کس کی شکایت کروں، کس کس کی ناقابلِ اعتباری کا گلہ کروں؟"

کیخا تو خان گھبرا گیا، کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "برادر محترم! اب میں جانا چاہتا ہوں، پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔"

ارغون خان نے کہا۔ "ٹھیک ہے تو جا سکتا ہے مگر کوشش کرنا کہ تیرا اعتبار قائم رہے۔"

کیخا تو خان چلا آیا لیکن اب وہ زیادہ پریشان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا ارغون کو رفیعہ کا علم ہو چکا ہے؟ اگر علم ہو چکا ہے تو یہ اطلاع کس نے دی ارغون کو؟ اس کو یہ بات معلوم کس سے ہوئی؟

جب وہ شاہی محل سے نکل رہا تھا تو اس نے اس وقت اپنے غلام اینال کو بھی شاہی محل سے نکلتے دیکھا۔ اس نے اینال کو آواز دے کر روک لیا اور پوچھا۔ "تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟"

اینال ذرا بھی نہ گھبرایا، بولا۔ "شاہی محل کے کئی غلام میرے دوست ہیں، کبھی کبھی ان سے ملنے چلا آتا ہوں۔"

کیخا تو خان نے درشت لہجے میں کہا۔ "لیکن جب تک میں کہیں جانے کی اجازت نہ دوں تجھ کو نہیں جانا چاہیے۔"

اینال نے سہم کر جواب دیا۔ "آئندہ میں اس کا خیال رکھوں گا۔"

کیخا تو خان آگے آگے تھا اور اینال پیچھے پیچھے۔ راہ میں چھاؤنی کے منگول سرداروں نے کیخا تو خان کو سلام کیا اور

احترام سے پیش آئے کیونکہ انھیں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کیخاتو خان عنقریب ان کا سپہ سالارِ اعلیٰ بننے والا ہے۔

اپنے قصر میں داخل ہونے کے بعد کیخاتو خان نے اینال کے ذریعے دوسرے غلام فرامرز کو بھی طلب کیا اور اس سے پوچھا۔ ”فرامرز! کیا شاہی محل کے غلاموں میں تیرے دوست بھی ہیں؟“

فرامرز نے جواب دیا۔ ”جی بندہ پرور! کئی دوست ہیں۔“

کیخاتو خان بپھر کر بولا۔ ”لیکن میں غلاموں کی دوستی کا قائل نہیں۔ میں نے اینال کو شاہی محل سے نکلتے دیکھا۔ کیا اس قصر میں میری نہیں غلاموں کی حکومت ہے؟ کیا غلام اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں؟“

اینال نے جواب دیا۔ ”بندہ پرور! میں نے آپ کے دل و دماغ پر اسلام کے اثرات محسوس کیے ہیں اور مسلمانوں میں آقا اور غلام میں مساوات پائی جاتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ اس کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیں گے اور مجھے اتنی آزادی تو حاصل ہی ہوگی کہ فارغ اوقات میں اپنی مرضی پر چل پھر سکوں۔“

کیخاتو خان تقریباً لاجواب ہو چکا تھا، بولا۔ ”لیکن میں مسلمان نہیں ہوں اور میں بالکل پسند نہیں کرتا کہ میرے غلام اپنی مرضی استعمال کریں۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا زنان خانے میں چلا گیا۔ وہاں ارغون کی عطا کردہ زرافشاں اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ کیخاتو خان کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ”میرے آقا! آپ نے مجھ میں کیا کمی دیکھی جو مجھے اپنی محبوبہ کی خدمت میں نہیں بھیجا اور وہاں معمولی درجے کی دو خادمائیں متعین کر دیں۔“

کیخاتو خان نے پوچھا۔ ”میری محبوبہ؟ کون سی محبوبہ؟ کہاں ہے میری محبوبہ؟“

زرافشاں نے جواب دیا۔ ”قصر کے اس آخری کمرے میں جس کی کھڑکیاں باغ میں کھلتی ہیں۔“

کیخاتو خان نے برہمی سے کہا۔ ”لیکن تو وہاں کس طرح پہنچ گئی تھی؟ وہاں کیوں گئی تھی؟“

زرافشاں نے جواب دیا۔ ”میں اتفاق سے وہاں چلی گئی تھی؛ مجھے وہاں جانے سے روکا بھی گیا مگر میں نہیں مانی کیونکہ میں جانتی تھی کہ میرا آقا مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے اور مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا۔“

کیخاتو خان نے اپنے لہجے کی برہمی قائم رکھی۔ ”یہ تجھے کس نے بتایا کہ وہ میری محبوبہ ہے؟“

زرافشاں نے جواب دیا۔ ”جس خوب صورت لڑکی کو آپ نے اتنے آرام اور اہتمام سے رکھا ہوا ہے، جس کو اس قصر کا آراستہ پیراستہ کمرا رہنے کو دیا گیا ہو، جس کی دو خادمائیں خدمت کے لیے متعین کر دی گئی ہوں، وہ محبوبہ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی۔“

کیخاتو خان نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ میری محبوبہ نہیں ہے۔ وہ ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے اور میرے پاس اس لیے آئی ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔“

زرافشاں نے کہا۔ ”اگر بات صرف اتنی سی تھی تو آپ نے اس کو اپنے قصر میں کیوں رکھا، اس کی مدد کر کے رخصت کر دیا ہوتا۔“

کیخاتو خان اپنا سر پکڑ کر چوکی پر بیٹھ گیا، بولا۔ ”آج معلوم نہیں کیوں مجھے بار بار چکر آ رہے ہیں۔“

زرافشاں اپنی کہے جا رہی تھی۔ ”میں تو یہ کہتی ہوں کہ اگر آپ کو اس سے زیادہ اور ذاتی دلچسپی نہیں تھی تو اس کو اپنے قصر میں نہیں رکھنا تھا اور یہ بات بھی اپنی سمجھ سے بالاتر ہے کہ اتنی خوب صورت لڑکی کو آپ یوں ہی جانے دیں۔“

کیخاتو خان بالکل مجبور اور بے بس ہو رہا تھا، بولا۔ ”زرافشاں! یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اگر وہ مجھے پسند بھی ہو تو اس کا کیا علاج کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں، مجھے یہ بات کون بتائے گا؟ میں اس سے یہ بات کس طرح پوچھوں؟“

زرافشاں نے کہا۔ ”آقا! آپ کیسے شہزادے ہیں۔ آپ کے بھائی ارغون خان تو اس طرح کبھی سوچتے ہی نہیں۔ آپ منگول تو اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ آپ نے کسی چیز کو پسند کر لیا، بس یہی کافی ہے۔ آپ نے اپنے اسی اصول پر ملکوں کو فتح کیا، قوموں کو پامال کیا، شہروں کو برباد کر ڈالا، اپنی خواہش اور مرضی سے تہذیبوں کو آگ لگا دی۔ آپ لوگوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ جو حسین ترین لڑکی آپ کی آغوش میں آپ کی خواہشات پوری کر رہی ہے، وہ آپ کو پسند بھی کرتی ہے یا نہیں، اسے آپ سے محبت ہے بھی کہ نہیں۔ یہ حسین ترین لڑکی جو آپ کے قصر میں عیش و آرام سے رہ رہی ہے، آپ کی ملکیت ہے۔ آپ اس کی مرضی، اس کی خواہش کیوں معلوم کریں؟“

کیخاتو خان کو آج تک زرافشاں کی شعلہ بیانی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ مسکرانے لگا، بولا۔ ”زرافشاں! بخدا تو، تو زبردست مقرر ہے۔ میں نے تیرا یہ وصف آج سے پہلے تو سمجھا ہی نہ تھا۔ بہرحال تو نے جو کچھ کہا، وہ سچ ہے، اس میں صداقت ہے لیکن افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھ سے مدد لینے آئی ہے، میں اس کی مدد تو کر سکتا ہوں مگر اس پر ظلم

نہیں کرسکتا۔''

زرافشاں نے پوچھا۔ ''میرے آقا! مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے مگر اس کا سبب؟ مجبوری کی کوئی خاص وجہ؟''

کیخاتو خان نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''میں وہ بات کہہ نہیں سکتا، اگر کہوں گا تو وہ مشہور ہوجائے گی اور اس کی تشہیر میرے لیے مضر ثابت ہوگی۔''

زرافشاں نے کہا۔ ''لیکن وہ بات مشہور ہی کیوں ہوگی؟ میں اس کو راز رکھوں گی۔''

کیخاتو خان نے زرافشاں کو اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ زرافشاں وعدہ کرو کہ میں جو کچھ کہوں گا اسے راز رکھو گی۔

زرافشاں نے ایک بار پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''میرے آقا! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ آپ مجھ پر اعتبار کرسکتے ہیں، مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''زرافشاں! میں مسلمان ہوچکا ہوں، ابھی تک میں نے اس کا اعلان نہیں کیا۔ میں نے ابھی تک کلمہ بھی نہیں پڑھا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میرے دل و دماغ مسلمان ہوچکے ہیں اور اسلام مجھے روک رہا ہے کہ میں اس مہمان لڑکی پر جبر کروں، اس کی مرضی معلوم کیے بغیر اپنی مرضی اپنی خواہش اس پر مسلط کردوں۔ دراصل میں اسلامی اخلاقیات کا پابند ہوگیا ہوں۔''

زرافشاں کچھ سوچنے لگی، بے خیالی میں بولی۔ ''تو یہ بات ہے۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بات ہے اور اگر یہ بات بھائی ارغون کو معلوم ہوگئی تو وہ مجھے اپنی افواج کا سپہ سالار نہیں بنائے گا۔''

زرافشاں نے پوچھا۔ ''میرے آقا! پھر وہی بات کہ میں آپ سے آپ کے راز کی باتیں معلوم کررہی ہوں، مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں انہیں معلوم کروں۔ آپ کی محرمِ راز بنوں لیکن اگر میں ان معاملات میں کسی طرح آپ کی مدد کرسکتی ہوں تو میں حاضر ہوں۔ میں آپ کی مدد کروں گی۔''

کیخاتو خان کسی قدر پُرامید ہوگیا اور اس نے رفیعہ اور تہمینہ کی ساری باتیں بتادیں، بولا۔ ''اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تہمینہ کو ارغون کے چنگل سے کس طرح رہائی دلاؤں اور رفیعہ کو کس طرح خوش رکھوں۔''

زرافشاں کچھ سوچ رہی تھی پھر جیسے سوچوں سے دھیان ہٹا کر پوچھا۔ ''ایک بات پوچھوں، آپ سچ سچ بتائیں گے؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''پوچھ، میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

زرافشاں نے پوچھا۔ ''اس لڑکی کا نام رفیعہ ہے، کیا یہ لڑکی آپ کو پسند ہے؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''وہ مجھے اچھی تو بہت لگتی ہے، لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ رفیعہ مجھے زبردستی چاہنے لگے۔''

زرافشاں نے کہا۔ ''میں اس سلسلے میں رفیعہ سے معلوم کروں گی۔''

کیخاتو خان پریشان ہوگیا، بولا۔ ''مگر اس طرح کہ اسے یہ شبہ تک نہ ہو کہ اس مقصد سے میں نے تجھے بھیجا ہے۔''

زرافشاں نے جواب دیا۔ ''اگر یہ بات رفیعہ کو معلوم ہوجائے تو اس میں میرا کیا کمال ہوگا۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''لیکن جب تک تہمینہ بھی نہ مل جائے اس سے یہ بات نہیں پوچھنی چاہیے۔''

زرافشاں نے تسلی دی۔ ''میرے آقا! آپ اداس نہ ہوں، شاید میں آپ کا یہ کام بھی کرسکوں گی۔ میں شاہی محل سے تہمینہ کو بھی لاسکتی ہوں مگر اس کے لیے ذرا وقت درکار ہوگا۔''

کیخاتو خان بے چینی سے کھڑا ہوگیا اور زرافشاں کو اپنی آغوش میں لے لیا، بولا۔ ''زرافشاں! بخدا میں نے تجھ کو اتنا کارآمد اور اتنا عقلمند کبھی نہیں سمجھا تھا۔ اگر تو نے میرا یہ کام کردیا تو میں زندگی بھر تیرا احسان مند رہوں گا۔''

زرافشاں نے کہا۔ ''لیکن میرے آقا! آپ کی احسان مندی میرے کس کام آئے گی؟ میں آپ کی احسان مندی کا کیا کروں گی۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''پھر تو ہی بتا کہ اپنے ان کاموں کے عوض تو مجھ سے کیا لینا پسند کرے گی؟''

زرافشاں نے کہا۔ ''میرے آقا! یہ بات بھی آپ ہی سوچیں گے کہ میرے ان کاموں کا بدل کیا ہوسکتا ہے؟ مجھے ان کا کیا معاوضہ ملنا چاہیے؟''

کیخاتو خان اپنے ذہن پر دیر تک زور دیتا رہا، پھر بولا۔ ''تیری ان خدمات کا ایک معاوضہ ہے میرے ذہن میں۔ معلوم نہیں تو بھی اسے پسند کرے گی یا نہیں۔''

زرافشاں نے کہا۔ ''کون سا معاوضہ؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''اب تک تو میں نے تجھ کو اپنی کنیز بنائے رکھا ہے، اس کے بعد میں تجھ کو اپنی بیوی بنالوں گا اور...... اور اگر میں کبھی ایل خان بن گیا تو، تو

میری ملکہ ہوگی۔''

زرافشاں کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پوچھا۔ ''اور یہ رفیعہ کیا بنے گی؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''محض بیوی، وہ بھی تب، جب وہ میری بیوی بننا پسند کرے گی۔''

زرافشاں کو عبرت ہو رہی تھی۔ منگول شہزادہ اپنی جبلت اپنی فطرت کو اتنا بدل چکا تھا کہ وہ خود اتنا معمولی کام نہیں کرسکتا تھا، اسے اپنے کام کے لیے زرافشاں کی ضرورت پیش آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میرے آقا! میں آپ کی بیوی اور پھر ملکہ بن جاؤں اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہوگی لیکن میں آپ کے کام کسی لالچ میں نہیں، خلوص اور محبت سے انجام دوں گی۔ آپ مجھے رفیعہ سے ملوا دیجیے، تہمینہ سے میں خود مل لوں گی۔''

کیخاتو خان زرافشاں کے ساتھ رفیعہ کے پاس پہنچا اور زرافشاں کا شاندار لفظوں میں تعارف کرایا۔ چونکہ زرافشاں خود بھی بے حد حسین تھی اس لیے رفیعہ اسے دیکھ کر چونک گئی، پوچھا۔ ''تو کیخاتو خان کی کیا لگتی ہے؟''

زرافشاں نے کیخاتو خان کی طرف دیکھا۔ کیخاتو خان اسی وقت باہر نکل گیا۔

زرافشاں نے جواب دیا۔ ''میں شہزادہ کیخاتو خان کی کنیز ہوں۔''

رفیعہ نے زہرخند کیا، ہنس کر بولی۔ ''یعنی ناجائز بیوی، خوب! یہاں میرے پاس کیوں آئی ہے؟''

زرافشاں نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنے آقا شہزادے سے وعدہ کیا ہے کہ میں آپ کی بہن تہمینہ کو نکال لاؤں گی اور آپ کے حوالے کردوں گی مگر یہ تو بتائیے کہ اگر میں آپ کی بہن کو نکال لاؤں تو آپ اس کو لے کر جائیں گی کہاں؟ ایل خان ارغون کے ہاتھ تو بہت لمبے ہیں۔''

رفیعہ نے بے مروتی سے کہا۔ ''جو کام شہزادہ خود نہیں کرسکتا، اسے تیرے سپرد کیوں کردیا؟''

زرافشاں نے کہا۔ ''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

رفیعہ نے کہا۔ ''دیکھ عورت! یہ کام تو نہیں کرسکے گی۔ یہ کام میں کروں گی۔ اگر تو کچھ کرسکتی ہے تو یہ کر کہ مجھے کسی طرح ارغون خان کے پاس پہنچا دے، بقیہ کام میں خود کرلوں گی۔''

زرافشاں کو یہ تلخ و ترش لڑکی پسند نہیں آئی، چڑ کر بولی۔ ''آپ اپنے کام کو اتنا آسان سمجھتی ہیں؟''

رفیعہ نے اسی بدمزگی اور تلخی سے کہا۔ ''اگر میں یہاں کیخاتو خان تک پہنچ سکتی ہوں تو اس [illegible] بھی جاسکتی ہوں۔''

زرافشاں منہ بنا کر بولی۔ ''اے لڑکی! [illegible] بار بار عورت کیوں کہتی ہے؟ تیری طرح میں بھی لڑکی [illegible]''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''جب تو شہزادے [illegible] بن گئی اور شہزادے نے تجھ کو بیوی کی طرح رکھ [illegible] لڑکی کہاں رہی، عورت بن گئی۔''

زرافشاں ذرا سی دیر میں اس سے عاجز آگئی، جاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے پھر کسی وقت ملوں گی۔ اس وقت آپ اپنے آپے میں نہیں ہیں شاید۔''

رفیعہ نے کہا۔ ''میں ہمیشہ اسی طرح ملوں گی تجھ سے۔''

زرافشاں وہاں سے چلی آئی اور باہر نکل کر کیخاتو خان سے کہا۔ ''توبہ توبہ، کیسی بددماغ ہے یہ لڑکی۔ وہ تو بات تک کرنے کو تیار نہیں۔''

کیخاتو خان نے ذرا سی دیر کی تفصیل پوچھی، زرافشاں نے صاف صاف بتا دیا۔ شہزادے نے کہا۔ ''زرافشاں! اس وقت تو، تو جا۔ پھر کسی وقت آجانا۔ اس وقت تو میں باتیں کرتا ہوں اس سے۔''

زرافشاں کے جاتے ہی کیخاتو خان رفیعہ کے پاس پہنچ گیا اور شکایتاً کہا۔ ''رفیعہ! تو نے زرافشاں کو جھڑک کر اچھا نہیں کیا۔''

رفیعہ پہلے ہی سے بھری بیٹھی تھی، بولی۔ ''شہزادے! تو مجھ کو ذلیل نہیں کرے گا، یہ عورت میری کیا مدد کرے گی۔ میری تو سمجھ میں کوئی بات آتی نہیں، یہ تو مجھے رسوا کردے گی۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''تیری مرضی۔ بہرحال آج میں نے تیری بہن تہمینہ کو دیکھ لیا۔''

رفیعہ مضطربانہ کھڑی ہوگئی۔ ''کہاں دیکھ لیا میری بہن تہمینہ کو؟ کیا تو سعداللہ یہودی کے گھر گیا تھا؟''

کیخاتو خان نے اسے پوری تفصیل سنا دی اور آخر میں کہا۔ ''اب وہ ارغون خان کے پاس پہنچ چکی ہے۔''

رفیعہ نے بےچینی سے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ''اب میرا شاہی محل تک پہنچنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''تو اگر شاہی محل میں داخل بھی کرادی گئی تو اس سے تجھے کیا فائدہ پہنچے گا اور تو وہاں کیا کرے گی؟''

رفیعہ نے کہا۔ ''میں کیا کروں گی اور کیا نہیں کروں

گی، یہ میرا اپنا کام ہے۔ تیرا جو کام ہے بس وہ کر دے تو۔''

کیخاتو خان یہ کہہ کر چلا آیا کہ میں پہلے اس معاملے پر غور کرلوں پھر کچھ بتاؤں گا۔

زرافشاں کیخاتو خان کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی، دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی تھی وہ احمق لڑکی؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''جب سے اسے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تہمینہ بھی ارغون کے پاس پہنچ چکی ہے، وہ شاہی محل تک پہنچنے کے لیے اور زیادہ بے قرار ہو چکی ہے۔''

زرافشاں نے کہا۔ ''میرے آقا! ایک بات کہوں؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''کہہ، بات ماننے والی ہوگی تو ضرور مانوں گا۔''

زرافشاں نے مشورہ دیا۔ ''آپ رفیعہ کو کسی بھی طرح ارغون کے پاس پہنچا دیں، اسی میں ہم سب کی بہتری اور نجات ہے۔''

کیخاتو خان ایک دم مشتعل ہو گیا۔ ''زرافشاں! یہ تو کیسے احمقانہ مشورے دے رہی ہے مجھے؟''

زرافشاں نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! یہ میرا احمقانہ نہیں عاقلانہ مشورہ ہے، اگر رفیعہ نے اپنے دل میں یہ طے کرلیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح شاہی محل میں داخل ہو کر رہے گی تو کوئی اُسے روک بھی نہیں سکے گا۔''

کیخاتو خان کا دل ڈوبنے لگا، پوچھا۔ ''تو، تو یہ معلوم کرنے گئی تھی کہ وہ مجھ پر کس حد تک راغب ہے؟ اس سلسلے میں کیا معلوم ہوا، کیا اندازہ لگایا تو نے؟''

زرافشاں نے پوچھا۔ ''شہزادے! میں نے کیا اندازہ لگایا، صاف صاف بتا دوں؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''ہاں، وہ صاف صاف بتا دے، یہ سوچے بغیر کہ وہ بات مجھ پر کتنی گراں گزرے گی۔''

زرافشاں نے کہا۔ ''تو صاف بات یہ ہے کہ رفیعہ صحیح لڑکی نہیں ہے۔ یہاں آنے کا جو مقصد اس نے بتایا ہے، شاید وہ ہے ہی نہیں، وہ یہاں کسی اور ہی مقصد سے آئی ہے اور اس مقصد کا علم رفیعہ کے علاوہ کسی کو بھی نہیں، وہ شاہی محل تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہے۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ میرے بھائی ارغون سے مالی مفاد حاصل کرنا چاہتی ہے۔''

زرافشاں نے جواب دیا۔ ''نہیں، وہ اتنا معمولی سودا کرنے نہیں نکلی ہے۔ میرے خیال کے مطابق وہ منگولوں کی ملکہ بننا چاہتی ہے۔ اس کے ارادے بلند، مقصد عظیم الشان اور منصوبہ بے مثل ہے۔''

کیخاتو خان نے بے بسی اور کرب سے کہا۔ ''اچھا، تو یہ بات ہے۔ انسان کتنا گہرا اور عجیب ہے کہ ہوتا کچھ ہے اور نظر کچھ آتا ہے اور سانپوں کی طرح کینچلی میں بند رہنے والا انسان بھی کتنا حیرت انگیز ہوتا ہے۔''

اس نے پورا دن بڑے کرب و اضطراب میں گزارا۔ وہ رفیعہ سے متنفر ہو چکا تھا۔ جھلاہٹ میں بار بار یہی فیصلہ کرتا کہ کیوں نہ اسے نکال باہر کرے لیکن زرافشاں نے اسے سمجھایا اور کہا۔ ''اگر آپ نے اسے قصر سے نکال دیا تو میرے آقا! یہ لڑکی آپ کے لیے مصیبت بن جائے گی۔ سیدھی ایل خان کے پاس پہنچے گی اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا، آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔''

وہ اس دن خلافِ معمول رات کو رفیعہ کے پاس پہنچ گیا۔ رفیعہ کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی باغ کی طرف دیکھ رہی تھی ــــ لیموں کی شاخیں کھڑکی کے اندر جھانک رہی تھیں اور وہ لیمو... کے پتے توڑ کر اس کی ترش خوشبو سونگھنے میں مشغول تھی۔ کیخاتو خان اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا مگر رفیعہ کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ آخر وہ کھنکھارا تو رفیعہ گھوم کر اسے دیکھنے لگی۔ پوچھا۔ ''کون؟''

کیخاتو خان نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ ''میں ہوں شہزادہ کیخاتو۔''

رفیعہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی، پوچھا۔ ''خیریت؟ یہ بے وقت آنے کا سبب؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''دن میں جب میں یہاں آیا تھا، اس وقت آپ بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔ اب آپ فرمائیں کہ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''شہزادے! یہ میں آپ جناب کی گفتگو تو جانتی نہیں جس طرح میں تم اور تو سے بات کرتی ہوں، اسی طرح تو بھی بات کرے گا۔''

کیخاتو خان نے پوچھا۔ ''اچھا یہ تو بتا کہ تو شاہی محل میں کیوں جانا چاہتی ہے؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس تیرے لیے اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جب بھی فرصت پاؤں تیرے حق میں دعائیں کرتی رہوں۔''

کیخاتو خان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور نبض زور زور سے اچھلنے لگی، بولا۔ ''رفیعہ! میں ایک بات پوچھوں؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''ضرور پوچھ۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''میں تیرا بھی خواہ ہوں، میرے بارے میں تیری اپنی کیا رائے ہے؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''تو اچھا آدمی ہے اور واقعی میرا بھی خواہ ہے۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''جب یہ بات ہے اور تو مانتی ہے کہ میں تیرا بھی خواہ ہوں تو، تو اس قصر کو چھوڑ کر بھائی ارغون کے شاہی محل میں کیوں جانا چاہتی ہے؟''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''میرا ایک مقصد ہے، جب تک وہ حاصل نہیں کرلوں گی، چین سے نہیں بیٹھوں گی۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''شاہی محل میں تیرا کون سا مقصد پنہاں ہے، میں سوچ سوچ کر حیران ہو رہا ہوں۔ ہاں میری یہ بات یاد رکھنا کہ ارغون جیسے ہی تجھے دیکھے گا، اپنا دل تجھے دے بیٹھے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ تو اس کی ملکہ بن جائے۔''

رفیعہ مسکرائی۔ ''ملکہ بننا کوئی مقصد نہیں ہے، بہر حال میں شاہی محل میں پہنچ کر رہوں گی۔''

کیخاتو خان نے رفیعہ کی باتوں سے جو اندازہ لگایا تھا، وہ زرافشاں کے اندازے سے مختلف نہیں تھا۔ شاید رفیعہ منگولوں کی ملکہ بننا چاہتی تھی اور اس کا حسن اسے ملکہ بنا سکتا تھا۔ کیخاتو نے کہا۔ ''اگر تو شاہی محل پہنچنا ہی چاہتی ہے، تو میں تجھے روک بھی نہیں سکتا اور پھر تہمینہ کو شاہی محل سے نکلوا کر تیرے حوالے کرنا فضول ہے۔''

رفیعہ نے جواب دیا۔ ''میں تہمینہ کو سعد اللہ کے چنگل سے رہائی دلوانا چاہتی تھی، اب وہ جہاں پہنچی ہے، اس کی صحیح جگہ ہے۔''

کیخاتو خان کو رفیعہ کی باتوں سے گھن آرہی تھی، بولا۔ ''خوب دولت، شہرت اور آرام و آسائش شاید یہی تم دونوں بہنوں کے نصب العین ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا ہے اور شرم سی محسوس کر رہا ہوں کہ تجھے پہچاننے میں کتنی بڑی غلطی کی ہے میں نے۔''

رفیعہ نے کہا۔ ''بیشک تو نے ہمیں پہچاننے میں بڑی غلطی کی ہے۔''

کیخاتو خان کچھ دیر اس کے پاس کھڑا اسے گھورتا رہا...... رفیعہ نے نہایت نرم اور شیریں لہجے میں کہا۔ ''تو کھڑا کیوں ہے، بیٹھ جا۔ کیخاتو خان! ہم دونوں تیرے لیے پہیلیاں بنی ہوئی ہیں، لیکن ذرا سوچ تو سہی کہ جن کا سب کچھ لٹ چکا ہو اور انہیں شاہی محل تک رسائی حاصل ہو رہی ہو تو وہ کیوں چوکے گا؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''رفیعہ! میں نے تجھے پناہ دی اور تیری بہن کی بابت یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے کسی بھی طرح تجھ سے ملوا دوں گا۔ میری حکومت اور میری قوم نے تجھ پر جو ظلم کیا ہے، میں اس کی یوں تلافی کرنا چاہتا تھا کہ مسلمان ہو کر تجھ سے شادی کرلوں کیونکہ میں عنقریب اپنی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ بننے والا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بھائی ارغون کے بعد میں ایل خان بن جاؤں لیکن تو انتظار نہیں کرسکتی...... تو صبر نہیں کرسکتی اس لیے مجبوری ہے، میں تجھ پر جبر نہیں کرسکتا۔''

رفیعہ اس کی باتیں سنتی رہی اور مسکراتی رہی، بولی۔ ''تیری پیشکش کا شکریہ۔ اگر میں زندہ رہی اور تو ایل خان بن گیا تو میں تجھ سے ضرور ملوں گی اور اس وقت بھی میرے بارے میں تیرے یہی احساسات اور خیالات رہے تو میں شکریے کے ساتھ تیری پیشکش قبول کرلوں گی۔''

کیخاتو خان کو اس کی مسکراہٹ میں طنز اور باتوں میں تمسخر محسوس ہو رہا تھا، وہ ناراض ہو کر وہاں سے چلا آیا اور اپنے کمرے میں تنہا بند ہو کر دیر تک خود کو ملامت کرتا رہا۔

زرافشاں نے بڑی غم خواری کی اور کمرے کا دروازہ کھلوا کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور شاندار اور پُراثر دلیلیں دے دے کر اسے سمجھاتی رہی۔

کیخاتو خان نے کہا۔ ''زرافشاں! اب میں اس کو ایک لمحہ بھی اپنے قصر میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں اسی وقت اس کو نکال باہر کرنا چاہتا ہوں۔''

زرافشاں نے اسے سمجھایا، بولی۔ ''میرے آقا! جذباتی نہ بنیے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

کیخاتو خان بڑبڑاتا رہا۔ ''آخر وہ ہے کیا۔ وہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟ کیا وہ اس طرح واقعی ملکہ بن سکتی ہے؟ کیا میں اپنے بھائی ارغون کو پہچانتا نہیں؟ زرافشاں! تو دیکھے گی کہ ارغون اس کو ملکہ نہیں کنیز بنا کے رکھے گا۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، سارے مقاصد خاک میں مل جائیں گے۔''

☆☆☆

جس طرح طوفان کی آمد سے پہلے ہوا رک جاتی ہے اور سناٹا طاری ہو جاتا ہے، اسی طرح کیخاتو خان اور رفیعہ کے مابین پراسرار سی کشیدگی طاری تھی، دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ کچھ سوچ رہے تھے، دونوں ایک دوسرے کے حال احوال سے غافل اور بے نیاز تھے کہ اچانک قصر میں زلزلہ سا آگیا۔ قصر کے خدام اور غلام حرکت میں آگئے۔ ایل خان ارغون اپنے حشم و خدم کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کیخاتو خان سے اچانک ملاقات کرنے آگیا

تھا۔ کیخاتو خان بھاگا بھاگا قصر کے باہر پہنچا تو ارغون گھوڑے سے اتر رہا تھا اور سعداللہ یہودی پہلے ہی اتر چکا تھا۔ خان کے خدمت گار بھی گھوڑوں سے پہلے ہی اتر چکے تھے۔ ارغون خان نے کیخاتو کو اپنی طرف آتے دیکھا تو شفقت سے بولا۔ ''کیخاتو! تو، تو ہر روز ہی شاہی محل پہنچ جاتا ہے، آج میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں خود کیوں نہ اپنے چھوٹے بھائی کے قصر چلا چلوں۔''

کیخاتو خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''برادر محترم! آپ کی آمد کا شکریہ، دیدہ و دل فرشِ راہ، میری خوش قسمتی کہ آپ تشریف لائے۔'' وہ زبان سے جو کچھ بھی کہہ رہا تھا، دل و دماغ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ارغون خان کی آمد خالی از علت ہرگز نہیں، وہ آیا نہیں بلکہ لایا گیا ہے۔

ارغون خان قصر میں داخل ہوا تو سعداللہ یہودی کو باہر ہی رک جانا پڑا۔ کیخاتو نے اس کو دارالاقامہ میں پہنچا دیا، کیخاتو نے پوچھا۔ ''سعداللہ ہم دونوں میں تو دوستی ہو چکی ہے، کیا میں اس دوستی کے حوالے سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ بھائی ارغون خان اچانک کس طرح آ گئے؟''

سعداللہ نے جواب دیا۔ ''ویسے مجھے تو کچھ پتا نہیں لیکن میں نے سوچا کہ کیوں نہ حساب کتاب برابر کر دیا جائے۔ میں یہودی ہوں اور ہم لوگ حساب کتاب کے معاملے میں کھرے اور صاف ہوتے ہیں۔''

ایک خدمت گار دوڑتا ہوا آیا اور کیخاتو خان سے کہا۔ ''آپ کو خان محترم یاد فرما رہے ہیں۔''

کیخاتو دوڑ کر بھائی ارغون کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت ایل خان اپنے عطا کردہ دونوں غلاموں سے باتیں کر رہا تھا۔ ارغون نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔ ''میں نے ایک عرصے سے تیرا قصر اندر سے نہیں دیکھا۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''تو اب دیکھ لیجیے۔''

ارغون خان ایک بڑے ہال سے گزر کر میدان میں پہنچ گیا۔ میدان سبزے سے اٹا ہوا تھا۔ میدان کے بعد جو عمارت تھی، اس میں کیخاتو کے عزیز و اقارب رہتے تھے، وہ سب ارغون خان کا استقبال کرنے لگے۔

ارغون خان نے پوچھا۔ ''اور کیخاتو! میری عطا کردہ کنیز کہاں چلی گئی؟ زندہ بھی ہے یا مار دی؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''آپ آگے تشریف تو لے چلیں، زرافشاں زندہ ہے اور بڑی وفاشعار ہے۔''

ارغون خان نے ہنس کر کہا۔ ''زرافشاں کتنی وفاشعار ہے، یہ میں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں۔''

ارغون خان اچانک ایک ایسے ہال میں داخل ہو گیا جس میں بڑے بڑے پردے لٹک رہے تھے اور ہر طرف رونق ہی رونق تھی لیکن محض ساز و سامان سے۔ یہاں آدمی ایک بھی نظر نہیں آیا۔ ارغون نے کیخاتو سے پوچھا۔

''یہ خالی کیوں ہے؟ یہاں کون رہتا ہے؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''برادر محترم! یہ یوں ہی خالی پڑا رہتا ہے، سوچتا ہوں اب اس کو آباد کر دوں۔''

اس ہال سے گزر کر وہ جس کمرے میں داخل ہوا یہاں زرافشاں بھی موجود تھی۔ اس نے ادب سے خان کو سلام کیا اور ایک طرف سلیقے سے کھڑی ہو گئی۔ ارغون خان نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور پوچھا۔ ''تجھے یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟''

زرافشاں نے جواب دیا۔ ''میں یہاں بہت خوش ہوں۔''

ارغون اور آگے بڑھ گیا اور راستے میں جو جو ملتا گیا، وہ اس سے سوال جواب کرتا رہا۔

کیخاتو خان نے جب یہ دیکھا کہ ارغون اب رفیعہ والے کمرے کی طرف جائے گا تو اس کو راستے ہی میں روک دیا، کہا۔ ''برادر محترم! آپ نے میرے قصر کا سب کچھ تو ملاحظہ فرما لیا، اب آئیے میں آپ کو اپنے باغ کی سیر کراؤں؟''

ارغون خان نے پوچھا۔ ''کیا پورا قصر میں نے دیکھ لیا یا ابھی کچھ باقی ہے؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''قصر میں اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ باغ میں تشریف لے چلیں، آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔''

ارغون خان آدھے راستے ہی سے واپس چلا گیا۔ بولا۔ ''بہتر ہے، وہی دکھا جو دیکھنے کے لائق ہو۔''

کیخاتو خان، ارغون خان کو لے کر باغ میں پہنچ گیا۔ ارغون ایک ایک درخت اور پودے کو بڑے انہماک سے دیکھتا رہا اور پوچھا۔ ''اس باغ کا مالی کون ہے؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''ایک ایرانی ہے۔''

ارغون خان نے کہا۔ ''بہرحال مالی بہت اچھا ہے۔''

اس کے بعد وہ گھومتا گھامتا اس کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا، جہاں سے رفیعہ اس باغ کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ ارغون نے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کھڑکی قصر کے کس کمرے کی ہے؟''

کیخاتو نے جواب دیا۔ ''برادر محترم! یہ جس کمرے کی کھڑکی ہے، اس کی نشاندہی دشوار ہے۔''

ارغون نے پوچھا۔ ''کیا میں اس کمرے میں جا چکا ہوں؟''

کیخا تو نے جواب دیا۔ ''نہیں، آپ اس کمرے میں نہیں گئے۔''

ارغون نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن میں اس کمرے میں کیوں نہیں گیا؟ وجہ؟''

کیخا تو نے جواب دیا۔ ''بس چوک ہو گئی۔''

ارغون اس کمرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ کیخا تو نے اس کی توجہ بٹانا چاہی مگر ارغون کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا، اس نے کہا۔ ''جتنا مزہ باغ کی سیر میں نہیں آیا، اس سے زیادہ مزہ اس کھڑکی سے آتا۔''

ابھی ارغون کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کھڑکی کھل گئی اور اس میں سے رفیعہ اور زرافشاں کے چہرے ایک ساتھ نظر آئے۔ ارغون نے رفیعہ کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ''ارے، یہ تہمینہ کہاں سے آگئی؟''

اب کیخا تو خان کی پریشانی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔

ارغون نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ ''یہ تہمینہ تیرے قصر میں کیونکر آگئی؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''برادر محترم! یہ تہمینہ نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔''

ارغون نے پوچھا۔ ''پھر یہ کون ہے؟ یہ قصر میں کہاں تھی جو مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ ہے کون؟''

کیخا تو خان کے پاس ان باتوں کے مختصر جواب نہیں تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ رفیعہ کا تعارف کس طرح کرائے۔

ارغون خان نے حکم دیا۔ ''اگر یہ تہمینہ نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اس کو میرے روبرو باغ میں پیش کیا جائے۔''

کیخا تو خان نے سرکشی اختیار کی۔ ''بھائی ارغون! یہ تہمینہ نہیں ہے۔ میں آپ کا بھائی ہوں کیا آپ کے لیے یہ مناسب ہے کہ آپ میرے قصر کی عورتوں کو بھی اپنی مرضی اور خواہش سے جہاں چاہیں لے جائیں اور ان کے ساتھ جو چاہیں کریں؟''

ارغون خان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''کیخا تو خان! میں ایل خان ہوں اور تو میری رعایا۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میری حدود مملکت میں جو کچھ بھی ہے، میرا ہے، میری ملکیت ہے۔'' اس نے دوبارہ حکم دیا۔ ''اس لڑکی کو حاضر کیا جائے۔''

کیخا تو خان ایل خان کے سامنے بے بس اور لاجواب ہو چکا تھا۔

ارغون خان نے کہا۔ ''تو بلواتا ہے اس لڑکی کو یا میں اپنے آدمی بھیج کر زبردستی بلوالوں۔''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''آپ قصر میں دوبارہ تشریف لے چلیں، وہ لڑکی وہیں آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔''

ارغون خان دوبارہ قصر میں داخل ہوا تو کیخا تو خان نے رفیعہ کو اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ارغون خان اس مجسمہ حسن و رعنائی کو دیکھتا رہ گیا۔ اسے حیرت تھی کہ تہمینہ سے اتنی مشابہت بھی کسی لڑکی میں ہو سکتی ہے؟

کیخا تو خان نے کہا۔ ''آپ تہمینہ اور رفیعہ کی حیرت انگیز مشابہت پر حیران نہ ہوں، یہ دونوں حقیقی بہنیں ہیں۔''

ارغون خان نے پوچھا۔ ''لیکن یہ تیرے پاس کہاں سے آگئی؟''

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''یہ میرے پاس خود بخود آگئی تھی اور میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کرنے والا تھا۔''

ارغون خان نے کہا۔ ''اگر تو میرے خاندان کا آخری بیٹا نہ ہوتا تو میں معلوم نہیں تیرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔''

کیخا تو خان کو رفیعہ اور زرافشاں پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے کھڑکی کھول کر اپنی رونمائی کر دی تھی اور اس طرح ارغون خان پر رفیعہ کی موجودگی کا راز افشا ہو گیا تھا۔

ارغون رفیعہ کو لے کر روانہ ہو گیا۔ کیخا تو کو ایسا لگا، گویا ارغون رفیعہ ہی کو لینے آیا تھا۔ ارغون کے قافلے کا آخری مسافر سعد اللہ تھا۔ وہ سب سے پیچھے تھا، اس نے کیخا تو خان کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تہمینہ کا حساب برابر ہوا۔ دراصل ہم یہودی لوگ حساب کتاب کے کھرے ہوتے ہیں۔''

کیخا تو خان جلا بھنا اپنے قصر میں واپس گیا اور زرافشاں پر برس پڑا۔ ''یہ تجھ سے کس نے کہا تھا کہ تو رفیعہ کو لے کر کھڑکی کھول کر کھڑی ہو جائے؟''

زرافشاں نے جواب دیا۔ ''کسی نے بھی نہیں۔ رفیعہ نے ضد کی اور کھڑکی کھول کر کھڑی ہو گئی۔''

کیخا تو خان کی جھنجلاہٹ کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا پورا وجود... آگ میں جل رہا تھا۔ ایک آگ وہ تھی جو اپنی بے بسی اور مجبوری سے پیدا ہو گئی تھی اور دوسری آگ تھی رفیعہ کی بے مروتی اور احسان ناشناسی کی اور تیسری آگ تھی رفیعہ کی جدائی کی۔

جب وہ زیادہ اونچی آواز میں بولنے لگا تو زرافشاں نے اسے سمجھایا۔ ''میرے آقا! آپ ہوش سے کام لیں اور آواز ذرا نیچی رکھیں۔''

کیخا تو خان کو اور غصہ آگیا۔ ”تو مجھے مشورہ دیتی ہے کہ میں اونچی آواز میں بات نہ کروں، تو مجھ سے کہتی ہے کہ میں ہوش سے کام لوں۔“

زرافشاں نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں آپ سے ہوش میں رہنے اور اونچی آواز میں بات نہ کرنے کی بات کرتی ہوں اور اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ آپ مغضوب الغضب ہیں اس لیے میری باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“

کیخا تو خان اور زور سے چیخا۔ ”زرافشاں! میں اپنے انجام کی پروا کیے بغیر کچھ بھی کرسکتا ہوں۔“

زرافشاں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا۔ ”آپ مجھے قتل کر دیں میرے آقا لیکن ادھر آئیے میرے ساتھ اور میں جو کچھ کہوں، اس کو غور سے سن کر فیصلہ کیجیے۔“

زرافشاں کیخا تو خان کو اسی کمرے میں لے گئی جہاں رفیعہ رہتی تھی۔ اس نے اپنے لباس کے اندر سے خنجر نکالا اور اسے کیخا تو کے ہاتھ میں دے دیا، بولی۔ ”یہ خنجر حاضر ہے، آپ میرا پیٹ چاک کر دیں، مجھے قتل کر دیں اور آپ یہاں چیخ چیخ کر باتیں کرسکتے ہیں۔“

زرافشاں کا انداز بتاتا تھا کہ ان واقعات کے پیچھے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، وہ ذرا نرم پڑ گیا مگر درشتی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، تو کیا کہنا چاہتی ہے؟“

اس نے خنجر زرافشاں کے ہاتھ سے لے لیا۔

زرافشاں نے پوچھا۔ ”آپ نے رفیعہ کو روک کیوں نہیں لیا؟ اس کو جانے کیوں دیا؟“

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ”میں مجبور تھا، میں ایل خان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔“

زرافشاں نے کہا۔ ”میرے آقا! آپ کو ارغون خان کے بعد حکومت کرنی ہے، آپ کو اصولِ جہاں بانی اور رموزِ مملکت کا علم ہونا چاہیے۔ آپ کو علم ہونا چاہیے کہ حیلۂ ملوکیت کسے کہتے ہیں اور مکرِ شاہی کیا ہوتا ہے۔“

کیخا تو خان نے پوچھا۔ ”تو کہنا کیا چاہتی ہے؟“

زرافشاں نے جواب دیا۔ ”میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ ہم ایل خان کے غلام ہیں، وہ ہمیں جس طرح چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت میں جو کچھ بتاؤں گی، اس کی سزا بھی بھگتوں گی مگر مجھے آپ سے جو انس ہوگیا ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں اپنی اور دونوں غلاموں فرامرز اور اینال کی اصل حقیقت بیان کر دوں۔“

کیخا تو خان کی توجہ زرافشاں کی باتوں پر مرکوز ہوگئی، پوچھا۔ ”تم تینوں کی اصلیت؟ یعنی تم تینوں کی کوئی اصلیت بھی ہے؟“

زرافشاں نے جواب دیا۔ ”ہم تینوں ارغون خان کے جاسوس ہیں۔ جب ہم تینوں کو آپ کے حوالے کیا گیا تھا تو ہمیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ آپ کی ایک ایک بات ارغون تک پہنچائیں، چنانچہ ہم تینوں نے ایل خان کی یہ خدمت پوری دیانتداری سے انجام دی ہے۔“

کیخا تو خان اپنی سادہ لوحی پر شرمندہ تھا، حیرت سے پوچھا۔ ”تو تم تینوں بھائی ارغون کے مخبر ہو؟“

زرافشاں نے جواب دیا۔ ”ہاں اور براہِ کرم اس کا ذکر کسی اور سے نہ کیجیے گا۔ فرامرز اور اینال کو بھی یہ بات معلوم نہ ہو ورنہ ہم تینوں قتل کر دیے جائیں گے۔“

کیخا تو خان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا، بولا۔ ”تو میں اس درجہ سادہ لوح انسان ہوں لیکن زرافشاں میں سادہ لوح نہیں، ارغون کا بھائی ہوں اور میں ارغون پر بھروسا کرتا ہوں۔“

زرافشاں نے مشورہ دیا۔ ”آپ کسی پر بھی بھروسا نہ کریں، ہمیشہ ہوشیار رہیں۔“

کیخا تو خان نے کہا۔ ”میں نے تیرا مشورہ مان لیا اور میں دیکھوں گا کہ اب مجھے کون بے وقوف بناتا ہے۔“

اب کیخا تو خان نے یہ روش اختیار کی کہ وہ اینال اور فرامرز کے سامنے ہمیشہ ایسی حرکتیں اور باتیں کرتا جس سے ارغون کے ساتھ اس کی وفاداری اور محبت استوار ہوتی رہتی۔

رفیعہ کے جانے کے بعد وہ کئی دن تک ارغون کے

شعور

ہم لوگ بھی عجیب ہیں۔ ثواب کی خاطر مرے ہوئے انسان کو کندھا دیتے ہیں مگر زندہ انسان کا سہارا بننے سے کتراتے ہیں۔

سوچیے

دنیا کے سارے راستے قبرستان کو جاتے ہیں، وہ امیر کے محل سے نکلتے ہوں یا غریب کی جھونپڑی سے۔

قوتِ برداشت

برداشت بزدلی نہیں بلکہ زندگی کا ایک اصول ہے اور جس دل میں قوتِ برداشت ہو، وہ کبھی ہار نہیں سکتا۔

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی لاہور

پاس نہیں گیا۔ وہ گھنٹوں بیٹھا کچھ سوچتا رہتا اور جب کوئی اس سکوت اور غمزدگی کا سبب پوچھتا تو یہی بتاتا کہ وہ اپنے بھائی سے بے حد شرمندہ ہے۔ آخر رفیعہ کو اپنے پاس اتنے دنوں تک کیوں روکے رکھا۔ جب یہ خبریں ارغون خان کو پہنچیں تو اسے اپنے بھائی پر رحم آگیا اور اس نے سعد اللہ یہودی کو بطورِ خاص بھیج کر بلوا لیا۔ سعد اللہ یہودی نے اسے تسلی دی، کہا۔ ''شہزادے! آپ بہت خوش قسمت ہیں کیونکہ رفیعہ نے آپ کی بابت یہ گواہی دے دی ہے کہ آپ نے رفیعہ کو اپنے لیے نہیں اپنے بڑے بھائی ارغون کے لیے رکھا تھا اور آپ نے کسی مناسب موقع کے انتظار میں اتنا وقت گزار دیا۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''میں تو اپنے بھائی پر جان تک قربان کرسکتا ہوں، ایک لڑکی کیا چیز ہے۔''

جب وہ ارغون خان کے سامنے پہنچا تو اس طرح گم صم اور پریشان حال پہنچا کہ ارغون کو اس پر رحم آگیا۔

ارغون خان نے پوچھا۔ ''تو اتنے دنوں سے کہاں غائب تھا؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''میری شرمندگی اور ندامت مجھے منہ چھپانے پر مجبور کرتی رہی۔ میں آپ لوگوں سے بھی شرمندہ ہوں۔''

ارغون نے ہنس کر کہا۔ ''تو میرا بھائی ہے کیخاتو خان۔ میں تیری بڑی عزت کرتا ہوں۔''

کیخاتو خان نے مصلحت اندیشی سے کام لیا اور کہا۔ ''اور جب تک نیلا جاودانی آسمان مجھ پر مہربان ہے، میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

ارغون نے تائید کی، بولا۔ ''بیشک۔''

اس کے بعد ارغون کئی دن متواتر کیخاتو خان کو بطورِ خاص بلواتا رہا۔ اب قصر سے اطلاعات بھی بہت اچھی مل رہی تھیں اور ارغون بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ کیخاتو خان اس سے بے حد محبت کرتا ہے اور اس کی وفاداری مسلم ہے۔ اب وہ کئی دن سے یہی سوچ رہا تھا کہ کیخاتو خان کو منگول عساکر کا سپہ سالارِ اعلیٰ بنا دیا جائے خراسان، قفقاز اور مصر سے جو خبریں آرہی تھیں ان کے پیش نظر یہ ضروری ہوگیا تھا کہ فوجوں کو ہر وقت چاق و چوبند اور تیار رکھا جائے۔ جوجی خان کا خانوادہ اصرار کر رہا تھا کہ مراغہ اور تبریز اس کے ہیں اس لیے انہیں خالی کردیا جائے۔ دوسری طرف چغتائیوں کا دعویٰ تھا کہ خراسان اور ہرات ان کے ہیں اس لیے انہیں چغتائیوں کے حوالے کردیا جائے۔

تیسری طرف مصر کے مملوک شام اور فلسطین سے آگے بڑھنے کی فکر میں تھے۔ خود ارغون ان محاذ آرائیوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اب وہ کیخاتو خان کو اس لائق سمجھتا تھا کہ اس پر اعتماد کیا جائے لیکن سعد اللہ یہودی اب بھی یہی کہہ رہا تھا۔ ''بندہ پرور ابھی نہیں! کچھ دن اور انتظار کرلیجیے۔ اگر آپ نے عجلت میں یہ قدم اٹھا دیا تو یقین رکھیے کہ آپ نے جو کچھ اپنے بڑے بھائی نکودار کے ساتھ کیا ہے، کیخاتو خان بالکل وہی سلوک آپ کے ساتھ کرے گا۔''

ارغون پھر رک گیا اور کیخاتو خان سپہ سالارِ اعلیٰ بنتے بنتے رہ گیا۔

☆☆☆

ان باتوں کو دو سال گزر گئے، اس دوران رفیعہ اور تہمینہ کا کوئی پتا نہ تھا۔ وہ ارغون کے محل میں جانے کہاں روپوش ہوگئی تھیں۔ سعد اللہ کے اثرات اور زیادہ گہرے اور قوی ہو چکے تھے۔ ارغون کچھ کچھ بیمار رہنے لگا تھا۔ اس کا چچازاد بھائی بایدو خان سپہ سالاری کی امید میں ارغون کی چاپلوسیوں میں لگا ہوا تھا۔ خود ارغون اب بھی اپنے بھائی کیخاتو خان کے حق میں تھا۔

اس دوران ارغون نے اپنے کئی دوستوں اور جاننے والوں کو مرتے دیکھا تھا۔ ان کی بیماریاں بھی زیادہ پیچیدہ نہیں تھیں۔ کوئی بخار میں چل بسا، کسی نے گٹھیا میں جان دے دی اور کوئی کسی ایسے مرض میں مرگیا کہ وہ جان لیوا بھی نہیں تھا چونکہ ارغون خود بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا اس لیے دوستوں اور جاننے والوں کی موت نے اسے کچھ زیادہ ہی چوکنا کردیا تھا۔ وہ کیخاتو خان سے بار بار یہی پوچھتا رہتا تھا کہ وہ ہندو گیانی ابھی تک کیوں نہیں آیا جس کے پاس طویل العمری اور سدا شباب کے نسخے پائے جاتے ہیں۔

کیخاتو خان کو بھی اس گیانی کا بڑا انتظار تھا، ہندوستانی تاجر اس سے کچھ رقم بھی لے گیا تھا۔ کیخاتو خان نے سوچا، شاید وہ ہندوستانی تاجر اس سے دھوکا کر گیا ہے۔ ارغون نے کہا۔ ''کیخاتو خان! آخر تو کب تک اس ہندوستانی تاجر کا انتظار کرے گا؟ اپنے بھائی، اپنے آقا، اپنے بادشاہ کے لیے تجھ کو خود ہی ہندوستان کا سفر کرنا چاہیے۔''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ''برادر محترم! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ خود ہی ہندوستان جانا پڑے گا اور وہاں سے مذکورہ گیانی کو لانا پڑے گا۔''

ارغون نے ہنس کر کہا۔ ''کیخاتو خان! میرا کیا ہے، جب تک ہندو گیانی آنہیں جاتا تو ہی خسارے میں رہے گا

کیونکہ میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ جب تک ہندو گیانی نہیں آئے گا، میں بھی تجھے منگول عساکر کا سپہ سالار نہیں بننے دوں گا۔"

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ "میں سپہ سالار نہیں بننا چاہتا میں ملازمت بھی نہیں کروں گا۔"

ارغون نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ پہلے تو، تو اس کا بھوکا تھا، پر اب کیا ہو گیا تجھ کو؟"

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ "میری دن رات یہی دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت یاب رکھے اور لمبی عمر دے اور آپ کو زندگی بھر ایل خان اور اپنی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ بنائے رکھے۔"

ارغون اٹھ کر بیٹھ گیا مگر کمزوری اس کو دوبارہ لیٹنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کیخا تو خان کا خیال تھا کہ اگر ارغون اسی طرح کمزور ہوتا رہا تو یہ دو چار سال کے اندر ہی رخصت ہو جائے گا۔

ایک دن علی الصباح وہ ہندوستانی تاجر بھی اچانک آ گیا، جس کا ارغون اور کیخا تو خان بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہندوستانی تاجر اپنے ساتھ ایک ہندو گیانی بھی لایا تھا۔

کیخا تو ان دونوں کو عزت و احترام سے اپنے قصر میں لے گیا۔ ان دونوں کے سامنے خشک میوے رکھ دیے گئے۔ ہندو گیانی نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "یہ شخص (کیخا تو خان) مسلمان ہے یا کچھ اور؟"

ہندوستانی تاجر نے جواب دیا۔ "یہ مسلمان نہیں، آسمان پرست ہے۔"

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد ہندو گیانی خشک میوے کھانے لگا۔ کیخا تو خان نے ان دونوں کو شراب بھی فراہم کردی۔

کیخا تو خان نے ہندو گیانی جیسا آدمی اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک دھوتی باندھ رکھی تھی اور اس کا نصف حصہ اپنے کاندھے پر ڈال لیا تھا۔ ڈاڑھی لمبی، مونچھ اور ڈاڑھی کے بال بھی گھنے اور بڑے بڑے تھے۔ اگر ڈاڑھی اور مونچھ نہ ہوتی تو سر کے بالوں کی وجہ سے وہ عورت نظر آتا۔

ہندوستانی تاجر نے اس کا تعارف کرایا۔ "خان بابا! یہ ہیں گرو شیو دیال جی۔ ان کے گیان دھیان کا کوئی حساب نہیں۔ اور ان کے پاس ایسے نادر نسخے ہیں کہ جن کے استعمال سے انسان کئی کئی سو سال زندہ رہ سکتا ہے اور گرو جی بوڑھوں کو جوان تو اس طرح کر دیتے ہیں جیسے پہلی کا چاند آہستہ آہستہ چودھویں کا بن جائے۔ ان کے علم کا پورے ہندوستان میں شہرہ ہے اور ان کے دیدار کے لیے ہر روز اتنے انسان جمع ہو جایا کرتے ہیں کہ اس سے ایک بازار کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔"

ہندوستانی تاجر گرو شیو دیال جی کی تعریفیں کیے جا رہا تھا اور کیخا تو خان اس عجیب و غریب شخص میں کھو گیا تھا۔ گرو جی کو اپنی زبان کے علاوہ کچھ آتا ہی نہ تھا لیکن گرو جی آدمی بے حد ذہین تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ کیخا تو خان کی زبان بہت جلد سیکھ لیں گے۔

کیخا تو خان اس گیانی کو جلد از جلد اپنے بھائی ارغون کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے ہندوستانی تاجر کو بھی اپنے ساتھ لیا اور تینوں ارغون خان کے پاس چل دیے۔ راستے میں کیخا تو خان نے ہندوستانی تاجر کو سمجھایا۔ "دیکھو، ایل خان تم سے پوچھے گا کہ تمہاری اس خدمت کے صلے میں وہ کتنی دولت عطا کرے، تم اس کے جواب میں کہنا کہ یہاں جو کچھ بھی ہے، خان ہی کا ہے اس لیے میں خان محترم کی خوشنودی کی خاطر اپنے گرو کو لے آیا ہوں۔ اس جواب سے خان بہت خوش ہوگا کیونکہ ہمارے آباؤاجداد بھی اسی طرح چیزیں خریدا کرتے تھے۔ ارغون تمہیں تمہاری خدمت کا صلہ نہیں، انعام و اکرام دے گا اور وہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا جو تمہارے ذہن میں ہوگا۔"

کیخا تو خان نے جب ارغون کو ہندوستانی گیانی کی آمد سے مطلع کیا تو وہ بہت خوش ہوا اور وہ جہاں اور جس حال میں تھا، وہیں ان تینوں کو طلب کرلیا۔ ارغون ہندو گرو کو اپنی طرف آتے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ کیخا تو خان نے ہندوستانی تاجر سے سرگوشی میں کہا۔ "ارغون گرو جی کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ سمجھ لو یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس سے اس گرو کو نوازا گیا ہے۔"

ارغون نے شیو دیال جی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور کہا۔ "میں مہینوں سے نہیں سالوں سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

شیو دیال جی نے ہندوستانی تاجر کی طرف دیکھا اور تاجر نے اس کا ترجمہ کر دیا۔ جواب میں گرو جی نے کہا۔ "میرا ملک یہاں سے بہت دور ہے، آتے آتے اتنا زمانہ گزر گیا۔"

ارغون نے تاجر سے پوچھا۔ "یہ ہماری زبان کیوں نہیں جانتا؟"

تاجر نے جواب دیا۔ ”جناب! یہ شخص دو ماہ میں آپ کی زبان سیکھ لے گا، آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔“

ارغون نے حکم دیا۔ ”جب تک یہ ہماری زبان نہ سیکھ جائے، تجھے یہیں رہنا ہوگا۔“

تاجر نے جواب دیا۔ ”خانِ معظم کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں تو اس حکم پر پوری زندگی یہیں گزارنے کو تیار ہوں۔“

ارغون نے پوچھا۔ ”تاجر! تو نے ہماری جو خدمت کی ہے، میں تجھ کو اس کا صلہ کیا دے دوں؟“

ہندی تاجر نے جواب دیا۔ ”یہ میری مجال کہ میں خان بابا سے اپنی محنت یا خدمت کا صلہ مانگوں۔ میں تو خان بابا کا غلام ہوں۔ مجھے آپ نے شرفِ باریابی بخشا میرے لیے یہی کیا کم ہے۔“

ارغون نے تالی بجائی، کئی کنیزوں کو حکم دیا۔ ”میں نے حکم دیا ہے کہ خزانچی کو حاضر کیا جائے۔“

تھوڑی دیر بعد خزانچی کو ارغون کے سامنے کھڑا کر دیا گیا، ارغون نے کہا۔ ”جب تین ماہ بعد یہ مراغہ سے جانے لگے تو اس کو میرے مشورے سے مالا مال کر دینا، یہ میرا حکم ہے۔“ اس کے بعد ہندوستانی تاجر سے کہا۔ ”پہلے تو اس عالم کو ہماری زبان سکھا دے اس کے بعد جہاں چاہنا چلے جانا۔ تو میرا مطلب تو سمجھ گیا ہوگا؟“

تاجر نے کہا۔ ”خان بابا! میں آپ کا غلام آپ کا تابعدار ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے، اس کی تعمیل کروں گا۔“

آخر میں ارغون نے اپنے بھائی کیخاتو خان کو مخاطب کیا۔ ”اور بھائی کیخاتو خان! میں تیرا شکر گزار ہوں کہ یہ کام تیرے ہی طفیل تکمیل کو پہنچا۔“

ارغون ہندوستانی تاجر کو ترجمان بنا کے گروشیو دیال جی سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ گروجی سے یہ معلوم کرتا رہا کہ کیا اس کے پاس ایسے نسخے ہیں جن سے انسانی عمر میں کئی کئی سو سال کا اضافہ ممکن ہو جائے اور یہ کہ کیا بڑھاپے کو جوانی میں بدلا جا سکتا ہے؟

گروجی نے جواب دیا۔ ”بچہ! سب کچھ ممکن ہے۔ میں تجھ کو کئی سو سال تک زندہ رکھ سکتا ہوں اور تیرے بڑھاپے اور جوانی کے بیچ میں ایک ایسی لکیر کھینچ سکتا ہوں کہ جوانی سدا کے لیے برقرار رہے اور بڑھاپا شرمندہ ہو کر اپنا منہ چھپا کے غائب ہو جائے۔“

ارغون بے حد خوش تھا، اس نے پوچھا۔ ”تو نے اپنے لیے بھی کچھ کیا کبھی؟“

گروجی نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنے لیے بھی کیا تھا اور میں اسی کی وجہ سے کئی سو سال گزار چکا ہوں۔“

ارغون نے اس کے پاؤں میں لکڑی کی چپل دیکھی جس کو گروشیو دیال جی کھڑاؤں کہتے تھے۔ لکڑی کی چپل کے تلے میں انگوٹھے کے پاس لکڑی کی ایک کھنڈی جڑی ہوئی تھی جن میں انگلی اور انگوٹھے کو پھنسا کر وہ چلتا تھا۔ ارغون نے ایسی مخلوق پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے گروجی کو کئی بار چلایا پھرایا اور اسے چلتے پھرتے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ گروجی نے بائیں کاندھے میں جنیو ڈال رکھا تھا جو سیدھی طرف کولہے تک لٹکا ہوا تھا۔ اس میں لوہے کی چھوٹی سی کنجی پروئی ہوئی تھی۔

ارغون نے... تاجر اور گروشیو دیال جی کو محل کے ایک حصے میں رکھ لیا۔ گروجی تاجر سے ارغون کی زبان سیکھنے لگے۔

اب ارغون اپنے چھوٹے بھائی کیخاتو خان سے بے حد خوش تھا۔ اس نے سعد اللہ یہودی سے پوچھا۔ ”سعد اللہ! بھائی کیخاتو خان نے ہمیشہ میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔ اس نے ہندوستان سے میری خاطر ایک زبردست گیانی بلوا لیا ہے چنانچہ اب میں اس کے احسان کی ادنیٰ سی قیمت ادا کرنا چاہتا ہوں۔“

سعد اللہ یہودی نے پوچھا۔ ”محترم خان! آپ اپنے بھائی کو اس کی خدمات کے صلے میں کیا دینا چاہتے ہیں؟“

ارغون نے جواب دیا۔ ”اپنی افواج کی سپہ سالاری۔“

سعد اللہ نے اس سے اختلاف کیا، بولا۔ ”خان محترم! میں آپ کو ایسا مشورہ نہیں دے سکتا جو آپ کے لیے مضر ہو، نقصان دہ ہو۔“

ارغون نے کہا۔ ”سعد اللہ! میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں۔ میں بڑھاپے سے پہلے ہی بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے ہاتھ کپکپا رہے ہیں اور جب میں چلتا ہوں تو میں کسی قدر کمان کی طرح جھک جاتا ہوں۔“

سعد اللہ یہودی نے پوچھا۔ ”پھر...... پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

ارغون نے جواب دیا۔ ”اس سے فرق یہ پڑتا ہے کہ میں اپنے دشمنوں کی افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک ایسا شخص درکار ہے جو میری افواج کی سپہ سالاری کر سکے۔“

سعد اللہ نے کہا۔ ”اس کام کے لیے آپ کے چچا کا بیٹا بایدو خان زیادہ مستحق ہے۔“

ارغون برہم ہو گیا اور سعد اللہ یہودی کو برا بھلا کہنے لگا۔ ”تو غداری کر رہا ہے کیا تو یہ چاہتا ہے کہ حکومت

میرے چچا کے خاندان میں چلی جائے۔ حالانکہ میں اپنے چچا کی اولاد سے نفرت کرتا ہوں۔''

ارغون نے اسی وقت کیخا تو خان کو بلوا کر سعد اللہ یہودی کے سامنے اپنی افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔ سعد اللہ یہودی ان ساری حرکات کو صبر و سکون سے دیکھتا رہا اور سپہ سالارِ اعلیٰ کیخا تو خان کو جس نے سب سے پہلے مبارکباد پیش کی، وہ یہی سعد اللہ یہودی تھا۔

ارغون سعد اللہ کو دیکھ کر مسکرایا، کہا۔ ''سعد اللہ! کیا بات ہے ابھی تو تو کیخا تو خان کی مخالفت کر رہا تھا اور اب تو ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے کیخا تو خان کو مبارکباد پیش کی ہے۔''

سعد اللہ نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کو ایک مشورہ دیا تھا، اس کو آپ نے مسترد کر دیا اور اپنا فیصلہ مسلط کر دیا۔ میں آپ کا خدمت گار ہوں اور خدمت گار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کے ہر حکم کی تعمیل کرے۔''

ارغون خان کے دل میں سعد اللہ کے خلاف جو ذرا سی گرد جم گئی تھی، وہ پھر صاف ہو گئی۔

ارغون خان اپنے چھوٹے بھائی کیخا تو خان کو محل کے اندر لے گیا اور کہا۔ ''کیخا تو خان! اب تو میری افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ ہے۔ گویا تو میرے بہت قریب آچکا ہے۔ اب محل کے دروازے تجھ پر کھل چکے ہیں۔ تو یہاں ہر وقت آجا سکتا ہے مگر خبردار میرے اس کمرے میں ہرگز نہ جانا جہاں میں آرام کرتا ہوں۔''

کیخا تو خان نے اپنے بڑے بھائی کا شکریہ ادا کیا۔

ارغون نے کہا۔ ''ہندوستانی وید آچکا ہے اور وہ دن دور نہیں جب میں کئی سو سال کے لیے دوبارہ جوان ہو چکا ہوں گا۔''

کیخا تو خان نے اپنے بھائی کو دعا دی۔ ''میری دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت یاب کرے۔''

محل میں اس کی نظریں رفیعہ اور تہمینہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن ان کا کہیں پتا نہ چلتا تھا۔

وہ کافی دیر بعد ہوش میں آیا تو دیکھا اور سنا کہ ارغون خان اس کے پاس کھڑا نصیحتیں کر رہا تھا، ارغون اسے سمجھا رہا تھا۔ ''کیخا تو! تو میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میرے مخلص لوگ مجھے خوفزدہ کرتے ہیں کہ تو سپہ سالار بنتے ہی مجھے معزول کر دے گا اور میں نے ان حاسدوں اور مفسدوں سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کیخا تو خان اگر چاہے تو مجھے ہلاک کر کے حکومت پر قبضہ کر لے، میں ان مفسدوں اور حاسدوں سے تنگ آگیا ہوں۔''

کیخا تو خان اپنے بھائی سے لپٹ گیا، بولا۔ ''بھائی! میں یہ کیونکر کر سکتا ہوں۔ میں آپ سے اتحاد ہی رکھوں گا کیونکہ میں نے اپنے والد مرحوم سے اس کا وعدہ کر لیا تھا۔''

ارغون اس کو لیے ہوئے دیوان جیسے حصے میں چلا گیا اور وہاں اپنے سامنے بٹھا کر بات کرنے لگا، بولا۔ ''بھائی کیخا تو خان! تو اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں کتنا بوڑھا ہو چکا ہوں۔ بوڑھا تو میں پہلے بھی ہو چلا تھا تقریباً دو سال پہلے لیکن ادھر کے دو سالوں نے مجھے بے حد کمزور کر دیا۔ اب وید آچکا ہے اور نیلے جاودانی آسمان نے چاہا تو میں پھر سے جوان بھی ہو جاؤں گا اور کئی سو سال زندہ بھی رہوں گا۔''

کیخا تو خان نے ایک بار پھر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، وہ غیر ارادی طور پر دونوں بہنوں کو تلاش کر رہا تھا۔ ارغون نے پوچھا۔ ''کیخا تو خان! یہ تیری نظریں دیر سے کس کو تلاش کر رہی ہیں؟''

کیخا تو خان گھبرا گیا، ارغون خان مسکرانے لگا، بولا۔ ''میں جانتا ہوں، تیری نظریں رفیعہ کو تلاش کر رہی ہوں گی۔ کیا تو اس سے ملنا چاہتا ہے؟''

کیخا تو خان اور زیادہ گھبرا گیا، اس کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ارغون اسے دھوکا دے کر اندر تو نہیں لے آیا اور یہاں قتل کرا دے لیکن ارغون نے خلافِ توقع رفیعہ کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ کیخا تو خان نے دو سال بعد رفیعہ کو دیکھا تھا۔ اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا، رفیعہ میں بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ اس کے حسن میں دھبا سا لگ گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے، کیخا تو خان رفیعہ کو زیادہ دیر نہیں دیکھ سکا۔

ارغون نے رفیعہ کی شکایت کی۔ ''کیخا تو خان! جب سے میں رفیعہ کو تیرے پاس سے لایا ہوں، میری صحت تیزی سے گرتی چلی گئی۔ معلوم نہیں کیوں۔''

کیخا تو خان نے رفیعہ سے پوچھا۔ ''کیوں رفیعہ! کیا بھائی ارغون سچ کہہ رہے ہیں؟''

رفیعہ زیادہ بے باک ہو چکی تھی، شوخی سے جواب دیا۔ ''جب چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے عورتوں میں گزریں گے تو بڑھاپا تو آئے گا ہی۔''

ارغون ہنس دیا۔ ''کیخا تو خان! اس کو سمجھا۔ انسان کو جوانی کس لیے دی گئی ہے اور پھر میں ایل خان ہوں۔ دنیا کے تمام انسانوں سے عظیم تر، برتر۔ مجھے لافانی نیلے آسمان نے وہ قوت دی ہے جو دنیا بھر کی عورتوں کے لیے کافی ہے۔ اگر مجھ میں قوت کی کمی آگئی ہے تو مجھے اتنا اختیار بھی دیا گیا ہے کہ میں

ہندوستان سے وید کو بلوا کر اپنی عمر کو کئی سو سال آگے بڑھا دوں۔ میں جوانی کو بڑھاپے میں بدل سکتا ہوں۔"

کیخاتو خان نے رفیعہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"رفیعہ! تجھے خوش ہونا چاہیے کہ تو ایل خان ارغون کی محبوبہ ہے۔ اگر یہی باتیں پچاس ساٹھ سال پہلے کسی منگول حکمران یا شہزادے سے کسی عورت نے کہی ہوتیں تو وہ اسی وقت ناپید کردی جاتی لیکن اب ہم لوگ تمدن کی دنیا میں رہ بس گئے ہیں۔ ہمارے مزاج انہی جیسے ہوتے جارہے ہیں۔ بھائی ارغون نے تیری تلخ ترش باتیں بھی برداشت کرلیں، بس اسی کو غنیمت جان۔"

ارغون نے کیخاتو خان کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ "کیخاتو! کیا تو رفیعہ سے محبت کرتا تھا؟"

کیخاتو خان یہی سمجھ رہا تھا کہ ارغون کی نیت ٹھیک نہیں ہے اور وہ کیخاتو خان کو قتل کرنے کے بہانے تلاش کر رہا ہے۔ وہ ہاں یا نہیں کہتے گھبرا رہا تھا۔

ارغون نے کیخاتو خان کو تسلی دی۔ "کیخاتو خان! تو ڈر نہیں۔ خوف نہ کھا۔ میں جانتا ہوں کہ تو رفیعہ سے محبت کرتا ہے مگر میرے خوف یا احترام کی وجہ سے تو اس کا اقرار نہیں کرے گا۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "بھائی ارغون! میں جو کچھ چاہتا ہوں، اسے خوف سے زیادہ احترام روک رہا ہے۔"

ارغون نے رفیعہ سے پوچھا۔ "کیا تو بھی کیخاتو خان کو پسند کرتی ہے؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "خان محترم! آپ نے یہ بات دو سال پہلے کیوں نہیں پوچھی؟"

ارغون برداشتہ خاطر ہوگیا۔ "میں تجھ سے جو پوچھ رہا ہوں' بس اس کا جواب درکار ہے۔" رفیعہ خاموش ہوگئی۔

کیخاتو خان نے حوصلے سے کہا۔ "برادر محترم! آج میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں رفیعہ سے آج بھی محبت کرتا ہوں حالانکہ ہم دونوں کی مفارقت میں دو سال حائل ہوچکے ہیں۔"

ارغون مسکرا رہا تھا، اس نے ایک بار پھر رفیعہ سے سوال کیا۔ "اور تیرا کیا حال ہے رفیعہ؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "میں نے نہ تو اس سے دو سال پہلے محبت کی تھی اور نہ ہی آج کوئی گنجائش ہے، اس کے لیے میرے دل میں۔"

ارغون نے تحکمانہ شان سے کہا۔ "بہرحال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ تجھے میرا بھائی کیخاتو خان پسند کرتا ہے، اب میں تجھے کیخاتو خان کے حوالے کرتا ہوں۔"

لیکن رفیعہ نے جانے سے انکار کردیا۔ انتہائی حقارت سے کہا۔ "لیکن میں یہیں اسی محل میں رہوں گی خان کے پاس۔ میں کیخاتو خان کے پاس نہیں جاؤں گی۔ میں کیخاتو خان کو ذرا بھی پسند نہیں کرتی۔"

ارغون اور زیادہ برہم ہوگیا۔ "لڑکی! میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ تو کیخاتو خان کے پاس چلی جا۔ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔ اگر تو چپڑ چپڑ کرے گی تو میں رسیوں سے باندھ کر کیخاتو خان کے حوالے کردوں گا۔"

رفیعہ چپ ہوگئی۔ کیخاتو خان نے رفیعہ کے چہرے پر بے بسی اور مجبوری کے آثار دیکھ لیے تھے۔

ارغون کہتا رہا۔ "میرے لیے تہمینہ اس کی بہن ہی کافی ہے اور یارو! یہ کیسی بدمذاقی ہے کہ میں ایک ہی شکل وصورت کی دو لڑکیوں سے دل بہلاؤں۔ میں رفیعہ سے تھک چکا ہوں۔ میں اس کو اب برداشت نہیں کرسکتا۔ رفیعہ کو لے جا اور پھر کبھی اس کو میرے پاس ہرگز نہ لانا۔"

کیخاتو خان کھڑا ہوگیا اور رفیعہ سے کہا۔ "آ رفیعہ! چل میرے ساتھ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو میرے ساتھ نہیں بھی رہنا چاہے گی تو میں تجھ سے زبردستی نہیں کروں گا، تجھ کو تیری مرضی پر چھوڑ دوں گا۔"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "کیخاتو خان! اب تو میں اس ماحول کی اتنی عادی ہوچکی ہوں کہ اگر تو مجھے چھوڑ دے گا، تب بھی میں یہاں سے نہیں جاؤں گی اور پھر میری بہن تہمینہ کو ابھی محل ہی میں رہنا ہے۔ میں اگر محل سے کہیں دور جانا بھی چاہوں تو نہیں جاسکتی۔"

ارغون نے کہا۔ "یہاں زیادہ باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ بس جو ہونا تھیں ہوچکیں۔"

کیخاتو خان کھڑا ہوگیا، بولا۔ "محترم خان! اب میں جانا چاہتا ہوں۔"

وہ رفیعہ کو لے کر باہر نکلا اور گھوڑے پر بیٹھ کر قصر روانہ ہوگیا۔

زرافشاں رفیعہ کو دوبارہ دیکھ کر حیران رہ گئی، پوچھا۔ "خان! خیر تو ہے؟ یہ رفیعہ آپ کے ساتھ؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "آج کل بھائی ارغون مجھ سے بہت خوش رہتے ہیں، انہوں نے رفیعہ کو بخش دیا۔"

زرافشاں نے بے یقینی سے پوچھا۔ "سچ؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "سچ، بالکل سچ۔

ارغون کہتا ہے کہ تہمینہ اور رفیعہ ہم شکل ہیں اس لیے وہ تہمینہ کو اپنے پاس رکھے گا اور رفیعہ سے بیزار ہو کر میرے حوالے کر دیا۔"

زرافشاں رفیعہ کے سامنے تو کچھ بھی نہیں بولی، بس اتنا کہہ کر چلی گئی کہ خدا کرے آپ کی بات سچ ہو۔

کیخاتو خان نے رفیعہ سے پوچھا۔ "تجھے اس قصر کا کون سا کمرا پسند ہے؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "کوئی بھی نہیں۔ میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی، زبردستی بھیجی گئی ہوں۔ جو کمرا چاہیں دے دیں۔"

کیخاتو خان نے پوچھا۔ "وہ باغ کے برابر والا کیسا رہے گا؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے، وہ بھی ٹھیک ہے۔"

زرافشاں نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب وہ کمرا کیوں؟ اسے کسی بھی کمرے میں بسا دو۔"

رفیعہ نے زرافشاں کو گھور کر دیکھا مگر بولی کچھ بھی نہیں۔

کیخاتو خان رفیعہ کو لے تو آیا تھا لیکن اب اسے دو باتیں زیادہ پریشان کر رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ رفیعہ کو دو سال بعد جس حال میں اسے واپس کیا گیا تھا، وہ کیخاتو خان کی نظر میں ایسا تھا، جیسے نچوڑی ہوئی ہڈی کتے کے آگے ڈال دی جائے۔ دوسری یہ بات خاصی اذیت ناک تھی کہ رفیعہ اسے بالکل نہیں چاہتی تھی مگر اسے بخش دی گئی اور وہ اسے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھا۔

کیخاتو خان نے کچھ دنوں کے لیے خود کو فوجیوں میں مشغول کر لیا۔ وہ ہر روز اپنی افواج میں جاتا، اس کا نظم و نسق دیکھتا۔ فوجی منصب داروں سے باتیں کرتا۔ ان کے گھوڑوں اور ہتھیاروں کا معائنہ کرتا۔ یہاں اس نے ہتھیاروں کو زنگ آلود اور گھوڑوں کو کمزور نکما پایا۔ یہ انہی منگولوں کی باقیات تھیں جنھوں نے قراقرم سے نکل کر ایشیا اور یورپ کو روند ڈالا تھا۔ جن کی ترک تازیاں میلوں اور کوسوں میں نہیں، عرض البلد اور طول البلد میں ہوا کرتی تھیں۔ پہلے یہ وحشی تھے اور اب یہ متمدن ہوتے جا رہے تھے۔

کیخاتو خان کو اس وید اور اس کے کارنامے پر بھی سوچنا پڑ رہا تھا جو ہندوستان سے اس کے ایما پر آیا تھا اور جو اس راز سے واقف تھا کہ انسان کو صدیوں کس طرح زندہ رکھا جائے۔ اور یہ کہ بڑھاپے کو جوانی پر کس طرح مسلط کیا جائے۔ اب اس کی دلچسپیاں شاہی محل سے بھی وابستہ ہو گئی تھیں۔ وہ ہر روز پابندی سے اپنے بھائی ارغون کے پاس جانے لگا تھا وہ جب بھی جاتا ارغون اور ہندو وید کو یکجا پاتا۔ وہ دونوں معلوم نہیں کن امور پر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ہندوستانی تاجر جو کچھ دنوں ترجمان کے فرائض انجام دے چکا تھا، اپنا انعام لے کر چلا گیا تھا۔ اب وید اور ارغون براہ راست باتیں کرنے لگے تھے۔

کیخاتو خان بھی وید کی مزے دار باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے ایک دن وید اور بایدو کو کہیں جاتے دیکھا۔ کیخاتو خان نے یہ خبر ارغون کو پہنچا دی اور اپنا یہ شبہ ظاہر کیا کہ کہیں بایدو خان سے ساز باز کر کے ارغون کے خلاف کوئی منصوبہ تو نہیں بنا رہا۔ ارغون نے کیخاتو کی بات گرہ میں باندھ لی اور جب وید ارغون کے پاس آیا تو اس نے کیخاتو خان کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

ارغون کہہ رہا تھا۔ "کیخاتو خان کیا یہ درست ہے کہ تو بایدو خان سے رسم و راہ بڑھا رہا ہے؟"

کیخاتو خان نے کہا۔ "خان محترم! بایدو میرے چچا کا بیٹا ہے، اس سے ملنے میں حرج ہی کیا ہے؟"

ارغون غصے میں چیخنے لگا۔ "جانتا ہوں وہ تیرا بھائی ہے، تیرے چچا کا بیٹا ہے لیکن تو ولی عہد ہے۔ میرے بعد تجھ ہی کو حکومت سنبھالنی ہے۔ تجھ کو اس سے محتاط رہنا چاہیے کہ وہ خود بھی حکومت کا امیدوار ہے اور پھر میں خود بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے پاس اٹھنے بیٹھنے والے لوگ میرے عزیزوں اور رشتے داروں سے تعلقات قائم کریں۔" اس کے بعد اس نے ہندوستانی وِدوان سے پوچھا۔ "کیوں ہندی عالم! اس بارے میں تیرا علم کیا کہتا ہے؟"

ہندی وِدوان نے جواب دیا۔ "میرا علم بھی وہی کہتا ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ میرا علم کہتا ہے کہ حکمران کا کوئی رشتے دار نہیں ہوتا اور اس کو اپنے راز یوں چھپانا چاہئیں جس طرح بلی اپنی اجابت۔"

ارغون نے برا سا منہ بنا کر ہندی وِدوان سے پوچھا۔ "ہندی بزرگ! میں اپنے دونوں بیٹوں میں سے ولی عہد کس کو بناؤں؟"

ہندی عالم نے جواب دیا۔ "چھوٹے کو؟"

ارغون نے حیرت سے پوچھا۔ "بڑے کو کیوں نہیں؟ دنیا بھر میں قانون تو یہی ہے کہ بڑا بیٹا ولی عہد ہوتا ہے۔"

ہندی عالم نے جواب دیا۔ "جی خان محترم! لیکن ہمارا ہندی قانون چھوٹے کو ولی عہد قرار دیتا ہے کیونکہ ہمارے دھرم میں بڑے بیٹے کو شہوت کی اولاد کہا جاتا ہے اور چھوٹے کو غور و فکر اور منصوبے کی پیدائش مانا جاتا ہے اسی

لیے ہم چھوٹے بیٹے کو ولی عہد بناتے ہیں۔‘‘
ارغون اور کیخاتو خان ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہ گئے۔
ارغون نے پوچھا۔ ’’ہندی عالم! کیا تجھے سیاست بھی آتی ہے؟‘‘
ہندی عالم نے جواب دیا۔ ’’مجھے کیا نہیں آتا خان محترم! آپ مجھ سے بات تو کریں۔ مجھ سے مشورے تو لیں!‘‘
ارغون کو اس کی باتوں میں مزہ آرہا تھا، پوچھا۔ ’’ہندی عالم مجھے اپنے پڑوسی ملکوں سے کس قسم کے تعلقات رکھنا چاہئیں؟‘‘
ہندی عالم نے جواب دیا۔ ’’خان محترم! آپ کو اتنا طاقتور ہونا چاہیے کہ پڑوسی آپ سے مرعوب بلکہ خوفزدہ رہیں اور دوستی ہمیشہ دور کے طاقتور ملکوں سے رکھنا چاہیے تاکہ بیچ کے کمزور ملک آپ کے مطیع اور فرماں بردار رہیں۔‘‘
ارغون نے ایک نیا سوال کردیا۔ ’’ہندی عالم! پڑوس کے کئی ملک میرے ملک پر للچائی نظریں ڈال رہے ہیں، ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘
ہندی عالم گروشیو دیال جی نے جواب دیا۔ ’’خان محترم! آپ نے ہمیشہ ہتھیاروں سے جنگیں جیتی ہیں لیکن یہ تو کوئی کمال نہیں۔ اپنے دشمن کو حیلہ سازی سے زیر کرو۔ اگر آپ کو حیلہ سازی آتی ہے تو آپ کوتاہ قامت ہی کیوں نہ ہوں، رستم تک کو زیر کرلیں گے۔‘‘
کیخاتو خان نے پوچھا۔ ’’بعض لوگ غداری کر جاتے ہیں اور ملازمتیں چھوڑ کر دشمنوں کی چاکری میں چلے جاتے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے آخر؟‘‘
گروشیو دیال جی نے جواب دیا۔ ’’انسان کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ آدمی کسی کی نوکری نہیں کرتا، زر و مال کی نوکری کرتا ہے۔ یہ جس کے پاس زیادہ اور سریع الحصول ہو، آدمی وہیں چلا جائے گا۔‘‘
وہ دونوں ہندی وداوان سے روزانہ اسی قسم کے سوال کرتے اور ان کے دلچسپ اور معنی خیز جواب پاتے رہے اور چند دنوں میں ہی اس نے ارغون کے دل و دماغ پر اپنا قبضہ جمالیا اور اس کو یقین ہوگیا کہ یہ وید اسے ایسی ادویات تیار کردے گا جس سے وہ کئی سو سال تک زندہ اور جوان رہ سکے۔

☆☆☆

دونوں بھائیوں میں محبت اور خلوص جتنا بڑھ رہا تھا، سعداللہ یہودی کو اس سے اتنا ہی دکھ ہو رہا تھا۔ مسیحی اپنی طرف سے فکرمند تھے کیونکہ انہیں یہ بات معلوم تھی کہ کیخاتو خان اپنے بھائی تکودار کی طرح اسلام پر مائل ہے۔
سعداللہ یہودی نے ارغون خان کے لیے بڑی محنت کی تھی۔ اس نے جوینی اور تکودار کے خلاف ایک شاندار معرکہ مارا تھا اور اب اس کو کیخاتو خان ضائع کر رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ارغون یا تو یہودی دین اختیار کرے یا پھر عیسائی ہوجائے لیکن ارغون اپنا آبائی دین چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ سعداللہ، ارغون کی طرف سے مایوس ہوکر بایدو خان سے مل گیا۔ کبھی کبھی کیخاتو خان سے بھی میٹھی میٹھی باتیں کرکے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا۔ کمزور ارغون نے جب ہندی وید کو بلوایا تو وہ سعداللہ یہودی سے اور زیادہ دور ہوگیا۔ اب وہ گروشیو دیال سے بھی حسد کرنے لگا۔
اسی دوران جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ارغون نے رفیعہ کو کیخاتو کو واپس کردیا ہے تو حسد نے اور زور مارا اور اس نے سوچا کہ اگر رفیعہ کیخاتو خان کو واپس کی جاسکتی ہے تو تہمینہ بھی سعداللہ کے حوالے کی جاسکتی ہے۔ پہلے کچھ دنوں تک تو سعداللہ کو اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا کہ رفیعہ کیخاتو خان کو واپس کی جاچکی ہے۔ اس کی عقل یہ بات ماننے کو تیار ہی نہ تھی کہ ارغون خان جیسا عورتوں کا حریص کسی لڑکی یا عورت کو واپس بھی کرسکتا ہے۔ اس نے اس کا ذکر بایدو سے کیا۔ بایدو خان نے اس کی تصدیق کردی مگر چالاک یہودی نے اس تصدیق پر بھی اعتبار نہیں کیا۔ اب وہ اس کی تصدیق کیخاتو خان سے کرنا چاہتا تھا۔
کیخاتو خان ابھی اپنے قصر سے نکلا نہیں تھا کہ سعداللہ یہودی اس کی خیریت معلوم کرنے پہنچ گیا۔ کیخاتو اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا لیکن مہمان نوازی کے خیال سے اس کو بٹھایا اور دودھ اور پھلوں سے اس کی تواضع کی۔ سعداللہ نے کمرے کے مشجر پردوں کو بہت پسند کیا۔ پردوں پر سبز پودے اور درخت بنے ہوئے تھے اور ان پودوں اور درختوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو بیٹھا دکھایا گیا تھا۔ سعداللہ نے کہا۔ ’’محترم کیخاتو خان! میں ان پردوں کی کس زبان سے تعریف کروں، بہت خوب صورت ہیں۔ یہ کہاں کے بنے ہوئے ہیں؟‘‘
کیخاتو خان نے جواب دیا۔ ’’دمشق کے، کیونکہ وہاں کے کاریگروں کا جواب نہیں۔‘‘
سعداللہ دیر تک ان پردوں کی تعریفیں کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک دم گریز کیا اور سپہ سالاری کا ذکر چھیڑ گیا۔ ’’کیخاتو محترم! حالانکہ یہ مبارکباد مجھے بہت دن پہلے دینا تھی

لیکن مصروفیات نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ بہرحال سپہ سالاری کی مبارکباد قبول ہو۔"

کیخاتو نے کہا۔ "سپہ سالاری تو تھی ہی میری، ملی دیر میں...... اتنے دنوں بھائی ارغون معلوم نہیں کیا سوچتے رہے۔"

سعد اللہ نے کہا۔ "خان محترم میں ساری صلاحیتیں موجود ہیں مگر قوتِ فیصلہ ذرا کمزور ہے۔ میں تو بار بار اور تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن انہیں باور کراتا رہتا ہوں کہ آپ اپنی قوتِ فیصلہ کو تیز کریں۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "بھائی ارغون اور قوتِ فیصلہ...... خوب! آخر آپ کس مرض کی دوا ہیں؟ وہ خود فیصلے کیوں کریں؟"

سعد اللہ نے کہا۔ "لیکن کیخاتو محترم! میں ان کے ذاتی معاملات میں کیونکر دخل دے سکتا ہوں؟ اب انہوں نے رفیعہ کو دو سال بعد آپ کو واپس کر دیا۔ اگر وہ اس سلسلے میں مجھ سے بات کرتے تو میں انہیں کیا مشورہ دیتا۔"

کیخاتو خان قائل ہو گیا، بولا۔ "لیکن میں حیران ہوں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

سعد اللہ ہنسنے لگا۔ "ایسا کیا کیوں؟ یہ مت سوچیے، یہ مت پوچھیے، میں تو یہ کہتا ہوں کہ دو سال پہلے جب وہ رفیعہ کو یہاں سے لے گئے تھے تو کیوں لے گئے تھے؟ انہیں اپنے بھائی کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

کیخاتو خان نے پوچھا۔ "تیری تہمینہ کا کیا ہوا؟"

سعد اللہ نے سرد آہ بھری۔ "کیا پتا کیا ہوا؟ بہرحال مجھے تو ابھی تک وہ ملی نہیں۔"

کیخاتو خان نے کہا۔ "مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ دونوں بہنیں چونکہ ہم شکل تھیں اس لیے کم عمر کو اپنے پاس رکھ لیا اور زیادہ عمر والی کو میرے حوالے کر دیا۔"

سعد اللہ جذباتی ہو گیا۔ "لیکن بڑے آدمیوں میں رکھ رکھاؤ ضرور ہونا چاہیے۔"

کیخاتو خان ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ سعد اللہ کے معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

لیکن سعد اللہ بھرا ہوا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔ "حالانکہ میں وہ آدمی ہوں جس نے ارغون خان کو حکومت دلائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے اس کے کردار اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کی۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ میں ارغون خان کی جگہ آپ کو حکمران بنا دیتا اور یہ میرے لیے بہت آسان تھا۔"

کیخاتو خان نے کہا۔ "بڑے بھائی کی موجودگی میں، میں کس طرح حکومت کر سکتا تھا۔ وہ میرے اور ہم سب کے بادشاہ ہیں اور ہم سب ان کی رعایا ہیں اور رعایا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے بادشاہ کو ہدفِ ملامت بنائے۔"

سعد اللہ نے احتیاط اختیار کی، بولا۔ "بیشک، ہم سب خان کی رعایا ہیں لیکن اگر کبھی کوئی موقع ہاتھ آئے تو آپ محترم خان سے تہمینہ کا ذکر ضرور کیجیے گا اور کہیے گا کہ اگر وہ بھی واپس مرحمت کی جائے تو عین نوازش ہوگی اور میں زندگی بھر خان محترم کو دولت و اقبال کی دعائیں دیتا رہوں گا۔"

کیخاتو خان نے مشورہ دیا۔ "خیر میں خود تو اس سلسلے میں ارغون بھائی سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر تو پسند کرے تو ہندوستانی عالم کو پکڑ لے اور یہی بات اس سے کہلوا دے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ترکیب سے تیرا کام ضرور بن جائے گا۔"

سعد اللہ نے کہا۔ "میں اس ہندوستانی سے کئی بار مل چکا ہوں۔ آدمی کیسا ہے؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "آدمی بہت اچھا ہے اور اس کے علم و دانش کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔"

سعد اللہ کو ترکیب جو معلوم ہوئی تو وہ وہاں پھر نہیں رکا۔ اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا، بولا۔ "اچھا پھر ملوں گا آپ سے۔ اس وقت تو میں اس ہندوستانی عالم کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

کیخاتو خان سعد اللہ کے چلے جانے کے بعد خوب خوب ہنسا۔ اپنے آپ سے بولا۔ "بہت چالاک سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ میں نے وہ ڈنک مارا ہے کہ زندگی بھر خوار اور تڑپتا رہے گا۔"

اندر رفیعہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ کیخاتو اندر پہنچا تو رفیعہ نے پوچھا۔ "یہ سعد اللہ کیا لینے آیا تھا؟"

کیخاتو نے جواب دیا۔ "وہ نہ لینے آیا تھا نہ دینے آیا تھا، بس یوں ہی چلا آیا تھا۔"

لیکن رفیعہ شاید کیخاتو خان کی باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ رفیعہ کے پاس سے ہٹا تو زرافشاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ زرافشاں نے بھی وہی سوال کیا۔ "یہ سعد اللہ یہاں کیوں آیا تھا؟"

کیخاتو نے جواب دیا۔ "وہ میرے ذریعے بھائی ارغون سے تہمینہ کو واپس لینا چاہتا ہے۔ کہتا تھا سفارش کر دو۔"

زرافشاں نے پوچھا۔ "پھر آپ نے کیا کہا؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ دیا کہ جو کچھ کرنا ہے خود کرو۔ اس میں دوسروں کو نہ ڈالو۔"

زرافشاں بہت بے چین تھی، پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

آگے کیا ہوا؟‘‘

کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ’’پھر آگے کیا ہوتا، میں نے اس کو گروشیودیال کے حوالے کردیا۔‘‘

زرافشاں نے کہا۔ ’’آپ نے بہت اچھا کیا اور آئندہ آپ اسے بٹھائیے گا بھی نہیں۔‘‘

کیخا تو خان قصر میں کچھ دیر رک کر اپنے بھائی ارغون کے پاس روانہ ہوگیا۔ اب وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ سعداللہ نے اور کیا کیا اور اگر ہندوستانی عالم نے اس کی سفارش کر بھی دی، تو اس کا ردعمل کیا ہوا؟

ہندوستانی وِدوان نے اپنا کام شروع کردیا تھا۔ وہ مراغہ اور اس کے مضافات میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ ارغون کے غلام اس کے ساتھ ساتھ چل پھر رہے تھے۔ اسے تھوہڑ کی سخت تلاش تھی اور وہ تھوہڑ کی تلاش میں میلوں گھوم پھر آیا مگر وہ نہیں ملا۔

ایک دن اس نے ایک چرواہے کو مویشیوں کا ریوڑ لے جاتے دیکھا تو اس کو روک لیا اور پوچھا۔ ’’کیا تو نے اس علاقے میں تھوہڑ کہیں دیکھا ہے؟‘‘

چرواہے نے جواب دیا۔ ’’تقریباً بیس میل یعنی سات فرسخ۔ قریب قریب۔‘‘

گروشیودیال نے کہا۔ ’’میں تجھے اپنے ساتھ لے چلوں گا اور انعام و اکرام بھی دلواؤں گا۔ تو چلے گا نا ہمارے ساتھ؟‘‘

چرواہا عذر کرنے لگا لیکن خان کے آدمیوں نے اسے گدی سے پکڑ کر گھوڑے پر ڈال لیا اور اس کی راہنمائی میں وہاں تک پہنچ گئے جہاں تھوہڑ کے درختوں کی بہتات تھی۔

گروشیودیال جی نے تھوہڑ کے پتوں کو توڑا تو اس میں سے سفید سفید دودھ نکلنے لگا۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس نے بہت سارے تھوہڑ توڑ کر ایک گٹھڑی سی باندھ لی اور چرواہے کو جہاں سے پکڑا تھا، وہیں پہنچا دیا۔ اسے چند سکے بھی دیے اور کہا۔ ’’چرواہے! اب مجھے تھوہڑ کی وہ قسم درکار ہے جس میں سے سفید دودھ کے بجائے سرخ دودھ نکلتا ہے۔‘‘

چرواہے نے جواب دیا۔ ’’جنابِ والا! میں نے آج تک ایسا تھوہڑ نہیں دیکھا جس میں سے سفید دودھ کے بجائے سرخ دودھ نکلتا ہو۔‘‘

گروشیودیال جی بضد رہے۔ ’’بہرحال کل مجھے تیری ضرورت ہے، میں تیرا انتظار کروں گا۔‘‘

چرواہا روہانسا ہوگیا۔ ’’چرواہے! میں طبیب ہوں، بادشاہ کے لیے دوائیں تیار کررہا ہوں۔ اگر تو نے مجھ سے تعاون نہ کیا تو بادشاہ تجھ کو وہ سزا دے گا کہ یاد کرے گا۔‘‘

چرواہا تیار ہوگیا، اس کے بعد وہ کئی دن تک سرخ دودھ والے تھوہڑ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے مگر ناکام رہے۔ آخر اس کام کا بیڑا سعداللہ نے اٹھایا اور کہا۔ ’’میں اس تھوہڑ کو اپنے خان کے لیے ضرور تلاش کرلوں گا۔‘‘

اور پھر سعداللہ بھی عاجز آگیا۔ اس نے گروشیودیال جی سے پوچھا۔ ’’گرو جی! کیا ایسا تھوہڑ ہوتا بھی ہے جس سے سرخ دودھ نکلتا ہو؟‘‘

گروشیو دیال جی نے جواب دیا۔ ’’ہوتا تو ہے، ہندوستان میں مل جاتا ہے لیکن اس میں دو ڈھائی سال ضائع ہوجائیں گے۔‘‘

سعداللہ نے پوچھا۔ ’’اور اس دوا کے بغیر ارغون خان کی زندگی کتنی ہے؟‘‘

شیودیال جی نے سعداللہ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی، پوچھا۔ ’’اس سوال سے تیرا مطلب؟‘‘

سعداللہ نے عرض کیا۔ ’’صرف یہ کہ کیا ارغون خان اتنے دنوں اس دوا کا انتظار کرسکیں گے؟‘‘

شیودیال جی نے جواب دیا۔ ’’نہیں، وہ اتنے دن نہیں جی سکیں گے۔‘‘

سعداللہ نے سرگوشی میں سمجھایا۔ ’’ہندوستانی دوست! اگر آپ ارغون خان کو اصل حقیقت بتا دیں گے تو وہ سرخ دودھ والے تھوہڑ کی تلاش میں ادھر ادھر اتنا بھگائے گا کہ آپ اپنی زندگی سے بیزار ہوجائیں گے، آپ کو وہ ہندوستان بھی نہیں جانے دے گا۔‘‘

شیودیال جی فکرمند ہوگئے، بولے۔ ’’اچھا، یوں بھی ہوسکتا ہے؟‘‘

سعداللہ نے جواب دیا۔ ’’بالکل، یوں بھی ہوسکتا ہے۔ یہ جبر کی سرزمین ہے۔ یہاں رشتوں اور محبتوں کی بات نہیں ہوتی، یہاں حکم چلتا ہے اور صرف اپنے مطلب کی بات کی جاتی ہے۔ آپ خود کو اس مصیبت سے کس طرح نکالیں گے، میرے پاس اس کی بھی ایک ترکیب ہے۔‘‘

شیودیال جی نے پوچھا۔ ’’کون سی ترکیب، مجھے ضرور بتا۔‘‘

سعداللہ نے جواب دیا۔ ’’ان سفید دودھ والے تھوہڑوں سے بہت سارا دودھ نکال کر اس میں انسانی خون شامل کرکے سرخ بنا دیں۔‘‘

شیودیال جی کو یہ ترکیب بہت پسند آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’تو ٹھیک کہتا ہے، مجھے یہ تجویز منظور ہے۔‘‘

اسی دن اعلان کردیا گیا کہ سرخ دودھ والا تھوہڑ مل گیا۔

بہت سارا عام تھو ہڑ تڑوا کر شاہی محل کے اس حصے میں پہنچا دیا گیا جہاں شیو دیال جی کو ٹھہرایا گیا تھا۔

خان ارغون خان نے ان جڑی بوٹیوں کا خود معائنہ کیا اور بہت خوش ہوا، پوچھا۔ ''اب یہ دوائیں کب تک تیار ہوجائیں گی؟''

گروشیو دیال جی نے فرمایا۔ ''بندہ پرور! ابھی اس میں دو جز و اور پڑیں گے اور ان دو میں سے ایک جز و بہت ضروری ہے۔ اس جز و کی فراہمی بھی ایک بادشاہ ہی کر سکتا ہے، ہر شخص نہیں۔''

ارغون خان نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ ''کون سا جزو؟ اور اس کی حصولیابی میں کیا دشواری پیش آئے گی؟''

گروشیو دیال نے کہا۔ ''جناب والا! میری ان جڑی بوٹیوں کو انسان کے دو بچوں کا خون درکار ہوگا اور یہ کہاں سے ملے گا؟ کون دے گا؟''

ارغون نے ہنس کر جواب دیا۔ ''یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے؟ کل تجھے یہ جز و بھی فراہم کر دیا جائے گا۔''

سعداللہ اپنی جگہ خوش تھا کہ گروشیو دیال اور ایل خان نے اس کی تجویز مان لی تھی۔

دوسرے دن دو لڑکوں کا خون بھی فراہم کر دیا گیا اور جملہ جڑی بوٹیوں کو اس خون میں ڈبو دیا گیا۔

اب سعداللہ گروشیو دیال سے اپنی بات کرنا چاہتا تھا۔ جب شیو دیال جی ان ادویات کو خون میں جوش دینے لگے تو سعداللہ نے ان سے کہنا شروع کیا۔ ''گرو جی محترم! آپ مجھ کو کب سے دیکھ رہے ہیں؟''

گروشیو دیال جی نے جواب دیا۔ ''جب سے میں یہاں آیا ہوں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔''

سعداللہ نے پوچھا۔ ''میں کیسا آدمی ہوں؟ وفادار یا بے وفا، غدار؟''

شیو دیال جی نے جواب دیا۔ ''ابھی تک تو میں نے تجھ کو اچھا، اور وفادار ہی پایا ہے۔ اندر کا حال ایشور جانے۔''

سعداللہ نے جلدی جلدی کہا۔ ''میں اندر سے بھی ایسا ہی ہوں۔'' پھر کچھ دیر چپ رہ کر بولا۔ ''گرو جی! میں خان ارغون خان کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں مگر ہمت نہیں پڑتی۔ اگر آپ اس کو پیش کر دیں اور منظور کرا دیں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔''

دوائیں آگ پر ابل رہی تھیں اور شیو دیال جی کی پوری توجہ ان ادویات پر تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''اپنا مقصد بیان کر۔''

مختصر مختصر

بوڑھا مریض۔ ''ڈاکٹر صاحب! میری دائیں ٹانگ میں بہت درد ہے۔''

ڈاکٹر۔ ''بڑے میاں! یہ عمر کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔''

مریض۔ ''لیکن میری دوسری ٹانگ بھی اسی عمر کی ہے۔''

☆☆☆

بازار سے واپسی پر بیوی نے شوہر کو بتایا۔ ''گاڑی کے بونٹ پر ذرا سی خراش آگئی ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو ایک نظر دیکھ لینا، بونٹ ڈکی میں رکھا ہے۔''

☆☆☆

جب حمید کا انتقال ہوا تو اس کا دوست حمید کی بیوی کے پاس پہنچا اور بولا۔ ''کیا میں حمید کی جگہ لے سکتا ہوں؟''

''ہاں! مجھے کوئی اعتراض نہیں، البتہ گورکن سے پوچھ لو۔'' بیوی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

حل

ایک عورت دکاندار سے۔ ''مجھے اپنے شوہر کے لیے کلف لگے کالر چاہئیں......''

دکاندار بات کاٹ کر۔ ''نمبر بتائیے۔''

عورت پریشان ہوکر۔ ''نمبر تو مجھے یاد نہیں مگر میرا ہاتھ اس کی گردن پر پورا آتا ہے۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

نشریات

ایک شخص نے اپنے ایک دوست سے جو ریڈیو اسٹیشن میں ملازم تھا، پوچھا۔ ''آپ کے پاس تو مختلف طبقوں کی سروے رپورٹس آتی ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ عام طور پر شوہر حضرات کو کس قسم کے پروگرام پسند ہوتے ہیں؟''

دوست نے جواب دیا۔ ''ایک مرتبہ ہم نے ٹیلی فون پر ایک ہزار شوہروں سے دریافت کیا کہ اس وقت آپ کیا سن رہے ہیں تو نو سو بچانوے افراد کی طرف سے جواب ملا...... اپنی بیوی کو۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

سعداللہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''استاد من! دو سال پہلے ارغون خان کو تہمینہ نامی ایک لڑکی پسند آ گئی تھی۔ یہ لڑکی میرے پاس تھی، ارغون خان نے اسے مجھ سے لے لیا۔ تہمینہ کی ایک بہن رفیعہ کیخاتو خان کے پاس تھی، ارغون نے اسے بھی لے لیا۔ اب دو سال بعد کیخاتو خان کی رفیعہ کو تو واپس کر دیا مگر تہمینہ ابھی تک شاہی محل ہی میں ہے۔ اگر آپ کوشش کریں تو تہمینہ مجھے واپس مل سکتی ہے۔''

گرو شیو دیال جی نے سنا تو بڑی توجہ سے مگر ظاہر یوں کیا گویا کچھ سنا ہی نہیں، پوچھا۔ ''تو کیا چاہتا ہے؟''

سعداللہ نے جواب دیا۔ ''ہندی استاد! کیا آپ نے میری روداد سنی نہیں؟''

شیو دیال جی نے کہا۔ ''سنی کیوں نہیں، مگر ایک بار اور بتا دے کہ تو چاہتا کیا ہے؟''

سعداللہ نے عرض کیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تہمینہ مجھے واپس مل جائے۔''

شیو دیال جی حیران تھے کہ ارغون خان کا وزیر ان سے سفارش کروا رہا ہے، انہوں نے پوچھا۔ ''تو ارغون خان کا وزیر ہے؟''

سعداللہ نے جواب دیا۔ ''ہاں ہندی استاد! میں ارغون خان کا وزیر ہوں۔''

شیو دیال جی نے کہا۔ ''تب پھر یہ بات مجھ سے کیوں کر رہا ہے؟ منگول راج کا پردھان منتری اپنے بادشاہ کو خود راضی نہیں کر سکتا؟''

سعداللہ نے جواب دیا۔ ''ہندی استاد! یہ میرا معاملہ نہ ہوتا تو میں آزادی اور دلیری سے بات کر سکتا تھا۔''

شیو دیال جی نے کہا۔ ''تب پھر پردھان منتری جی میرا جواب بھی سن لو۔ میں تمہارے بادشاہ کا بلایا ہوا، ہندوستان جیسے دور دراز ملک سے آیا ہوں۔ میں دولت کمانے آیا ہوں، ابھی مجھے نہیں معلوم کہ تیرا بادشاہ میرے کام کا کیا صلہ دے گا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں کوئی کام مفت نہیں کروں گا۔ تو اگر اپنا کام کرانا چاہتا ہے تو اس کے لیے میں تجھ سے پانچ سیر سونا لوں گا۔ یہ میرا ذمہ کہ تیرا کام ہو جائے گا۔''

شیو دیال نے تیز آنچ کو کم کر دیا۔ بولے۔ ''ارے میں نے ادھر تو توجہ ہی نہیں دی۔ تیز آنچ میں دوائیں جلی جا رہی تھیں۔''

سعداللہ نے جواب دیا۔ ''میں پانچ سیر سونے کا انتظام کر دوں گا لیکن میرا کام ہو جانا چاہیے۔''

شیو دیال جی نے بے مروتی اختیار کی، بولے۔ ''اجرت پیشگی، کام بعد میں۔''

سعداللہ اسی وقت اپنے گھر گیا اور پانچ سیر سونا شیو دیال جی کے حوالے کیا، پوچھا۔ ''میرا کام کب تک ہو جائے گا؟''

شیو دیال جی نے سونے کے ڈلے سعداللہ کی طرف پھینک دیے، بے غرضی سے کہا۔ ''کام دو چار دن میں نہیں، دس بارہ دن میں ہوگا۔ اگر تو مجھ پر اعتبار کرے گا تو میں سونے کے ڈلے رکھ لوں گا، ورنہ یہ تیرے ہیں، واپس لے جا۔''

سعداللہ نے سونے کے ڈلے اٹھا کر دوبارہ شیو دیال جی کے حوالے کر دیے، کہا۔ ''استاد! مجھے جلدی نہیں ہے۔ دس بارہ دن، پندرہ دن جتنے بھی لگیں، مجھے کوئی جلدی نہیں ہے لیکن یہ کام ہونا چاہیے۔ اگر کام پانچ سات دن میں ہو جائے تو میں اور سونا پیش کر سکتا ہوں۔''

شیو جی نے پوچھا۔ ''اور کتنا سونا دے سکتا ہے تو؟ اگر اس میں دو سیر کا اضافہ ہو جائے تو میں دوسروں کے کام روک کر تیرا پہلے کر دوں گا۔''

سعداللہ بھاگا بھاگا گھر گیا اور دو سیر سونا اور تلے آیا۔ سیر سیر بھر کے دو ڈلے لیے شیو دیال جی کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ''گویا اب میرا کام پانچ سات دن میں ضرور ہو جائے گا۔''

شیو دیال جی نے سونے کے جملہ ڈلے یوں ہی پڑے رہنے دیے اور کہا۔ ''اب تو جا سکتا ہے۔ ایشور نے چاہا تو تیرا کام پانچ سات دن میں ضرور ہو جائے گا۔''

سعداللہ چلا گیا۔ شیو دیال جی نے سونے کے ڈلے ایک پوٹلی میں باندھ کر صندوق میں بند کر دیے۔

ارغون خان نے جب سے یہ سنا تھا کہ گرو شیو دیال نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، وہ بہت خوش نظر آنے لگا تھا۔ وہ جب تب شیو دیال جی کے پاس چلا آتا اور دیگ میں ابلتی ہوئی ادویات کی خوشبو سونگھتا رہتا۔ اس کے جسم میں خوشی خون اور ہوا کی طرح دوڑ رہی تھی۔ اس دوران شیو دیال جی سفوف کی کئی پڑیاں تیار کر چکے تھے۔ وہ ان پڑیوں کو ارغون کے سامنے رکھ دیتے اور کہتے۔ ''یہی وہ سفوف ہے جو آپ کو جوان کر دے گا۔ پہلے میں آپ کو ان ادویات کے پانی سے نہلاؤں گا۔ اس کے بعد ایک ہفتے تک یہ سفوف پھنکواؤں گا اور آپ دوبارہ جوان ہونے لگیں گے۔''

ارغون خان خوشی سے پاگل سا ہو جاتا، کہتا۔ ''میں وہ کام کر رہا ہوں جو میرے آباؤ اجداد بھی نہ کر سکے۔ میں اپنے خاندان کا عظیم ترین انسان ہوں۔ اتنا عظیم کہ جو کام خان

اعظم چنگیز خان بھی انجام نہ دے سکا، میں پورا کروں گا۔''

ایک دن شیودیال جی نے ارغون خان کو سمجھایا۔

''خانِ محترم! میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ کیمیا کی قسم کا ایک فن ہے، ایک علم ہے، ایک ودیا ہے اور اس ودیا کا نام رسائن ہے۔ میں نے رسائن کی ودیا اس فن کے مشہور زمانہ گرونا گار جن کی کتابوں سے حاصل کی ہے۔ گرونا گارجن سومنات کے قریب قلعہ دیہک کے رہنے والے تھے اور اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ جب میں اپنے نسخوں سے آپ کو نہلاؤں گا اور سفوف کھلاؤں گا تو آپ کیسے جوان ہوجائیں گے۔ آپ کے سفیدی کی طرح مائل سرمئی بال نوجوانوں کی طرح سیاہ چمکدار اور گھنے ہوجائیں گے۔ مضمحل حواس میں تیزی اور شیر جیسی چستی اور قوت آجائے گی اور اس حال میں آپ صدیوں زندہ رہیں گے۔''

ارغون خان نے کہا۔''اوراے ہندی عالم! میں بھی تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تجھے مال مال کر دوں گا اور تجھے تیرے وزن کے مطابق سونا دوں گا۔''

شیودیال جی نے کہا۔''خان! اب میں خواب میں ان روحوں کا انتظار کرتا ہوں جو مجھے یہ بتائیں گی کہ میں آپ کا علاج کس دن سے شروع کروں اور وہ میری کتنی مددگار ثابت ہوں گی۔''

ارغون نے پوچھا۔''یہ روحیں کس کی آتی ہیں؟''

شیودیال جی نے جواب دیا۔''بھاری جی کی جو اجین کا رہنے والا تھا اور مہاراجا بکرما دتیہ کا ہم عصر تھا۔ جو رسائن کے فن میں یکتا تھا اور اس عورت کی روح جس کا نام راجیشوری تھا اور جس نے علم رسائن کے تجربے کے لیے بھاری کو اپنی ساری دولت دے دی تھی۔ سومنات کے ناگار جن کی روح، جس کی کتابوں سے میں نے یہ فن، یہ علم سیکھا ہے۔ یہ عالمِ رویا میں میرے پاس آتی ہیں اور ہدایتیں دے کر چلی جاتی ہیں۔ اس کے بعد میں علاج شروع کرتا ہوں اور کامیابی حاصل کرتا ہوں۔''

ارغون خان علاج کے لیے بے چین تھا۔ وہ طویل العمری اور جوانی کی خاطر دیوانہ ہوا جا رہا تھا، پوچھا۔''یہ روحیں کب تک آئیں گی؟''

شیودیال جی نے جواب دیا۔''میں گیان دھیان میں لگا ہوا ہوں، امید ہے کہ دو چار دن میں یہ روحیں ضرور آجائیں گی۔''

اس بات کے تیسرے روز یہ روحیں خواب میں آگئیں اور انہوں نے خواب میں جو ہدایات دیں، شیودیال جی انہیں بتاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔

جب ارغون خان شیودیال جی سے روحوں کی ہدایات سننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا، مدتوں بعد شمس الدین جوینی کیخاتو خان کے ساتھ ارغون خان سے ملنے آیا۔ جوینی نے ارغون خان کو شیودیال جی کے روبرو سر جھکائے بیٹھے جو دیکھا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔

کیخاتو خان نے بہ آوازِ بلند ارغون خان سے کہا۔

''برادرِ محترم! جوینی آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

ارغون خان نے آنکھیں کھول دیں اور جوینی کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔''جوینی! تو اتنے دنوں کہاں رہا؟''

جوینی نے جواب دیا۔''محترم خان! جب میں نے خود کو حکومت کے لائق نہیں سمجھا تو عزلت نشینی اختیار کرلی اور میری صلاحیتیں زنگ خوردہ ہوکر رہ گئیں۔''

ارغون خان نے پوچھا۔''اس وقت یہاں میرے پاس کیوں آیا ہے؟''

جوینی نے جواب دیا۔''محترم خان! میں دو چار ماہ کے لیے بغداد جانا چاہتا ہوں، اس سلسلے میں مجھے آپ کی اجازت درکار ہے۔''

ارغون خان نے کہا۔''تو جاسکتا ہے جہاں بھی جانا چاہے، بغداد، دمشق، حلب، بعلبک جہاں بھی جانا چاہے بشوق جاسکتا ہے۔''

اس وقت وہاں ادویات کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور کئی قسم کے سفوف پڑیوں میں باندھے جا رہے تھے۔ جوینی نے ان ادویات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔''یہ سب کیا ہے خانِ محترم؟''

ارغون قہقہہ مار کر ہنس دیا، بولا۔''ان ادویات اور سفوف میں میری کئی سو سالہ زندگی قید ہے اور میں عنقریب کڑیل نوجوان ہوجاؤں گا اور کئی سو سال تک زندہ رہوں گا۔''

جوینی کو ہنسی آگئی، بولا۔''خوب، خوب!''

کچھ دیر بعد جب کیخاتو خان جوینی کو چھوڑنے کے لیے باہر گیا تو جوینی نے بڑے افسوس سے کہا۔''یہ ارغون خان کو آخر ہو کیا گیا ہے؟''

کیخاتو خان نے جواب دیا۔''وہ کئی سو سال تک زندگی اور شباب چاہتے ہیں۔ اس ہندوستانی عالم نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے فن رسائن کے زور سے ایسا کردے گا۔''

جوینی معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔''تب پھر میں ابھی بغداد نہیں جاؤں گا اور شہزادہ کیخاتو خان! آپ اقتدار سنبھالنے کی تیاری کیجیے۔ ارغون خان کی زندگی بہت کم رہ

گئی ہے۔''

کیخا تو خان نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ ''خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔''

ان مختصر مکالموں کے بعد جوینی اپنی راہ چلا گیا اور کیخا تو خان دوبارہ ارغون خان کے پاس مؤدب بیٹھ گیا۔ اس وقت شیودیال جی فرما رہے تھے۔ ''خان محترم! رات تینوں روحیں ایک ساتھ میرے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اپنے خان سے کہو کہ وہ کسی تہمینہ نامی لڑکی کو اپنے پاس جبراً رکھے ہوئے ہے۔ اب وہ جس دن اس لڑکی کو اپنے محل سے نکال دے گا، وہی دن علاج کے لیے مناسب ترین دن ہوگا۔''

ارغون خان نے حیرت سے پوچھا۔ ''تینوں روحوں نے یہ کیا کہا ہے؟ لیکن میں نے تہمینہ کو جبراً نہیں روکا ہے، وہ اپنی خوشی سے میرے پاس رہ رہی ہے اور شاید وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے۔''

شیودیال جی نے کہا۔ ''خان جی! میں نے جو کچھ خواب میں سنا تھا، آپ کے گوش گزار کر دیا۔ یوں میں آج پھر ان تینوں روحوں کو بلا کر ان سے ان کا قطعی فیصلہ معلوم کروں گا۔''

ارغون خان نے کہا۔ ''یوں میں اس پر بھی آمادہ ہوں کہ اگر وہ تینوں روحیں یہی چاہتی ہیں کہ میں تہمینہ کو اپنے محل سے نکال دوں تو میں تہمینہ کو سعد اللہ یہودی کے حوالے کر دوں گا کیونکہ تہمینہ مجھے اسی سے ملی تھی۔''

شیودیال جی نے کہا۔ ''کیا میں ایک بار اس دیوی کے درشن کر سکتا ہوں جس کا نام تہمینہ ہے؟ میں اس سے اس کی مرضی معلوم کروں گا اور پھر تینوں روحوں سے بحث کروں گا اور ان کا جو آخری فیصلہ ہوگا اس سے آپ کو مطلع کر دوں گا۔''

ارغون نے اسی وقت تہمینہ کو بلوا لیا اور کہا۔ ''تہمینہ موجود ہے۔ تو اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتا ہے پوچھ لے۔''

شیودیال جی نے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے مجھے تخلیہ درکار ہوگا چند لمحوں کے لیے..... کیونکہ لڑکی سب کے سامنے اپنے من کی بات نہیں کر سکے گی۔''

ارغون اور کیخا تو خان وہاں سے ہٹ گئے۔ کیخا تو خان اس ہندوستانی ودوان کی اقبال مندی پر رشک کر رہا تھا۔ اس نے ارغون خان کو مٹھی میں لے لیا تھا۔

کچھ دیر بعد شیودیال جی، ارغون خان اور کیخا تو خان کے پاس خود ہی پہنچ گئے اور کہا۔ ''خان جی! آپ کو مبارک ہو۔ تہمینہ آپ سے پریم کرتی ہے اور وہ کسی جبر سے محل میں نہیں رہ رہی ہے۔ اب میں تینوں روحوں کو ایمانداری سے بتا سکوں گا کہ تہمینہ اپنی خوشی سے آپ کے پاس رہ رہی ہے، اسے بادشاہ سے جدا نہ کیا جائے۔''

ارغون خان کی جان میں جان آئی اور وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے شیودیال جی کی عزت کرنے لگا۔

دوسرے دن خواب میں تینوں روحوں نے شیودیال جی کو یہ کہہ کر خوش کر دیا کہ وہ خود جہاں رہنا چاہے رہے، اس پر جبر ہرگز نہ کیا جائے۔

ارغون نے پوچھا۔ ''پھر میرا علاج کب شروع ہوگا؟''

شیودیال جی نے جواب دیا۔ ''پرسوں سے کیونکہ رسائن کی تینوں روحوں نے یہی دن مقرر کیا ہے آپ کے علاج کے لیے۔''

ارغون خان کیخا تو خان کو اپنے محل میں لے گیا اور کہا۔ ''جب میں پھر سے نوجوان ہو جاؤں گا اور میری زندگی کئی سو سال کی ہو جائے گی تو میں تہمینہ کو بھی انہی ادویات سے نہلواؤں گا اور انہی سفوف کو کھلواؤں گا۔''

جب یہ باتیں مشہور ہوئیں اور سعد اللہ کے کانوں تک پہنچیں تو وہ نہایت برہم شیودیال جی کے پاس پہنچا، پوچھا۔ ''او مکار ہندی عالم! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ میرے کان کیا سن رہے ہیں؟''

شیودیال جی نے ناگواری سے پیشانی پر شکنیں ڈال لیں اور کہا۔ ''شریمان جی! اپنی زبان کو لگام دے، تو اپنے سونے کے ڈلے واپس لے سکتا ہے۔''

لیکن سعد اللہ یہودی نے کہا۔ ''نہیں ہندی عالم نہیں..... میں نے تجھ سے اس لڑکی کے عوض معاملہ کیا تھا، میں تو تہمینہ کو آپ سے لوں گا۔''

شیودیال جی نے جواب دیا۔ ''وہ لڑکی تیرے پاس نہیں آنا چاہتی اور جو لڑکی اپنے ارادوں کی پکی اور دل کی مضبوط ہو، اس کو تو بھگوان بھی مجبور نہیں کر سکتے، ایشور بھی دخل نہیں دے سکتے۔''

سعد اللہ نے کہا۔ ''تب پھر میرے سونے کے ڈلے واپس کر دے۔''

شیودیال جی نے کہا۔ ''شریمان جی! زیادہ گرمی نہ دکھاؤ۔ اگر یہ باتیں ارغون خان کے کانوں میں پڑ گئیں تو سوچ لو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔''

سعد اللہ تلملا رہا تھا۔ ''تو کیا تو میرے سونے کے ڈلے واپس نہیں کرے گا؟''

MEDICAM
Bleach Cream
Whiteness
in 14 days
*No Side Effects
MEDICAM
Bleach Cream
MEDICAM
BLEACH CREAM
Skin Whitening Cream

شیو دیال جی نے جواب دیا۔ ”کیوں...... واپس کیوں نہیں کروں گا لیکن کیا تم چند دن صبر نہیں کر سکتے ؟“

سعد اللہ نے کہا۔ ”ھندی عالم! تو مجھے دھمکی دے رہا ہے، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ میں بھی تیرے خلاف کچھ کر سکتا ہوں۔“

شیو دیال جی گویا برف کے بنے تھے۔ انہیں غصہ آیا بھی مگر ظاہر نہیں ہوا، کہا۔ ”پردھان منتری جی! تم آزاد ہو، جو چاہو کرو۔ میں آزاد ہوں جو چاہوں کروں۔ ہم دونوں آزاد ہیں، جو چاہیں کریں لیکن بہتری اسی میں ہے کہ تم چار پانچ دن انتظار کرلو۔“

سعد اللہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ ”تو میرا سونا ھضم نہیں کر سکتا۔ میں چار پانچ دن صبر کرلوں گا لیکن اس کے بعد دیکھوں گا کہ تو کس طرح میرا سونا واپس نہیں کرتا۔“

☆☆☆

شیو دیال جی کی دیگیں آگ پر چڑھی ہوئی تھیں۔ ان میں ادویات کو الگ الگ جوش دیا جا رہا تھا۔ ارغون خان وسیع و عریض غسل خانے کے ایک کونے میں کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ شیو دیال جی اسے کب اپنے پاس بلائیں اور غسل دیں۔ مختلف سفوف کی پڑیاں دیگوں کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔

شیو دیال جی نے ارغون سے کہا۔ ”خان جی! اس موقع پر آپ جس جس کو اپنے پاس رکھنا چاہیں، بلوالیں۔“

ارغون خان نے جواب دیا۔ ”میرے بھائی کیخا تو خان اور تہمینہ کو یہیں بلوالیا جائے تا کہ وہ اس عجیب و غریب جادوئی عمل کو دیکھیں اور مجھے مبارکباد دیں کہ میں عنقریب اپنے چھوٹے بھائی کیخا تو خان سے بھی چھوٹا نظر آنے لگوں گا اور تہمینہ یہ دیکھ کر خوش ہوجائے گی کہ اس کا محبوب کتنا کمسن ہو گیا ہے۔“

ارغون خان نے کیخا تو خان اور تہمینہ کو غسل خانے ہی میں بلوالیا۔

شیو دیال جی نے ایک دیگ میں سے تھوڑا سا پانی نکالا اور سفوف کی ایک پڑیا لے کر ارغون کے پاس پہنچا، بولا۔ ”خان جی! یہ سفوف پھانک کر یہ پانی پی لیجیے۔“

ارغون نے کسی تامل کے بغیر سفوف پھانک کر پانی پی لیا۔ شاید سفوف بہت بدمزہ تھا، ارغون خان منہ بنانے لگا۔

اب شیو دیال جی نے اپنے ہاتھوں سے غسل دینا شروع کردیا۔ پانی میں پڑی ہوئی ادویات کی ملی جلی خوشبو سے پورا غسل خانہ مہک رہا تھا۔ جب ایک دیگ سے غسل دیا جا چکا تو ارغون کو چادر اوڑھا کر ایک تخت پر بٹھا دیا گیا، اس طرح تقریباً ایک گھنٹے تک بٹھائے رکھا گیا۔ اس کے بعد دوسرے سفوف کی پڑیا دی گئی اور دوسری دیگ کے پانی کے ساتھ اسے بھی حلق کے نیچے اتار دیا گیا اور دوسری دیگ کے پانی سے ارغون خان کو نہلا دیا گیا اور اس بار بھی ایک موٹی چادر میں لپیٹ کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔

شیو دیال جی نے پوچھا۔ ”مہاراج! آپ کیسا محسوس کررہے ہیں؟“

ارغون خان نے جواب دیا۔ ”میں خود کو بیمار اور ست محسوس کر رہا ہوں۔ میری کھال گلی جارہی ہے اور گوشت ادھڑا جارہا ہے۔“

شیو دیال جی نے تسلی دی۔ ”مہاراج! مبارک ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی پرانی کھال اتر رہی ہے اور اس کی جگہ نئی کھال پیدا ہوجائے گی۔ اس طرح پرانا گوشت گل کر ہڈیوں پر سے اتر جائے گا اور اس کی جگہ نیا گوشت پیدا ہوجائے گا۔“

تہمینہ بہت خوش تھی، اس نے کہا۔ ”گرو شیو دیال جی! یہ عمل کب تک مکمل ہوجائے گا؟“

شیو دیال جی نے جواب دیا۔ ”تقریباً سات دن۔ انہی سات دنوں میں جو کچھ ہونا ہے، ہوجائے گا۔“

ارغون خان سات دن کا سن کر گھبرا گیا، بولا۔ ”او ھندی عالم! یہ سات دن کیوں؟ پہلے تو تو نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

شیو دیال جی نے جواب دیا۔ ”مہاراج! گھبرائیں نہیں۔ ابھی سفوف کی دو پڑیاں اور ادویات کے پانی کی دو دیگیں باقی ہیں۔“

شیو دیال جی نے سفوف کی ایک پڑیا اور کھلا دی اور اوپر سے ادویات کا پانی پلا دیا اور تیسری دیگ کے پانی سے نہلا دیا۔ اسی طرح جب چوتھی دیگ کا عمل بھی ختم ہو گیا تو ارغون خان کی حالت بالکل ابتر ہو چکی تھی، وہ تڑپنے لگا۔ اس کی کھال گلی جارہی تھی اور گوشت پھٹا جارہا تھا۔ کانوں کی لوئیں گل کر جھڑ گئیں اور ناک پھول کر کپا ہو گئی۔ ارغون خان کو اس کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ شیو دیال جی نے ارغون خان کو مشورہ دیا کہ جب تک پرانی کھال اور گوشت جسم سے جدا نہ ہوجائیں اور ان کی جگہ نئی کھال اور نیا گوشت نہ پیدا ہوجائے، آپ کسی خدمت گار یا رشتے دار کو اندر نہ آنے دیں۔ ہاں کیخا تو خان اور تہمینہ اندر ارغون خان کے پاس رہ سکتے ہیں۔

شیو دیال جی یہ مشورہ دے کر چلے گئے اور ارغون

خان دردو کرب سے تڑپنے لگا۔ کئی گھنٹے بعد ارغون نے اپنے
بھائی کیخا تو خان سے کہا۔ ”یہ شیوو دیال کہاں چلا گیا؟“
کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ”محل ہی میں اپنے
کمرے میں، کیوں؟“
ارغون خان نے کہا۔ ”بھائی کیخا تو خان! تو جا اور
اس کو میرے پاس پکڑ لا، میں اس سے پوچھوں گا کہ یہ درد
اور یہ اذیت کتنی دیر اور رہے گی؟“
کیخا تو خان چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کے جواب
دیا۔ ”برادر محترم! شیوو دیال جی نے آنے سے انکار کر دیا
ہے اور کہا ہے کہ یہ اذیت کم از کم تین دن ضرور رہے گی۔“
ارغون خان چیخنے چلانے لگا۔ ”تین دن اور رہے گی
اور وہ بھی کم از کم۔ کیخا تو خان! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو
شیوو دیال کو گرفتار کر کے میرے روبرو حاضر کر۔ میں اسے
سزا دوں گا۔“
کیخا تو خان نے پوچھا۔ ”آپ اسے کس بات کی سزا
دیں گے؟“
ارغون خان نے جواب دیا۔ ”شیوو دیال نے میرے
ساتھ دھوکا کیا ہے۔“
کیخا تو خان وہاں سے ایسا گیا کہ پلٹ کر ہی نہ آیا۔
ارغون خان بہت پریشان تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیامت کا
تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے سرہانے کھڑی ہوئی تہمینہ کو دیکھا
اور غصے میں کہا۔ ”یہ کیخا تو خان معلوم نہیں کہاں مر گیا جا کر؟“
تہمینہ نے جواب دیا۔ ”صبر کریں خان محترم! کیخا تو
خان آتا ہی ہوگا۔“
ارغون خان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی انگلیاں گل چکی
تھیں۔ ارغون خان نے انگلیوں کی طرف دیکھا اور چیخ چیخ
کر رونے لگا۔ ”ہائے میری انگلیاں...... تہمینہ! یہ کیا ہو رہا
ہے؟ تو ہی جا اور شیوو دیال کو پکڑوا کر میرے پاس لے آ۔“
تہمینہ نے جواب دیا۔ ”ارغون خان! پریشان نہ ہو
ورنہ مجھے پریشان کرو۔ اب شیوو دیال یہاں نہیں آئے گا۔“
ارغون نے جھنجلا کر پوچھا۔ ”وہ یہاں کیوں نہیں آئے
گا...... اس کی اتنی ہمت کہ میں بلواؤں اور وہ نہ آئے؟“
تہمینہ نے جواب دیا۔ ”ارغون خان! یہ ہمت کی
بات نہیں ہے۔ شیوو دیال جی تو یہاں اس لیے نہیں آئیں گے
کہ ان کا کام ختم ہو چکا۔ ہاں کیخا تو خان اور رفیعہ بس آتے
ہی ہوں گے۔“
ارغون خان نیم پاگل ہو چکا تھا، بولا۔ ”لیکن میں
نے رفیعہ کو تو نہیں بلوایا تھا؟“
تہمینہ نے جواب دیا۔ ”وہ آپ کی بن بلائی مہمان
بننے والی ہے۔“
ارغون خان نے غصے میں کہا۔ ”تم سب پاگل ہو چکے
ہو۔ میں کنیزوں اور خدمت گاروں کو بلوا کر تجھے بھی قتل
کرا دوں گا اور کیخا تو خان، رفیعہ اور شیوو دیال کو سسکا سسکا
کر موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔“
تہمینہ مسکرا مسکرا کر ارغون کے زخمی دل و دماغ پر نمک
پاشی کر رہی تھی، اس نے کہا۔ ”خان محترم! تالی بجانے کی
زحمت نہ کیجیے گا کیونکہ آپ کی انگلیاں تو جھڑ چکیں اور دونوں
ہتھیلیاں کافی زخمی ہیں ان سے تالی نہیں بجے گی اور اگر
بفرضِ محال تالی بج بھی گئی، تو کوئی یہاں آئے گا نہیں۔“
ارغون خان نے پوچھا۔ ”کوئی یہاں کیوں نہیں آئے گا؟“
تہمینہ نے جواب دیا۔ ”کوئی یہاں موجود ہی نہیں تو
تالی کی آواز پر آئے گا کہاں سے؟“
ارغون خان چیخنے لگا۔ ”تہمینہ! میں تجھے بھی کبھی نہیں بخشوں
گا، تو غدار ہے۔ سچ بتا یہ سب کیا ہے؟ کس کی سازش ہے؟“
تہمینہ نے جواب دیا۔ ”خان محترم! آپ ذرا بھی نہ
گھبرائیں۔ آپ کئی سو سال تک زندہ رہیں گے، آپ
نوجوان ہو جائیں گے تاکہ عورتوں پر دلیری اور پوری قوت
سے حملہ آور ہو سکیں۔ آپ صدیوں اس لیے زندہ رہیں گے
کہ خدا کی مخلوق کا قتلِ عام کر سکیں، مسلمانوں کو نیست و نابود
کر سکیں۔ ان کے بوڑھے، بچے، عورتیں اور مریض تک
آپ کی تلوار سے محفوظ نہ رہیں۔“
ارغون خان کرب و اذیت سے نیم بلب مدہوش
ہو گیا۔ تہمینہ ارغون کی خواب گاہ سے نکل کر دوسرے کمرے
میں چلی گئی اور خواب گاہ کو باہر سے بند کر دیا۔
کئی گھنٹے بعد کیخا تو خان فاتحانہ شان سے محل میں
داخل ہوا۔ اس کے ساتھ رفیعہ بھی تھی اور زر افشاں بھی۔ ان
دو کے علاوہ اس کی حمایتی سپاہ کا ایک دستہ بھی جس نے شاہی
محل کے دربانوں اور سپاہیوں کو گرفتار کر کے ایک بڑے
ہال میں قید کر دیا۔
کیخا تو خان نے رفیعہ کو ساتھ لیا اور ارغون کی خواب
گاہ میں پہنچ گیا۔ اس وقت ارغون خان چیخیں مار مار کر رو رہا
تھا۔ اس کا جسم تیزی سے سڑ گل رہا تھا۔ کیخا تو خان کو اپنے
سامنے دیکھ کر ارغون خان مشتعل ہو گیا۔ ”مجھے اندازہ ہو چکا
ہے کہ یہ ساری شرارت تیری ہے اور یہ شیوو دیال تیرا ہی
آدمی تھا۔ تو نے مجھے مار دیا لیکن اگر میں بچ گیا تو تیری
بوٹیاں کروا کے چیل کوؤں کو کھلوا دوں گا۔“

رفیعہ آگے بڑھی اور کہا۔ ”او ظالم خان! یاد ہے تجھے وہ دن جب تو نے مسلمانوں کی بربادی اور قتلِ عام کا حکم دیا تھا...... ہم دونوں بہنوں نے اسی دن سے یہ عہد کرلیا تھا کہ تیرے اس ظلم کا تجھ سے بھیانک ترین انتقام لیں گے۔ جو رحم نہیں کرے گا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔“

اب ارغون خان بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اس نے تہمینہ کو آواز دی لیکن تہمینہ وہاں نہیں تھی۔ آخر میں اس نے اپنے وزیر سعد اللہ یہودی کو پکارا۔ رفیعہ نے جواب دیا۔

”وہ قتل کر دیا گیا ہے۔“

ارغون خان نے دھندلی آنکھوں سے جوینی کو اپنی خواب گاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو پوچھا۔ ”یہ تو جوینی؟ کیا تو بغداد سے اتنی جلدی واپس آ گیا؟“

لیکن جوینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ارغون خان نے سنا، جوینی کیخاتو خان سے کہہ رہا تھا۔ ”شہزادے محترم! آپ باہر جا کر یہ اعلان کرادیں کہ ارغون خان کی حالت نازک ہے اور ہنگامی اور عارضی طور پر آپ اس کی ذمے داریاں سنبھال رہے ہیں۔“

کیخاتو خان وہاں سے چلا گیا تو ارغون نے پوچھا۔

”تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟“

جوینی نے پوچھا۔ ”ارغون خان! کیا میں تجھ سے پوچھ سکتا ہوں کہ تو نے حالتِ نماز میں اپنے بڑے بھائی تکودار کو کیوں قتل کر دیا تھا؟ یہ سوال تو تکودار کو تجھ سے کرنا تھا لیکن مجبوراً میں اس کی طرف سے کر رہا ہوں۔“

ارغون نے جواب دیا۔ ”لیکن جوینی یاد رکھ میں تو مر جاؤں گا لیکن میری قوم کے لوگ تجھ سے اور کیخاتو خان سے انتقام ضرور لیں گے کیونکہ یہ ظلم رنگ لا کر رہے گا۔“

ارغون کی قوت گویائی بھی ختم ہوتی چلی گئی۔ بالکل آخری لمحات میں ارغون کو سبھی نے چھوڑ دیا تھا۔ بس تہمینہ خاص طور پر ارغون کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ارغون ادھ کھلی نظروں سے اسے دیکھ کر زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔ تہمینہ نے اپنا داہنا کان اس کے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ارغون کہہ رہا تھا۔ ”میں مر رہا ہوں اور مرتے مرتے اپنی قوم کو حکم دے رہا ہوں کہ وہ کیخاتو خان، جوینی، رفیعہ کو ہرگز معاف نہ کریں اور اگر شیودیال ان کے ہاتھ آجائے تو اس کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔“

تہمینہ اس کی باتیں سن کر اس کے کان پر جھک گئی، بولی۔ ”ارغون! میں بھی بس ایک بات کہنے کے لیے تیرے پاس رکی ہوئی ہوں، شاید تجھ کو یاد ہوگا کہ تیرا دادا ہلاکو خان الموت کے شیخ الجبال کو تباہ و برباد کر کے اس کے قلعوں پر قابض ہو گیا تھا اور اس کی قوم اور پرستاروں کو ہلاک کر کے آخری شیخ الجبال رکن الدین خورشاہ کو گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔ وہ آخری شیخ الجبال ہمارا دادا تھا، آج ہم دونوں بہنیں بہت خوش ہیں کہ دادا پر ہونے والے ظلم کا بدلہ مظلوم دادا کی پوتیوں نے ظالم دادا کے ظالم پوتے سے لے لیا۔“

ارغون خان نے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ ارغون خان پوری قوت سے کہہ رہا تھا۔ ”تہمینہ اور رفیعہ کو فی الفور قتل کر دیا جائے، اسی وقت اور ابھی۔“

اس کے بعد وہ سسک سسک کر مر گیا۔

کیخاتو خان سپہ سالارِ اعلیٰ بھی تھا اور ارغون کے بعد اس کا حقیقی جانشین بھی۔ اس نے برسرِاقتدار آتے ہی اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ اس نے ارغون کو کسی عام اور گمنام آدمی کی طرح دفن کر دیا۔ شیودیال مراغہ سے بہت سارا سونا کما کر ہندوستان واپس چلا گیا۔ بعد میں یہ بھی سنا گیا کہ شیودیال نے تہمینہ سے بھی کافی سونا کمایا تھا۔

کیخاتو خان نے پہلی بار کاغذ کا سکہ جاری کیا جس کو منگول تو یوت کہتے تھے مگر آج اس کو نوٹ کہا جاتا ہے۔ کیخاتو خان نے اپنے یوت کے دونوں طرف کلمۂ طیبہ طبع کروایا تھا۔ کلمے کے نیچے کیخاتو خان کا نام اور یوت کی قیمت درج تھی۔

کیخاتو خان نے زرافشاں سے جو وعدہ کیا تھا، پورا کیا۔ زرافشاں اس کی ملکہ بن گئی اور رفیعہ اور تہمینہ کو ان کی مرضی اور حال پر چھوڑ دیا گیا۔ رفیعہ کو امید تھی کہ کیخاتو خان اسے اپنی ملکہ بنالے گا لیکن کیخاتو خان کو رفیعہ کی وفاداریوں پر شبہ تھا اس لیے اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ یہ دونوں اپنی آخری ناکامیوں سے دل برداشتہ ہو کر بحیرۂ خزر کے جنوب مغربی شہر موغان واپس چلی گئیں۔ اسی موغان میں ان کا آبائی قصبہ تھا اور اسی قصبے کی آب و ہوا نے انہیں پالا تھا۔

ماخذات

تاریخِ اسلام۔ اکبر شاہ خان۔ تاتاریوں کی یلغار۔ ہیرالڈ لیمب۔ دی فلیم آف اسلام۔ ہیرالڈ لیمب۔ تمدنِ ہند۔ سید علی بلگرامی۔ کتاب الہند۔ البیرونی۔ تاریخ ہندی فلسفہ۔ ایس این داس گپتا

چھ روز سے میں نے اپنے باس رون کوری کو نہیں دیکھا تھا، جب اس نے سورج نکلتے ہی میرے فلیٹ سے دوڑ لگائی تھی، اس نے میرا بوسہ لیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے جھوٹ بولا کہ وہ مجھ سے بعد میں ملے گا۔ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے یہ داستانِ غم اپنے بہترین دوست اور ساتھی جان ڈریمر کو سنائی تو اس نے اپنی جیب سے ایک رومال نکال کر مجھے دیا اور انتظار کرنے لگا کہ میں اپنی ناک اور چہرہ صاف کرلوں۔

دنیا میں نہ تو سب کچھ درست حالت میں ہوسکتا ہے اور نہ ہی غلط... جہاں کچھ کچھ درست اور کچھ کچھ غلط ہو وہاں آنکھ مچولی کا کھیل بھی جاری رہتا ہے۔ چھپانے والے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور کھوج لگانے والے تجسّس میں مبتلا رہتے ہیں اور بالآخر... صحیح خطوط پر ہونے والی تفتیش رنگ لے آتی ہے۔
کچھ ایسا ہی تماشا اس ادارے میں بھی ہوا جہاں "سب درست" کا بورڈ آویزاں تھا۔

بے نقاب

تنویر ریاض

تہ در تہ نقابوں میں لپٹے چند چہروں کی رونمائی کا قصہ

''سارے مرد بزدل ہوتے ہیں۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''وہ سوموار کو بھی کام پر نہیں آیا۔ ایتھل کا کہنا ہے کہ وہ رشین سیکٹر میں ہے۔ وہ پورے ہفتے دفتر نہیں آیا۔ البتہ اس کی جانب سے مجھے یہ کاغذ ضرور ملا ہے۔'' میں نے اسے وہ کاغذ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھے میڈلنگ سینی ٹوریم بھیج رہا ہے۔ انہیں ایک اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے۔ اس سے بڑا خودغرض شخص میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔''

جان نے فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کا مرغولہ بناتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی ایک کام ہے جو تمہیں سونپا جارہا ہے۔''

''تم جانتے ہو، وہ ٹی بی سینی ٹوریم ہے۔''

''ہاں لیکن وہ کوئی بری جگہ نہیں ہے۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔''

''اپنے کزن کو دیکھنے کے لیے؟''

''ہاں۔ میری اس سے دور کی رشتے داری ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کسی کی عیادت کو جانے اور وہاں ایک کمرے میں رجسٹروں کے درمیان بیٹھ کر کام کرنے میں بہت فرق ہے۔''

''واقعی، میں تم سے شرمندہ ہوں ایلس۔ کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ جو حساب کتاب کنٹرول کرے وہ ساری دنیا کو کنٹرول کرسکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہاں کچھ گڑبڑ چل رہی ہے۔ شاید تم اس کا پتا چلاسکو کیونکہ تم ہم سب سے زیادہ اہل ہو۔''

''کس قسم کی گڑبڑ؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''بہت سی چیزیں ہیں۔ وہاں پانی کی طرح پیسا بہایا جارہا ہے اور ایسے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے جن کا وہاں کوئی کام نہیں ہے۔ وہ مریض ہیں اور نہ ہی ملازمت کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ویانا میں ہر کسی کو کھانسی ہوگئی ہے اور وہ مرنے کے قریب ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں اتوار کو ہونے والے ناشتے میں ہوجائے گا جہاں عمدہ قسم کی شیمپین کا کاک ٹیل ملتی ہے۔''

''وہ مجھے کبھی مدعو نہیں کرے گی کیونکہ میں ایک اکاؤنٹنٹ ہوں۔''

''لیکن تمہارا خاندانی پس منظر بہت اعلیٰ ہے۔ تمہارے والد ایک معزز شخصیت ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔ تمہیں ضرور مدعو کیا جائے گا۔ وہاں ہر طرح کے لوگ نظر آئیں گے۔''

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیا اسی لیے رون میرا پیچھا کررہا تھا؟ ''میڈی موئسیل ہر ایک کو مدعو کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اردلی بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔

تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ اس طرح کے لوگوں کو تو میڈلنگ کے بجائے کسی اصلاحی جیل میں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ مسز پال جمعرات کی سہ پہر چائے کا اہتمام کرتی ہے۔ اس کی بھانجی پاؤلا وہاں زیرِ علاج ہے جو دیکھنے میں پریوں کی شہزادی لگتی ہے۔ وہ شدت سے اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار کررہی ہے جو اسے اس قلعے سے باہر لے جائے۔''

''رون مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کررہا ہے۔'' میں نے پُرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ سمجھتا ہے کہ یہی سب سے آسان طریقہ ہے۔''

''شاید......'' جان نے میری ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ رونا دھونا بند کرو اور غور سے میری بات سنو۔ اگر تم چاہتی ہو کہ ہمارے امریکن اتحادی تمہاری خواہش کریں، تم سے محبت کریں تو تمہیں اپنی خودمختاری ثابت کرنا ہوگی۔ انہیں یہی بات پسند ہے۔ اس لیے یہ ذمے داری قبول کرلو۔''

''میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم یہ ذمے داری قبول کرلو اور اسے احسن طریقے سے سرانجام دو۔ تمام کھاتوں کا بغور معائنہ کرو۔ میں بتا رہا ہوں کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ میں اس کی بو سونگھ رہا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کی محتاط طریقے سے مدد کریں گے۔ اگر تم کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئیں تو تمہارا قد کچھ اور اونچا ہوجائے گا۔ مسٹر کورنی کی نظروں میں تمہاری عزت بڑھ جائے گی اور شاید وہ ایک بار پھر تمہارے پاس لوٹ آئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تب بھی تمہیں یہ اطمینان تو رہے گا کہ تم نے ایک قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔''

اس طرح میں میڈلنگ میں اپنی ذمے داریاں سنبھالنے چلی گئی۔ وہاں کے کچھ حصے بہت خوب صورت تھے۔ میرے دفتر میں ایک بڑی کھڑکی اور دو دروازے تھے جن میں سے ایک چیف فنانشل آفیسر لورین ہوفنر اور دوسرا فرنٹ آفس میں کھلتا تھا۔ جہاں بیسی اور کرسٹن ٹائپنگ کرتی تھیں لیکن ان کا زیادہ وقت باتیں کرتے اور سگریٹ پینے میں گزر جاتا تھا۔ ڈائریکٹر ٹریسلر کا دفتر کافی فاصلے پر تھا۔ اس کا اپنا عملہ تھا اور میرا اس سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں تھا۔ البتہ کچھ باتیں بہت تکلیف دہ تھیں۔ میرے پیش رو ہیری ولیم نے تباہ شدہ حالت میں ریکارڈ چھوڑا تھا اور اسے ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ حساب کتاب میں بڑے پیمانے پر گڑبڑ کی گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مختلف ردی کاغذوں، رسیدوں اور چیک کی

کاؤنٹر فائل کی مدد سے اکاؤنٹس کس طرح تیار کروں۔ یہ بہت ہی مشکل اور تکلیف دہ کام تھا۔ چیف فنانشل آفیسر ہوفنر نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہیں اس کام میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا لیکن ہمیں جلد از جلد ان چیزوں کو ترتیب میں لانا ہے۔ یہ یورپ کا سب سے بہترین سینی ٹوریم ہے اور ہمیں اس کو اصل حالت میں واپس لانا ہے تاکہ یہ ایک بار پھر مالی اعتبار سے مضبوط ہوجائے اور ہم اپنے معیار پر واپس آجائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے ایک ایسے کام پر لگادیا جو اکاؤنٹنٹ سے زیادہ کسی ماہر آثارِ قدیمہ کے لیے زیادہ موزوں تھا۔

میرے ذہن میں کئی سوالات تھے۔ اردلیوں اور نرسوں کی تنخواہیں ایک جگہ پر رکی ہوئی تھیں۔ جبکہ انتظامی عملے کی تنخواہوں میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا۔ میں نے یہی بات ہوفنر سے کہی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جو شخص دماغ سے کام کرتا ہے وہ ہاتھ سے کام کرنے والے کی نسبت زیادہ کماتا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''بالکل، لیکن ہاتھ سے کام کرنے والوں کی تنخواہ میں بھی کچھ نہ کچھ اضافہ ہونا چاہیے۔ بہرحال یہ پلمبنگ کیا ہے؟''

''اس کا ذکر کہاں سے آگیا؟''

''میں نے ایک فہرست دیکھی ہے جس میں ڈاکٹر گروئن، ڈاکٹر براؤن اور چند دوسرے ڈاکٹروں کے نام کے نیچے پی ایل ایم بی کے اخراجات اور بونس کی تفصیل دی گئی ہے اور انہیں بار بار دہرایا گیا ہے۔ صرف گزشتہ دو ہفتوں کے درمیان ان کی تعداد چوبیس ہے۔ کیا یہ لوگ پائپ لگانے کا کام بھی کررہے ہیں۔''

ہوفنر نے میری بات سن کر قہقہہ لگایا تو میں نے کہا۔

''اگر یہ پلمبنگ نہیں تو پوچھ سکتی ہوں کہ پھر یہ کیا ہے؟''

''یہ پلمبنگ نہیں بلکہ plombage ہے۔ یہ ایک جراحی کا عمل ہے اور تپ دق کے ان مریضوں پر کیا جاتا ہے جن کے پھیپھڑے خراب ہوتے ہیں اور اکثر اوقات یہ بیماری کو مکمل ختم کردیتا ہے۔''

''تم مذاق کررہے ہو۔'' میں نے بے یقینی کی کیفیت میں کہا۔

لیکن وہ سنجیدہ تھا۔ میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم روزانہ کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ تمہارا شکریہ کہ میری غلط فہمی دور کردی۔'' میں نے فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ یہ عمل کئی بار دہرایا گیا ہے۔''

''مائی ڈیئر مس ویسٹ! یہ سرجن کا فیصلہ ہوتا ہے اور ہمارے پاس یورپ کے بہترین ڈاکٹرز ہیں۔ آپ ان لوگوں سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں انہیں اس کا معاوضہ ملتا ہے۔''

میں اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی لیکن میرا نام پورے سینی ٹوریم میں ایک ایسی لڑکی کے طور پر مشہور ہوگیا جو اس عمل جراحی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ البتہ جان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مجھے وہاں ہونے والی تقریبات میں شرکت کے دعوت نامے ملنے لگے۔ میں نے پہلی بار مارگریٹ کے سنڈے برنچ میں شرکت کی جہاں بڑی مقدار میں مشروب میسر تھا اور بے حجابانہ لغو گفتگو ہورہی تھی۔ وہ مسلسل اپنے منگیتر رابرٹ کے بارے میں باتیں کررہی تھی جبکہ اس کے ہاتھ ایک اردلی کے جسم پر تھے۔

''میری دادی نے ہمیشہ یہی بتایا کہ نشے کی زیادتی آدمی کو عیاش بنادیتی ہے۔'' میں نے دو دن بعد جان سے کہا۔ ''اور اب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''

''تم اس کی فکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ پلمبنگ کے بارے میں مزید کیا معلومات حاصل ہوئیں؟''

''بہت زیادہ۔ تم نے بھی اتنے زیادہ خراب پائپ نہیں دیکھے ہوں گے۔ یہاں تو میڈی مونسیل سے لے کر پاؤلا تک سب کو ہی پلمبر کی ضرورت ہے۔ ویسے تمہیں معلوم ہے کہ پاؤلا کا باپ ایک پادری ہے جو میڈلنگ میں آوارہ پھرتا رہتا ہے۔''

''وہ ایک سپاہی ہے اور جنگ میں بھی حصہ لے چکا ہے۔''

''واقعی۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے ایک سے زیادہ شادیاں کی تھیں۔''

''مجھے یقین نہیں آتا کہ پاؤلا کو پلمبر کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔''

''ریکارڈ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ تقریباً ہر مریض کی یہ سرجری کی گئی ہے۔ کم از کم کاغذوں کی حد تک۔ اس میں غریب مریض بھی شامل ہیں جو کہ ایک دلچسپ بات ہے کیونکہ ان کا اتنا مہنگا علاج کون کرسکتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ کوئی فیاض شخص ان کی مدد کررہا ہو۔ ایلس تم اپنا کام جاری رکھو۔ میں چند دنوں کے لیے شہر سے باہر جارہا ہوں لیکن میں جمعرات کو ایلن کی تھیوسوفی سوسائٹی کی میٹنگ میں ضرور شرکت کروں گا۔ تم سے وہیں ملاقات

ہوگی۔‘‘

’’کیا میرا آنا ضروری ہے؟‘‘

’’ہاں۔اس سے تمہارے علم میں اضافہ ہوگا۔‘‘

اس میٹنگ میں حاضرین کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ چند ڈاکٹر، کچھ انتظامیہ کے لوگ، ادھر ادھر بکھری ہوئی تھوڑی سی عورتیں جن میں پاؤلا، مسز پال اور دو نرسیں شامل تھیں۔میں جان کی وجہ سے آئی تھی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔میں نے اسے میڈلنگ میں آتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا، اس نے کسی سے کوئی بات کی اور نیچے ہال میں چلا گیا۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی حالانکہ میں نے اس کی پسند کی فراک پہن رکھی تھی۔

ایلن کے پھیپھڑوں نے صرف دس منٹ اس کا ساتھ دیا۔اس کے بعد وہ کھانستا ہوا چبوترے سے نیچے آ گیا اور اس کی جگہ ہر جے فیلڈ نے سنبھال لی لیکن اس کا لیکچر سننے میں کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ ڈاکٹر گروئن، ڈاکٹر براؤن، طرا اور دوسرے لوگ دیر سے آئے۔ کافی کا وقت ہو چکا تھا۔ مسز پال، ڈاکٹر گروئن سے چپک گئی اور میں پاؤلا سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگی۔

وہ کمزور مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔’’رات بھر تکلیف میں مبتلا رہنے کی وجہ سے نقاہت محسوس کر رہی ہوں۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ تم اپنے کمرے میں واپس جا کر آرام کرو۔‘‘

’’میں کمرے میں پڑے پڑے تنگ آ چکی ہوں۔ میں جلد از جلد صحت یاب ہو کر تمہاری طرح مضبوط، متحرک اور پیاری نظر آنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’یقیناً مس ویسٹ ہمارے سینی ٹوریم میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔‘‘ ایلن نے کہا۔’’لیکن پاؤلا تمہیں تھوڑی سی ہمت کرنی چاہیے۔تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔تم پہلے سے بہتر اور پیاری لگ رہی ہو۔‘‘

پاؤلا نے اپنی گہری نیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ بیماری کے باوجود اس میں اتنی کشش تھی کہ کوئی بھی مرد اس کا دیوانہ ہو سکتا تھا لیکن ایلن کے معاملے میں یہ وقت ضائع کرنے کے برابر تھا۔

’’اوہ مس ویسٹ!‘‘ ڈاکٹر گروئن نے کہا۔’’کیا تم نے حال ہی میں کوئی نئی طبی اصطلاح سیکھی ہے؟‘‘ پھر وہ مسز پال سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔’’تم نے سن لیا ہوگا کہ مس ویسٹ نے میرے بارے میں کیا تبصرہ کیا ہے یعنی یہ کہ میں سرجن نہیں بلکہ پلمبر ہوں۔‘‘

مسز پال نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔’’بہت پیاری فراک پہن رکھی ہے۔میں نہیں سمجھتی کہ یہاں کلریکل اسٹاف کو اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ وہ ایسی قیمتی فراک خرید سکیں۔‘‘

’’مجھے اپنے گھر والوں سے بھی کچھ جیب خرچ ملتا ہے۔‘‘ مجھے یہ انکشاف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی۔

’’وہ اسکاٹ لینڈ میں رہتے ہیں۔‘‘

’’اچھا۔تمہارا تعلق ارل آف منٹو سے ہے۔ میں یہاں تمہیں خوش آمدید کہتی ہوں۔‘‘ پھر وہ پاؤلا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔’’اب ہمیں چلنا چاہیے۔کافی دیر ہو گئی ہے۔تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔‘‘

’’بے چاری لڑکی۔‘‘ ڈاکٹر گروئن نے انہیں جاتا ہوا دیکھ کر کہا۔’’اس نے بیماری کے خلاف بڑی جدوجہد کی ہے لیکن ہم کامیابی کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ جلد ہی وہ بھی معمول کی زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے گی۔‘‘

’’مجھے یقین ہے کہ وہ سنڈریلا جیسی زندگی گزارنے کو ترجیح دے گی۔ اپنے خوابوں کے شہزادے کے ساتھ۔‘‘

’’بالکل ٹھیک کہا تم نے۔کون ہوگا وہ؟ ایلن تم؟‘‘

ایلن شرماتے ہوئے بولا۔’’نہیں۔‘‘

’’وہ کوئی مریض نہیں ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔’’اس نے اپنی ساری زندگی سینی ٹوریم میں گزاری ہے۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ جو کوئی بھی ہو لیکن وہ خون نہیں تھوکے گا۔‘‘

ایلن میرے لہجے کی تلخی پر چونک اٹھا۔’’وہ کوئی ممتاز، بہادر، مضبوط اور سچا شخص ہوگا۔اس کے علاوہ وہ کسی عورت کی جان بچانے کے مقابلے میں اس کا دل جیتنے کا کوئی اور طریقہ نہیں۔‘‘ میں نے ڈاکٹر گروئن کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔’’تمام عورتیں اندر سے رومانی ہوتی ہیں۔‘‘

ڈاکٹر نے سر خم کیا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

’’تم بہت تیز فہم ہو۔‘‘ ایلن نے کہا۔’’وہ دل سے چاہتا ہے کہ پاؤلا سے شادی ہو جائے لیکن پہلے اس کا صحت یاب ہونا ضروری ہے۔‘‘

’’اتنا طویل انتظار کیوں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’میرے خیال میں یہ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ مرنے سے پہلے وہ زندگی کا مزہ لے لے۔‘‘

میں نے پہلے ہی plombage سرجری کی فہرست نام اور تاریخوں کے ساتھ تیار کر رکھی تھی۔ اب میں نے اسے مریضوں کی فائلوں سے چیک کرنا شروع کر دیا لیکن جب ہوفنر نے جواب تک میرے ساتھ بہت زیادہ تعاون

کر رہا تھا، پاؤلا کی فائل پڑھتے دیکھا تو میرے ہاتھوں سے فائل چھینتے ہوئے بولا۔

''تم اس فائل میں کیا دیکھ رہی ہو؟''

''میں فائل سے اس سرجری کی تفصیلات چیک کر رہی ہوں۔ ہماری زبان میں اسے ڈبل چیک کہا جاتا ہے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ بلنگ صحیح ہوئی ہے اور تمام رسیدیں موجود ہیں۔''

''تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''کیونکہ میں ایک اکاؤنٹنٹ ہوں اور میرا یہی کام ہے۔ ہم ڈبل چیک کرتے ہیں، خاص طور پر جب معاملہ بھاری اخراجات اور بونس کا ہو؟''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہمارے سرجن پورے یورپ میں سب سے بہترین ہیں۔ یہ تمام آپریشن منظور شدہ تھے اور کامیابی سے مکمل ہوئے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ وہی کام کرو جس کے لیے تمہیں یہاں بھیجا گیا ہے یا پھر تمہیں ڈاکٹر گروئن، براؤن اور دوسرے لوگوں سے کوئی دشمنی ہے؟''

''بالکل نہیں۔ میں صرف حسابات کی جانچ پڑتال کر رہی تھی۔''

''میں تمہاری لگن کی قدر کرتا ہوں۔ بہرحال مریضوں کی فائلوں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ وہ ذاتی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو؟''

میرے پاس ہاں کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

اس شام سب لوگ جا چکے تھے لیکن میں اپنے کمرے میں بیٹھی رجسٹروں سے سر کھپا رہی تھی۔ میرے لیے اس کام کو ترتیب میں لانا بہت مشکل ہو رہا تھا، گو کچھ ریکارڈ ضائع ہو گیا تھا لیکن بہت کچھ ابھی موجود تھا جیسا کہ Plombage سرجری کی فہرست لیکن ضروری نہیں کہ غبن کیا گیا ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد نازی وہاں سے جا چکے تھے اور اس پیسے کا حساب دینا تھا۔ آیا یہ رقم چوری ہوئی، ضائع ہوئی یا جیبوں میں گئی لیکن اس حساب کتاب کی ضرورت کیوں پیش آ رہی تھی کیونکہ ویانا کے ہر بڑے ادارے میں بڑے پیمانے پر نظرثانی شروع ہونے والی تھی جس میں ان حسابات کا آڈٹ بھی شامل تھا۔ لہٰذا اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کے لیے بڑی احتیاط سے نئے رجسٹر تیار کیے جائیں اور اس کے لیے باہر کے کسی اکاؤنٹنٹ کو بلوانا ہوگا۔ اس کے لیے امریکنوں کا مہیا کردہ اکاؤنٹنٹ فائدہ مند رہے گا۔

جرمنی اور آسٹریا کے عارضی ملاپ کے بعد نازیوں نے ان اداروں میں اپنے سربراہان مقرر کر دیے تھے جنہیں وہ بند کرنے یا لوٹنے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن ٹریسلر اور ہوفنر تو یہاں برسوں سے کام کر رہے تھے پھر میڈلنگ کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ میں نے سنا ہے کہ نازی اس سینی ٹوریم کے مریضوں کے قریب آنے سے ڈرتے تھے کہ کہیں انہیں بھی یہ متعدی مرض نہ لگ جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقریباً سبھی مریض اتنے دولت مند تھے کہ وہ اپنی صحت اور تحفظ کے لیے خود اخراجات برداشت کر سکتے تھے اور بقیہ مریضوں کو فلاحی تنظیموں سے مدد مل جاتی تھی۔

ایک دلچسپ انکشاف یہ بھی ہوا کہ وہاں رہنے والے سب لوگ مریض نہیں تھے۔ سیسی نے گپ لگائی کہ سینی ٹوریم کے آئسولیشن وارڈ میں جنگ کے دنوں میں کچھ دلچسپ ''مریض'' دیکھے گئے۔ ان میں یہودی بینکاروں سے لے کر ویانا کی نامی گرامی طوائفیں بھی شامل تھیں۔ سب سے بڑھ کر مسز پال جو جنگ سے بھاگ کر میڈلنگ میں آرام اور سکون سے رہ رہی تھی۔ اس کے لیے اسے اپنی بھانجی کا شکرگزار ہونا چاہیے تھا لیکن پاؤلا کے صحت یاب ہونے کے بعد وہ کیا کرے گی؟ کیا اس نے ڈاکٹر گروئن سے شادی کر لی، اسی لیے وہ اسے یہاں زیادہ دیر تک رکھنا چاہ رہا تھا۔ ایسا ہو سکتا ہے، ان ڈاکٹروں کا کیا بھروسا؟

میں نے بار بار Plombage کے ریکارڈ کو دیکھا۔ نہ جانے کیوں میں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ڈاکٹر براؤن نے 1939ء اور ڈاکٹر گروئن نے 1940ء سے اس مد میں پیسے وصول کرنا شروع کیے، یعنی جرمنی اور آسٹریا کے عارضی ملاپ کے بعد۔ میں نے اپنی کرسی کی پشت سے کمر لگا لی۔ چرچ کے گھنٹا گھر سے سات بجنے کی آواز سنائی دی۔ کافی دیر ہو گئی تھی اور تقریباً سب لوگ جا چکے تھے۔ میں نے اپنی چیزیں اکٹھی کیں اور فرنٹ آفس کی جانب بڑھی۔ میرے دائیں جانب ایک مقفل الماری تھی جس میں مریضوں اور عملے کا ریکارڈ رکھا ہوا تھا۔ مجھے تالا کھولنے کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ہیں اور میں انہیں آزمانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ایک کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' وہ ایک مضبوط جسم والا اردلی تھا۔

''کام کر رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں تیزی سے ایک

طرف ہٹ گئی۔ اس اثنا میں دوسرا اردلی بھی آ گیا جو پہلے اردلی سے قد میں چھوٹا، اور زیادہ عمر والا تھا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اتنی دیر..... تم یہاں اکیلی ہو؟''

''میں یہاں اکاؤنٹنٹ ہوں۔ بس اپنا کام ختم کر کے جانے ہی والی تھی۔''

''ہر لڑکی اپنے محبوب سے ملنے کے لیے یہی بہانہ بناتی ہے۔'' بعد میں آنے والا میرے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ اس نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

میں نے اپنے کندھے اچکائے اور کہا۔ ''اب میں گھر جا رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے چلنا شروع کر دیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں پہلے والے کے پاس سے گزری لیکن دوسرے نے آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا اور بولا۔ ''میرے ساتھ چلو۔''

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' ایک گرج دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ ایک طویل قامت شخص تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ پاؤلا کا باپ جیمس کارتھوس تھا۔ اس نے دونوں اردلیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اس لڑکی کا ہاتھ چھوڑو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

دونوں اردلی مجھ سے دور ہٹ گئے۔ دوسرا بولا۔

''ہم صرف یہ پوچھ رہے تھے کہ یہ لڑکی چھٹی ہونے کے بعد یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''تم ہوتے کون ہو یہ بات پوچھنے والے۔ اپنے نام بتاؤ۔ میں تمہاری شکایت کروں گا۔''

وہ دونوں کچھ کہے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ اس آدمی نے مجھ سے کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ میں پہلی فرصت میں ان دونوں کی شکایت پرسنل منیجر سے کروں گا۔ تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں۔ بس تھوڑا سا گھبرا گئی تھی۔''

''معاف کرنا۔ میں نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔''

''میں جانتی ہوں کہ تم کون ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایلس ویسٹ ہوں۔ یہاں پر اکاؤنٹنٹ ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ اپنی بیٹی سے تمہارے بارے میں سنا ہے۔ میں اس سے ملنے آتا رہتا ہوں اسی لیے یہاں نظر آ رہا ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''تم خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو۔ کیا میرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کرو گی؟ اس وقت تمہیں اچھے کھانے اور ڈرنک کی ضرورت ہے۔''

ایک معزز اور بہادر شخص کی پیشکش ٹھکرانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی مفت کا کھانا کسے برا لگتا ہے لہٰذا میں نے سر جھکا کر رضامندی ظاہر کر دی۔ کھانے کے دوران میں نے اسے اپنی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں بھی بتایا جب میں ایک آسٹرین نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی لیکن یہ تعلق دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ اسی طرح جیمس نے بھی مجھے بہت سی باتیں بتائیں۔ اپنی بیٹی پاؤلا، پہلی بیوی جو دوران زچگی فوت ہو گئی تھی جبکہ دوسری بیوی ایک فضائی حملے میں ماری گئی۔ اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ میں میڈلنگ میں کیسے آ گئی۔

''ایک ایجنسی کے ذریعے، انہوں نے مجھے اکاؤنٹس کا کام دیکھنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''حساب کتاب کی کیا صورت حال ہے؟''

''میں نہیں بتا سکتی کیونکہ یہ خفیہ ہے۔''

''خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تم یہاں آ گئی ہو۔ سننے میں آیا ہے کہ ویانا کے تمام اداروں کا ریکارڈ دوبارہ چیک کیا جائے گا بلکہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہاری آمد بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔''

''اگر ایسا ہوتا تب بھی میں اتنی نادان نہیں ہوں کہ تمہیں بتا دیتی۔''

''ممکن ہے کہ کوئی بے احتیاطی ہوئی ہو لیکن گروئن اور آدھے سرجن نازی ہیں۔ براؤن بھی دونوں ملکوں کے الحاق کے ساتھ ہی یہاں آ گیا تھا۔ اسے نازی ہیڈ کوارٹر کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔''

''کیا کسی نے مقامی حکام کو اس بارے میں نہیں بتایا؟''

''میں نے یہاں آنے کے بعد پہلا کام یہی کیا تھا لیکن نازی ہو یا کوئی اور..... سرجن تو صرف سرجن ہی ہوتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ہم بہت خوش قسمت ہیں جو یہ سرجن ہمیں ملے۔''

''کیا کبھی تمہاری بیٹی کی Plombage سرجری ہوئی ہے؟''

وہ خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔ ''جو تپ دق کے مریضوں کی ہوتی ہے۔''

''نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس سے محفوظ رہے لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ بہت سے مریضوں کا نام غلط

طریقے سے اس سرجری کی فہرست میں ڈال دیا گیا ہے۔ اب مجھے واپس جاکر یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ان سے بھی اس آپریشن کے اخراجات وصول کیے گئے ہیں۔"

میں نے مشروب کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم میری مدد کرو گے؟ میرے سپروائزرز سمجھتے ہیں کہ میں وقت ضائع کر رہی ہوں لیکن اب یہ جاننا بہت اہم ہوگیا ہے۔"

"میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اگلے روز میں نے ایلن کے ساتھ لنچ کیا۔ ہم نے موزارٹ، ٹرولوپ اور ٹالستائی پر گفتگو کی۔ اس نے مجھے سیاہ کاک ٹیل لباس کے بارے میں بتایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے سینی ٹوریم کے علاوہ گھر سے بھی معقول جیب خرچ ملتا ہے۔ باتوں باتوں میں گزشتہ روز ہونے والے واقعے کا ذکر نکل آیا۔

"ہر ایک اس بارے میں باتیں کر رہا ہے کہ تمہیں کس طرح خوفزدہ کیا گیا اور کس طرح اس بہادر انگریز پادری نے آکر تمہیں بچایا۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میڈلنگ سے چلے گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ دوسری عورتوں کے لیے بھی مسئلہ بنے ہوئے تھے لیکن تمہارے ساتھ ہونے والا واقعہ ان کے لیے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔"

"تم جانتے ہو وہ کون تھے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ میڈی موئسیل انہیں ضرور جانتی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "بڑے شرم کی بات ہے، مجھے بتاؤ کہ تمہارے کزن کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیا وہ بھی علاج کے لیے یہاں آیا تھا؟"

"نہیں۔ وہ بھی کبھی مجھ سے ملنے آتا تھا۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"ہاں۔ میں اس سے سنڈے برنچ پر ملی تھی۔ اس نے مجھے تھیوسوفی لیکچرز کے بارے میں بتایا تھا۔"

"واقعی؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "اس نے دو لیکچر اٹینڈ کیے تھے، لیکن اسے واپس اسٹراس برگ جانا پڑ گیا۔ اب وہ وہیں کام کر رہا ہے۔"

"شاید وہ دوبارہ تم سے ملنے کے لیے آئے۔"

"مجھے شبہ ہے اگر میں یہاں سے زندہ چلا گیا تو بھی واپس نہیں آؤں گا پھر وہ ایسا کیوں کرے گا؟"

سیسی نے مجھے ان دونوں اردلیوں کے نام

بتادیے۔ ان میں سے ایک کا نام فرینز ویبر اور دوسرے کا ہیرچ پولارڈ تھا۔ میرے پادری نے مجھے بتایا کہ پاؤلا سمیت مریضوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کی سرجری نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کا الگ سے بل بنایا گیا لیکن اس کے عوض وصول کی جانے والی رقم کاغذوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگئی۔ واضح طور پر یہ غبن کا معاملہ تھا۔

اس نے مجھے ایک بار پھر ڈنر پر چلنے کی دعوت دی جسے میں نے آئندہ کسی روز کے لیے قبول کرلیا۔ میں اپنے آپ کو بہت زیادہ بے قرار ظاہر کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس رات میں کام ختم ہونے کے بعد جان کے فلیٹ پر گئی۔ میرے پاس اس کی ایک فالتو چابی تھی اس لیے اندر جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میرے فلیٹ کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹا لیکن اس سے کہیں زیادہ پُرتعیش تھا۔ کمرے میں ترکی قالین، قیمتی پردے اور شاندار فرنیچر موجود تھا۔ میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اس کی تلاشی لینے لگی۔ میری معلومات کے مطابق وہاں سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا ہوگا، اپنے پہننے کے کپڑوں کے علاوہ کچھ نہیں لے کر گیا تھا۔ پودے بھی تقریباً مرجھا چکے تھے، میں نے انہیں پانی دے دیا۔

جمعرات کی سہ پہر مسز پال نے ہائی ٹی کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر براؤن حسب معمول کریم کیک پر ہاتھ صاف کررہا تھا جبکہ ڈاکٹر گروئن کی ساری توجہ پاؤلا پر تھی۔ مسز پال نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''پاؤلا نے ہمیشہ بیماری کا بہادری سے مقابلہ کیا۔''

''مجھے یقین ہے البتہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ تمہاری مدد کے بغیر وہ اتنے طویل عرصے تک یہ سب کیسے کرسکتی تھی۔''

وہ مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میں نے ہمیشہ اپنا فرض نبھایا۔ مجھے اپنی بھانجی سے بہت محبت ہے۔''

''یقیناً ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر گروئن اس سے محبت کرتا ہے؟''

''بہت سے مرد میری بھانجی پر فریفتہ ہیں۔ اسی طرح بہت سی عورتیں میرے بہنوئی پر مرتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کی شادی میری بہن سے ہوئی تھی۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا کیونکہ پاؤلا تمہاری بھانجی ہے۔''

''میری بہن لوئیس جوانی میں ہی مرگئی تھی۔''

''زچگی کے دوران یا اس کے بعد؟''

''زچگی کے دوران ہی، وہ بہت بڑا حادثہ تھا۔'' وہ پھٹ پڑی جیسے کوئی زخم کھل گیا ہو۔

''پھر میرے بہنوئی نے اس کے کچھ ہی عرصے بعد اپنی بہترین دوست سے شادی کرلی لیکن وہ بھی سمندر میں ڈوب کر مرگئی۔''

''بہت افسوس ہوا۔ اس کا کیا نام تھا؟''

''بیرائل..... پھر اس کی زندگی میں وائلٹ آئی۔ وہ فضائی حملے میں ماری گئی۔'' مسز پال نے کانپتے ہوئے کہا۔ ''اس کی سب بیویاں جوانی میں ہی مرگئیں۔''

میں نے گزشتہ رات ہی پادری کے ساتھ ڈنر کیا تھا اور ایتھل کو یہ ذمے داری دی تھی کہ وہ اس کے بارے میں مجھے مکمل معلومات فراہم کرے لیکن مسز پال مجھے یہ سب کیوں بتارہی تھی؟ کیا وہ مجھے خبردار کرنا چاہ رہی تھی یا اس کا مقصد جیمس کو بدنام کرنا تھا؟

میں اتوار کی سہ پہر ہفتہ وار رپورٹ لکھ رہی تھی جب رون کمرے میں داخل ہوا۔

''پچھلے دنوں تم کہاں تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنے کام پر۔''

''میں نے اس رات تمہیں پادری کے ساتھ ریستوران میں ڈنر کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ وہ میرے لیے کارآمد ہوسکتا ہے اور اس کے ذریعے میری ہر جگہ تک رسائی ممکن ہوسکتی ہے۔''

''کیا تم نے اس سے کچھ حاصل کیا؟''

''مریضوں تک رسائی اور مذہبی ہدایات۔ درحقیقت وہ ایک مستند مذہبی راہنما ہے، میں اس کے ہمراہ اتوار کے اجتماعات میں سب لوگوں سے مل سکوں گی۔''

''ایلس!''

میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ ''کیا؟''

رون مجھے گھور رہا تھا۔ ''میں پوچھ رہا ہوں کہ تم مذہبی ہدایات کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''میرے والد سینٹ کتھ برٹ کے ناظم تھے۔''

''کیا وہ اعتراضات سنتا ہے؟ میں تمہارے والد کی نہیں جیمس کی بات کررہا ہوں۔''

''مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔''

''تمہیں ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ تمہارا اسٹائل نہیں ہے۔''

مجھ سے اس کا طنز برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے رپورٹ اس کی طرف اچھال دی اور وہاں سے چلی آئی۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ کوئی مجھے جیمس کا رتھوس کے بارے میں بتائے کہ وہ میرے مطلب کا بندہ نہیں ہے بلکہ

محبتوں کے حسین رنگوں سے مرصع فروری 2017، کا دلربا پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
شیریں حیدر کے نئے ناول کے ساتھ ساتھ رفعت سراج
اور انجم انصار کے دلچسپ ناول اگلی منزل کی طرف گامزن
سحر ساجد کی دل پزیر تحریر...... من جانبازم کا اگلا پڑاؤ
سیما رضا ردا نے افشا کیے کچھ نئے اسرار اپنے منی ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں
ماضی کی معروف نیوز کاسٹر مہ پارہ صفدر
اور عالمی شہرت یافتہ براڈ کاسٹر صفدر علی ہمدانی
سے ایک خوب صورت ملاقات
Stay Tuned To Paksociety.com
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے انوارِ قرآن کا نیا سلسلہ
قانتہ رابعہ، نگہت اعظمی اور غزالہ عزیز کی خصوصی تحریریں
اس کے علاوہ
مایہ ناز قلمکاروں کے شاہکار افسانے...... جس میں شمیم فضل خالق، طیبہ عنصر مغل،
سیما بنت عاصم، فرح طاہر قریشی، روزی، ہما بیگ، بنت زہرا و دیگر شامل ہیں
اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ معلومات افزا منفرد مستقل سلسلوں کا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

حقیقت یہ ہے کہ وہ رون کے مقابلے میں بہت بہتر تھا۔ اس کا پس منظر، تعلیم و تربیت اور کلاس میں وہ رون سے بہت آگے تھا۔ ہاں اس کی عمر کچھ زیادہ تھی۔

مجھے اردلیوں کے بارے میں مسلسل شکایات موصول ہو رہی تھیں لہٰذا میں نے ہونفر کی توجہ اس جانب مبذول کروائی اور کہا۔ ''کیا ہم اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ان کا رویہ ٹھیک نہیں ہے اور زیادہ تر کا کوئی طبی پس منظر بھی نہیں ہے۔''

''مس ویسٹ! ہم تاریخ کی سب سے بڑی جنگ سے گزر رہے ہیں اور......''

''میں جانتی ہوں اور میرا بھی یہی مطلب ہے، جنگ کی وجہ سے بے روزگاری بہت بڑھ گئی ہے اور لوگ ملازمت حاصل کرنے کے لیے قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک تربیت یافتہ بھی ہوں گے جو بڑی خوشی سے میڈلنگ میں اردلی کی ملازمت قبول کر سکتے ہیں۔ اس کے بجائے ہم نے ایسے غیر تربیت یافتہ لوگوں کو رکھا ہوا ہے جو مستقل مزاجی سے کام نہیں کرتے اور آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''اگر کوئی مسئلہ ہے تو ہیر بومین سے بات کرو۔ وہ پرسنل منیجر ہے۔ میں نے تو کوئی شکایت نہیں سنی۔''

''تم نے نہیں سنا کہ کس طرح مریض اپنی چیزیں تالے چابی میں بند رکھنے پر مجبور ہیں۔ چوریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اسی طرح زنانہ عملے کے ساتھ بھی واقعات پیش آ رہے ہیں۔''

''اگر یہ سچ ہے۔'' اس نے سیسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو خراٹے لے رہی تھی۔ ''تو ہمیں سیکیورٹی بڑھانا ہوگی۔''

''تمہیں ایسے لوگ رکھنے چاہئیں جو اس کام کے قابل ہوں۔'' میں نے کہا۔

☆☆☆

''مجھے ایک نئی ہاؤس کیپر ملی ہے۔'' کارتھوس نے بتایا۔

''کیا مطلب؟''

''وہ کہتی ہے کہ اسے اس ایجنسی نے بھیجا ہے جس کا ایک دفعہ تم نے ذکر کیا تھا۔''

مجھے فوراً خیال آیا کہ رون نے کارتھوس کے گھر میں اپنی جاسوس بھیج دی ہے۔ تاہم میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور بولی۔ ''کیا تمہیں ہاؤس کیپر کی تلاش تھی؟''

''بالکل۔ ہر ایک کو ہوتی ہے۔''

''پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ البتہ میں تم سے دو سوال کروں گی۔''

''ہاں، پوچھو؟''

''پہلا تو یہ کہ تم تھیوسوفی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں بلکہ اس چھوٹے سے گروپ کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔''

''لگتا ہے کہ وہ اسے سنجیدگی سے لے رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اس سوسائٹی کی بانی بلاواسکی کو روسی زبان میں پڑھنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔''

''حالانکہ اس نے زیادہ تر تفصیل نثر انگریزی میں لکھی ہے۔''

''ہاں۔ اسی لیے میرے ذہن میں ایک دوسری سوچ پیدا ہو رہی ہے۔''

''اور تمہارا دوسرا سوال؟'' اس نے تقریباً میرے کان کے قریب اپنا منہ لاتے ہوئے کہا۔

''شاید تمہیں کسی پادری کی خدمات درکار ہیں۔ میں سند یافتہ ہوں اور اسکاٹ لینڈ میں رہ چکا ہوں، میرے والد پادری ہیں......''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ تم نے بتایا تھا۔'' میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے کوئی مزید بات نہیں کی اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ میرے خیال میں وہ جگہ ان باتوں کے لیے مناسب نہیں تھی۔

اتوار کی صبح میں اس کے ساتھ آئسولیشن وارڈ میں گئی جہاں انتہائی شدید بیماروں کو دوسرے مریضوں سے الگ رکھا جاتا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے مجھے کچھ ترغیب دینا پڑی۔ ان مریضوں کی مسلسل کھانسی کی آواز انتہائی دہشت ناک تھی۔ اس نے ان کے درمیان دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''خداوند تمہیں جسمانی اور روحانی امراض سے نجات دے اور تمہاری طاقت بحال ہو جائے۔'' وہ ہر کمرے میں جا کر ایک ایک مریض کے پاس کھڑے ہو کر یہ مذہبی رسم دہراتا رہا۔

پھر ہم غریب مریضوں کے پاس گئے۔ کارل شمٹ ایک جرمن تھا اور بیماری نے اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا خون نکالنا پڑے گا۔ ایرون جونز بے ہوش تھا اور اس کا درد کم کرنے کے لیے دوائیں دی جا رہی تھیں۔ پھر میری نظر جان پر گئی اور جیسے ہی کارتھوس نے اس کے بے جان سر پر ہاتھ رکھا تو میں تقریباً رو پڑی۔ وہ حرکت

کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔

''اب مجھے جانا ہوگا۔'' میں نے ہال کی طرف جاتے ہوئے سرگوشی کی۔

''لیکن ابھی تین مریض اور باقی ہیں۔'' کارتھوس نے کہا۔

''ہاں۔'' میں آہستہ سے بولی۔ اس مرحلے پر مزید کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم باہر جاکر تازہ ہوا میں سانس لو......''

میں نے اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک دیکھی۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ میں وارڈ کے مریضوں کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ جبکہ میں اسے مضبوط ہونے کا تاثر دینا چاہ رہی تھی لیکن اس وقت جان کی خیروعافیت سب سے اہم تھی۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''ابھی آئی۔''

میں نے جھانک کر ہال میں دیکھا۔ نرس دوسرے سرے پر تھی اور کاؤنٹر پر کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے وہاں رکھے ہوئے ٹیلی فون سے ایمرجنسی نمبر ڈائل کیا۔

''ہاں بولو۔'' دوسری طرف سے رون نے غراتے ہوئے کہا۔

''جان آئسولیشن وارڈ میں ہے اور مرنے کے قریب ہے۔ اسے فوری مدد کی ضرورت ہے۔'' میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور میں ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔ میں نے اسے تلاش کرلیا، وہ زندہ تھا۔

کارتھوس آخری کمرے سے نکل کر میری طرف آیا اور اس نے مجھے نرسنگ کاؤنٹر پر کھڑے دیکھا تو بولا۔ ''اب کیسا محسوس کررہی ہو؟''

''بہت بہتر......''

''کیوں نہ ہم ہاتھ دھوکر ڈنر کے لیے چلیں۔''

''تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔'' میں کہیں بھی نہیں جانا چاہ رہی تھی جب تک یقین نہ ہوجاتا کہ جان خطرے سے نکل آیا ہے۔

''میں تم سے چند باتیں ضرور پوچھنا چاہوں گی۔ جب میں یہاں کام کرنے آئی تو میڈی مونسیل نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری دوشادیاں ہوچکی ہیں۔''

''ہاں وہ ایک دردناک حادثہ تھا۔ مجھے اس کی جوان موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔''

''تمہاری سالی نے بتایا ہے کہ تمہاری چار مرتبہ شادی ہوچکی ہے۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کروگے کہ تمہاری کتنی شادیاں ہوئی ہیں؟''

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بولا۔ ''کیا اس وقت یہ باتیں کرنا بہت ضروری ہیں؟''

''ہاں۔ یہ جاننا میرے لیے بہت اہم ہے۔''

اس نے لمبی چوڑی وضاحت بیان کرنا شروع کی لیکن ڈاکٹر گروئن کی مداخلت سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ آئسولیشن وارڈ کے دروازے سے باہر آیا اور نرس کو آواز دینے لگا تاکہ وہ ایک مریض کو لے جانے میں اس کی مدد کرے۔

''جلدی کرو۔'' میں نے کارتھوس سے سرگوشی میں کہا۔ ''اسے روکو۔''

وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور تیزی سے گروئن کے پاس جاکر بولا۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہے...... میں تمہاری کچھ مدد کرسکتا ہوں؟ میں نے بھی تھوڑی بہت طبی تربیت لی ہوئی ہے۔''

''کچھ نہیں۔'' ڈاکٹر گروئن کاٹ کھانے والے انداز میں بولا۔ ''ایک ایمرجنسی ہوگئی ہے، بہتر ہوگا کہ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''لیکن کیسی ایمرجنسی؟ میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں۔'' کارتھوس اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کررہا تھا۔

گروئن جھپٹ کر میرے پاس سے گزرا تو یوں لگا جیسے اس نے مجھے دھکا دیا ہو۔ کارتھوس نے اسے گردن سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا اور اس کے جبڑے پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ وہ دیوار سے جاٹکرایا اور عین اسی وقت پولیس وہاں پہنچ گئی۔ رون بھی ان کے ساتھ تھا۔

''جان اندر ہے۔'' میں نے رون کو بتایا۔ دو پولیس والوں نے گروئن کو قابو کرلیا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' کارتھوس نے مجھ سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم بتاؤ۔''

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے اپنی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ جان کون ہے؟ تمہارا آشنا ترین دوست؟''

''نہیں۔ ہم ساتھ کام کرتے ہیں اور اچھے دوست ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن تم کیوں مسکرا رہے ہو؟''

''کیونکہ......'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور خاموش ہوگیا۔

جان دو دن تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس کے بعد بھی ایک مہینے تک اس کی کمزوری دور نہ ہوئی۔ یہ میں ہی تھی جس نے رون کو بتایا کہ ڈاکٹر گروئن سابق نازیوں کو اس سینی ٹوریم میں بھرتی کررہا تھا۔ خاص طور پر اردلیوں کے طور پر، اس کے علاوہ آئسولیشن

وارڈ ان کے لیے ایک پناہ گاہ تھی اور منحرف ہونے کی صورت میں انہیں کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا تھا۔ یہ جان جیسے لوگوں سے پیچھا چھڑانے کا آسان طریقہ تھا جو مسئلہ بن سکتے تھے۔''

''میں جانتا تھا کہ تم یہ کام کرلوگی۔'' جان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اس بارے میں کچھ جانتے تھے؟'' رون نے جان سے پوچھا۔

جان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شک تھا لیکن میں کمیونسٹوں، ایلین اور اس کے دوستوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، وہ.....'' اس نے ایک بار پھر لمبا سانس لیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

''وہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کی میٹنگوں کو رومیوں اور ایک دوسرے کو معلومات کی ترسیل کے لیے استعمال کرتے تھے اور میڈم بلاواسکی کا نام ایک کوڈ کے طور پر لیا جاتا ہے۔''

''جسے میں تقریباً سمجھ گیا تھا۔'' جان نے پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایلین کو یہ بات معلوم ہوگئی اور اس نے گروئن کو بتادیا۔ اس نے حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کیے بغیر ایک چاقو کے ذریعے میری سرجری کردی۔''

''دوسرے لفظوں میں اس نے تم پر چاقو سے وار کیا اور آئسولیشن وارڈ میں ڈال دیا تاکہ تم زندہ لاش بن جاؤ۔''

''لیکن اب سب ٹھیک ہے۔ اس کے لیے میں ایلس کا شکرگزار ہوں۔'' جان نے میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور سونے کے لیے چلا گیا۔

''کچھ اور پوچھنا باقی ہے۔'' رون ہلکے سے غرایا۔

''اس طرح کہ جان ڈسٹرب نہ ہو۔''

ڈاکٹر گروئن اور ڈاکٹر براؤن کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اسی طرح نصف کے قریب اردلی بھی گرفتار ہوگئے۔ باقی آدھے غائب ہوگئے۔ ایلن اور کئی دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ شروع ہوگئی۔ تین روسی ایجنٹ بھی پکڑے گئے۔

ان سب لوگوں سے پوچھ گچھ ہوئی جو سوسائٹی کی میٹنگز میں شرکت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مسز پال سے بھی پوچھا گیا جس نے سوسائٹی کو مکمل طور پر بکواس قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ محض ایک شہری ہونے کے ناتے اس کی میٹنگز میں شرکت کیا کرتی تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ دورانِ جنگ ڈاکٹر گروئن کو اپنا ذاتی معالج بننے کی ترغیب دیتی رہتی تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ سچ بول رہی ہے۔'' میں نے رون کو بتایا۔ ''لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں اس پر نظر رکھوں گی۔''

''اب تمہیں سینی ٹوریم میں مزید کام کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔ اس سے میری رشتے داری ہونے والی ہے۔''

''کیا؟''

''جیمس اور میں شادی کررہے ہیں۔''

''جیمس؟''

''جیمس کارتھوس۔''

''تم مذاق کررہی ہو؟''

''بالکل نہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ وہ پہلے بھی شادی کرچکا ہے؟''

''چار مرتبہ..... تین مرگئیں۔ ایک کو طلاق ہوگئی۔ ایتھل نے میرے لیے اس کا پوراپس منظر معلوم کرلیا ہے۔''

''لیکن تم اس سے شادی کیوں کررہی ہو؟''

''کیونکہ وہ مجھے خوش رکھتا ہے اور میری مرضی کے مطابق چلتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بے حد پرکشش ہے۔''

''یہ پاگل پن ہے۔'' وہ گرج دار آواز میں بولا۔ پھر اس نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا چاہتی ہو..... ترقی، بلندی، انگوٹھی؟''

''عزت، بلندی۔ جیمس کم از کم مجھے عزت دے سکتا ہے۔''

''وہ تمہیں بھی مار دے گا۔ میرے خدا! کاش میں تمہیں قتل کرسکتا۔''

''لیکن مجھے مکمل تحفظ حاصل ہوگا۔ پادری کی بیوی بننے کے بعد میں ہر جگہ جاسکتی ہوں۔ میں بہت کچھ کرسکتی ہوں اور جس سے جو چاہوں پوچھ سکتی ہوں۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی۔''

''میں تم پر دھونس نہیں جماسکتا۔''

اور اس طرح میرا پہلا کیس کامیاب رہا۔ ایک طرف تو میں ڈاکٹر گروئن اور اس کے ساتھیوں کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوگئی تو دوسری جانب جیمس کارتھوس جیسا معزز شخص میری زندگی میں آگیا۔

سلیم انور

دنیا گول ہے جس کے باعث نہ صرف انسان بلکہ بعض اوقات کچھ قیمتی اشیا بھی سفر کرتے کرتے اپنے مرکز کی جانب لوٹ آتی ہیں... بالکل ایسے ہی وہ نیکلس بھی مختلف اشخاص کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا اپنے اصل وارث کے گلے کی زینت بن گیا... گویا ایسے ہی واقعات احساس دلاتے ہیں کہ دنیا کس قدر مختصر ہے اور انسان کی زندگی اس سے بھی زیادہ مختصر جو دنیا کی کھوج میں ہی فنا ہو جاتی ہے۔

جھوٹے دعوے داروں کی قلعی کھل جانے کا دلچسپ منظر

ایلکس پیٹرسن نے مشروب کے جام کو گردش دیتے ہوئے اپنی نظریں بیرنگٹن فیملی کے پورٹریٹ پر جما دیں۔ پورٹریٹ میں نومی بیرنگٹن اپنے شوہر ہینری بیرنگٹن کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اپنی عقاب کی مڑی ہوئی چونچ جیسی ناکوں کی اوٹ سے گھنگھرالے سنہری بالوں والی اس آٹھ سالہ لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو پنک لیس کے فراک میں ان کے پاس کھڑی ہنس رہی تھی۔ اس بچی کا سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔

کمرے کی دوسری جانب سے زندہ سلامت نومی نے ایلکس کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ لہرا دیا۔ پورٹریٹ میں نظر آنے والی نومی سے اب اس کی عمر کم از کم دس برس زیادہ ہو چکی تھی اور وزن بھی تیس پونڈ بڑھ چکا تھا۔

وہ مہمانوں کے گروپ کو چھوڑ کر ایلکس کے پاس آ گئی اور اس کا بازو تھام لیا۔ اس کی نظریں بھی پورٹریٹ کی جانب اٹھ گئیں۔ غالباً اس نے بھی ایلکس کو پورٹریٹ کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''سنتھیا کتنی پیاری بچی تھی، ہے نا؟ میں ہینری سے اکثر کہا کرتی ہوں کہ میں نے اس سے شادی اس کی بیٹی کی خاطر کی تھی۔ اس لیے کہ کسی بھی بچے کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے......'' یہ کہتے ہوئے نومی نے تاسف کے انداز میں سر ہلایا۔ ''لیکن اب...... یہ نوعمر اور جوان نسل!''

ایلکس نے تائید میں ہلکی سی آواز نکالی۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اور نہ ہی اسے اولاد کی کوئی خواہش تھی۔

''میرے خیال سے میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے، مائی ڈیئر۔ میرے کل صبح سویرے کے کچھ اپائنٹمنٹ ہیں۔''

''اوہ، واقعی؟ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ تم پارٹی میں آئے۔'' نومی نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

ایلکس نے اپنا مشروب کا گلاس نیچے رکھ دیا اور نومی کا بھاری بھرکم ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''اپنے مہمانوں کو تنہا مت چھوڑو۔ میں خود ہی باہر تک چلا جاؤں گا۔''

اس نے نومی کے غازہ لگے ہوئے رخسار کا بوسہ لیا اور اپنی نظریں اس جگمگ کرتے ہوئے نیکلس پر سے ہٹائیں جو نومی کے بھاری بھرکم سینے پر نمایاں تھا۔

پیشے کے لحاظ سے ہینری بیرنگٹن ایک جوئیلر تھا۔ لہٰذا اس کی مہارت اور نومی کی دولت بیرنگٹن فیملی کے جواہرات کے شاندار ذخیرے کی ضمانت بن گئی تھی۔ ایلکس ہمیشہ سے ایسے ہی لوگوں سے تعلقات بڑھانے اور راہ و رسم پیدا کرنے کا خواہش مند رہا تھا۔

ایلکس تنہا مکان کے پیش دالان کی جانب بڑھ گیا جہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ رقص گاہ کی جانب سے جہاں تمام مہمان اکٹھا تھے، دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں کو غور سے سننے لگا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کسی نے اس کا پیچھا نہیں کیا تو وہ نفیس تختوں سے آراستہ ہال وے کے اس چھوٹے سے کمرے کے سامنے رک گیا جس کے اندر کپڑے رکھنے کی بڑی سی الماری بنی ہوئی تھی۔

یہ بیرنگٹن فیملی کی تیسری پارٹی تھی جس میں وہ شریک ہوا تھا۔ اپنی پہلی پارٹی میں وہ نومی کے ہمراہ اس گھر کا بھرپور جائزہ لے چکا تھا۔ نومی نے خود اسے اپنے گھر کا چپا چپا دکھا دیا تھا۔

اس نے دائیں بائیں ہال میں نگاہ دوڑائی۔ ہال ویران پڑا ہوا تھا۔ ایلکس نے ایک گہری سانس لی اور اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ الماری کی جانب بڑھ گیا۔ پھر وہ الماری کا پٹ کھول کر اندر چلا گیا اور خود کو سب سے نچلے شیلف پر ایڈجسٹ کرنے کے بعد اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

اپنی اس خفیہ پناہ گاہ میں پہنچنے کے بعد ایلکس کو سکون مل گیا تھا۔ اس پُراعتمادی کے عالم میں اس پر ہلکی سی غنودگی طاری ہو گئی۔ اسے خواب میں وہ نیکلس نظر آیا جو اس شب نومی نے پہنا ہوا تھا۔ خالص ہیروں اور زمرد سے آراستہ یہ جگمگاتا ہوا نیکلس 'کوئنز رینسم' کہلاتا تھا۔

اس نیکلس سے منسوب جو داستان بیرنگٹن فیملی بڑے چاؤ سے اپنے مہمانوں کو سناتی تھی، وہ یہ تھی کہ یہ نیکلس فرانس کی ملکہ میری انٹوئنیٹ نے کسی عنایت کے صلے میں نومی کے پرکھوں کو انعام میں دیا تھا۔

لیکن ایلکس اس کہانی کا دوسرا رخ جانتا تھا...... وہ یہ کہ نومی کے پرکھوں نے یہ نیکلس فرانسیسی ملکہ کے پاس سے چوری کیا تھا۔ میری انٹوئنیٹ کی نسل اسی وقت سے اس نیکلس کو تلاش کر رہی تھی۔ اور اب یہ نیکلس اس جیسے ایک نچلے درجے کے مجرم کی دسترس میں تھا۔

ایلکس نے اپنی ابتدائی عمر مشغلے کے طور پر چھوٹے چھوٹے جرائم کرنے میں گزاری تھی جیسے دھوکے بازی، چکما دینا، جیب کاٹنا، پرس چھیننا۔ ایک بار تو اس نے ایمان داری سے زندگی بسر کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ایک جنٹلمین چور کی زندگی اسے کسی اور طرز کی زندگی کے مقابلے میں سب سے بھلی لگی تھی جس میں وہ اپنی شامیں دولت مندوں کے چاؤ چونچلوں میں اور راتیں ان کا مال ہتھیانے میں گزارتا تھا۔

گھنٹوں بعد جب ایلکس کی آنکھ کھلی تو اس کا بدن اینٹھ رہا تھا۔ الماری کے نچلے شیلف میں اکڑوں سونے سے اس کے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ سننے کی کوشش کی لیکن مکان میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔

ایلکس نے اپنا سانس روک لیا اور الماری کا پٹ

آہستہ سے کھولتے ہوئے باہر جھانکا۔ یہ اس کے منصوبے کا سب سے زیادہ خطرناک حصہ تھا۔ اگر وہ الماری میں داخل ہوتے وقت پکڑا جاتا تو وہ یہی جواز پیش کرتا کہ اسے باتھ روم جانے کی حاجت ہو رہی تھی اور وہ باتھ روم کی تلاش میں تھا۔

لیکن رات گئے کسی گھر میں چوری چھپے ڈرتے ڈرتے منڈلانا پکڑے جانے کی صورت میں تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا البتہ اسے یہ یقین تھا کہ نومی اور ہینری جس انداز سے پارٹی میں مے نوشی کر رہے تھے، اب وہ نشے کے خمار میں دیر تک گہری نیند سوتے رہیں گے۔

ایلکس اندھیرے ہال میں راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ فرش کے دبیز قالین پر اس کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ دروازے گنتا ہوا جب چوتھے دروازے پر پہنچا تو رک گیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لائبریری کا دروازہ ہے۔

اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

اب اس نے اپنی ننھی سی فلیش لائٹ آن کر دی اور پلکیں جھپکاتے ہوئے اپنی آنکھوں کو روشنی میں مانوس کرنے کے لیے وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس نے روشنی کی دھار کمرے میں گھمانا شروع کر دی۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا جب روشنی کا حلقہ ایک لڑکی کے سیاہ ہیولے پر پڑا جو میز کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

تب میز کا لیمپ ایک کھٹکے کے ساتھ روشن ہوگیا اور کمرا اچانک تیز روشنی میں نہا گیا۔ ایلکس کے دل نے اس کے سینے میں ہتھوڑے سے برسانا شروع کر دیے۔ وہ پریشان نظروں سے اس لڑکی کو دیکھنے لگا جو اس کے سامنے کھڑی تھی۔

اس دبلی پتلی ٹین ایجر لڑکی کے بال سیاہ تاروں کی طرح اکڑے ہوئے تھے۔ ایک کان میں سونے کا چھلا پڑا تھا اور اس کے کان کی لو میں ایک چھوٹی سی کھوپڑی لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی بھویں بچی ہوئی تھیں اور وہاں ننھی سے سنہری... بار بیل چسپاں تھے۔ اس کے نچلے ہونٹ سے ایک بڑا سا ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی دبلی پتلی ٹانگوں پر سیاہ رنگ کی لیگنگ پہنی ہوئی تھی اور اس کا اوپری بدن ایک سیاہ بے ہنگم سی جیکٹ میں چھپا ہوا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے سامنے کا ایک دانت غائب تھا۔

''تم سنتھیا ہو!'' ایلکس نے حیرت بھری سرگوشی کے انداز میں کہا۔ وہ اپنے ذہن میں پورٹریٹ میں موجود گلابی لیس والی کم سن بچی اور سامنے موجود مخلوق کا موازنہ کرنے لگا۔

لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اپنے ہاتھ پشت پر رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''میرے تمام دوست مجھے اسپائک کے نام سے پکارتے ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔ جب وہ گویا ہوئی تو ایلکس نے دیکھا کہ اس کی زبان بھی چھدی ہوئی تھی اور اس میں ایک سنہری اسپائک دکھائی دیا تھا۔ پھر اس کی سیاہ گول آنکھیں باریک بینی سے ایلکس کا جائزہ لینے لگیں۔ ''تم آخر ہو کون؟''

ایلکس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور مزاح کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''ویل، ہوں...... اسپائک! میرا خیال ہے کہ میں نے پارٹی میں کچھ زیادہ چڑھالی تھی۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد میں اپنا کوٹ لینے کے لیے اوپری منزل پر گیا تھا لیکن نیند کی شدت کے باعث کسی گیسٹ روم میں سو گیا تھا۔''

اسپائک نے اپنی چھدی ہوئی بھویں اوپر اٹھائیں اور حقارت بھری نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ پھر ایک طویل لمحے کے بعد اس کے ہاتھ اس کی جیکٹ کی جیبوں میں رینگ گئے۔ ''فضول بکواس۔'' اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

ساتھ ہی اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک بڑی لمبی سی سیاہ شے باہر نکال لی۔

ایلکس کے گھٹنے جیسے جم گئے۔ وہ تشدد پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کا ہمیشہ یہی وتیرہ رہا تھا کہ وہ اپنی تمام وارداتیں غیر مسلح ہو کر کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

لیکن اب اس وقت اسے اپنی موت...... یا اس سے بھی بدتر اپنی حراست سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے قبل کہ اس کی پسلیوں میں اس کا دل دھڑکنا بند ہو جاتا، اس نے دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں موجود شے کوئی گن نہیں تھی۔ وہ ایک سیاہ رنگ کا لمبا سا جیولری کیس تھا جو لڑکی نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔

لڑکی وہ جیولری کیس اس کی جانب لہراتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم جس شے کے چکر میں یہاں آئے ہو، وہ یہ ہے! درست؟'' یہ کہتے ہوئے لڑکی نے وہ جیولری بکس کھول دیا۔ جیولری بکس میں موجود ہیروں اور زمرد کی چمک دمک سے ایلکس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔

کوئنز رینسم اس ٹین ایجر کی تحویل میں۔

ایلکس ششدر کھڑا رہا۔ پھر اس کا ذہن تیزی سے صورتِ حال کو خیالی ترتیب دینے میں مصروف ہوگیا، وہ معصوم بنا رہے گا اور اپنی بیان کردہ کہانی پر ڈٹا رہے گا...... اگر اسپائنک نے اپنے والدین اور پھر پولیس کو طلب کیا تو!

لیکن نیکلس تو لڑکی کی جیب میں موجود تھا۔ ایلکس کو یقین تھا کہ اس کے والدین کو اس حقیقت کی خبر نہیں ہوگی کہ وہ بیش قیمت نیکلس ان کی بیٹی کی تحویل میں ہے۔

تب ایلکس کا اعتماد کسی حد تک لوٹ آیا۔ وہ بولا۔ ''تم نے یہ نیکلس اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے، اسپائنک؟''.... ساتھ ہی اس کی نظریں لڑکی کی جیکٹ کی اس جیب کی جانب اٹھ گئیں جس میں لڑکی نے اس سیاہ جوئیلری بکس کو رکھا تھا۔

اسپائنک نے شانے اچکا دیے۔ ''کسی نہ کسی دن یہ میرا ہوگا۔ میری پیاری سوتیلی ماں اسے شاذونادر ہی پہنتی ہیں۔ وہ اب مہینوں تک اس کے بارے میں سوچیں گی بھی نہیں۔''

ایلکس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اسپائنک نے اپنا ہاتھ جیب میں اس انداز سے ڈالا ہوا تھا جیسے وہ جوئیلری بکس اس کی ذاتی ملکیت ہو۔'' میں اس کے عوض صرف تھوڑی سی رقم قرض لینا چاہتی ہوں۔ پھر اس سے قبل کہ پیاری ممی کو اس کے غائب ہونے کا علم ہو، میں اسے واپس سیف میں رکھ دوں گی۔''

ایلکس کو اپنا حلق سکڑتا محسوس ہوا۔ ''تم...... اسے...... گروی رکھو گی...... کوئنز رینسم کو......!''

''یہ تمہارے لیے کیا ہے؟'' اس نے ایلکس کی جانب قیاس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ تم اسے اوپن مارکیٹ میں فروخت نہیں کرسکتے۔ کیا تمہاری نگاہ میں کوئی شوقین ہے جو اس کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہو؟''

ایک طویل لمحے کے بعد ایلکس گویا ہوا۔ ''ایک شوقین ہے جو اس میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

اسپائنک نے یہ سن کر منقش فرشی قالین پر ادھر سے ادھر ٹہلنا شروع کردیا۔ ''میں تمہیں بتاؤں! اگر تمہارا شوقین مزاج کلکٹر واقعی اسے حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں یہ تمہیں فروخت کردوں گی۔''

ایلکس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ لڑکی اس کے ساتھ ڈیل کرنا چاہتی ہے۔ ایلکس نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی۔ ''لیکن یہ تمہاری ملکیت نہیں کہ تم اسے فروخت کرو۔''

اسپائنک نے ایک بار پھر حقارت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ترنخ کر بولی۔ ''اور یہ تمہاری ملکیت بھی نہیں کہ تم اسے چوری کرو۔''

ایلکس یہ سن کر سناٹے میں آگیا۔

''دس ہزار ڈالرز!'' اسپائنک نے کہا۔

دس ہزار ڈالرز! ایلکس کا ذہن تیزی سے حرکت میں آگیا۔ کیا اسپائنک کو علم ہے کہ اس نیکلس کی حقیقی مالیت کیا ہے؟ بلیک مارکیٹ میں اس کی کم سے کم قیمت ایک لاکھ ڈالر ہوگی لیکن ایک قدرشناس کے لیے یہ ایک انمول شے تھی۔

ایلکس کے ذہن میں اس نیکلس کی خریداری کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ لیکن وہ اس لڑکی کے ساتھ ڈیل کرنے کا یہ سنہری موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

''آل رائٹ! مجھے رقم اکٹھی کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔''

''تو پھر ہم تین دن کے بعد عوامی مقام پر ملیں گے۔ دوپہر کے وقت سٹی پارک میں۔'' وہ دانت نکوستے ہوئے بولی۔ ''پلے گراؤنڈ پر بندر کے پنجرے کے سامنے!''

☆☆☆

پارک میں داخل ہوتے وقت تک ایلکس کو یقین تھا کہ وہ لڑکی وہاں موجود نہیں ہوگی۔

لیکن وہ جوں ہی کارنر سے گھوما وہ اسے دکھائی دے گئی۔ اپنے مخصوص اسپائکی بالوں اور سیاہ بے ہنگم جیکٹ میں وہ سب سے الگ تھلگ اور منفرد نظر آرہی تھی۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

ایلکس اس کے پاس پہنچ کر اس کے برابر میں بینچ پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ان لوگوں کو دیکھنے لگے جو ان کے سامنے سے گزر رہے تھے...... نوجوان جوڑے، فیملیز، لنچ کے لیے آنے والے ورکرز۔

''کیا وہ تمہارے پاس موجود ہے؟'' ایلکس نے پوچھا۔

اسپائنک نے اثبات میں سرہلا دیا۔ اس کے پتلے شانے بڑی سی۔ جیکٹ میں اندر کو دھنسے ہوئے تھے اور وہ چھوٹی اور عاجز سی دکھائی دے رہی تھی۔ ''جانتے ہو، نومی مجھ پر ہی شک کرے گی۔ مجھے تم سے زیادہ رقم طلب کرنی چاہیے تھی۔''

ایلکس نے یہ سن کر تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم نے اپنا ارادہ بدل تو نہیں لیا؟ ایسا تو نہیں ہے نا؟''

اسپائک نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے سیاہ نیل پالش لگی ہوئی انگلیاں اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈالیں اور وہ جانا پہچانا سیاہ رنگ کا لمبوترا جوئیلری بکس باہر نکال لیا۔ اس نے جوئیلری بکس کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ دھوپ کی کرنوں نے جیسے اس نیکلس کے جواہرات کو آگ سی لگا دی۔ ایلکس کی آنکھیں چکاچوند ہونے لگیں۔

''بیوٹی فل!'' ایلکس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکل گیا۔

پھر اس نے جوئیلرز والا ایک آنکھ کا چشمہ نکالا اور وہ دونوں جوئیلری بکس پر جھک گئے تاکہ نیکلس کو متجسس لوگوں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکیں۔ ایلکس کو اسپائک کی سانسوں سے پیپرمنٹ اور سگریٹ کی بو بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔

ایلکس نے عدسے کی مدد سے ان ہیروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اسپائک نے اس دوران وہ جوئیلری بکس مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔

ایلکس مطمئن ہو گیا۔ وہ نیکلس اصلی، نظر فریب اور کسی بھی قدر شناس کا خواب تھا۔

وہ بینچ پر سیدھا بیٹھ گیا اور اس نے جوئیلری بکس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

''ابھی نہیں۔'' اسپائک نے جوئیلری بکس واپس اپنی جیکٹ کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے رقم دکھاؤ!''

کسی بی ٹائپ مووی کے جاسوس کے مانند ایلکس نے اپنی جیب میں سے ایک لفافہ نکالا اور اس کا منہ کھول کر اسپائک کے سامنے کر دیا تاکہ وہ اس میں موجود رقم دیکھ لے۔

اسپائک نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جوئیلری بکس ایک بار پھر اپنی جیب سے باہر نکال لیا۔ پھر سرسری انداز میں وہ بکس ایلکس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اتنے میں ایلکس کی داہنی جانب سے سوٹ میں ملبوس ایک شخص نمودار ہوا جیسے وہ کسی قصد سے آگے بڑھ رہا ہو۔

ایلکس نے فوراً اپنا ہاتھ اسپائک کی کمر میں ڈالتے ہوئے اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ کوئی پولیس مین ہے۔ یوں ظاہر کرو جیسے تم میری گرل فرینڈ ہو۔''

وہ دونوں چند لحوں تک ایک دوسرے سے چپٹے ساکت رہے۔ اسپائک کی بے ہنگم بھاری جیکٹ سے ایلکس کو اس کے دل کی دھڑکن صاف محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ کوئی خوف زدہ چڑیا ہو۔

سوٹ میں ملبوس وہ شخص ان کی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ اپنی راہ چلا گیا۔

اسپائک ایک جھٹکے سے ایلکس سے جدا ہو گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا لباس درست کرنے لگی۔ ''تمہاری گرل فرینڈ! میں تو تمہاری بیٹی کی طرح ہوں۔ بدچلن کہیں کے۔''

ایلکس نے فوراً اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ ''سوری، میں نے تو صرف احتیاط کی خاطر یہ حرکت کی تھی۔''

پھر وہ جدا ہو کر اپنی اپنی راہ روانہ ہو گئے۔

ایلکس اپنی کار میں اپنے الگ تھلگ واقع چھوٹے سے مکان پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنا برگلر الارم آف کر دیا اور عقبی دروازے سے مکان میں داخل ہو گیا۔ وہ زینے کے راستے سیدھا بیسمنٹ میں چلا گیا۔ باہر سے اس کا مکان قطعی غیر نمایاں تھا لیکن اس کا بیسمنٹ اس کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی دیواریں قیمتی لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی تھیں اور فرش پر قیمتی دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔

اس بیسمنٹ کی واحد فرنشنگ وہ گلاس کیسز تھے جن میں جواہرات اور آرٹ کے دیگر نمونے جگمگا رہے تھے۔

وہ سیدھا اس ڈسپلے کیس کے پاس چلا گیا جو اس نے کوئنز رینسم کے لیے تیار کیا تھا۔ اس نے جوئیلرز کا عدسے والا ایک آنکھ کا چشمہ اپنی آنکھ سے لگایا اور سیاہ جوئیلری بکس کا ڈھکن کھول دیا۔

سیاہ ویلوٹ کے استر پر رکھا ہوا نیکلس اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ جگمگ کر رہا تھا۔ ایلکس نے جوہری عدسے کی مدد سے پوری احتیاط کے ساتھ اس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پھر وہ ایک طویل لمحے تک ساکت کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔ پھر اس نے نیکلس ڈسپلے کیس میں رکھ دیا اور ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا۔

اس نے اپنی یادداشت کے سہارے بیرنگٹن کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری جانب سے فون اسپائک نے اٹھایا تھا۔

''تم نے مجھے جعلی نیکلس فروخت کیا ہے۔ تم نے ایسا کیسے کیا؟ جو نیکلس میں نے دیکھا تھا، وہ سو فیصد اصلی نیکلس تھا۔''

جواباً اسپائک نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''جب پارک

میں، میں نے وہ نیکلس جیب میں رکھا تھا تو اسی وقت اسے بدل دیا تھا۔ تم تو جانتے ہو، اس دھندے میں سب چلتا ہے۔ ہے نا؟ اس کے علاوہ میرے ڈیڈی نے اس نقل کو تیار کرنے میں بہت محنت کی ہے۔ اس پر کم از کم تین سو ڈالرز لاگت آئی ہے۔ تومی اپنی دولت کے معاملے میں زیادہ سخی ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے مجھے اور ڈیڈی کو اپنی ضروریات خود پوری کرنی پڑتی ہیں اور اب تک ہم نے تم جیسے دلچسپی رکھنے والے شوقین مزاجوں کو صرف چند ہی ایسے نمونے فروخت کیے ہیں۔''

ایلکس خاموش رہا۔

پھر کچھ دیر بعد گویا ہوا۔ ''ویل، میں پولیس کے پاس نہیں جاسکتا۔ ہے نا؟ لیکن اسپائک......''

''ہاں میں سن رہی ہوں۔''

''میں نے تمہیں لفافے میں جو رقم دی ہے اس میں نوٹوں کے درمیان تمہیں چند سادے نوٹوں کے سائز کے کٹے ہوئے کاغذ بھی رکھے ہوئے ملیں گے جن کی مالی حیثیت کچھ نہیں۔ اس دھندے میں سب چلتا ہے۔ ہے نا؟'' اس نے اسپائک کا جملہ دہرادیا۔

''تم......''

دوسری جانب اسپائک کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ پڑا۔

ایلکس نے فون بند کردیا اور واپس ڈسپلے کیس کی جانب پلٹ گیا۔

''بائی داوے، اسپائک۔'' وہ خالی کمرے سے مخاطب ہوا۔ ''میرے ابتدائی کیریئر کے پیشوں میں سے ایک پیشہ جیب تراشی بھی تھی۔ جب تم نے اصلی نیکلس جیب میں رکھنے کے بعد مجھے نقلی نیکلس تھمایا تھا تو اس وقت یہ میرے لیے آسانی سے ہاتھ آنے والی شے بن گیا تھا کیونکہ جب میں نے پارک میں تمہیں سینے سے لگانے کے لیے کھینچا تھا تو اسی وقت وہ نقلی نیکلس تمہاری جیب میں ڈالتے ہوئے اصلی نیکلس واپس نکال لیا تھا اور اب یہ اصلی نیکلس میری تحویل میں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ایلکس ستائشی نظروں سے ڈسپلے کیس میں سجے ہوئے کوئنز ریگسم کو دیکھنے لگا۔

وہ کافی دیر تک اس نیکلس پر نگاہیں جمائے رہا پھر بلند آواز سے بولا۔ ''میری پرکھن ملکہ میری انٹوئنیٹ کا سر فخر سے بلند ہوگیا ہوگا کہ ان کا یہ بیش قیمت نیکلس خاندان میں واپس آگیا ہے۔''

باعثِ تکلیف

مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''میری مصنوعی ٹانگ میرے لیے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی ہے۔''

ڈاکٹر حیرت زدہ رہ گیا اور مریض کو گھورتے ہوئے بولا۔

''کمال ہے، لکڑی کی مصنوعی ٹانگ تمہارے لیے کیسے تکلیف دہ ثابت ہوسکتی ہے۔''

مریض نے سر جھکا کر کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے ڈاکٹر صاحب، کل میری بیوی نے لکڑی کی یہ مصنوعی ٹانگ میرے سر پر دے ماری تھی۔''

خبر

ڈاکٹر حادثے میں زخمی ہونے والے مریض سے کہہ رہا تھا۔ ''میرے پاس تمہارے لیے دو عدد خوشخبریاں ہیں، ایک اچھی ہے اور ایک بری۔ تم پہلے کون سی سننا پسند کروگے؟''

''پہلے مجھے بُری خبر سناؤ۔'' مریض نے کہا۔

''بُری خبر یہ ہے کہ حادثے کے بعد تمہاری ٹانگیں کاٹنی پڑیں اور اچھی خبر یہ ہے کہ ساتھ والے بیڈ کے مریض نے تمہارے جوتے خریدنے کو کہا ہے۔''

قابلیت

باپ کو بچے کے بارے میں اسکول کے ٹیچر کا خط ملا تو اس نے غصے میں بیٹے کو بلایا اور گرج کر کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے تمہارے ٹیچر نے اس خط میں کیا لکھا ہے؟''

''جی نہیں۔'' بیٹے نے سر ہلادیا۔

''اس نے لکھا ہے کہ وہ شاید زندگی بھر کوشش کریں تو بھی تمہیں کچھ نہیں سکھاسکیں گے۔''

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ ٹیچر کسی قابل نہیں ہیں۔'' بچے نے منہ بنا کر کہا۔

خرچہ

''تمہاری بیوی کے ڈرائیونگ سیکھنے پر کتنا خرچہ آیا؟''

''ایک ٹویوٹا، چار سوزوکیاں، آدھی ہنڈا سوک۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

شیش محل

قسط:19

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رب جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری۔ خصوصاً فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور مقدم مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوؤں اور ناآسودہ تمناؤں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہولہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاسی دلچسپ داستان
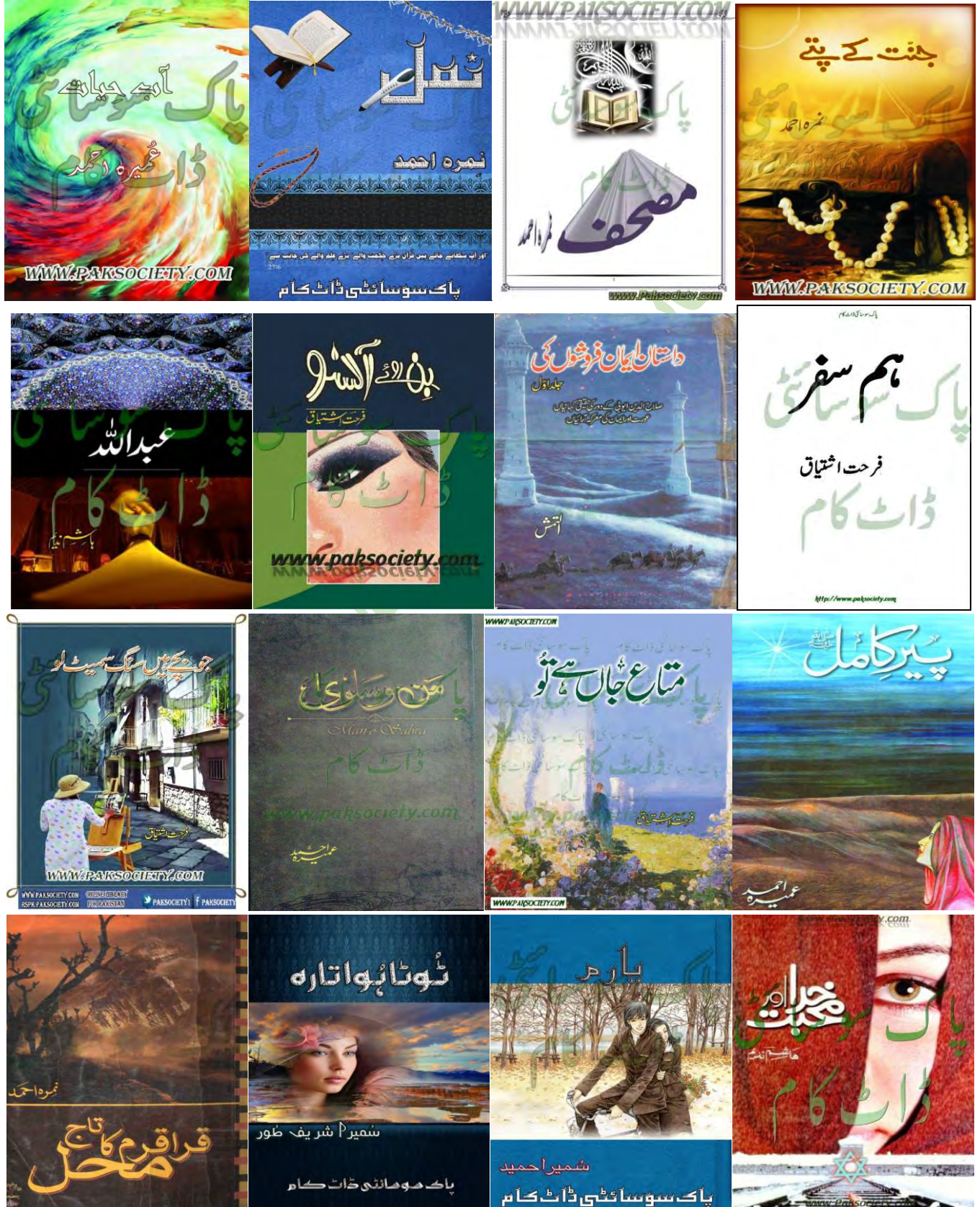
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیامِ پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دورانِ ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ بملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر ربن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو اٹھا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس ربن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے۔ ربن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدرآباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر معلومات حاصل کرتا ہے وہ چاند بانو کی ایکسیڈنٹ کی ذمے دار بملا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ فاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ حویلی میں آپا بیگم کا بیٹا اختر جولیٹ کو پامال کرنا چاہتا ہے تاہم جولیٹ کے شور مچانے پر وہ پکڑا جاتا ہے۔ اسی وقت جولیٹ انکشاف کرتی ہے کہ وہ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور آگے کا فیصلہ نواب سلیم اللہ کی حویلی آمد تک موقوف ہو جاتا ہے۔ تاہم نواب صاحب ہندو بلوائیوں کے حملے میں شدید زخمی ہو جاتے ہیں اور حویلی میں تا حال صورتِ حال تبدیل ہو جاتی ہے۔ فاروق کے اغوا میں بھابیہ سیٹھ کی بیٹی بملا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بملا فاروق کو خود کو اپنانے پر زور دیتی ہے۔ انکار پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ ربن فاروق کو روپوش کر دیتا ہے۔ وہ فاروق کی خواہش پر انوپم اگروال کی فیملی کے ہمراہ اس کے لندن جانے کے انتظامات کرتا ہے۔ ربن فاروق کو دیکھنے بندرگاہ جاتا ہے۔ واپسی میں ڈی ایس پی اور مجو کے گرگے اسے گھیر کر شدید زخمی کر دیتے ہیں۔ ادھر فاروق کو پتا چلتا ہے کہ آغا لندن میں نہیں بلکہ کراچی میں ہے تو وہ جہاز سے اتر کر ایک ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہے۔ وہیں سے وہ کیتھی سے ملنے جاتا ہے جہاں ربن کو بسترِ مرگ پر پڑا پاتا ہے۔ فاروق اپنے دل میں تہیہ کرتا ہے۔ کہ وہ دشمنوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرے گا۔ نواب سلیم اللہ کی حویلی پر بلوائی حملہ کر دیتے ہیں جس میں حویلی کے تمام افراد مارے جاتے ہیں صرف اسد اللہ، صفی اللہ اور آپا بیگم بچتے ہیں۔ اسد اللہ فاروق کو ڈھونڈنے بمبئی گئے ہوتے ہیں، ادھر جولیٹ پہلے ہی حویلی سے نکل چکی ہوتی ہے تاکہ آغا کو اس کے انجام تک پہنچا سکے مگر اس کی کوٹھی پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ آغا کراچی جا چکا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''آپ صورت سے پریشان دکھائی دیتے ہو صاحب اور اتنی رات کو بیچ پر جانے کو مانگتے ہو۔ کوئی لفڑا ہے تو اپنے سے بولو۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے پچھلی نشست پر براجمان سواری کو عقبی آئینے کی مدد سے دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔ اتنی رات کو اپنی ٹیکسی میں بیٹھنے والا یہ شخص اسے بہت عجیب لگا تھا۔ اپنے لباس سے یہ شخص صاحب ثروت لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں اور آنکھوں پر سیاہ شیشوں کا چشمہ تھا۔ وہ اچانک ہی اندھیرے سے نمودار ہوا تھا اور ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر اسے بیچ پر چلنے کا حکم سنایا تھا۔ اس نے نہ تو یہ پوچھنے کی زحمت کی تھی کہ ڈرائیور اس وقت اس کے مطلوبہ مقام پر چلنے کے لیے راضی ہے یا نہیں اور نہ ہی کرایہ طے کیا تھا۔ ڈرائیور کو وہ قدرے پراسرار اور دلچسپ آدمی محسوس ہوا تھا اس لیے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

''کیا مطلب؟ تمہارے خیال میں کیا لفڑا ہے؟'' پراسرار شخص نے قدرے تیکھے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''یہ اپن کیسے بول سکتا ہے بس اپنے کو لگا کہ آپ کسی مشکل میں ہو تو اپن آپ کو ہیلپ کا آفر کر دیا۔'' ڈرائیور اس کے لہجے سے قطعی مرعوب نہیں ہوا اور اطمینان سے بولا۔

''تم کیا ہیلپ کر سکتے ہو۔ تم تو خود ایک معمولی سے ڈرائیور ہو۔'' سوار نے رعونت کا مظاہرہ کیا۔

''آدمی کو جانچے بنا اس کے عام یا خاص ہونے کا فیصلہ کرنا بڑی نادانی ہے صاحب! اپن دیکھنے کو ایک چھوٹا سا آدمی ہے پر بڑے بڑے لوگوں کے کام آتا ہے، بس کام لینے والا اپنی جیب سے نوٹ نکالنا جانتا ہو۔'' ٹیکسی ڈرائیور کے لہجے میں کھلی پیشکش تھی۔

''کیا کیا کام کر سکتے ہو تم؟'' اس بار سوار نے اس میں دلچسپی ظاہر کی۔

''سمجھو ہر کام کر سکتا ہے اپن، بس شرط ہے کام کا اچھا ریٹ دینا۔'' وہ کچھ اور کھلا۔

''ریٹ لے کر آدمی کا مرڈر کر سکتے ہو؟'' سوار نے سرگوشی نما لہجے میں پوچھا تو وہ پل بھر کے لیے چپ ہوا اور پھر بولا۔

''آپ شاید اپنے سے جوک کرتا ہے۔''

''جوک کی کیا بات ہے، ابھی تم ہی نے تو بولا کہ اچھے ریٹ پر ہر کام کر سکتے ہو۔''

''اس سے اپنا مطلب تھا کوئی چرس، کوئی لڑکی، کوئی بوتل شوتل...... آدمی کی پریشانی دور کرنے کو یہ تینوں چیزیں بڑی اچھی رہتی ہیں۔'' سوار کی سنجیدگی نے ڈرائیور کو جزبز کیا۔

''بمبئی میں ان تینوں چیزوں کو حاصل کرنا کیا مشکل ہے کہ تم انہیں مہیا کرنے پر خود کو کام کا آدمی بولتے ہو۔'' سوار نے نخوت کا مظاہرہ کیا تو ٹیکسی ڈرائیور اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور باقی کا راستہ خاموشی سے ٹیکسی چلاتا رہا۔ منزل کے قریب پہنچ کر سوار نے ہی اس خاموشی کو توڑا اور اسے بتانے لگا کہ وہ کس مقام پر ٹیکسی سے اترنا چاہتا ہے۔ وہ ٹیکسی کو ساحل کے اس بعید ترین گوشے میں لے گیا جہاں تاریکی کا راج تھا اور ویرانی ہی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ٹیکسی سے اترنے سے قبل ہی اس نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر ڈرائیور کو کرائے کی رقم تھمائی۔ رقم دیکھ کر ڈرائیور چونک گیا۔ وہ متوقع کرائے سے تین گنا زیادہ رقم تھی۔

''صاحب......'' سوار نے ٹیکسی سے اتر کر پہلا ہی قدم آگے بڑھایا تھا کہ ڈرائیور نے اسے پکارا اور خود بھی پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔ جانے والے نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''اپن اچھا ریٹ لے کر آدمی کا مرڈر بھی کر سکتا ہے۔'' اس نے پست آواز میں اپنا آپ کھولا تو کوٹ پینٹ والا آدمی پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی اور ارد گرد بھی تاریکی کا راج تھا، اس کے باوجود ٹیکسی ڈرائیور کو یوں لگا جیسے وہ چھیدتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہو۔ وہ ساحل پر موجود تھے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم سے ٹکرا کر خوشگوار احساس پیدا کر رہے تھے لیکن اس لمحے جانے کیوں ٹیکسی ڈرائیور کے جسم سے پسینا پھوٹ پڑا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا اور اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اس پراسرار شخص سے مزید گفتگو آگے بڑھانے کے بجائے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتا، اس سے قبل ہی مقابل کھڑے شخص کے ہونٹوں نے حرکت کی اور وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ربن دادا کے قتل میں شامل ہونے کے لیے کتنی رقم لی تھی تم نے؟'' اس سوال پر ٹیکسی ڈرائیور کے قدم لڑکھڑائے اور اس نے پلٹ کر ٹیکسی میں سوار ہونے کی کوشش کی۔

''نہیں رمیش......! تم اتنی آسانی سے نہیں بھاگ سکتے۔ دادا کے قتل میں شامل کوئی بھی شخص اتنی آسانی سے نہیں بھاگ سکتا۔ اس قتل میں شامل ہر شخص کو پورا پورا حساب دینا ہوگا اور میں تم سے اس حساب کا آغاز کر رہا

ہوں۔ بولو کیوں اور کس کے کہنے پر تم اس جرم میں شامل ہوئے تھے؟'' پراسرار شخص جو کہ فاروق تھا، نے ٹیکسی ڈرائیور رمیش کا بازو کسی ہشت پا کی سی سختی سے جکڑ لیا۔ ربن کے قاتلوں سے نمٹنے کے لیے اس نے فوری طور پر اقدامات شروع کردیے تھے۔ سکھ والا حلیہ اس کے لیے اچھی ڈھال ثابت ہوا تھا اور اس حلیے میں وہ آرام سے شہر میں گھومتا رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش پر اسے ٹیکسی ڈرائیور رمیش کا پتا چل گیا تھا۔ اس نے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ عموماً رمیش کس ٹیکسی اڈے پر رات گزارتا ہے چنانچہ وہ رات کو ایک بار پھر روپ بدل کر اس اڈے پر پہنچ گیا تھا اور ساری ٹیکسیوں کو نظرانداز کرکے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رمیش کی ٹیکسی میں سوار ہوگیا تھا۔

''تم کو کوئی غلطی لگی ہے صاحب! اپن کسی دادا کے مرڈر میں شریک نہیں ہوا۔'' اس کی گرفت سے بازو آزاد کروانے کی کوشش کرتے ہوئے رمیش نے خود کو سنبھالا اور اپنی بریت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ تم دادا کے قتل میں شریک تھے یا نہیں۔ تمہاری شرکت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ تم بس مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیوں اور کس کے کہنے پر اس کے قتل میں شامل ہوئے تھے؟'' فاروق نے اپنا سوال دہرایا تو اس کے لہجے کی سنگینی میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا۔ اس موقع پر رمیش نے خلافِ توقع ردعمل کا مظاہرہ کیا اور اپنا بازو فاروق کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش ترک کرکے اچانک ہی داہنی ٹانگ گھما کر فاروق کے پیٹ میں مارنے کی کوشش کی۔ فاروق اس کی طرف سے ایسا غافل نہیں تھا۔ رمیش کی ٹانگ اپنے پیٹ تک پہنچنے سے قبل ہی اس نے اس کا بازو چھوڑا اور اس کی ٹانگ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس قوت سے جھٹکا دیا کہ رمیش کا دوسرا پیر بھی زمین سے اکھڑ گیا اور فاروق نے اسے زور سے زمین سے دے مارا۔ اس کے بعد تو جیسے اس کا جسم مشین بن گیا اور رمیش کو زمین سے اٹھنے کا موقع دیے بغیر وہ لگاتار اسے اپنے پیروں سے مارتا چلا گیا۔ اس نے اپنے پیروں میں بھاری تلے کے جوتے پہن رکھے تھے، ان کی چوٹ نے رمیش کا بھرکس نکال کر رکھ دیا۔ رمیش ایسا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ خاموشی سے پڑا پٹتا رہتا لیکن فاروق پر جو وحشت وجنون سوار تھا اس کی حیثیت ایک تندوتیز طوفان کی سی تھی اور طوفان کے آگے کب کسی کی پیش چلتی ہے۔ رمیش کی بھی ہر کوشش اپنی جگہ دم توڑ گئی اور اسے زمین سے اٹھ کر کھڑا ہونا بھی نصیب نہیں

ہوا۔ رات کے اس پہر اس ویرانے میں کوئی اس کی مدد کرنے اور چیخ وپکار سننے والا بھی نہیں تھا۔ سمندر کے شور سے مل کر اس کی ہر فریاد وپکار وہیں پر گم ہورہی تھی۔ جب نڈھال ہوکر اس نے ہر طرح کی مزاحمت ترک کردی تو فاروق کی وحشت کو ذرا لگام لگی اور اس نے نیچے جھک کر رمیش کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور کھینچ کر ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ وہ ہوش میں تھا لیکن اس حال میں کہ ذرا چوں چاں کی تاب نہیں تھی۔ ہونٹ، ناک اور ایک آدھ دوسرے مقام سے خون بہہ رہا تھا اور چہرے سمیت پورے جسم سے چمٹ جانے والی ساحلی مٹی کے ساتھ مل کر اس کی عجب ہیئت کذائی پیش کررہا تھا۔ فاروق نے ٹیکسی کی اندرونی بتی جلادی تھی اسی لیے یہ سب واضح دکھائی دے رہا تھا۔

''کک...... کون ہو تم اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' رمیش نحیف سی آواز میں بولا تو اس کے لہجے میں خوف کی لرزش تھی۔ اس لرزش کو فاروق کی آنکھوں کی بے پناہ وحشت اور سرخی بتدریج بڑھاتی جارہی تھی۔ اپنی آنکھوں پر موجود سیاہ شیشوں کی عینک اس نے رمیش کی ٹھکائی کے اولین مرحلے میں ہی اتار کر جیب میں رکھ لی تھی اور اب ٹیکسی کی اندرونی روشنی میں رمیش کے لیے خوف کی علامت بنا بیٹھا تھا۔ خوف ودہشت کے اس تاثر کو مزید گہرا کرنے کے لیے اس نے اپنا چاقو بھی باہر نکال لیا اور رمیش کی شہ رگ پر رکھتے ہوئے بولا۔

''میں کون ہوں اس بات کو چھوڑ کر یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور ربن کے قتل کے خونی کھیل میں کیسے شریک ہوئے۔ میں اس خونی کھیل کے ایک ایک کردار کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''اپن کچھ نہیں جانتا۔ اپن سیدھا سادہ ایک ڈرائیور ہے۔ اپن کو جانے دو صاحب...... اپن کے بیوی بچے تم کو دعا دیں گے۔'' وہ جو کچھ دیر قبل بڑا طرم خان بن رہا تھا اور ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار تھا، اب اچانک سیدھا سادہ ڈرائیور بن کر اس کی منتیں کرنے لگا۔

''اب میں تجھ سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اب تیرا منہ اس وقت تک بند رہے گا جب تک تو خود بولنے کے لیے راضی نہیں ہوجاتا۔'' فاروق پر اس کی منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہوا اور مزید سنگین لہجے میں بولتے ہوئے اس نے ٹیکسی میں ہی پڑا ایک میلا کچیلا کپڑا اٹھا کر بہ سرعت ڈرائیور کے منہ میں ٹھونس دیا۔ یہ کپڑا جو شاید وہ اپنی گاڑی کی صفائی کے لیے استعمال کرتا تھا، اب اس کی زبان بندی کا وسیلہ بن گیا تھا۔ اس کا منہ بند کرتے ہوئے فاروق نے اس کا

دایاں ہاتھ تھاما اور بولا۔

''تو ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے دادا کے ہاتھ پیروں کی انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ اب تیرا بھی حق نہیں بنتا کہ تو اپنے ہاتھ پیروں میں انگلیاں لے کر پھرے۔'' جملہ مکمل ہوتے ہی اس نے رمیش کی اکٹھی دو انگلیاں ایک جھٹکے سے کاٹ ڈالیں۔ خود کو بچانے کی کوشش میں رمیش کا جسم جھٹکے لے کر رہ گیا کہ فاروق نے اسے پائیدان پر گرا کر اپنے پیروں کا پورا بوجھ اس کے جسم پر ڈال رکھا تھا۔ انگلیاں کٹنے کی تکلیف سے وہ اپنی جگہ پڑے پڑے ہی پھڑ پھڑانے لگا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے رمیش..... صرف دو انگلیاں کٹنے پر اتنا تڑپ رہے ہو۔ ابھی تو تمہاری پوری اٹھارہ انگلیاں باقی ہیں۔'' یہ وہ نرم خو اور نازک احساسات والا فاروق نہیں تھا۔ یہ وہ فاروق تھا جس نے اپنی عزیز ترین ہستی کی زخم زخم لاش دیکھی تھی، جس نے ایک ایسے شخص کو اسپتال کے بستر پر خاموشی اور بے بسی سے دم توڑتے دیکھا تھا جو زندگی کی علامت تھا۔ جس سے وہ چھاؤں چھن گئی تھی جو زندگی کی تپتی دوپہر میں اس کی بقا کا سبب بنی تھی۔ تو آج کا فاروق اگر ہاتھ سے کتابیں رکھ کر خنجر تھامے درندوں سے ان کی درندگی کا حساب لینے پر اتر آیا تھا تو یہ کوئی اتنی انوکھی بات نہیں تھی۔ درندوں سے کبھی اس زبان اور انداز میں گفتگو نہیں کی جا سکتی جس انداز میں خوش رنگ و خوش گلو معصوم پرندوں سے کی جاتی ہے یا بھولے بھالے مفید مویشیوں سے کی جاتی ہے۔ درندوں سے نمٹنے کے لیے اپنے اندر بھی ایک درندگی پیدا کرنی پڑتی ہے، حوصلے کو بلند کرنا پڑتا ہے اور دل کو مضبوط کر کے بیٹھنا پڑتا ہے۔ تو آج وہ یہ سب کر رہا تھا جب ہی تو رمیش کی تیسری انگلی کو پکڑ کر کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپا نہ دل میں رحم کی کوئی لہر اٹھی۔ تیسری انگلی کٹنے کی اذیت نے رمیش کا رہا سہا دم خم بھی نکال ڈالا اور وہ بری طرح سر پٹختے ہوئے اشارہ کرنے لگا کہ وہ فاروق کا مطالبہ ماننے کے لیے تیار ہے۔

''تمہاری انگلیاں کاٹنے میں بہت لطف آ رہا تھا لیکن تم بڑے عقلمند نکلے کہ صرف تین انگلیوں پر ہی ہار مان لی۔'' فاروق نے زہر خند لہجے میں کہا اور اس کے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا کھینچ کر باہر نکالا۔

''میرا بہت خون بہہ رہا ہے۔ پہلے ان زخموں پر کوئی پٹی باندھ دو۔'' منہ کھلتے ہی اس نے دہشت زدہ لہجے میں اس سے درخواست کی۔

''میرے پاس تو صرف یہ چاقو ہے اور چاقو خون روکتے کے نہیں، خون بہانے کے کام آتا ہے۔ تم چاہو تو میں تمہاری چوتھی انگلی بھی کاٹ کر دکھا سکتا ہوں۔'' بے حد سرد مہری سے یہ بات کہتے ہوئے فاروق نے اس کے دوسرے ہاتھ کا پنجہ گرفت میں لیا۔

''بھگوان کے لیے نہیں۔ تم پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو۔'' رمیش کانپ گیا اور بے اختیار ہی اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا لیکن فاروق کی گرفت اتنی کمزور نہیں تھی کہ وہ اس سے اپنا ہاتھ چھڑا پاتا۔

''مجھے سب کچھ بتاؤ۔ دادا کے قتل کے پیچھے موجود ہر محرک کے بارے میں اور اپنی اس قتل میں شمولیت کے بارے میں۔'' فاروق نے اسے حکم دیا تو وہ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔

''دادا کے مرڈر کے پیچھے سب سے بڑا موٹیو (Motive) بھاٹیہ سیٹھ تھا۔ کچھ دن ہوئے سیٹھ کی اکلوتی بیٹی نے سوسائڈ کر لی۔ پولیس کے ایکسپرٹس کی رپورٹ یہی کہتی تھی کہ لڑکی نے آتما ہتھیا کی ہے لیکن سیٹھ یہ بات نہیں مانتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ اس کی بیٹی کا مرڈر ہوا ہے اور اس مرڈر میں ربن اور اس کے اڈے کے لوگ شامل ہیں۔ سیٹھ اسپیشلی کسی فاروق استاد کا نام لیا تھا لیکن پتا لگا کہ ربن نے فاروق کو کہیں چھپا دیا ہے یا کنٹری سے باہر نکال دیا ہے۔ سیٹھ بولا فاروق سے جب موقع ملے حساب لے لیں گے، پہلے اس کے گاڈ فادر ربن کا کام تمام کرواور ایسا چکر چلاؤ کہ پورا اڈا تباہ ہو جائے۔ پولیس پہلے ہی ربن سے خار کھائے بیٹھی تھی۔ گورے افسر ولیم کے کیس میں انوالو ہونے کے باوجود ربن اس کیس سے صاف بچ نکلا تھا اور پولیس کی اچھی خاصی انسلٹ ہوئی تھی۔ اس کیس میں پولیس کو مجو دادا نے ربن کا نام دیا تھا۔ اس کی انسپکٹر وکرم سے گہری یاری ہو گئی تھی۔ انسپکٹر نے اپنے پروموشن کے چکر میں مجو کو بہت چھوٹ دی اور اپنے پاس پناہ بھی دے بیٹھا۔ بعد میں انسپکٹر خود غائب ہو گیا اور مجو ہی نے بتایا کہ اس کام کے پیچھے بھی ربن کا ہاتھ ہے۔ پولیس کو ثبوت بھی مل گیا اور ربن کے وہ دونوں آدمی پکڑے گئے جو انسپکٹر کی لاش کو ٹھکانے لگانے لے جا رہے تھے۔ اتنے بڑے ثبوت کے بعد پولیس ربن کو اریسٹ کر سکتی تھی لیکن ڈی ایس پی راٹھور نے الگ چکر چلا دیا۔ اس نے ربن سے ڈیمانڈ کی کہ وہ بلوائی بن کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلمان آبادیوں پر دو چار حملے کر ڈالے تو سارا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ربن نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ ڈی ایس پی راٹھور بھی معاملہ ختم کرنے کا

کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ صرف ربن کو جھانسا دے کر اس سے یہ کام لینا چاہتا تھا۔ ایک دو بلووں کے بعد پولیس خود ربن اور اس کے ساتھیوں کو گھیر کر مار ڈالتی یا اریسٹ کر لیتی اور دنیا کو یہ بتایا جاتا کہ مسلمان آبادیوں پر اصل میں ہندو نہیں بلکہ غنڈے بدمعاش حملے کر رہے ہیں جن کا مقصد لوٹ مار کرنا ہے۔ ربن کے مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھا کر ایک بیان یہ بھی داغ دیا جاتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے اصل میں خود مسلمان ہی ہیں اور وہ یہ سارا ڈراما خود کو مظلوم اور ہندوؤں کو ظالم ثابت کرنے کے لیے کر رہے ہیں یوں ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے لیکن ربن مانا ہی نہیں تو اسے دوسرے طریقے سے شکار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

''میں ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں سالوں سے پولیس کے لیے کام کر رہا ہوں لیکن کبھی کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوا۔ اڈے کے لوگوں کو بھی نہیں کیونکہ میں نے کبھی ان کے کسی کام میں دخل ہی نہیں دیا۔ پر اس بار میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ ربن اکیلے میں کہیں آتا جاتا دکھائی دے تو اس پر نظر رکھوں اور فوراً تھانے میں رپورٹ کروں۔ نصیب سے ایسا ہوا کہ ربن میری ٹیکسی میں بیٹھ کر ہی سی پورٹ جانے کے لیے نکلا تو میں اسے ادھر چھوڑ کر سیدھا تھانے پہنچ گیا۔ ڈی ایس پی صاحب کو فون کر کے ساری بات بتائی گئی تو وہ بھی آ گئے اور مجو دادا اور اس کے ساتھیوں کو بھی بلوا بھیجا۔ ہم کو اندازہ تھا کہ ربن پورٹ پر گیا ہے تو اسے وہاں تھوڑا اسے لگے گا لیکن پھر بھی وہ ہمارے اندازے سے تھوڑا پہلے ہی ادھر سے لوٹ پڑا۔ راستے میں مجو دادا ہی نے تانگے میں اس کی جھلک دیکھ کر باقیوں کو خبردار کیا تو اسے وہاں گھیر لیا گیا۔ آگے جو ہوا وہ تو تم بھی سمجھ سکتے ہو۔'' بولتے بولتے آخر میں رمیش کا لہجہ ایسا ہو گیا جیسے اسے بہت نقاہت ہو رہی ہو اور وہ مشکل سے ہی گفتگو کو جاری رکھے ہوئے ہو۔ تینوں کٹی ہوئی انگلیوں سے جاری خون کا... بسرعت اخراج ہی یقیناً اس نقاہت کا سبب تھا۔ کچھ اثر نفسیاتی بھی ہوگا کہ اپنے جسم سے اپنے خون کو تیزی سے خارج ہوتا دیکھنا واقعی بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے اور پولیس کے ایک مخبر میں اتنا دل گردہ نہیں ہوتا۔

''تم فاروق استاد ہونا؟ اپن نے تمہیں دیکھ رکھا ہے پر تمہارا حلیہ بدلا ہوا ہونے کی وجہ سے پہلے پہچانا نہیں تھا۔'' رمیش کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی فاروق کچھ پل کے لیے یوں ہی بیٹھا رہا تو خود رمیش نے ہی دوسری بات چھیڑی۔

''پہلے پہچان جاتے تو اس جال میں پھنسنے کے بجائے مجھے کسی جال میں لے جا کر پھنسا دیتے۔'' فاروق نے اس پر طنز کیا۔

''اپن نے تمہاری بہت تعریف سنی ہے۔ لوگ کہتے ہیں تم من کے بہت نرم ہو۔ پلیز اپن کا بلڈ روکنے کے لیے کچھ کرو بلکہ ہو سکے تو اپنے کو اسپتال پہنچا دو۔'' اب وہ خوشامد پر اتر آیا تھا۔

''صرف تین انگلیاں کٹنے سے کوئی اتنی جلدی نہیں مرتا رمیش! دادا کی بیس کی بیس انگلیاں کاٹ دی گئی تھیں، اس کے جسم پر چاقو سمیت پتا نہیں کن کن چیزوں سے گھاؤ لگائے گئے تھے اور سب سے بڑھ کر اس کے سینے میں گولی ماری گئی تھی پھر بھی وہ کئی گھنٹوں تک زندہ رہا تھا، صرف اس آس پر کہ آخری سانسیں میری موجودگی میں لے گا۔ کیا اس دنیا میں تمہارا ایسا کوئی پیارا نہیں ہے کہ جس کے لیے تم جینا چاہو، چاہے تمہارے جسم سے زندگی قطرہ قطرہ کر کے نکل رہی ہو پھر بھی تم اس پیارے کا دیدار ہونے تک جیتے رہو۔'' فاروق کے لہجے میں ایسی سرد مہری اور بے اعتنائی در آئی کہ رمیش کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

''بھگوان کے لیے مجھ پر دیا کرو۔ میں یہاں پڑے پڑے مر گیا تو میرے بچوں کا کیا ہوگا۔'' رمیش باقاعدہ رونے لگا۔

''تمہیں ایسی درخواست کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تم نے ربن کے ساتھ وہ سب کرتے ہوئے سوچا تھا کہ ایک اس کے جانے سے کتنے لوگ اجڑ جائیں گے۔ تم اکیلے اپنے بچوں کے لیے روتے ہو لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ ربن کا ہاتھ کتنے بے آسرا بچوں کے سر پر تھا۔ وہ بمبئی کے کتنے یتیموں کی کفالت کر رہا تھا۔ دادا تو اس کو حالات نے بنا دیا تھا ورنہ اس کے سینے میں کیسا سونے کا سا دل تھا، کاش کسی نے دیکھا ہوتا۔ اس نے تو کبھی کسی مظلوم کی مدد کرتے ہوئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی کہ وہ مسلمان ہے، ہندو ہے، سکھ ہے یا پارسی۔ وہ تو بس انسانوں کے کام آتا تھا لیکن تم جیسے درندے بھلا ایک اچھے انسان کو کیسے پہچان سکتے تھے۔ تم نے اسے قتل کر دیا اور اپنے لیے زندگی مانگتے ہو۔ کیسے ظالم ہو تم لوگ۔''

فاروق نے ایک آہ بھری اور کرب سے آنکھوں کو بھینچ لیا۔ رمیش کو شاید ایسے ہی کسی موقع کی تلاش تھی۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے یکدم ہی فاروق کے چاقو والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ ردعمل میں فاروق کے ہاتھ نے اضطراری حرکت کی اور چاقو اسے کھینچ مارا۔ چاقو سیدھا اس کے قدموں میں پڑے رمیش کے دل میں پیوست ہوا اور اس کا جسم جھٹکا کھا کر لمحوں میں ساکن ہو گیا۔

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی...... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرربار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہربار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لپٹی دل گداز داستان

بہت جلد

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

دل پر ہونے والے وار نے اسے دوسرا سانس لینے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ ہر چند کہ فاروق خود بھی اسے زندہ چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا پھر بھی اس کے یکدم زندگی سے محروم ہوجانے پر ذرا دیر کے لیے سناٹے میں آگیا۔ زندگی بڑی بے ثبات شے کا نام ہے لیکن یہ جب بھی بچھڑتی ہے، پیچھے والوں کو جھٹکا ضرور لگتا ہے۔ فاروق کو بھی ایک جھٹکا لگا تھا اور پل بھر کے لیے ان بچوں کا خیال بھی آیا تھا جن کا وہ اسے مسلسل واسطہ دیتا رہا تھا لیکن وہ جو کچھ کررہا تھا، اس کا جلد یا بدیر یہی انجام ہونا تھا۔ ایک طرف وہ پولیس کے لیے خفیہ طور پر خدمات انجام دے رہا تھا تو دوسری طرف اپنے لیے ایسے شکار ڈھونڈتا پھرتا تھا جن کی مطلوبہ خدمات انجام دے کر چند نوٹ کھرے کرسکے۔ یہ خدمات یقینی طور پر اخلاق اور قانون کے دائرے سے باہر تھیں جیسے کہ اس نے فاروق کو بھی پیشکش کی تھی۔ اس نے تو یہاں تک بھی اعتراف کیا تھا کہ وہ رقم کے عوض قتل بھی کرسکتا ہے تو ایسا آدمی بھلا کس ہمدردی کے لائق تھا۔ وہ ایسا ویسا آدمی نہ ہوتا تو رات کے اس پہر اس کے ساتھ ساحل کے اس دور افتادہ حصے تک کیوں چلا آتا۔ اسے آس ہوگی کہ پسنجر اس کے مطلب کا ہوا تو اس کی جیب ڈھیلی کروانے میں کامیاب ہوجائے گا اور کسی مشکوک سرگرمی میں مبتلا پایا گیا تو وہ پولیس کو مخبری کرکے وہاں سے انعام پائے گا لیکن ہر بار تو آدمی کو کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ سیانا کوا بھی کبھی دھوکا کھا جاتا ہے اور یہی آج رمیش کے ساتھ ہوا تھا۔

فاروق اس کی موت کے لحاتی صدمے سے باہر آیا تو پہلے اس کے سینے سے اپنا چاقو کھینچ کر اس کے کپڑوں سے صاف کیا پھر اپنے ہاتھ بھی پونچھ ڈالے۔ خون کے چھینٹے اس کے لباس پر بھی آئے تھے لیکن وہ پہلے ہی بااہتمام ایسے گہرے رنگ کا لباس پہن کر آیا تھا کہ اس پر خون کے یہ داغ نمایاں نہیں ہورہے تھے۔ رمیش کی لاش کو ٹیکسی میں چھوڑ کر وہ نیچے اترا اور خراماں خراماں چلتا ہوا وہاں سے دور ہٹتا چلا گیا۔ اس کے پیروں میں اتنی جان تھی کہ وہ ویرانے کو طے کرکے اسے کسی ایسے مقام تک پہنچا سکیں جہاں سے اسے اپنے لیے سواری مل جائے البتہ رمیش کا بے جان جسم ایک سواری میں موجود ہونے کے باوجود حرکت کرنے سے محتاج تھا اور لاش کے دریافت ہونے تک اسے وہیں پڑے رہنا تھا۔

☆☆☆

''اب کیا ارادہ ہے سسٹر! اب کیا کرنے کا ہے؟'' ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی جولیٹ کے چہرے پر شکست خوردگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے وہ سارا ہار سنگار ختم کردیا تھا جو آغا تک رسائی کے لیے کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ بہت سادہ سیا کرتہ پاجامہ اور اس کا ہم رنگ دوپٹا زیب تن کیے ہوئے تھی اور اس کے ذہنی تناؤ کا یہ حال تھا کہ اس نے جانی کے سامنے اعتراف کرلیا تھا کہ ولدار آغا ہی وہ شخص ہے جس نے اس کی زندگی تباہ کی تھی۔ سمجھ جانی خود بھی گیا تھا۔ پنجاب کے اس حصے میں جولیٹ انتقام کے ارادے سے ہی آئی تھی اور اس نے بڑی تیاری کے ساتھ آغا کی رہائش گاہ کا رخ کیا تھا تو یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ کس شخص سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ جولیٹ نے اس کے سامنے یہ بھی اعتراف کرلیا تھا کہ اس نے جانی سے سیلف ڈیفنس کے نام پر جو چاقو حاصل کیا تھا، اس کا اصل مقصد آغا سے انتقام لینا ہی تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ہر بار آغا کی قسمت اسے بچالے گئی تھی۔ آغا کی یہ خوش نصیبی جولیٹ کی بدنصیبی تھی۔ اپنی بدنصیبی پر شاکی وہ خلاف طبیعت بار بار آغا کو کوسنے لگتی تھی۔ جانی اس کی ذہنی اور قلبی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اس لیے فوری طور پر کچھ نہیں بولا لیکن جب جولیٹ قدرے پُرسکون ہوکر ایک طرف خاموش بیٹھ گئی تو اس سے اس کے اگلے قدم کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''میں اپنی آخری سانس تک اس سے بدلہ لینے کا ارادہ نہیں بدل سکتی اور طے کرچکی ہوں کہ قبر تک اس کا پیچھا کروں گی اس لیے یہ بات صاف ہے کہ اگر وہ کراچی گیا ہے تو مجھے بھی کراچی جانا ہے۔'' شکست کا صدمہ اپنی جگہ تھا لیکن اپنے عزم میں وہ اب بھی بہت پختہ تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے سسٹر لیکن کراچی جانا بھی اتنا ایزی نہیں ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ سالا حالات کتنا خراب ہے۔ راستے میں بھی کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ اپن تو بولتا ہے کہ تم واپس بمبئی چلو۔ ادھر دادا ہے، وہ اس معاملے کو سنبھال لے گا۔ تم کس واسطے خود کو اتنا ہلکان کرتا ہے۔'' جانی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے اپنے مجرم کو اپنے ہاتھ سے سزا دینی ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں تم بار بار ایک ہی بات کرتے ہو۔ میں نے تمہیں زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھا ہے۔ تمہیں دادا کے پاس جانا ہے تو تم جاؤ۔ میں اپنے لیے کراچی جانے کا انتظام خود کرلوں گی۔'' جولیٹ نے تیز اور مشتعل لہجے میں جانی کو جواب دیا۔ لہجے کا یہ اشتعال دانستہ تھا۔ بھلا وہ کیسے ربن کے پاس جاسکتی تھی کہ اسے معلوم تھا، اب تک اسد اللہ وہاں پہنچ چکے ہوں گے اور فاروق کی

صورت اپنے بچھڑے بھتیجے محب اللہ تک رسائی حاصل کر لی ہوگی۔ فاروق ان کے خود تک پہنچنے کا ذریعہ دریافت کرتا تو لازماً جولیٹ کا تذکرہ آتا اور اس کے تذکرے کے ساتھ ہی اس کی بربادی کی داستان بھی سامنے آجاتی۔ وہ اپنی بربادی کی اس داستان کے ساتھ اپنے باپ کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دوبارہ ان سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی پھر وہ ربن تک کیسے جاتی کہ اس تک جانے کی صورت میں اسے اسد اللہ کی خود تک رسائی کا خدشہ تھا۔ اس نے چار دن اپنے باپ کی محبت وشفقت کے سائے میں گزار لیے تھے اس کو ہی اپنی خوش نصیبی سمجھتی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ انہیں اپنے حوالے سے اذیت سے گزرتا ہوا دیکھے۔

''تم ایک دم رانگ سوچ رہا ہے سسٹر۔ اپن کو بھی معلوم ہے کہ اپنے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں ہے، بس اپن کو جو ٹھیک لگ رہا تھا اپن تمہیں وہ ایڈوائز کیا تھا۔ تم ریفیوز (انکار) کرتا ہے تو ٹھیک ہے اپن تمہارے ساتھ کراچی چلے گا اور تمہارا کام ہو جانے کے بعد دادا کے پاس واپس لوٹے گا۔ اپن تمہارے کو سسٹر بولا ہے۔ تمہارے واسطے اپن دادا سے چار باتیں بھی سن لے گا۔'' جانی نے اسے اپنا فیصلہ سنایا۔

''سوری برادر! میں جانتی ہوں کہ تم میرے ساتھ سنسیئر ہو لیکن میں تمہارے اوپر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ تمہاری دادا کے ساتھ اچھی انڈراسٹینڈنگ ہے اور تمہارے سارے معاملات اس کے ساتھ چلتے ہیں تو اچھا ہے تم اسی کے ساتھ رہو۔ میں تو ویسے بھی دنیا میں اکیلی ہوں اور اکیلے جینے کا ہنر بھی سیکھ چکی ہوں۔ کراچی پہنچنے کے لیے بھی کسی نہ کسی طرح راہ نکال ہی لوں گی۔'' جولیٹ اس بار نرم لہجے میں جانی سے مخاطب ہوئی۔

''اب تم غیروں والی بات کرتا ہے سسٹر! ایسا کونسا بے غیرت بھائی ہوگا جو اپنی بہن کو ایسے حالات میں اکیلا چھوڑ دے گا۔ تم کو ایسے چھوڑ کر اپن دادا کے پاس جائے گا تو وہ بھی اپنے منہ پر تھوک دے گا۔'' اس بار جانی نے اپنے لہجے سے خفگی کا اظہار کیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا برادر۔ میں تو بس......''

''مطلب وطلب کو چھوڑو۔ فائنل فیصلہ ہو گیا ہے کہ اپن تمہارے ساتھ رہے گا اور تمہارے ساتھ ہی کراچی جائے گا۔ اب آگے سے تم کو کچھ بولنے کا نہیں ہے۔'' جانی نے اس کی بات کاٹ دی اور اپنا فیصلہ سنایا تو جولیٹ کے پاس بھی اگر مگر کی گنجائش ختم ہو گئی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''او کے باس جیسا تم بولو۔ اب میں تمہارے بی ہاف پر ہوں۔'' اور جانی کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ مسکرائی تو سہی۔

☆☆☆

''ہم لٹ گئے، ہم برباد ہو گئے اسد اللہ۔ ہمارا پورا خاندان ختم ہو گیا۔ ہائے ابا جان......! آپ کیا گئے پورا خاندان آپ کے پیچھے چلا گیا۔ اکیلے ہم دو بھائی ضعیف پھپھی جان کے ساتھ فرقت کے اس اتنے بڑے صدمے سے کیسے نمٹیں گے، کسی نے یہ بھی نہ سوچا۔'' اسد اللہ حیدر آباد پہنچے تو ان کی ہر آس، ہر امید نے دم توڑ دیا۔ زخمی صفی اللہ جنہوں نے جانے کیسے اب تک خود کو سنبھالا ہوا تھا، انہیں سامنے پا کر ان کی بانہوں میں بکھر بکھر گئے۔ خود اسد اللہ کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ وہ پیاری بہن عالیہ، وہ فرمانبردار اور سمجھدار بھتیجا حبیب اللہ، اس کی ہنستی مسکراتی بیوی اور پھول سے پیارے بچے، وہ تیکھے مزاج والی عشرت جہاں، شفیق سی بھابی، عزیز دوست کا پیارا بیٹا آصف خان اور وفادار و جاں نثار ملازمین...... کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔ وہ جن لوگوں کے لیے خوشیاں لینے بمبئی گئے تھے، وہ سب جہان ہی چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ واپس آکر محب اللہ کے مل جانے کی خوشی اور آصف خان اور جولیٹ کی نسبت طے ہو جانے کا جشن ایک ساتھ منعقد کریں گے لیکن نہ تو وہ محب اللہ کو اپنے ساتھ لا سکے تھے اور نہ ہی یہاں کچھ باقی بچا تھا۔ ان کی جولیٹ، ان کی جوزفین کی واحد نشانی بھی آگ وخون کے اس کھیل میں ان سے کھو گئی تھی لیکن...... لیکن...... انہوں نے لحہ بھر کو رک کر صفی اللہ کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک فرد کے نام کو یاد کیا۔ صفی اللہ نے جن جن کے مرنے کا تذکرہ کیا تھا، ان میں جولیٹ کا نام شامل نہیں تھا۔ وہ یہ نام بھول گئے تھے یا...... ان کے دل میں امید کی ننھی سی کرن چمکی۔ 'کیا پتا میری جولیٹ زندہ ہو۔ اسے اللہ نے بچالیا ہو۔' غم سے نڈھال بڑے بھائی کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے ان خطوط پر سوچا ضرور لیکن صدمہ بہرحال اتنا بڑا تھا کہ خود انہیں اپنا آپ سنبھالنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے موقع پر ان کے میزبان اور کرم فرما نواب ثروت بیگ نے دخل اندازی کر کے ان کی مشکل آسان کی اور بہت دلسوزی سے دونوں بھائیوں کو تسلی اور دلاسا دینے لگے۔

ثروت بیگ، نواب فراست بیگ جیسے وضع دار آدمی کے بیٹے تھے اور اپنے والد کی صفات انہیں ورثے میں ملی تھیں۔ ان کی حویلی میں تو ملازمین کا بھی خصوصی خیال رکھا جاتا تھا اور یہاں تو معاملہ نواب سلیم اللہ کے خاندان کا تھا

جہاں پشتوں سے دوستی کا سلسلہ قائم تھا۔ انہوں نے بہت کشادہ دلی سے نواب سلیم اللہ کے خاندان کے باقی ماندہ افراد کو اپنی حویلی میں جگہ دی تھی اور جملہ مرنے والوں کے جنازے ان ہی کی حویلی سے اٹھائے گئے تھے۔ تجہیز اور تکفین سے لے کر مرنے والوں کی دیگر آخری رسومات تک سب اخراجات انہوں نے خود اپنی جیب سے کیے تھے حالانکہ دربار سے بھی اس سلسلے میں پیشکش کی گئی تھی لیکن انہوں نے رسم دوستی نبھانے کے لیے ان فرائض کی تکمیل کی ادائیگی خود کرنا ضروری سمجھا تھا اور بخوبی یہ فرض نبھایا تھا۔

اسداللہ کی واپسی کے بارے میں خبر ملتے ہی انہوں نے اپنے منشی کو مع ڈرائیور وگاڑی مستقل اسٹیشن پر بٹھادیا تھا کہ جیسے ہی اسداللہ کی تشریف آوری ہو، انہیں آرام واحترام سے یہاں لایا جاسکے اور ایسا ہی ہوا تھا اور اب وہ ان بھائیوں کے ساتھ بیٹھے ان کا غم بانٹ رہے تھے۔ تسلی وتشفی کی بہت سی باتیں کر چکنے کے بعد جب انہوں نے دونوں بھائیوں کے جذبات کو قدرے اعتدال پر پایا تو کھانا لگانے کے سلسلے میں اجازت چاہی۔

''پہلے ہم پھپھی جان سے ملاقات کریں گے پھر شہداء کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے جائیں گے۔ کھانے کا فی الحال کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ضرورت زندگی ہے اور اس سے کسی صورت منہ نہیں موڑا جاسکتا لیکن چند وقت کا کھانا نہ کھانے سے کوئی اتنا بڑا فرق بھی نہیں پڑتا...... آدمی بڑی ڈھیٹ چیز کا نام ہے، برے سے برے حالات میں بھی جینے کا کوئی سہارا تلاش کر ہی لیتا ہے۔ ہم دونوں بھائی بھی ایسے ہی کسی سہارے سے جی لیں گے لیکن فی الوقت آپ اصرار نہ فرمائیے۔'' اسداللہ کی آنکھیں شدتِ غم سے سرخ ہورہی تھیں۔ انہوں نے کچھ ایسی قطعیت سے نواب ثروت بیگ کی کھانے کی دعوت مسترد کی کہ وہ مزید اصرار نہیں کرسکے اور دھیمے لہجے میں بولے۔

''آپ کی پھپھی بیگم اندر زنان خانے میں موجود ہیں۔ صدمے نے انہیں سکتے میں مبتلا کردیا ہے۔ ڈاکٹر صبح وشام باقاعدگی سے ان کے معائنے کے لیے آرہا ہے لیکن وہ ہنوز اسی کیفیت میں ہیں۔ آپ ان سے ملاقات کرکے دیکھ لیں، شاید ان کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع ہوجائے۔'' ثروت بیگ نے انہیں ندرت جہاں کی حالت سے باخبر کیا اور ملازم کو حکم دینے لگے کہ اندر زنان خانے میں پردے کا کہلوادیا جائے۔ صفی اللہ اس ساری گفتگو سے بے نیاز اسداللہ کے پہلو میں گم صم بیٹھے تھے۔ اسداللہ نے اب تک اپنا ایک بازو ان کے گرد حمائل کررکھا تھا۔ بیٹے کی طویل جدائی کو خاموشی سے برداشت کرنے والے صفی اللہ پورے خاندان کو کھودینے کے بعد ڈھے سے گئے تھے اور اپنی اصل عمر سے کئی برس آگے محسوس ہورہے تھے۔ بلوے والی رات انہیں گولی بس چھو کر گئی تھی اس لیے زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اور دو تین پٹیوں سے ہی ٹھیک ہوگیا تھا۔ ذرا دیر بعد اسداللہ نواب ثروت بیگ کی معیت میں زنان خانے میں پہنچ گئے۔ بہترین لباس میں ملبوس ندرت جہاں صاف ستھرے بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھیں اور ایک ملازمہ ان کی خدمت پر مامور تھی۔ ملازمہ نے ادب سے انہیں اور نواب ثروت بیگ کو سلام کیا۔

''آداب پھپھی جان۔'' اسداللہ نے ندرت جہاں کے پلنگ کے قریب جاکر اتنی آواز میں کہا کہ وہ بہ آسانی سن لیں لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئیں اور یک ٹک کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتی رہیں۔ ان کا لباس اور صاف ستھرا جسم گواہی دے رہا تھا کہ یہاں ان کی بہترین نگہداشت و دیکھ بھال ہورہی ہے اس کے باوجود یہ وہ ندرت جہاں نہیں تھیں جنہیں چھوڑ کر وہ بمبئی گئے تھے۔ اکلوتے بیٹے اختر کی موت نے اگرچہ پہلے ہی ان کو بستر سے لگادیا تھا لیکن اب تو حال ہی جدا تھا۔ وہ ندرت جہاں کے بجائے ان کا سایہ محسوس ہورہی تھیں۔

''پھپھی جان! ہم ہیں اسداللہ۔ ہماری طرف دیکھیے۔'' اس بار اسداللہ نے ان کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ کر ہمدردی اور محبت سے پکارا لیکن ان کے کسی عضو میں معمولی سا تحرک بھی پیدا نہیں ہوا۔

''مسلسل یہی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے صدمے کی شدت نے انہیں اس حال تک پہنچادیا ہے۔ ڈاکٹر سکون آور ادویات استعمال کروارہا ہے لیکن یہ بتانے سے قاصر ہے کہ یہ کتنے عرصے تک اسی حال میں رہیں گی۔'' ان کے ساتھ موجود ثروت بیگ نے آہستہ سے انہیں بتایا تو وہ یونہی سر ہلا کر رہ گئے۔ ندرت جہاں عرف آپا بیگم جنہوں نے نہایت طویل عرصے تک اپنے بھائی سلیم اللہ کی حویلی پر حکمرانی کی تھی اور براہِ راست لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی رہی تھیں، اب اس بے کسی کی حالت میں لیٹی انہیں ذرا اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ باوجود یہ کہ جوزفین کو ان کی زندگی سے نکالنے میں انہوں نے سب سے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ وہ اس لمحے ان کے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کررہے تھے۔ کچھ بھی سہی ان کے درمیان خونی رشتہ تھا اور خون کے رشتے کی کشش کے علاوہ دردِ مشترک نے بھی جذبۂ ہمدردی کو پروان چڑھایا تھا۔ وہ کچھ

دیر یونہی ندرت جہاں کے سرہانے کھڑے رہے پھر واپس مردانے میں آ گئے۔ موٹر انہیں قبرستان لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ صفی اللہ بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھے۔ دونوں بھائی نواب ثروت بیگ کے ہمراہ موٹر میں جا بیٹھے اور موٹر چل پڑی۔

''عشرت جہاں کے سسرالی عزیز تو اس موقع پر ضرور تشریف لائے ہوں گے؟'' اسد اللہ نے دھیمی آواز میں صفی اللہ سے دریافت کیا۔ نواب ثروت بیگ کے خاندان سے دیرینہ تعلقات سہی لیکن رشتے داری کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ایسے غم کے موقع پر رشتے دار ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر سہارا دیتے ہیں پھر یہاں تو عشرت جہاں خود اس سانحے میں اپنی جان سے گئی تھیں۔ گھر کی بہو کے حوالے سے نواب سلیم اللہ کے خاندان کا دکھ ان کا اپنا دکھ تھا پھر کیا تھا کہ ان لوگوں کا کوئی کردار نظر نہیں آ رہا تھا۔

''وہ لوگ میت میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ثروت بیگ نے آپ کی واپسی اور رسم قل تک اپنی حویلی میں رکنے کی پیشکش کی لیکن وہ لوگ یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ رسم قل وہ اپنے گھر پر منعقد کریں گے تاکہ ان کے اعزا اور احباب بھی اس میں شرکت کر سکیں۔ ہمیں کسی ذریعے سے البتہ یہ معلوم ہوا ہے کہ پہلے ابا جان اور پھر حویلی کو نشانہ بنائے جانے پر وہ لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہمارا خاندان کسی ذاتی دشمنی کا شکار ہوا ہے اس لیے اس خدشے کے تحت کہ کہیں کسی اگلے حملے میں وہ لوگ بھی زد میں نہ آ جائیں، وہ ہمارے خاندان سے دور رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' صفی اللہ نے دھیمی آواز میں ان کے سوال کا جواب دیا۔ ثروت بیگ سے بہت قریبی تعلقات کے باوجود اپنوں کے اس بےدردرویے کو ان کے سامنے بیان کرنے میں انہیں جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔

''زمانے کا یہی دستور ہے بھائی جان! ڈوبتے ہوئے جہاز کے قریب کوئی بھی جانا پسند نہیں کرتا۔'' اسد اللہ نے مختصر تبصرہ کیا اور سرد آہ بھر کر راستے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حیدرآباد میں انہوں نے اپنے بچپن سے جوانی اور پھر ادھیڑ عمری تک کئی برس گزارے تھے۔ یہاں کا چپا چپا ان کا دیکھا بھالا تھا۔ یہاں کے ذرّے ذرّے سے انہیں محبت تھی اور گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس دھرتی پر اس بری طرح لٹ جائیں گے کہ یہاں کی ہوائیں بھی انہیں اجنبی لگنے لگیں گی۔ تحریکِ پاکستان پر نظر ہونے اور مسلمانوں کو اپنے مطالبے میں حق بجانب محسوس کرنے کے باوجود انہوں

مصیبت

ایک عورت دوسری عورت سے۔ ''میں تمہیں اپنی صحیح عمر تو بتا دوں لیکن تم میری بات کا یقین نہیں کرو گی؟''

دوسری عورت۔ ''یہی مصیبت میرے ساتھ بھی ہے۔ میرا بھی کوئی یقین نہیں کرتا۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

چھوٹی سی بات

☆ ہوا میں تعمیر کردہ محل نہایت پائیدار ہوتے ہیں کیونکہ وہ آپ خود بناتے ہیں، کسی ٹھیکیدار سے نہیں بنواتے۔

☆ خیالات کی آمدنی کم ہو تو لفظوں کی فضول خرچی سے پرہیز کریں۔

☆ وقت ایک ایسا آوارہ گرد ہے جس کے پاس ایک جگہ پر قیام کرنے کے لیے کوئی خیمہ نہیں۔

☆ کوشش کر کے ناکام ہو جانا بہتر ہے، بجائے اس کے کہ کوشش ہی نہ کی جائے۔ جل کر کباب ہو جانے سے بہتر ہے کہ انسان کھل کر گلاب ہو جائے۔

تخت

ایک چیونٹی نے جلیل القدر پیغمبر بادشاہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر کی دعوت کی۔ آپؑ کے لشکر میں انسانوں کے علاوہ جنات اور پرند، چرند، درند بھی شامل تھے۔ ہواؤں اور موسموں پر بھی آپؑ کی حکومت تھی۔ میزبان چیونٹی کو حضرت سلیمانؑ نے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور پوچھا۔

''بتا تیری سلطنت بڑی ہے یا میری؟''

چیونٹی نے کہا۔ ''کس کی سلطنت پُرعظمت ہے؟ یہ بات تو اللہ کو معلوم ہے مگر میں یہ جانتی ہوں کہ اس وقت میرا تخت سلیمانؑ کا ہاتھ ہے۔''

قلمی تعاون۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مسلمان حیدر آباد میں غیر محفوظ ہیں یا انہیں یہاں سے ہجرت کا فیصلہ کرنا پڑے گا لیکن دلِ برباد یکدم ہی یہاں کی فضاؤں سے بیزار ہوگیا تھا اور یہاں کی سرزمین میں جو واحد کشش باقی رہ گئی تھی، وہ اپنے پیاروں کی قبریں تھیں۔ انہی قبروں پر حاضری دینے کے لیے وہ شہرِ خموشاں کی طرف گامزن تھے۔

قبرستان پہنچ کر نواب ثروت بیگ کی ہمراہی میں دونوں بھائی ایک قطار میں بنی ان قبروں تک پہنچے جن میں ان کے پیارے، ان کے جگر کے ٹکڑے ابدی نیند سوئے ہوئے تھے۔ قبریں ابھی کچی تھیں اور ان پر گزشتہ یوم ڈالی گئی پھولوں کی پتیاں مرجھا سی گئی تھیں۔ نواب ثروت بیگ کے ڈرائیور نے مرجھائی ہوئی پتیاں صاف کر کے ساتھ لائی تازہ پھولوں کی پتیاں قبروں پر پھیلانے کا کام شروع کر دیا۔ ہر قبر کے سرہانے نشانی کا پتھر رکھا تھا۔ جس پر سفید چاک سے صاحبِ قبر کا نام درج تھا۔ اسد اللہ ایک ایک قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنے سے قبل مردے کا نام پڑھتے تھے۔ صفی اللہ بھی مسلسل ان کے ساتھ تھے حالانکہ ہر قدم پر یوں لگتا تھا کہ وہ اب گرے کہ تب گرے۔ حسیب اللہ کی قبر پر پہنچ کر ان کا حوصلہ بالکل جواب دے گیا اور وہ بیٹے کی قبر سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگے۔ اسد اللہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے لیکن انہوں نے خود کو باندھے رکھا کہ اب ان ہی کو ہمت کر کے اپنے بچے کھچے خاندان کا سہارا بننا تھا۔ انہوں نے صفی اللہ کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر زبردستی حسیب اللہ کی قبر سے الگ کیا اور سینے سے لگا کر تسلی دینے لگے۔

''ہمارا سینہ پھٹ رہا ہے اسد اللہ۔ ہم سا بدقسمت باپ بھی کوئی ہوگا جو اپنے تین تین جگر گوشوں کو کھو کر بھی جینے پر مجبور ہے۔ ہم تو بری طرح لٹ گئے اسد اللہ۔'' وہ بڑے دلخراش انداز میں گریہ کرنے لگے۔ ساتھ آئے ثروت بیگ اور ان کے ڈرائیور کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اسد اللہ کا وفادار ملازم شمس تو پہلے ہی ایک ایک قبر کی پائنتی بیٹھ کر گریہ کرتا رہا تھا۔ اس نے اپنی پوری عمر حویلی میں گزاری تھی اور حویلی والوں سے اس کی وفاداری اور محبت بالکل غیر مشکوک تھی۔

''ایسا مت سوچیے بھائی جان! بے شک آپ کا ایک بیٹا اور بیٹی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں لیکن ایک بیٹا تو موجود ہے۔ محب اللہ زندہ ہیں بھائی جان۔'' انہوں نے بڑے بھائی کو زندگی کی ڈور کا ایک سرا تھمایا۔

''کیا خبر اسد اللہ کہ وہ ہیں بھی یا نہیں۔ اتنے برس بیت گئے ان کی راہ دیکھتے ہوئے لیکن مایوسی کے سوا کیا ہاتھ آیا۔'' صفی اللہ کے لہجے میں حسرت تھی۔

''وہ زندہ ہیں بھائی جان! آپ کے محب اللہ زندہ ہیں۔ ہمیں ان کے زندہ ہونے کی بہت باوثوق شہادتیں ملی ہیں۔ یہاں سے واپس حویلی پہنچنے پر ہم آپ کو تفصیلاً آگاہ کریں گے۔'' اسد اللہ نے جیسے ان میں نئی روح پھونک دی۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' انہوں نے کسی بچے کی بے چینی سے پوچھا۔

''بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ آپ چل کر موٹر میں آرام سے بیٹھیے۔ ہم باقی قبروں پر فاتحہ خوانی کے بعد واپس آتے ہیں۔'' اسد اللہ نے انہیں یقین دلایا اور اپنے ملازم شمس کے ساتھ انہیں موٹر گاڑی کی طرف روانہ کر دیا۔ اس وقت وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جگر ان کا بھی چھلنی تھا اور دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن وہ صبر کو اپنی آبرو کھونے نہیں دے رہے تھے۔ جملہ گھر والوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے بعد انہوں نے ملازمین کی قبروں پر بھی فاتحہ خوانی کی۔ وہ سب ان کے وفادار تھے اور حویلی کی آن پر نثار ہوگئے تھے۔ بھلا وہ کیسے ان کے اس خلوص کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ جملہ اہلِ خانہ اور ملازمین کی قبریں دیکھ لینے کے باوجود انہیں جولیٹ کا نام کہیں نظر نہیں آیا تو اچانک خیال آیا۔ وہ تو مذہباً عیسائی تھی۔ اس کی قبر یہاں مسلمانوں کے قبرستان میں کیسے موجود ہو سکتی تھی۔ دل کڑا کر کے انہوں نے ثروت بیگ سے جولیٹ کے بارے میں استفسار کیا۔

''ہماری یادداشت میں مرنے والوں کے ناموں کی جو فہرست موجود ہے، اس میں یہ نام شامل نہیں ہے۔ مرنے والے ملازمین میں مسلمانوں کے علاوہ کچھ ہندو ملازمین بھی شامل تھے جن کی لاشیں ان کے ورثا کے حوالے کر دی گئی تھیں لیکن کسی کرسچین خاتون کا تذکرہ بالکل نہیں ہوا۔ خواتین کی میتوں کی شناخت کے لیے ہم نے کچھ بیگمات کے علاوہ آپ کی حویلی کی ایک پرانی ملازمہ اکّا بیگم کی نواسی سے مدد لی تھی۔ ہمارے علم میں آیا تھا کہ وہ لڑکی بھی حویلی کی ملازمہ ہے لیکن جمعے والی رات اکّا بیگم کی نزاعی کیفیت کے باعث اسے گھر بلوا لیا گیا تھا اس لیے وہ زندہ بچ گئی۔ اس لڑکی نے بڑی ہمت سے ایک ایک لاش کو شناخت کیا تھا اور ہمیں نہیں یاد کہ اس نے کسی جولیٹ کا نام لیا ہو۔ بہرحال حویلی واپس پہنچنے پر ہم اس لڑکی کو تصدیق کے لیے طلب کر لیں گے۔'' ثروت بیگ کا جواب ان کے لیے حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ امید افزا بھی تھا۔ مرنے والوں میں جولیٹ کا نام شامل نہیں تھا تو امید کی جا سکتی تھی کہ وہ زندہ

ہے۔ کیسے اور کہاں؟ ان سوالات کے جواب ڈھونڈنے پر مل سکتے تھے، ابھی تو وہ اس امید کے ساتھ ہی جینا چاہتے تھے کہ ان کی جولیٹ زندہ ہے۔

''شریعت کا حکم ہے کہ مرنے والوں کی جلد از جلد تدفین کردی جائے۔ موسم اور لاشوں کی حالتیں بھی ایسی نہیں تھیں کہ ہم آپ کی آمد کا انتظار کرسکتے اس لیے اپنی ذمے داری پر یہ فریضہ انجام دے دیا۔ امید ہے آپ کو ناگوارِ خاطر نہیں ہوگا۔'' وہ لوگ قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے واپس موٹر گاڑی کی طرف جارہے تھے جب نواب ثروت بیگ نے معذرتی انداز میں ان سے کہا۔

''شرمندہ مت کیجیے ثروت بیگ۔ واللہ آپ نے تو بالکل سگے بھائیوں کی طرح غم کی اس گھڑی میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہمیں ایسا محسوس ہورہا ہے کہ ہم دو نہیں بلکہ تین بھائی ہیں۔ ہم بھلا اپنے ایک بھائی کے راست اقدامات پر کسی قسم کی ناگواری کیسے محسوس کرسکتے ہیں۔ ہمارا تو رُواں رُواں آپ کا احسان مند ہے اور ہم نہیں جانتے کہ آپ کے اس احسان کا بدلہ کیسے دے پائیں گے۔'' جواب میں اسد اللہ نے حقیقی احسان مندی کا اظہار کیا۔

''احسان کا ذکر کرکے آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ جب آپ ہمیں اپنا بھائی تسلیم کررہے ہیں تو احسان کا کیا ذکر۔ ہم نے تو بھائی کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ اس رشتے کو نبھاتے رہیں گے۔'' ثروت بیگ نے نہایت خلوص سے انہیں جواب دیا تو وہ شدتِ جذبات سے ان کے گلے لگ گئے اور بولے۔

''ہم بھی وعدہ کرتے ہیں ثروت بیگ کہ مرتے دم تک اس رشتے کی لاج رکھیں گے۔ آج سے آپ اور ہم ایک ہی خاندان ہیں۔'' ثروت بیگ نے بھی جواباً گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

''کون......'' دروازے پر ہونے والی دستک کو سن کر فاروق بستر سے اٹھا اور دروازے کے پاس پہنچ کر دبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں کیتھی۔'' باہر حسب توقع کیتھرائن موجود تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ کیتھرائن اندر آگئی۔ آج اس کے ہاتھ میں خلافِ معمول کھانے کی ٹوکری کے بجائے رول کیا ہوا اخبار موجود تھا اور وہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

''بیٹھو کیتھی......کیسی ہو؟'' فاروق نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی۔

''آپ یہ دیکھیے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اخبار کھول کر اس کے زیریں گوشے میں شائع ایک خبر کی طرف اشارہ کیا۔

فاروق نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر خبر پڑھی، خبر میں اس کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ سمندر کنارے ملنے والی ٹیکسی ڈرائیور رمیش کی تشدد شدہ لاش کی برآمدگی کی خبر تھی جسے بہت زیادہ تفصیل سے شائع نہیں کیا گیا تھا۔ اصل میں آج کل ملکی حالات میں جس انتہا کی اکھاڑ پچھاڑ مچی ہوئی تھی، اس کے سامنے اس قسم کے واقعات بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ اخبار نے خبر دے دی تھی، یہی بہت تھا۔

''ٹھیک ہے لیکن تم مجھے یہ خبر کیوں دکھا رہی ہو؟'' فاروق نے اخبار اسے واپس کیا۔

''اس خبر کو پڑھنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو ہوٹل میں نہیں رہنا چاہیے۔ یہاں بہت لوگ آتے جاتے ہیں۔ اسٹاف کے لوگ الگ ہیں۔ آپ کو سروس دینے والا ویٹر کتنا ہی کوآپریٹو ہو، اسے تجسس تو ہوگا کہ آپ کون ہیں اور کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ آج وہ پیسوں کے لیے آپ کا ہر کام کررہا ہے، کل انعام کے لالچ میں پولیس کا انفارمر بن گیا تو آپ کیا کرلیں گے۔'' اس نے فاروق سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ رمیش کی ہلاکت میں اس کا کتنا کردار تھا لیکن وہ اس کے لیے صدقِ دل سے متفکر نظر آتی تھی۔

''یہاں نہیں رہوں گا تو کسی دوسرے ہوٹل شفٹ ہونا پڑے گا اور خطرات وہاں بھی یہی ہوں گے۔'' اس نے گویا کیتھرائن کی بات ہوا میں اڑائی۔

''جگہ کا اریجمنٹ گاڈ کی طرف سے خود ہی ہوگیا ہے۔ میری ایک مسلم فرینڈ اپنے گھر والوں کے ساتھ کراچی چلی گئی ہے۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے اپنے گھر کی چابیاں دی تھیں کہ چاہوں تو میں اس گھر میں رہ لوں اور اگر نہ رہنا چاہوں تو بھی کبھار چکر لگا کر گھر کی دیکھ بھال کرلیا کروں۔ یہاں سے جانے والوں کے گھروں پر ہندو قبضہ کررہے ہیں، اس گھر پر بھی قبضہ ہوجائے اس سے پہلے ہم وہاں جاکر رہ لیتے ہیں۔ وہاں آپ کے لیے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرنا بھی آسان ہوجائے گا۔'' کیتھرائن کے پاس حل موجود تھا۔ وہ سب طے کرکے آئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ جیسا تم کہو لیکن یہ بتاؤ کہ کب چلنا ہے؟'' فاروق نے ذرا کی ذرا اس کی تجویز پر غور کیا اور پھر ہامی بھرلی۔

''ابھی اور اسی وقت۔ آپ پر اگر ہوٹل کے کچھ ڈیوز

وغیرہ ہیں تو اسے کلیئر کرالیں۔ اتنی دیر میں، میں آپ کا سامان پیک کرتی ہوں۔'' کیتھرائن نے کہا اور فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔ فاروق ہوٹل کے اس کمرے میں خالی ہاتھ آیا تھا لیکن مختصر قیام کے عرصے میں ضرورتاً منگوائی گئی کئی چیزیں جمع ہو گئی تھیں۔ کیتھرائن کپڑوں سمیت دیگر اشیا سمیٹ کر ایک بیگ میں بھرنے لگی۔ یہ بیگ بھی فاروق نے بعد میں منگوایا تھا۔ ذہن میں خیال تھا کہ جب بھی ہوٹل کا کمرا چھوڑنا پڑا، سامان لے جانے کے لیے بیگ کی ضرورت پڑے گی اور ضرورت پڑ گئی تھی۔ کیتھرائن کے سامان رکھنے کے دوران فاروق نے ویٹر کو بلا کر ہوٹل کا سارا حساب بے باق کیا۔ ویٹر حیران اور متجسس تھا کہ وہ اچانک وہاں سے کہاں اور کیوں جا رہا ہے لیکن فاروق نے اسے زیادہ لفٹ نہ کروائی۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ ٹیکسی میں سوار ہوٹل سے جا رہے تھے۔ فاروق نے کیتھرائن کو پہلے ہی بات سمجھا دی تھی کہ وہ براہِ راست اس کی سہیلی کے گھر نہیں جائیں گے، اس لیے جب اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کسی دوسرے علاقے کا نام بتایا تو وہ حیران نہیں ہوئی۔ گنجان آبادی والے ایک علاقے میں ٹیکسی رکوا کر وہ دونوں پیدل ہی ایک طرف چل پڑے۔

اب ٹیکسی ڈرائیور نہ تو ان کا تعاقب کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی کو ان کی اصل منزل کے بارے میں آگاہ کر سکتا تھا۔ انہوں نے پیدل اچھا خاصا فاصلہ طے کیا اور پھر دوسری سمت سے ایک اور ٹیکسی لے لی۔ اس ٹیکسی کو بھی وہ براہِ راست اپنے مطلوبہ مکان تک نہیں لے گئے بلکہ فاصلے پر ہی رکوا کر اس سے اتر گئے۔ مکان پر پہنچے تو فاروق یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مکان کے دروازے پر تالا نہیں ہے اور کیتھرائن دستک دے رہی ہے حالانکہ اس نے بتایا تھا کہ مکان خالی پڑا ہے۔ وہ کوئی سوال کرتا، اس سے قبل ہی دروازہ کھلا اور کوئی گولی کی طرح آ کر اس سے لپٹ گیا۔

''فاروق بھائی۔'' دھاڑیں مار کر روتے ہوئے اس گول مٹول وجود کو پہچاننے میں اس سے کیسے غلطی ہو سکتی تھی۔ گولو کے لمس پر خود اس کا دل بھر آیا اور ربن کی جدائی کا غم ایک بار پھر تازہ ہو گیا۔ کتنا چاہتا تھا وہ ربن کو۔ خود اپنے باپ سے بچھڑے تو اسے برسوں بیت گئے تھے۔ اس کے لیے تو ربن ہی اس کا باپ تھا اور وہ بڑے مان سے اسے بابا کہہ کر پکارتا تھا۔ اب وہ اپنے بابا کے بارے میں پوچھتا تو فاروق اسے کیسے بتاتا کہ تجھے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھنے والا خود منوں مٹی نیچے جا سویا ہے۔

''پہلے بھائی کو اندر آنے دے گولو پھر سب دکھ سکھ کہہ لینا۔'' پیچھے سے گولو کو کھینچ کر اس سے جدا کرنے والا وجے تھا۔ وہ سب اندر داخل ہوئے تو سجو بھی ہاتھ میں کفگیر تھامے باورچی خانے سے نکل آیا اور فاروق سے چمٹ گیا۔

''تو تم نے ان سب کو یہاں جمع کیا ہوا ہے؟'' فاروق نے ایک طرف کھڑی کیتھرائن سے پوچھا۔

''ہاں، بس مجھے کچھ شٹل کاک برقعوں اور پردے والے تانگے کا انتظام کرنا پڑا تھا۔'' کیتھرائن دھیرے سے مسکرائی۔

''تھینک یو سو مچ کیتھرائن۔'' فاروق تہِ دل سے اس کا ممنون ہوا۔

''تھینک یو کس بات کا۔ میں نے تو بس اپنی فیملی کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔''

''اور یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے۔'' فاروق نے اسے سراہا۔

''اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اب آپ کو سجو کے ہاتھ کے پکے کھانے کھانے کو ملیں گے۔'' کیتھرائن ماحول کو ہلکا پھلکا رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ربن کی جدائی کے غم سے نڈھال فاروق کا دل اپنے ساتھیوں کے درمیان پہنچ کر کتنا بوجھل ہوگا۔ اس پر سوا یہ بوجھ تھا کہ اسے یہ اندوہناک خبر اپنے ساتھیوں کو سنانے کا ناگوار فریضہ بھی انجام دینا تھا۔

''اپن آلو گوشت کے سالن کے ساتھ خشکہ (چاول) بنا رہا ہوں فاروق بھائی! سسٹر جلدی میں یہی سودا لا سکی تھی۔ آگے اپن کسی دن آپ کی پسند کا لوکی کا حلوا بھی بنا کر کھلائے گا۔'' سجو نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''سجو! تم مجھ کو سودے کی لسٹ بنا کر دے دینا۔ میں ساری چیزیں لے کر آجاؤں گی۔ ابھی تو جلدی میں جو سمجھ آیا لے کر آ گئی۔'' کیتھرائن نے براہِ راست سجو سے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ آج کل فاروق جس کیفیت سے گزر رہا تھا، اسے کھانے پینے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے نزدیک تو یقیناً یہ ساری گفتگو بھی بوجھ تھی اور وہ خود جواب دے کر اس کا بوجھ بانٹ رہی تھی۔

''بھگوان کے کھیل نرالے۔ اپن اڈے والے جو کل تک سارے شہر میں دندناتے پھرتے تھے اب ایسے منہ چھپا کر بیٹھے ہیں اور ایک کنیا ہمارے واسطے بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔'' وجے نے ایک سرد آہ بھری پھر فاروق کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''آپ بتاؤ فاروق بھائی! اتنے سمے سے کدھر تھے

اور اچانک کیسے ہم تک آن پہنچے۔ اپنی طرف تو بڑی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی ہے۔ کسی کے پلے کچھ نہیں پڑا کہ ہوا کیا ہے؟ بہتوں کو تو پولیس نے اپن کی آنکھوں کے سامنے اریسٹ کیا تھا۔ کچھ اپنی طرح ہی ادھر ادھر چھپ کر بیٹھے ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ دادا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ وہ پولیس کے ریڈ سے پہلے ہی اڈے سے نکل گیا تھا۔ ہوسکتا ہے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گیا ہو اور وہاں سے ہمارے لیے کچھ کرے۔‘‘

وجے کی امید ربن سے بندھی تھی۔ اس ربن سے جو اپنے ہمیشہ کے ٹھکانے تک پہنچ گیا تھا اور وہاں سے کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وجے کے الفاظ پر پہلے ہی سے غم زدہ فاروق کا دل بھر آیا۔ کیتھرائن اس کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہی تھی، اس نے فاروق کے ضبط کا بندھن ٹوٹنے سے قبل اسے سہارا دینے کا فیصلہ کیا اور جلدی سے بولی۔

’’باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اچھا ہوگا کہ پہلے فاروق بھائی کو فریش ہونے دیں۔ میں اچانک انہیں یہاں لے کر آئی تھی اور انہیں چینج کرنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ اچھا ہوگا یہ کھانے سے پہلے فریش ہوجائیں۔ کیوں سجو! کھانا کس اسٹیج پر ہے؟‘‘ اس نے روئے سخن سجو کی طرف کیا۔

’’سمجھو ریڈی ہے سسٹر! چاول دم پر رکھے ہیں اور سالن میں بس ہری مرچ اور ہرا دھنیا ڈالنا باقی ہے۔‘‘ سجو نے مستعدی سے رپورٹ پیش کی۔

’’گڈ۔ تم کھانا لگانے کی تیاری کرو۔ میں فاروق بھائی کو ان کا کمرا دکھانے کے بعد تمہاری ہیلپ کرتی ہوں۔‘‘ کیتھرائن نے کہا اور فاروق کو اپنے ہمراہ ایک کمرے تک لے گئی۔

’’تھینک یو کیتھرائن! تم نے بہت مشکل سچویشن میں میری ہیلپ کی۔‘‘ کمرے میں پہنچ کر فاروق نے نم آنکھوں سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

’’میں نے آپ کے لیے تھوڑا ٹائم حاصل کیا ہے۔ ورنہ آپ کو انہیں بتانا تو پڑے گا۔‘‘ کیتھرائن نے اداسی سے کہا۔

’’ہاں مگر سب کو نہیں۔ میں صرف وجے کو بتاؤں گا۔ گولو کو پتا چلا تو اسے سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔‘‘ فاروق نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

’’جو آپ کو ٹھیک لگے۔ ابھی میں جاکر سجو کی ہیلپ کرواتی ہوں۔ آپ جلدی سے فریش ہوکر آجائیں۔‘‘ کیتھرائن کہتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ فاروق نے غسل خانے میں نہاتے ہوئے پانی کے ساتھ ڈھیروں آنسو بھی بہائے لیکن خود کو سنبھالنے میں کافی حد تک کامیاب ہوگیا۔

واپس سب کے درمیان پہنچا تو دسترخوان بچھ چکا تھا اور کمرے میں اشتہا انگیز خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔

’’کیا بات ہے اپنے سجو کی۔ بڑے سے بڑے شیف کے ہاتھ سے پکا کھانا کھاتے ہوئے بھی اپنے سجو کا کھانا نہیں بھولتا۔‘‘ گولو کے برابر میں بیٹھتے ہوئے فاروق نے تبصرہ کیا تو سجو کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ واحد خاتون کی حیثیت سے کیتھرائن نے سب کو کھانا پیش کرنے کی خدمت اپنے ذمے لے لی۔ وجے ہندو ہونے کے باوجود گوشت سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔ اڈے پر وہ سب ساتھ مل کر کھاتے پیتے تھے اور اس قسم کی تفریقات کو نظر انداز کردیا جاتا تھا۔ وجے بھی اسی طریقے پر چل رہا تھا۔ کھانے کا سلسلہ شروع ہوا تو اڈے کے وسیع بارونق دسترخوان کے تذکرے چھڑ گئے۔ باتوں باتوں میں شاید سب ہی دنوں بعد رغبت سے کھانا کھانے لگے۔ صرف فاروق تھا جو کھانے میں بھرپور دلچسپی نہیں لے پارہا تھا لیکن کیتھرائن موقع کا فائدہ اٹھا کر بہ اصرار کھانے پر مجبور کررہی تھی۔ کیتھرائن کے اصرار اور دوسروں کے خیال سے اسے نہ چاہتے ہوئے بھی کھانا پڑ رہا تھا۔ کھانے کے بعد دسترخوان سمیٹا گیا اور سجو باورچی خانے میں چائے بنانے گیا تو فیصلہ ہوا کہ سب تھوڑی دیر آرام کریں گے۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے فاروق نے وجے کو چپکے سے اشارہ کیا کہ وہ اس کے کمرے میں آجائے۔ گولو کو کیتھرائن نے اپنے ساتھ مصروف کرلیا۔ شملہ میں قیام کے عرصے میں گولو کی اس سے بہت دوستی ہوگئی تھی چنانچہ وہ دنوں بعد فاروق سے ملاقات ہونے کے باوجود اسے چھوڑ کر کیتھرائن کے ساتھ مصروف گفتگو ہوگیا۔ فاروق کے آجانے سے اسے یہ امید بھی ہوگئی تھی کہ اسی طرح ایک دن ربن اور دوسرے ساتھی بھی ان سے آن ملیں گے۔ ادھر وجے تشویش زدہ فاروق کے زیر استعمال کمرے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

’’سب ٹھیک تو ہے نا فاروق استاد؟ اپن کو تمہاری صورت سے کوئی بڑی گڑبڑ دکھائی پڑتی ہے۔ بہت کمزور ہوگئے ہو اور آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ اندر ہی اندر کوئی دکھ کھائے جارہا ہے۔ جب سے تم اپن سے ملا ہے، اپن نوٹ کررہا ہے کہ بات تو کرتے ہو پر دھیان کہیں اور ہے۔ اپن گولو اور سجو کے سامنے جان کر کوئی سوال نہیں کیا پر اگر تم نہیں بھی بلاتے تو اپن خود اکیلے میں آکر تم سے بات کرتا۔‘‘ وہ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان کو ایک دوسرے کے رویّوں اور انداز کو پڑھنے کا ہنر آتا تھا پھر

کیسے ممکن تھا کہ فاروق کے شدتِ غم سے سلگتے اندرون کی آنچ وجے تک نہیں پہنچتی۔ اس نے جو محسوس کیا کہہ ڈالا لیکن فاروق کے پاس بتانے کے لیے جو حقیقت تھی، اسے کہہ ڈالنا آسان نہیں تھا۔ بولنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ فقط تھرا کر رہ گئے۔

''کیا ہے استاد! بولونا۔ اپن کا من ہول رہا ہے کہ ایسی کیا قیامت آگئی جو تم سے بتلائی نہیں جاتی۔'' وجے بے چین ہوا اور قریب بیٹھ کر فاروق کا ہاتھ تھاما یوں جیسے اسے سہارا دے رہا ہو کہ وہ جو کہنا ہے کہہ ڈالے۔

''قیامت ہی تو آئی ہے وجے اور میری قسمت دیکھو کہ میں نے اکیلے اس قیامت کو جھیلا ہے۔ تم میں سے کس کا جگر تھا کہ اسے قبر کی گہرائی میں اتار کر اس پر اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالتے اور اپنے ہوش گنوائے بغیر اس زمین پر سانس لیتے رہتے۔'' اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی کرچیاں تھیں۔ وجے وحشت زدہ ہو گیا اور اس کو دونوں شانوں سے تھام کر جیسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''کس...... کس کی بات کرتے ہو فاروق استاد۔ کون چلا گیا ہے؟''

''وہی جس کے جانے کا کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا اور جس کی واپسی کی راہ دیکھتے سب امید کر رہے ہیں کہ وہ آئے گا تو سب پہلے کی طرح ٹھیک کر دے گا۔'' فاروق کی زبان سے ادا ہوئے جملوں پر وجے نے ایسے جھٹکے سے اپنے ہاتھ اس کے شانوں سے جدا کیے جیسے اسے طاقتور برقی رو چھو گئی ہو۔

''کیا بولتے ہو فاروق استاد؟ کہیں اپنے مگج (مغز) نے تمہاری بات کی غلط سمجھ تو نہیں دی ہے اپنے کو؟'' جس نے اپنے ہاتھوں سے ربن کو منوں مٹی تلے دفن کیا تھا، جو اس کے قاتلوں سے انتقام کی راہ پر چل پڑا تھا اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ربن اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے تو پھر وجے کیسے چند مبہم جملوں سے نکلنے والے مفہوم کو درست مان لیتا۔

''دماغ کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے وجے...... بس دل اس سچائی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ دادا اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔'' ٹوٹے لہجے میں اس بار فاروق نے واضح جملہ ادا کیا۔

''یہ کیا ہو گیا بھگوان! اتنا بڑا اندھیر کب اور کیسے مچا اور اپن سالا اپنی جان بچا کر عورتوں کے ما فک چھپ کر بیٹھا رہا۔'' دہائیاں دیتے وجے نے اپنا سر عالمِ دیوانگی میں مسہری کے سرہانے سے مارنا شروع کر دیا۔

''ہوش میں رہو وجے! ہوش کھو دیے تو دادا کے قاتلوں سے انتقام کیسے لیا جائے گا۔'' فاروق نے دونوں بازوؤں سے تھام کر اسے سنبھالا۔ بہت بوجھ تھا اس کی جان پر۔ وہ جس دکھ سے خود ریزہ ریزہ ہوا جا رہا تھا، اسے سہہ کر دوسروں کو سمیٹنے کا فریضہ اس کے شانوں پر آ گیا تھا۔ وہ جب سے ربن کے پاس آیا تھا، اس کے حصے کے بوجھ بھی ربن اپنے شانوں پر لادنے کی فکر میں رہتا تھا۔ اسے ہر فکر سے بےفکر رکھنے کی کوشش کرنے والا خود اسے اتنے بڑے غم کے بوجھ سے لاد گیا تھا۔

''کیسے ہوا یہ سب؟ اپنے کو پوری بات بتاؤ فاروق استاد۔'' وجے بہت دیر تک اس کے سینے سے لگا روتا رہا۔ فاروق گولو اور سجو کا واسطہ دے کر اس کی چیخوں اور فریاد کو تو روکنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اشکوں کے سیلِ رواں پر بند باندھنا آسان نہیں تھا۔ بہت دیر بعد وجے نے خود ہی اپنی سسکیوں اور آہوں پر قابو پایا اور اس سے ربن کے قتل کی تفصیلات جاننے کی کوشش کی۔ جواب میں فاروق کو دل پر پتھر رکھ کر پوری داستان سنانی پڑی۔

''اپن سالا کسی ایک حرام کے جنے کو نہیں چھوڑے گا۔ اپنے کو یتیم کرنے والوں کی پیڑھیاں (نسلیں) اجاڑ کر رکھ دے گا۔ بھگوان کی سوگند دادا کے قاتلوں کو دھرتی کے نیچے پہنچائے بغیر اپن چین سے نہیں بیٹھے گا۔'' انتہا کے غم سے گزرنے کے بعد وجے کا ردعمل بھی فاروق جیسا ہی تھا۔ غم کے آنسوؤں نے انتقام کے شعلے بھڑکا ڈالے تھے۔

''ہم میں سے کوئی بھی قاتلوں کو انجام تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا وجے لیکن انتقام کی راہ پر اندھا دھند چل پڑنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہمیں ہر کام پلاننگ سے کرنا ہو گا کیونکہ ہمارے حریف عام لوگ نہیں ہیں۔ ہمیں بھاٹیہ سیٹھ جیسے دولت مند اور راٹھور جیسے طاقتور پولیس افسر سے ٹکر لینی ہے۔ مجو، فیکا اور ان کے دوسرے ساتھی بھی ان ہی لوگوں کے سائے میں ہیں۔ ایسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے ہوشیاری سے کام لینا ہوتا ہے۔ تم وعدہ کرو کہ میری مرضی اور اجازت کے بغیر کچھ نہیں کرو گے۔'' فاروق نے اسے سمجھانے کے ساتھ ساتھ پابند بھی کرنے کی کوشش کی۔

''جیسا تم بولو استاد! دادا تم کو اتنا چاہتا تھا، اپن تمہارا بات کیسے ٹال سکتا ہے لیکن ایک بات جرور (ضرور) بولیں گا کہ تمہارے کو ایسے کاموں کا تجربہ نہیں ہے۔ دادا اپنا سارا ہنر تمہارے کو سکھایا تھا پر تمہارے مجاز (مزاج) کو دیکھتے ہوئے کبھی تم سے ایسا ویسا کوئی کام نہیں لیتا تھا، بولتا تھا اپنا

فاروق تو شہزادہ ہے، اسے اس مار دھاڑ اور دادا گیری میں ڈالنے کو من نہیں مانتا۔'' وجے نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے تحفظات وخدشات کا اظہار کیا۔

''وقت آدمی سے سب کروالیتا ہے وجے۔ دادا نے بھی کچھ سوچ کر ہی مجھے اپنے سارے ہنر سکھائے تھے اور دیکھو برا وقت پڑا تو اس کے سکھائے ہنر ہی کام آرہے ہیں۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے دادا کے قاتلوں سے انتقام کا سلسلہ شروع کردیا ہے اور وہ ٹیکسی ڈرائیور جس نے پولیس کو مخبری کی تھی، اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ کیتھرائن کے پاس آج کا انگریزی اخبار ہے تم اس سے خبر سن کر معلوم کرلینا کہ میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کا کیا حال کیا ہے۔'' فاروق، وجے کو مہیش کے قتل کے بارے میں بتا رہا تھا تو اس کے چہرے کے تاثرات اس قدر بدلے ہوئے تھے کہ وجے کو اس پر کسی اجنبی شخص کا گمان ہوا۔

''اپن جرور (ضرور) وہ خبر سنے گا پر ابھی آگے کا پروگرام بولو۔ ابھی تو جو کچھ کرنا ہے اپن دونوں ہی کو کرنا ہے...... پولیس والوں نے چالاکی دکھائی اور دونوں طرف کے اڈوں پر ایک ساتھ دھاوا بول دیا۔ اپن کی بتی پر غلامو چاچا ادھر کا حال پتا کرنے گیا تھا۔ واپس آکر بولا کہ ادھر بھی اڈے کے دروازے پر تالا مار کر پولیس کا آدمی بٹھا دیا ہے اور راموا استاد سمیت کسی کی کوئی کھبر (خبر) نہیں۔ بھگوان جانے کتنوں کو پکڑ کرلے گئے اور کتنے اپن کی طرح ادھر ادھر چھپے ہوئے ہیں۔'' وجے نے پولیس والوں کو ایک زبردست گالی سے نوازتے ہوئے صورتِ حال بیان کی۔

وہ مار دھاڑ کی دنیا کا آدمی تھا اس لیے فاروق کی بات اسے جلدی سمجھ میں آگئی تھی اور رونا دھونا چھوڑ کر اب وہ شدت سے اس بات کا خواہاں تھا کہ دادا کے قاتلوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔

''ساتھیوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہے وجے لیکن سب سے پہلے دادا کے قاتلوں سے بدلہ لینا ضروری ہے۔ قاتل ہوشیار ہوگئے تو ہمارا کام مشکل ہوجائے گا۔ کیتھرائن وہاں ہوٹل میں مجھے لینے آئی تو میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا اور ایک پلان بھی بنالیا تھا۔ تم ساتھ ہوگے تو اس پلان پر عمل کرنے میں اور آسانی ہوجائے گی۔''

''تم اپنے کو حکم کرو استاد۔ اپن تمہارے حکم پر اپنی جان بھی دے دے گا۔'' وجے نے یقین دلایا۔

''ابھی تو تم جا کر آرام کرو۔ اپنے پلان پر عمل کرنے کے لیے مجھے کسی سے رابطہ کرنا ہے، اس کے بعد ہی کچھ ہوسکے گا۔'' فاروق نے پرسوچ انداز میں اس سے کہا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''خیال رکھنا وجے، بجو اور گولو کو ذرا بھی اندازہ نہ ہو۔ گولو کا تم کو پتا ہے کہ دادا کو کتنا چاہتا تھا اسے پتا چلا تو سہہ نہیں سکے گا۔ میں نے خود اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا ہے، اسے کچھ ہوگیا تو اسے کیسے سنبھالوں گا۔ ابھی میرے سر پر سب سے بڑھ کر انتقام کی دھن سوار ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے اس کام میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔'' فاروق نے جاتے ہوئے وجے کو تنبیہہ کی۔

''بے فکر رہو استاد! سینے میں من سلگ سلگ کر خاک ہوجائے گا لیکن اپن ہونٹوں سے ایک آہ نہیں نکالے گا۔'' وجے نے پلٹ کر فاروق کو جواب دیا تو دونوں کی نظریں باہم ٹکرائیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی نگاہوں میں درد مشترک کو پڑھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس عزم کو دہرایا کہ وہ اپنے دکھ کو آنسو بن کر بہنے نہیں دیں گے بلکہ اس پہاڑ سے دکھ کے بوجھ سے اپنے دشمنوں کو روند ڈالیں گے۔ انتقام...... زندگی جیسے اب اسی ایک لفظ کا نام تھی۔

☆☆☆

اسد اللہ نے اپنے سامنے کھڑی نوعمر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ اور سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ بری طرح ستا ہوا تھا۔ وہ اکا بیگم کی کم عمر نواسی زہرا تھی جو حویلی میں ہی خدمت انجام دیتی تھی لیکن حملے والی رات اپنی نانی کے عالم نزع میں ہونے کی وجہ سے حویلی سے گھر چلی گئی تھی اور یہی اس کی زندگی بچنے کا بہانہ بن گیا تھا۔ اس چھوٹی سی لڑکی کو حویلی میں مرنے والی خواتین کی شناخت کا بڑا کام انجام دینا پڑا تھا اور وہ اتنے بڑے کام کے بوجھ سے شل ہوکر رہ گئی تھی۔ اتنے بڑے سانحے کو سن کر انجان لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے اور اس بے چاری کو ان لاشوں کو دیکھنے اور شناخت کرنے کے عمل سے گزرنا پڑا تھا جنہیں وہ چند گھنٹوں قبل ہی جیتا جاگتا، ہنستا مسکراتا چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کی نوعمری کے لیے یہ بوجھ بہت زیادہ تھا اور اس کی پوری شخصیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس بوجھ تلے کتنی بری طرح مجروح ہوئی ہے۔ اس کے پہلو میں ہی اس کی جوان العمر ماں کھڑی تھی جس کے زہرا کے علاوہ بھی مزید پانچ بچے تھے اور ان بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں مصروف ہونے کی وجہ سے ہی اس نے حویلی کی ملازمت اختیار نہیں کی تھی۔

''ہمیں اکا بیگم کی رحلت کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ مرحومہ نے بہت طویل عرصے تک حویلی میں خدمت

انجام دی۔ اگر آج حالات اس نہج پہ نہ ہوتے تو اس موقع پر حویلی کی طرف سے ان کی خدمات کا باقاعدہ اظہار اور اعتراف کیا جاتا۔ فی الحال تو ہم زبانی ہی آپ لوگوں سے اظہار افسوس کر سکتے ہیں۔'' اسد اللہ ایک نظر میں بہت کچھ دیکھ لینے کے بعد اپنی آنکھیں جھکا چکے تھے اور ماں بیٹی دونوں سے مخاطب تھے۔

''اماں کی تو جانے کی اچ عمر تھی سرکار۔ ان کی جدائی کا غم اپنی جگہ پر دل کو یہ تسلی ہے کہ انہوں سب خوشیاں غم دیکھ کر اپنی طبعی موت مرے، پر ان کے واسطے دل خون کے آنسو روتا ہے جو جوان اور زندگی سے بھرپور تھے اور ظالموں نے اچانک ہی ان سے ان کی زندگی چھین لیے۔ حویلی کی عزت دار بیبیاں حویلی کی آبرو پر اپنی جاں نثار کر کے ہمارے دلوں میں اور بھی اونچا مقام پا گئے۔ ان کے دکھ میں روتے روتے ہم کو اماں کا غم تو یاد اچ نہیں آتا بس یہی سوچ سوچ کر رو دیے جاتے ہیں کہ اب کبھی وہ پیاری صورتیں دکھائی نہیں دیں گی۔ جن کے آنگن کی خوشیاں ہمارے گھروں کو بھی ہرا بھرا رکھتی تھیں۔'' زہرا کی ماں نے اسد اللہ کے پرسے کے جواب میں بولنا شروع کیا تو اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ ساتھ کھڑی زہرا بھی سسکیوں سے رونے لگی۔

''نصیب میں جو قیامت دیکھنی لکھی تھی، ہم دیکھ رہے ہیں اور اللہ سے دعا گو ہیں کہ ہمارے حوصلے کو برقرار رکھے۔ جن پر ظلم ہوا ان کا معاملہ ہم نے اللہ کے سپرد کر دیا۔ اب تو بس اپنے بچے کھچے خاندان کو سمیٹنے کی فکر ہے اور زہرا کو ہم نے اسی سلسلے میں یہاں بلوایا ہے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ حویلی کی جملہ خواتین کو مع ملازماؤں کے زہرا نے ہی تدفین سے قبل شناخت کیا تھا۔ ہم تمام مرنے والوں کی قبور پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے تھے اور اپنے ساتھ ایک سوال لے کر واپس آئے ہیں، حسیب اللہ کی دختر ماہ نور کی تعلیم کے لیے جولیٹ نامی جو خاتون مقرر تھیں، ان کے بارے میں کوئی شنید نہیں ہے۔ کیا زہرا اس سلسلے میں ہمیں کچھ بتا سکتی ہیں۔'' انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ان کی خواہش پر ثروت بیگ کے ملازم کے ذریعے ان دونوں ماں بیٹی کو اسی سوال کے جواب کے حصول کے لیے یہاں بلوایا گیا تھا۔

''سن رہی ہو بیٹی زہرا۔ سرکار کیا پوچھ رہے ہیں؟ تمہیں کچھ خبر ہے جولیٹ بی بی کی؟'' زہرا کی ماں نے اس کے شانے کو ہولے سے ہلاتے ہوئے گویا اسد اللہ کا سوال دہرایا اور پھر اسد اللہ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''معاف کیجیے گا سرکار بچی جب سے لاشیں شناخت کر کے آئی ہے اس کی بہت اچ بری حالت ہے۔ کسی طرح سکون نہیں آتا، بار بار بیبیوں کے نام پکار کر روتی ہے۔ اب بھی آپ کا حکم ملا تو میں اس نگوڑی کو روتا ہوا ہی یہاں لے کر آئی ہوں۔'' زہرا کی طرف سے جواب میں تاخیر پر اس کی ماں نے وضاحت پیش کی۔

''ہم سمجھ سکتے ہیں بہت بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس بچی نے اپنے شانوں پر۔ اللہ اس کو جزا اور ہمت دونوں دے اور یہ جلد از جلد اس حادثے کو بھول جائے۔ ہمیں خود اتنی زیادہ بے قراری نہ ہوتی تو ہم اسے زحمت نہیں دیتے۔'' اسد اللہ کا اپنا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ بہت بڑے دکھ سے گزرے تھے لیکن ایک امید نے زندگی سے باندھ دیا تھا سو اس امید کا دامن کیسے چھوڑتے۔

''زحمت کا لفظ استعمال کر کے ہمیں گناہ گار نہ کریں سرکار۔ ہم آپ کے غلام ہیں۔'' زہرا کی ماں ان کے الفاظ پر تڑپ ہی تو گئی۔ خود زہرا کو بھی جیسے جھٹکا لگا اور گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

''آپ کے غم کے آگے میرے غم کی کیا اوقات ہے سرکار بس دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا اس لیے اچ فوراً جواب نہیں دی میں نے۔ آپ جولیٹ بی بی کا پوچھے ہیں نا...... مجھے اچھی طرح یاد آ گیا ہے کہ مرنے والیوں میں جولیٹ بی بی شامل نہیں تھے۔''

''پھر وہ کہاں گئیں؟ ہم حویلی سے روانہ ہوئے تو وہ حویلی میں ہی تھیں۔ اس حادثے میں گنتی کے چند ملازمین ہی زخمی حالت میں باقی بچ پائے ہیں اور جولیٹ ان میں بھی شامل نہیں ہیں۔ کیا وہ حادثے والی رات سے قبل ہی کہیں چلی گئی تھیں؟'' اسد اللہ کی امید کو زہرا کے جواب نے مزید توانا کیا۔

''اس کی تو مجھے خبر نہیں سرکار۔ میں جب حویلی سے نکلی تو انہوں حویلی اچ میں تھے۔ مجھے سروری آپا نے نانی کی حالت کے بارے میں بتا کر گھر جانے کا بولے تو اسی وقت جولیٹ بی بی کی طرف سے ان کا بلاوا آیا تھا۔'' اب زہرا اپنی یادداشت کا بھرپور استعمال کر رہی تھی۔

''دخل اندازی معاف سرکار پر میرے دماغ میں ابھی اچ ایک بات آئی ہے۔ اجازت ہو تو بول دوں!'' زہرا کی ماں اچانک ہی بولی تو اسد اللہ نے سر کے اشارے سے اسے بولنے کی اجازت دی۔

''مجھے دینو چاچا بتائے تھے کہ حملے والی رات سروری

آپا ان کو حویلی سے ایک عورت کو ریلوے اسٹیشن پہنچانے کو بولے تھے۔ عورت برقعے میں تھی پر جوان معلوم ہوتی تھی۔ دینو چاچا مجھے بتائے تھے کہ ان کو وہ عورت ادھر اپنے حیدرآباد کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بول چال حیدرآبادی عورتوں سے بالکل الگ تھی۔'' زہرا کی ماں کی دی یہ اطلاع بڑی خاص تھی۔ اسد اللہ کی امید کو مزید توانائی ملی اور انہوں نے اندازہ لگایا کہ کسی بھی وجہ سے سہی جولیٹ نے حملے سے قبل حویلی چھوڑ دی تھی۔ اس کے ریلوے اسٹیشن جانے کا مطلب تھا کہ وہ حیدرآباد سے کہیں باہر گئی تھی، کہاں......؟ اس سوال کے جواب کے حصول میں دینو مدد کر سکتا تھا چنانچہ انہوں نے زہرا کی ماں سے دینو کے بارے میں دریافت کیا۔

''ہم دینو چاچا کے تانگے میں اچ یہاں آئے ہیں۔''

اس نے جواب دیا تو اسد اللہ نے فوراً دینو کو اندر بلوا لیا۔ اس سے ابتدائی سوال جواب میں انہیں وہی معلوم ہوا جو زہرا کی ماں کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا لیکن پھر دینو نے انہیں ایک بات اور بتائی۔ اس نے بتایا کہ اس کے تانگے میں اسٹیشن جانے والی عورت کو وہاں ایک آدمی ملا تھا جسے اس نے برادر جانی کہہ کر پکارا تھا اور اس آدمی کے ملنے کے بعد ہی اسے وہاں سے یہ کہہ کر رخصت کر دیا تھا کہ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔

کوچوان کے اس بیان کے بعد اسد اللہ کا یقین اور مضبوط ہو گیا کہ جولیٹ زندہ ہے لیکن اس یقین کے ساتھ ہی بہت سی الجھنیں بھی تھیں اور وہ بہت سوچنے پر بھی اندازہ نہیں لگا پا رہے تھے کہ وہ کیوں، کہاں اور کس کے ساتھ گئی ہے؟ وہ ان کا خون ہی نہیں ان کی محبوب ترین عورت کی بھی بیٹی تھی اس لیے وہ اس پر شک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن وہ جن حالات میں اور جس طرح حویلی سے گئی تھی وہ بہت مشکوک تھے اور ان کے سوا کوئی دوسرا شخص بہت سی قیاس آرائیاں کر سکتا تھا اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس بات کا ذکر کسی اور سے نہیں کریں گے اور اپنے طور پر دعا کرتے رہیں گے کہ جولیٹ ایک بار پھر ان سے آملے، آخر وہ پہلے بھی تو انہیں ملی تھی، وہ بھی ایسے وقت جب انہیں اس کے بارے میں کوئی علم ہی نہیں تھا۔ فیصلہ کر چکنے کے بعد انہوں نے اپنے سامنے کھڑے تینوں نفوس کی طرف نہایت سنجیدہ نظروں سے دیکھا اور پھر دھیرے سے بولے۔

''ہماری خواہش ہے کہ آج یہاں ہماری آپ تینوں سے جو گفتگو ہوئی ہے، اسے آپ لوگ بالکل فراموش کر دیں اور آئندہ کبھی آپ کی زبانوں پر جولیٹ کا نام نہ آئے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس نام کے ساتھ کسی طرح کے قصے کہانیاں یا قیاس آرائیاں وابستہ ہوں، اس لیے آپ تینوں سے احتیاط کے طلب گار ہیں۔ کیا ہم امید رکھیں کہ آپ لوگ ہماری اس خواہش کی پاسداری کریں گے؟'' اسد اللہ نے سوالیہ نظروں سے ایک ایک کی طرف دیکھا۔

''ہماری جانیں آپ پر قربان سرکار! آپ کی حکم عدولی کا ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔'' زہرا کی ماں نے جواب دینے میں سب سے زیادہ پھرتی سے کام لیا۔ وہ اکا بیگم کی سات اولادوں میں سب سے چھوٹی تھی اور اس نے کبھی حویلی میں ملازمت نہیں کی تھی لیکن حویلی والوں سے وفاداری اس کے خون میں رچی ہوئی تھی۔

''رافعہ بیٹی ٹھیک بولے ہیں سرکار! ہم نے برسوں حویلی کا نمک کھایا ہے۔ آپ کا حکم نہ مان کر کاہے کو اپنی وفاداری پر داغ لگائیں گے۔'' دینو نے بھی زہرا کی ماں کی تائید کی۔

''بہت شکریہ۔ اب آپ میں سے کوئی حویلی کا ملازم نہیں رہا۔ حویلی ہی باقی نہیں رہی تو کسی کی ملازمت کا کیا سوال لیکن اس کے باوجود آپ لوگوں نے ہماری درخواست قبول کر کے ہمارا جو مان رکھا ہے اس کے لیے ہم تہ دل سے آپ کے شکر گزار ہیں۔'' اسد اللہ کے کہے ان الفاظ پر وہ تینوں زاروقطار رونے لگے اور زہرا سب کی نمائندگی کرتے ہوئے بولی۔

''حالات کچھ بھی ہوں سرکار! ہماری وفاداریاں ہمیشہ حویلی والوں کے لیے قائم رہیں گی۔ آپ کا جب دل چاہے ہمیں آزما لیجیے گا۔''

''آپ لوگوں کے اس خلوص کے لیے ہمارے پاس فقط شکریے کے الفاظ ہی ہیں۔ بہرحال اب آپ لوگ یہاں سے جائیے۔ ہمیں کچھ دوسرے امور کے متعلق بھی سوچ بچار کرنی ہے۔''

اسد اللہ نے انہیں وہاں سے رخصت کر دیا اور خود اپنے حالات پر غور کرنے لگے۔ صفی اللہ کو انہوں نے محب اللہ کے بارے میں سب کچھ بتا کر ان کے اندر زندگی کی نئی آس جگا دی تھی لیکن بمبئی سے کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں آئی تھی۔ بمبئی میں مقیم اپنے دوست ڈی سوزا سے انہوں نے آج ہی ٹرنک کال کے ذریعے معلوم کیا تھا کہ ربن دادا کے اڈے سے کسی نے اس سے رابطہ کیا یا نہیں۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ خود دیکھ کر آئے تھے کہ اڈے پر تالا پڑا ہے اور پولیس نے سب اجاڑ دیا ہے۔ ایسے میں کسی رابطے کی امید کم ہی تھی پھر بھی بڑے بھائی کی آس قائم رکھنے کے لیے

کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ ادھر نواب ثروت بیگ کی صلاح تھی کہ حیدرآباد سے ہجرت کرلی جائے۔ نواب سلیم اللہ کی حویلی پر ہونے والے حملے نے بہت سوں کو خوفزدہ کردیا تھا اور وہ لوگ جو یہاں سے جانے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتے تھے، وہ بھی اب ہجرت کے لیے اپنا اسباب باندھ رہے تھے۔ نواب ثروت بیگ کا خاندان بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھا۔ اسد اللہ کو بھی ہجرت ہی مناسب لگ رہی تھی اور وہ اس سلسلے میں صفی اللہ کو بھی تقریباً راضی کرچکے تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ہجرت کرلی جائے اور واحد رکاوٹ یہ خیال تھا کہ بچھڑے ہوؤں میں سے اگر کوئی پلٹا تو انہیں کہاں تلاشے گا؟ جولیٹ اور محب اللہ...... یہ دو ہی تو رہ گئے تھے اور دونوں ہی اپنی مرضی سے وہاں سے گئے تھے۔ محب اللہ کے بارے میں تو پھر بھی اتنا پتا تھا کہ وہ فاروق کے نام سے لندن کے لیے روانہ ہوا ہے لیکن جولیٹ کا تو کوئی نام ونشان ہی نہیں ملا تھا۔ ڈی سوزا کے ذریعے وہ بمبئی میں اس کے پرانے گھر پر بھی معلوم کرواسکتے تھے لیکن ان کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں گئی ہوگی۔ ان کے پاس واحد حل یہی رہ گیا تھا کہ ان کے وہ احباب جو یہاں سے ہجرت کا ارادہ نہیں رکھتے انہیں بعد میں اپنے پتے سے آگاہ کرکے انہیں ہدایت کردیں کہ اگر کوئی انہیں ڈھونڈتا ہوا آئے تو اسے اس پتے سے آگاہ کردیا جائے۔

زندگی اب امید اور انتظار کا نام ہی تو رہ گئی تھی۔ آج ان کا اپنی حویلی کا چکر لگانے کا بھی ارادہ تھا۔ وہ ابھی تک اس طرف کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرسکے تھے حالانکہ ثروت بیگ نے کئی بار یاددہانی کروائی تھی۔ انہوں نے کچھ ملازمین حویلی کی نگرانی پر مامور کررکھے تھے۔ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے کے مصداق سب جانتے تھے کہ لٹ جانے اور برباد ہوجانے والی حویلی میں ابھی بہت کچھ باقی ہوگا۔ ثروت بیگ چاہتے تھے کہ اسد اللہ ایک بار خود جائزہ لے لیں اور حویلی کی فروخت یا آئندہ کے لیے کلیم وغیرہ سے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرلیں تو ہجرت کے پروگرام پر بھی عمل درآمد شروع کیا جائے۔ ابھی راستے کھلے تھے اور کسی محفوظ ذریعے سے محفوظ مقام تک پہنچا جاسکتا تھا۔ اسد اللہ نے فیصلہ کیا کہ آج حویلی کا چکر لگالیا جائے اور فوراً ہی اس پر عمل درآمد کے لیے تیار بھی ہوگئے۔ روانگی سے قبل انہوں نے صفی اللہ سے بھی پوچھا لیکن انہوں نے ساتھ چلنے سے انکار کردیا۔ وہ ثروت بیگ کے ڈرائیور اور اپنے ملازم کے ہمراہ حویلی پہنچے۔ حویلی کے توڑے گئے پھاٹک کو ثروت بیگ نے حفاظتی نقطۂ نظر سے دوبارہ نصب کروادیا تھا لیکن پھر بھی پرشکوہ حویلی اجڑے دیار کا منظر پیش کررہی تھی۔ لگائی جانے والی آگ نے رنگ وروغن کو چاٹ لیا تھا اور پائیں باغ میں لگے خوشنما خوشبودار درختوں اور پودوں کو بھی کھا گئی تھی۔

حادثے کو کئی دن بیت گئے تھے لیکن وہ اب بھی فضا میں جلنے اور خون کی بو کو محسوس کرسکتے تھے۔ یہ بو ان کے دل ودماغ کو بوجھل کرگئی لیکن پھر بھی انہوں نے ہمت کا دامن نہیں چھوڑا اور آگے بڑھتے رہے۔ کئی کمروں کے دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ کافی سازوسامان بھی تباہ وبرباد ہوگیا تھا لیکن ثروت بیگ نے بچ جانے والے سامان کو اپنے ملازمین سے درست حالت میں موجود کمروں میں رکھوا کر ان کے دروازے مقفل کروادیے تھے۔ مقفل دروازوں کی چابیاں اسد اللہ کی تحویل میں تھیں۔ پہلے انہوں نے غیر مقفل کمروں کا جائزہ لیا۔ ندرت جہاں اور نواب سلیم اللہ کے کمروں میں موجود تجوریوں کے قفل توڑ کر ان میں سے سب مال ومتاع نکال لیا گیا تھا اور تجوریاں یونہی کھلی پڑی تھیں۔ عقبی آنگن میں موجود کنویں پر پہنچ کر ان کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا اور دل کی کیفیت عجیب ہوگئی۔ اس کنویں نے حویلی کی کل خواتین کی زندگیاں نگل کر ان کی عزتوں کی حفاظت کی تھی۔ وہ اس کنویں کو کیا سمجھتے۔ قتل گاہ...... یا پناہ گاہ۔ شاید یہ پناہ گاہ ہی تھی کہ جان دینے والی بیبیوں نے خود اس کی عمیق گہرائیوں کو اپنے لیے منتخب کیا تھا۔

وہ بہت دلگرفتہ سے اس جگہ سے ہٹے اور مقفل دروازے کو کھولنا شروع کیا۔ ان کمروں میں سے ایک حبیب اللہ کی خواب گاہ تھی جہاں بستر کے سرہانے کی میز پر حبیب اللہ اور اس کی بیوی بچی کی تصویر اب بھی فریم میں جڑی رکھی ہوئی تھی۔ تصویر نے ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک کو محفوظ کرلیا تھا لیکن زندگیاں تو جاچکی تھیں۔ انہوں نے فریم سمیت اس تصویر کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ دوتین مقفل کمروں کو انہوں نے کھول کر دیکھنے کے بعد باہر ہی سے جائزہ لے کر بند کردیا کہ یہ کمرے اثاث سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ حویلی کا بچ جانے والا قیمتی فرنیچر اور آرائشی اشیا اپنے مالکان کے جانے کے بعد بے حیثیت ہوگیا تھا اور انہیں ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بچ جانے والے کمروں میں خود ان کی خواب گاہ بھی شامل تھی اور حیرت انگیز طور پر اس طرح محفوظ رہی تھی جیسے حویلی کا حصہ ہی نہ رہی ہو۔ اس وسیع خواب گاہ میں بھی کچھ سازوسامان رکھوایا گیا تھا لیکن

ایسی صورتِ حال نہیں تھی کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو جائے۔ ہاں گردوغبار ضرور جمع ہو گیا تھا لیکن حالات ایسے نہیں تھے کہ ماضی کی نازک مزاجی کا مظاہرہ کیا جائے۔ وہ اپنے کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ایک امید سی تھی کہ شاید یہاں موجود رقم وغیرہ محفوظ ہو۔ ثروت بیگ کی وضع داری و مدارت اپنی جگہ لیکن بالکل تہی داماں ان پر بوجھ بنے رہنا خود ان کی طبیعت کے لیے بھی بوجھ تھا۔ انہوں نے جائزہ لیا تو ان کی امید برآئی، ساتھ ہی وہ زیورات بھی مل گئے جو انہوں نے جولیٹ کے حوالے کردیے تھے۔ ان زیورات کو دیکھ کر جہاں انہیں حیرت ہوئی وہیں ایک ثبوت اور مل گیا کہ جولیٹ حادثے سے قبل خود زیورات یہاں رکھ کر حویلی سے چلی گئی تھی۔ زیورات کی موجودگی نے اس کے کردار کی شفافیت کا بھی ثبوت دیا کہ کم ازکم وہ کسی لالچ یا بے ایمانی کی وجہ سے یہاں سے نہیں گئی تھی۔ پھر جانے کی وجہ کیا تھی؟ اس سوال کا جواب یقیناً اسی کے پاس تھا اور وہ امید اور دعا ہی کرسکتے تھے کہ وہ دوبارہ ان سے آن ملے۔

رقم اور زیورات کے تھیلے کو لے کر وہ کمرے سے نکلنے ہی لگے تھے کہ گردآلود فرش پر پڑا ایک لفافہ ان کی نظروں میں آ گیا۔ ان کی خواب گاہ کی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس ٹوٹے ہوئے شیشے سے کمرے میں گردوغبار اندر آتا رہا تھا۔ یہ لفافہ بھی شاید لکھنے کی میز پر تھا جو ہوا سے نیچے گر گیا تھا۔ انہوں نے جھک کر گردآلود لفافے کو اٹھایا تو انہیں اس میں سے ایک مخصوص مہک آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک بے حد چاہنے والے باپ کی حیثیت سے وہ اس مہک کو شناخت کرسکتے تھے۔ انہوں نے بے تابی سے لفافہ کھولا۔ بغیر لائن کے سادہ سفید کاغذ پر بے حد خوب صورت لکھائی میں بہ زبانِ انگریزی ایک مختصر تحریر درج تھی۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا۔

''بے حد محترم و معزز والد صاحب!

السلام علیکم

آپ کو جب یہ خط ملے گا میں یہاں سے جا چکی ہوں گی۔ کیوں؟ اس کی وجہ شاید آپ کے علم میں آ جائے اور آپ میری مجبوری کو سمجھ سکیں۔ میں آپ کی دل آزاری کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں اور ساتھ ہی یہاں سے اپنی روانگی کو ممکن بنانے والی ہستی کے لیے بھی معافی کی طلب گار ہوں۔ امید ہے آپ میرے تھوڑے کہے کو کافی جانیں گے، بس میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپ سے جدا ہوتے ہوئے میرا دل بہت رنجیدہ ہے لیکن پھر بھی میں خوش ہوں کہ میرا دامن آپ کی محبت اور شفقت کے پھولوں سے بھرا ہوا ہے اور اس قیمتی خزانے کے ہوتے ہوئے مجھے کسی مادی دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ مجھے عنایت کیا تھا، اسے میں یہیں چھوڑ کر جارہی ہوں اور میرے پاس ماں کی نشانی کے طور پر بس وہی لاکٹ ہے جسے میں اپنے ساتھ لائی تھی۔ میرے لیے دعا کیجیے گا۔

فقط آپ کی بدنصیب بیٹی

جولیٹ اسد اللہ''

جولیٹ کے نام کے ساتھ اپنا نام لکھا دیکھ کر جہاں ان کا دل خوش ہوا تھا، وہیں وہ اس کے خود کے لیے بدنصیب کا لفظ استعمال کرنے پر تڑپ گئے تھے۔ پتا نہیں اس پر کیا گزری تھی کہ وہ خود کو بدنصیب قرار دینے پر مجبور ہوگئی تھی اور یوں اچانک آناً فاناً حویلی چھوڑ گئی تھی۔ انہوں نے حسیب اللہ کی تصویر کی طرح جولیٹ کے خط کو بھی اپنے سینے سے لگایا اور بوجھل قدموں سے باہر کا رخ کیا۔ ان کی ہدایت پر ڈرائیور کے ساتھ ہی باہر رک جانے والا وفادار ملازم شمس انہیں دیکھ کر تیزی سے دوڑا آیا۔ انہوں نے رقم اور زیورات والا تھیلا اسے تھمادیا اور خود تصویر و خط کو سینے سے لگائے گاڑی میں جا بیٹھے۔ ان کا اشارہ پا کر ڈرائیور نے موٹر گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا تو انہوں نے حویلی کی عمارت پر حسرت زدہ الوداعی نظر ڈالی اور اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک عمارت ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

☆☆☆

تانگا پختہ سڑک پر سرپٹ دوڑ رہا تھا اور فضا میں محض اس کی ٹاپوں کی ہی آواز تھی۔ ہمیشہ جاگنے والا پُررونق بمبئی بہت حیران، ٹھٹکا ہوا اور متوحش محسوس ہوتا تھا۔ ہندوستان کا سیاسی بھونچال بمبئی کے چہرے سے نمایاں تھا۔ تانگے میں کوچوان سمیت کل تین نفوس سوار تھے۔ پچھلی نشست پر موجود جوڑے نے مکمل خاموشی اختیار کررکھی تھی اور لگتا تھا کہ ہر فرد اپنی اپنی جگہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ عورت نے گلابی رنگ کی اوبلی کی ساڑی زیب تن کررکھی تھی اور پلو کا گھونگھٹ نکال رکھا تھا، اس کے باوجود اس کے ہاتھ پیروں اور سراپا کی نزاکت و رنگت سے ظاہر تھا کہ وہ ایک بہت خوب صورت عورت ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے معمولی کپڑے کا سفید کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا اور شانے پر سیاہ حاشیے والی سفید چادر لی ہوئی تھی۔ قدوقامت کا وہ بھی اچھا تھا لیکن اس کی گہری سانولی رنگت اور بڑی بڑی مونچھوں نے اسے خاصا خوفناک بنادیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ

پری کے پہلو میں کوئی دیو بیٹھا ہو۔ بس فرق یہ تھا کہ اس دیو کے سر پر سینگوں کے بجائے دو پلی کی ٹوپی تھی اور اس ٹوپی سے بالوں کی تیل لگی لٹیں باہر نکل کر ماتھے پر چاند کی صورت براجمان عجب بہار دکھا رہی تھیں۔ کلّے میں دبے پان کے بیڑے نے ہونٹوں کو سرخی عطا کر دی تھی اور لگتا تھا دیو صاحب ابھی کسی کا خون پی کر آ رہے ہیں۔ تانگا بمبئی کے پوش علاقے میں داخل ہوا تو کوچوان سمیت تانگے میں سوار تینوں نفوس چوکنے سے ہو گئے۔ چند منٹوں میں تانگا ایک عالیشان کوٹھی کے پھاٹک پر جا رکا۔

''کون ہے؟'' فوراً ہی پھاٹک پر موجود چوکیدار نے کڑے لہجے میں دریافت کیا اور ساتھ ہی سواریوں کو دیکھنے کے لیے ان پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔

''ہم چاند بانو ہیں۔ ہمارے ساتھ ہمارا ایک سازندہ بھی ہے۔ ہم سیٹھ صاحب سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔'' عورت نے گھونگھٹ کے اندر سے اپنی مترنم آواز میں جواب دیا۔

''ملاقات کے لیے اور اس سمے...... سیٹھ جی اتنی رات کو کسی سے نہیں ملتے۔'' چوکیدار کا کرخت لہجہ خود بخود ہی نرم ہو گیا اور اس نے اطلاع فراہم کی۔

''سیٹھ صاحب جانتے ہیں کہ ہماری طرف کا دن، رات کو ہی چڑھتا ہے۔ تم جا کر انہیں اطلاع دے دو کہ زمرد بائی کے کوٹھے سے چاند بانو ملاقات کے لیے آئی ہے۔ وہ خود ہی فیصلہ کر لیں گے کہ ہماری آمد کا سمے مناسب ہے یا نامناسب۔'' چاند بانو کے لہجے کی چاشنی کچھ اور بھی بڑھ گئی چوکیدار کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ اب بھی اس کی آمد کی اطلاع اندر نہ پہنچاتا۔ تھوڑی ہی دیر میں حسب توقع اندر سے بلاوا آ گیا۔ کوچوان تانگا ایک طرف کر کے باہر ہی رکا رہا اور چاند بانو اپنے سازندے کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی اور ایک دوسرے ملازم نے ایک کمرے تک ان کی راہنمائی کی اور باہر رک کر دھیمی آواز میں بولا۔

''سیٹھ جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور ڈاکٹر نے آرام کا بولا ہے اس لیے آپ لوگ زیادہ دیر اندر مت ٹھہریے گا۔''

''فکر مت کرو، ہمیں خود بھی سیٹھ صاحب کی صحت کا بہت خیال ہے۔'' چاند بانو نے اسے جواب دیا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ وسیع و عریض بستر پر بھاٹیہ کا مختصر وجود عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ ایک گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز دروازے کی طرف ہی متوجہ تھا۔ چاند بانو نے اپنا گھونگھٹ پیچھے سرکایا اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سیٹھ کو آداب کہا۔

''کہو کیسے آئی ہو؟'' بھاٹیہ نے روکھے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''آپ سے اپنی حالت کہنے آئے ہیں سرکار! جس کوٹھے پر لوگ قطاریں باندھے حاضری کی اجازت کے منتظر رہا کرتے تھے وہاں اب الّو بول رہے ہیں۔ ہمارے داغدار حسن کا کوئی طلب گار نہیں رہا اور فاقوں کی نوبت آنے کو ہے اس لیے ہم نے بہتر سمجھا کہ آپ جیسے قدردان کے دروازے پر دستک دے کر اپنی قسمت کو آزمائیں۔'' چاند بانو رٹے شدہ مکالمے ادا کر رہی تھی۔

''اپن سے زیادہ تو وہ اڈے کا لونڈا تیرا قدر دان تھا۔ سنتے تھے تو بھی اس کے عشق میں سارے سنسار کو ٹھوکر میں رکھتی تھی پھر اس کے پاس کیوں نہیں گئی؟'' وہ صورت سے بیمار دکھائی دیتا تھا اور آواز میں بھی نقاہت تھی اس کے باوجود لہجے کی نفرت و حقارت اپنی جگہ نمایاں ہو رہی تھی۔

''کم ظرفوں کو آئینہ دکھانے کے لیے یہاں آنا بہت ضروری تھا۔'' سیٹھ کی تحقیر و نفرت کا زہر آلود لہجے میں جواب دینے والا وہ شخص تھا جسے سیٹھ نے ابھی تک ایک معمولی سازندہ جان کر نظرانداز کر رکھا تھا۔ وہ بولا تو سیٹھ اس کی آواز سن کر چونک گیا اور سراسیمگی کے عالم میں سرہانے رکھی گھنٹی کا بٹن دبانے کی کوشش کی لیکن مقابل اس سے ہزار گنا زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ اڑتا ہوا سیٹھ تک پہنچا اور اس کے ہاتھ کو اپنی آہنی گرفت میں لیتے ہوئے بولا۔

''یہاں اب تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ اپنا حساب بے باق کیے بغیر میں کسی اور کو تو کیا موت کے فرشتے کو بھی یہاں نہیں آنے دوں گا۔''

''حساب تو اپنا بنتا ہے تمہاری طرف۔ تم میری بیٹی کا مرڈر کر کے بھاگ گئے اور حساب بھی مجھ سے مانگتے ہو۔'' سیٹھ جوش غضب سے کانپ رہا تھا۔

''تمہاری بیٹی کو میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ اس نے خودکشی کی تھی لیکن تم ان لوگوں میں شامل ہو جن پر ربن کے قتل کی ذمے داری عائد ہوتی ہے اور میں عہد کر چکا ہوں کہ اس کا کوئی قاتل اس روئے زمین پر زندہ نہیں رہ سکے گا۔'' سازندے کے بہروپ میں موجود فاروق نے خوفناک لہجے میں اسے آگاہ کیا۔ چاند بانو اس عرصے میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے خود ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ فاروق نے بھاٹیہ کی کوٹھی میں داخلے کے لیے اس کی مدد مانگی

تھی اور اس کے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ کیتھرائن کے ذریعے ملنے والے پیغام پر دوڑی چلی آئی تھی۔ فاروق کیا کر رہا ہے اور اس کے کیا نتائج نکلیں گے اس سے بڑھ کر اس کے لیے اس بات کی اہمیت تھی کہ فاروق اس سے کیا چاہتا ہے اور اس کی خواہش پر وہ من وعن سب کرتی چلی گئی تھی۔ اس نے سازندے کے روپ میں فاروق کی بھاٹیہ سیٹھ تک رسائی کو آسان بنا دیا تھا جبکہ باہر تانگے میں کوچوان کے روپ میں وجے موجود تھا جو ناگزیر حالات میں ہی حرکت میں آتا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ میری بیٹی کو سوسائڈ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بھاٹیہ سیٹھ کی بیٹی تھی اور اس کے اشارے پر دنیا کی ہر چیز اسے مل سکتی تھی، وہ کس کارن سوسائڈ کرتی۔'' بھاٹیہ نے نخوت سے اس کی بات مسترد کی۔

''بھاٹیہ کی بیٹی ہونے کا زعم ہی تو اسے لے ڈوبا۔ تم نے اس کی گھٹی میں ڈالا ہوگا کہ دولت سے دنیا کی ہر چیز حاصل کی جاسکتی ہے اسی لیے جب وہ اپنی دولت سے مجھے خریدنے میں ناکام ہوگئی تو برداشت نہیں کرسکی۔ تم نے اپنی بیٹی کی تربیت ٹھیک نہیں کی تھی سیٹھ۔ اس کی فطرت میں ہی قتل وغارت گری تھی جب ہی پہلے اس نے اپنے پتی کو قتل کروایا اور پھر چاند بانو کی بھی جان لینے کی کوشش کی۔ دیکھ رہے ہو نا اس کا داغدار حسن۔ یہ تمہاری بیٹی ہی کا کارنامہ ہے۔ اس جیسی جنونی عورت نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے کر کچھ انوکھا نہیں کیا ہے۔ اس جیسے مزاج والوں کا عام طور پر ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔'' فاروق بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔ بھاٹیہ کے چہرے کی بدلتی رنگت سے ظاہر تھا کہ وہ اس کی سچائی کو تسلیم کر رہا ہے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے کارناموں سے واقف ہو۔ آخر وہ اپنے مقاصد کے لیے اسی کے ملازمین کو تو استعمال کرتی تھی۔ اتنا گھاگ کاروباری آدمی ہوکر سیٹھ اپنے اردگرد ہونے والے تماشوں سے ناواقف کیونکر ہوسکتا تھا۔

''اپن مان بھی لے کہ اس نے آتما ہتھیا کی تھی تو بھی تمہیں نردوش نہیں سمجھ سکتا۔ اس نے آتما ہتھیا بھی کی تھی تو تمہارے کارن ہی کی تھی نا؟'' بھاٹیہ کے الفاظ سے ثابت ہوگیا کہ بیٹی کو ہٹ دھرمی باپ سے ورثے میں ملی تھی۔

''جرم میرا تھا تو تم نے ربن کو کیوں اس کی سزا دی؟ مجھ پر ہاتھ ڈالتے۔'' فاروق نے اسے جھنجوڑا۔

''اسی کے بل پر تو، تو اچھلتا تھا۔ ویسے بھی ربن کی موت اپنے اکیلے کا فیصلہ نہیں تھا، بہت لوگوں سے پنگا لے رکھا تھا اس نے۔'' فاروق بھاٹیہ کے سر پر سوار تھا اور وہ آرام سے سب بولتا جا رہا تھا۔

''میں تجھ سے مجو اور ڈی ایس پی راٹھور کا پتا لینے ہی آیا ہوں۔'' فاروق نے اسے آگاہ کیا۔

''اور اگر اپن نہ بتائے تو؟'' سیٹھ کے لہجے میں استہزا تھا۔

''تو تیرے لیے اپنی بیٹی کی طرح جان دینا بھی آسان نہیں ہوگا۔ میں تجھے زندگی اور موت کے بیچ لٹکا دوں گا۔'' فاروق کا لہجہ خوفناک ہوگیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ فاروق نے فوراً بھاٹیہ کا منہ دبوچ لیا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ چاند بانو نے اسے اشارے سے اطمینان دلایا کہ وہ سب سنبھال لے گی اور گھونگھٹ آگے کھسکا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر اس نے دستک دینے والے کو اندر آنے یا جھانکنے کا موقع نہیں دیا اور خود تیزی سے باہر نکل گئی۔ باہر سے اس کی اور اس ملازم کی جو انہیں یہاں تک چھوڑ کر گیا تھا، دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر آوازیں دور چلی گئیں۔ چاند بانو نے ملازم سے کیا گفتگو کی تھی، سنائی نہ دینے کے باوجود فاروق نے سمجھ لیا کہ وہ اسے سنبھالنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ ادھر بھاٹیہ بستر پر پڑے پڑے ہی مچلتا رہا کہ کسی طرح باہر موجود ملازم کو متوجہ کرلے لیکن فاروق کے آگے اس کی کوئی پیش نہیں چلی اور وہ اس کے بازوؤں میں ہی پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

''بے کار ہے سیٹھ! تمہاری ساری کوشش بے کار ہے۔ میں سر سے کفن باندھ کر یہاں آیا ہوں اور میرے سر پر خون سوار ہے۔ تم میری بات جتنی جلدی مان لو گے تمہارے لیے اتنی آسانی رہے گی۔ مجھ سے کسی رحم کی امید بالکل مت رکھنا۔ ربن کی لاش دیکھنے کے بعد میرے اندر کا درندہ جاگ گیا ہے اور اس درندے کے منہ کو خون کا ذائقہ لگ چکا ہے اس لیے تمہارا خون بہانے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔'' ایک تو اس نے حلیہ اچھا خاصا خوفناک بنا رکھا تھا، اس پر لہجہ مزید خوفناک ہوگیا تو سیٹھ کا سارا اطمینان اور بے نیازی کافور ہوگئی اور وہ خوفزدہ نظر آنے لگا۔ اس نے آنکھوں کے اشاروں اور مبہم آوازوں سے فاروق سے التجا کی کہ وہ اس کو کچھ بولنے کی اجازت دے دے۔ فاروق نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹالیا۔ ہاتھ ہٹانے پر سیٹھ نے پہلے گہرے گہرے سانس لیے پھر بولا۔

''اپنے کو مجو دادا اور راٹھور کے اتے پتے کی کھبر (خبر) نہیں ہے۔ ان دونوں سے ادھر تھانے میں ہی

ملاقات ہوئی تھی۔''

''ٹھیک ہے جب تمہیں معلوم نہیں ہے تو اپنا منہ بند رکھو۔ میں خود ہی ان کا پتا معلوم کرلوں گا۔'' فاروق نے پھرتی سے ایک تکیے کا غلاف اتارا اور سیٹھ کے منہ میں ٹھونس دیا۔ سیٹھ کے منحنی سے وجود میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ فاروق کا مقابلہ کر پاتا۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹنے والی ہوگئیں۔ فاروق نے اپنی جیب سے چاقو برآمد کیا تو آنکھوں کی وحشت اور بھی بڑھ گئی۔

''اس چاقو کی دھار بہت تیز ہے۔ بھلا نے سوسائڈ کے لیے اسی چاقو کو استعمال کیا تھا لیکن فکر نہیں کرو۔ میں اس چاقو کو تمہارے سینے میں گھونپ کر تمہاری جان نہیں لوں گا۔ ابھی تو ابتدا ہے اور مجھے پہلے ربن کی کٹی ہوئی انگلیوں کا حساب لینا ہے۔'' نہایت سکون سے کہتے ہوئے اس نے سیٹھ کا دایاں ہاتھ پکڑا اور چھنگلی کو ایک جھٹکے سے کاٹ کر الگ کردیا۔ منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوتا تو سیٹھ یقیناً فلک شگاف چیخیں مارتا۔ فی الحال تو وہ بس بستر پر ہی لوٹ پوٹ ہوکر رہ گیا اور بری طرح ہاتھ پیر مارنے لگا۔

''صرف ایک چھنگلی پر یہ حال ہے سیٹھ۔ دادا کے دونوں ہاتھوں پیروں سے پوری بیس کی بیس انگلیاں غائب تھیں۔ سوچو کیسی تکلیف ہی ہوگی اس نے۔'' ربن کی میت کو غسل دیتے ہوئے اس نے اس کے بغیر انگلیوں کے ہاتھ پیر اچھی طرح دیکھے تھے۔ اب بھی وہی تصویر نظروں کے سامنے آگئی اور سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ آنکھوں کی وحشت کچھ اور سوا ہوگئی۔ تکلیف سے تڑپتے بھاٹیہ سیٹھ کو اس وحشت نے مزید خوف زدہ کردیا اور اس نے اشارے سے فاروق کو یقین دہانی کروائی کہ وہ اسے اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کو تیار ہے۔ فاروق نے اس کے منہ میں ٹھسا تکیے کا غلاف باہر نکال دیا۔ اس بار سیٹھ نے فرفر اس کے مطلوبہ افراد کے پتے بتادیے۔

''یہی بات پہلے بول دیتے تو آسان موت مرتے۔ فضول میں اپنی ایک انگلی کٹوائی۔'' فاروق اس کے خاموش ہونے کے بعد سنجیدگی سے بولا اور چاقو ہاتھ میں لے کر یوں تولنے لگا جیسے اسے بھاٹیہ کے سینے میں اتارنے والا ہے۔ دہشت سے بھاٹیہ کی آنکھیں پھٹ گئیں اور چہرہ یوں زرد ہوگیا جیسے جسم میں خون کی ایک بوند بھی نہ بچی ہو۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ اذیت بھرے انداز میں مسخ ہونے لگا اور وہ اپنی جگہ پڑے پڑے بری طرح تڑپا۔ اس کی کیفیت پر لمحہ بھر کے لیے تو فاروق حیران ہوا پھر سمجھ گیا کہ خوف نے دل کے دورے کی شکل اختیار کرلی ہے اور اب اسے چاقو کے استعمال کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ وہ سیٹھ کو یونہی تڑپتا چھوڑ کر اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ اس نے اپنے پیچھے بند کردیا تھا۔ اب اسے چاند بانو کی تلاش تھی۔ بیرونی راستے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اسے بھی کھوج رہا تھا۔ آخر ایک کھلے دروازے سے اسے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے گئی۔ چاند بانو کی آواز شناخت کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ کمرے کی چوکھٹ پر جا کھڑا ہوا۔ چاند بانو اور اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ملازم نے اسے دیکھ لیا۔ چاند بانو فوراً کھڑی ہوگئی۔

''کام ہوگیا استاد جی۔'' اس نے بڑے ادب سے فاروق سے دریافت کیا۔ اب وہ پورا گھونگھٹ نہیں نکالے ہوئے تھی اور پلو کو اس انداز میں سر پر اوڑھ رکھا تھا کہ اس کے چہرے کا داغدار حصہ بھی پلو میں چھپ گیا تھا۔ آدھا نظر آنے والا چہرہ بدلی سے جھانکتا چاند تھا اور ظاہر ہے اس نے اپنے حسن کی یہ چاندنی دکھا کر ہی ملازم کو اس طرح زیر کیا تھا کہ اسے دوبارہ آکر یہ یاد دہانی کروانے کا خیال نہیں آیا تھا کہ سیٹھ صاحب کا زیادہ وقت نہ لیا جائے۔

''ہاں ہوگیا کام۔ میں نے سیٹھ سے جو مانگا اس نے سب دے دیا۔'' فاروق نے سنجیدگی سے بتایا۔

''ہمیں سیٹھ صاحب سے یہی امید تھی۔ اچھا مسٹر لکھن! ہم چلتے ہیں۔ زندگی رہی تو ہوسکتا ہے پھر کبھی ملاقات ہوجائے۔'' چاند بانو نے پہلا جملہ فاروق سے اور دوسرا اس ملازم سے کہا جو شاید یہاں ملازمین کا انچارج تھا اور اس وقت چاند بانو جیسی حسینۂ عالم کے ساتھ گفتگو کا شرف حاصل کرکے بہت خوش نظر آرہا تھا۔

''میں بھگوان سے پراتھنا کروں گا کہ ایسی شبھ گھڑی جلد دوبارہ آئے۔'' ملازم بری طرح ریشہ خطمی ہورہا تھا۔ چاند بانو نے اسے مسکراہٹ سے نوازا اور فاروق کے پیچھے چل پڑی۔ باہر وجے تانگے میں ان کا منتظر تھا۔

''سب ٹھیک رہا استاد۔'' ان دونوں کے بیٹھتے ہی اس نے تانگا آگے بڑھاتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں، سب ٹھیک رہا۔ بس سیٹھ ضرورت سے زیادہ بزدل نکلا اور خود ہی دل کے دورے سے مرگیا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں اطلاع دی اور چاند بانو کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔

''مجھے ابھی ابھی احساس ہوا ہے کہ میں نے تمہیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ سیٹھ کے ملازمین اس کی لاش ملنے کے بعد پولیس کو یہ ضرور بتائیں گے کہ رات کو تم نے کسی

آدمی کے ساتھ اس سے ملاقات کی تھی۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم پولیس سے نمٹ لیں گے۔ یوں بھی سیٹھ دل کے دورے سے مرا ہے تو اتنی فکر کی کیا ضرورت ہے۔'' چاند بانو نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

''میں نے سیٹھ کی چھنگلی کاٹ ڈالی تھی جس سے خاصا خون نکل کر بستر پر پھیل گیا تھا۔ سیٹھ کی موت کی وجہ کا اصل تعین بعد میں ہوگا اور ملازمین خون دیکھ کر پہلے پولیس کو بلوالیں گے۔'' فاروق نے اسے مکمل صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''آپ تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ پولیس اتنی آسانی سے ہم تک نہیں پہنچ سکے گی۔ ہم کاجل سے بات کر کے اپنی روپوشی کا انتظام کرلیں گے۔ ویسے بھی جو حالات ہیں ان میں پولیس کو سیٹھ کی موت پر تحقیق کرنے کے لیے زیادہ مہلت نہیں مل سکے گی۔'' چاند بانو کا اشارہ سیاسی جغرافیائی تبدیلیوں کی طرف تھا اور تبدیلی تو واقعی آچکی تھی۔ وہ لوگ چاند بانو کو اس کے کوٹھے کے سامنے اتار کر واپس پلٹ رہے تھے تو ریڈیو پر قیام پاکستان کا اعلان کیا جارہا تھا۔ مسلمانوں کی انتھک جدوجہد نے ان کے علیٰحدہ وطن کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کردیا تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا برادر! کراچی جانے کا کوئی انتظام ہوا یا نہیں؟'' تھکا ہارا جانی واپس ہوٹل آیا تو جولیٹ نے بے قراری سے دریافت کیا۔ دلدار آغا کے نہ ملنے کے بعد وہ لوگ دہلی آگئے تھے اور یہیں انہیں قیام پاکستان کی خبر سننے کو ملی تھی۔ اس خبر کو سننے کے بعد جولیٹ فکرمند ہوگئی تھی کہ کہیں راستے بند نہ ہوجائیں۔ جانی بھی اسی فکر میں مبتلا تھا اور مسلسل اسی تگ و دو میں لگا ہوا تھا کہ کراچی جانے کا کوئی محفوظ انتظام ہوجائے۔ جانے کو قافلے جارہے تھے لیکن حفاظتی نقطۂ نظر سے زیادہ تر لوگ اپنی روانگی کو خفیہ رکھ رہے تھے۔ ٹرینیں بھی کھچا کھچ بھری ہوئی جارہی تھیں، اسی لیے جانی کو انتظام کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی اور جولیٹ کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔

''آج اپن کچھ کامیاب واپس آیا ہے سسٹر! ادھر اسٹیشن پر اپنے کو اپنا ایک پرانا یار مل گیا تھا۔ ہندو جاتی کا ہے لیکن ایک نمبر کھرا آدمی ہے۔ اس نے اپن کو پرامس کیا ہے کہ اگر اپن ٹھیک چار بجے اسٹیشن پر پہنچ جائے تو وہ ٹرین میں اپنے کو جگہ دلا دے گا۔ ٹرین ادھر سے لاہور جائے گی پھر ادھر سے اپن کراچی جانے کا انتظام کرے گا۔'' جانی نے اسے اطلاع دی تو وہ خوش ہوگئی اور بولی۔

''تھینک گاڈ۔ اس پرابلم کا کوئی سولوشن تو نکلا ورنہ میں تو پریشان ہوگئی تھی کہ کیسے کراچی پہنچوں گی۔''

''اپن کے ہوتے تم کس لیے وری ہوتا ہے سسٹر۔ اپن ہے نا تمہارے پرابلمز سولو کرنے کو۔'' جانی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلایا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو برادر! تمہارے ہونے سے رئیل میں مجھے بہت سپورٹ ہے لیکن سم ٹائم میں گلٹی بھی فیل کرتی ہوں کہ میری وجہ سے تمہیں اپنے سارے لوگوں کو چھوڑنا پڑا ہے۔ یقیناً تم اندر سے سیڈ (اداس) ہوگے اور وہ لوگ بھی تمہارے لیے فکرمند ہو رہے ہوں گے۔ بہتر ہے کہ تم مجھے ٹرین میں بٹھا کر خود اپنے دوستوں کے پاس واپس لوٹ جاؤ۔ آئی ایم آ بریو گرل، مجھے اکیلے سفر کرتے ہوئے بالکل ڈر نہیں لگے گا۔'' جولیٹ، جانی کے خلوص کی معترف تھی لیکن نہیں چاہتی تھی کہ اسے سب سے جدا کر کے اپنے ساتھ لے جائے اس لیے اسے واپس پلٹنے کی پیشکش کرتے ہوئے اپنی طرف سے اطمینان دلایا۔

''تم ایسی باتیں کر کے اپن کو سیڈ کرتا ہے سسٹر۔ اپن پہلے بھی تم کو بولا ہے کہ اپن تم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے کا ہے، پھر تم کائے کو اپنے کو فورس کرتا ہے۔'' جانی نے ناراضی کا اظہار کیا تو جولیٹ نے فوراً ہی اس سے سوری کرلی۔ اس کے بعد ان کے درمیان سفر سے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ دونوں کے پاس اپنا مختصر اسباب تھا جس میں اضافے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں اپنے اپنے طور پر سفری اخراجات کے لیے جو رقم ساتھ لے کر نکلے تھے، اسے بے جا مصارف میں خرچ کرنے کے بجائے احتیاط سے استعمال کرنا ہی ٹھیک تھا۔ ہوٹلوں میں قیام کی وجہ سے پہلے ہی انہیں خاصی رقم خرچ کرنا پڑ رہی تھی۔ آگے پاکستان پہنچ کر نہ جانے کیا حالات پیش آتے۔ بالکل انجان جگہ پر خالی ہاتھ پہنچنا دشواریوں میں اضافے کا باعث بن سکتا تھا۔ جانی کو اس کے دوست نے ویسے بھی تنبیہ کردی تھی کہ پاکستان جانے والی ٹرینیں اثاثہ بھر کر جارہی ہیں اس لیے وہ اپنے ساتھ زیادہ اسباب نہ لائے۔ یوں انہیں سفر کی کوئی خاص تیاری نہیں کرنا تھی۔

انہوں نے وہ پوری رات اور اگلے دن کا بیشتر حصہ آرام کرتے ہوئے گزارا اور تین بجے سہ پہر اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ چار بجے سے کچھ پہلے ہی اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ پریشان حال مرد و زن اور بچے ٹولیوں میں پورے اسٹیشن پر پھیلے ہوئے

تھے۔ جانی کو اس کا دوست مقررہ جگہ پر مل گیا۔ وہ حیران تھا کہ وہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ پاکستان جانے کے خواہش مند کیوں ہیں جبکہ کرسچین کمیونٹی کو ہندوستان میں کوئی خطرہ بھی لاحق نہیں تھا۔ حیرانی کے اظہار کے ساتھ اس نے تھوڑی سی تشویش کا بھی اظہار کیا کہ موجودہ حالات میں یہ سفر ان کے لیے خطرناک ثابت نہ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ قیام پاکستان پر اس کے ہم قوم لوگ غم، غصے، رنج اور نفرت سے بھر گئے ہیں اور ان کی یہ جذباتی کیفیت کوئی بھی گل کھلاسکتی ہے۔ جانی اور جولیٹ اس کا اشارہ سمجھ رہے تھے۔ اتنے عرصے سے جاری کشمکش ان کے بھی علم میں تھی اور وہ ایسے واقعات سے بھی واقف تھے جب ان جذبات نے خاک وخون کا بازار گرم کیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جولیٹ اپنے اندر بھڑکتے انتقام کے شعلوں کو سرد کیے بغیر سکون سے نہیں رہ سکتی تھی اور جانی اس کا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، اس لیے تمام خطرات وخدشات کے باوجود ان کا پاکستان جانا ناگزیر تھا۔

ٹرین شام چھ بجے اسٹیشن پہنچی اور لوگوں کا ہجوم اس کی طرف لپکا۔ جانی کے دوست کی معیت میں وہ بھی ٹرین کی طرف بڑھے۔ بوگیوں کے دروازے بند تھے لیکن لوگوں کے سیلِ رواں کے آگے کوئی دروازہ بند نہ رہ سکا۔ اس ہجوم میں سے جگہ بنا کر انہیں ٹرین پر سوار کروانا جانی کے دوست کا کارنامہ تھا۔ کچھ اس کی گارڈ سے واقفیت بھی کام آئی لیکن موقع ایسا نہیں تھا کہ انہیں کوئی وی آئی پی سیٹ مل پاتی۔ جو سیٹیں مل گئیں، انہوں نے ان پر ہی شکر کا کلمہ ادا کیا۔ لمحوں میں پوری ٹرین بھر گئی تھی۔ سیٹوں کے علاوہ لوگ درمیانی جگہ پر بھی بیٹھے اور کھڑے تھے۔ جہاں اتنے لوگ ہوں وہاں شور بھی لازمی ہوتا ہے۔ بچوں کے رونے کی آوازیں، ان کی ماؤں کی خوف میں ڈوبی تسلیاں اور لوریاں، مردوں کی فکر وجھنجلاہٹ بھری ہدایتیں اور اپنے اہلِ خانہ کی تعداد مکمل ہونے کی تسلی کے لیے لگائی جانے والی پکاروں نے وہاں مچھلی بازار سے بھی سوا غل مچایا ہوا تھا۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے گھٹن بھی ہورہی تھی۔ موسم گرم تھا اور جسموں سے پھوٹتے پسینے کی بدبو نے اس گھٹن میں اضافہ کردیا تھا لیکن جولیٹ اپنے دل میں کسی قسم کی ناگواری محسوس نہیں کررہی تھی۔ اسے شعور تھا کہ اتنی بڑی تبدیلی کے عمل سے گزرتے یہ افراد حقیقت میں ہمدردی کے مستحق ہیں۔ اپنی بسی بسائی دنیا کو چھوڑ کر مختصر اسباب کے ساتھ، خوف کے سائے میں انجان زمین پر ایک امید کے سہارے قیام کے لیے جانا کوئی معمولی عمل نہیں تھا۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی جذباتی، نفسیاتی یا معاشی بحران سے گزر کر یہ مرحلہ طے کرنے جارہا ہوگا۔ ان میں سے کچھ پُرجوش ہوں گے کہ اب وہ اپنے علیحدہ وطن میں اپنے مذہبی تشخص کے ساتھ آزادانہ زندگی گزار سکیں گے جبکہ کچھ نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس لیے ہجرت کا فیصلہ کیا ہوگا کہ اب مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی سرزمین تنگ ہوگئی تھی اور انتہاپسند ہندو یہاں موجود مسلمانوں کو اپنے غم وغصے کا نشانہ بنارہے تھے۔ وجہ جو بھی تھی وہ سب اپنی جڑوں سے اکھڑ کر نئی زمین پر بسیرا کرنے جارہے تھے اور امید وخوف میں مبتلا ان لوگوں کے لیے ناگواری محسوس کرنا غیرانسانی رویہ ہوتا، سو وہ بھی شور، گھٹن اور بُو کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی دل میں بخیریت اس سفر کے مکمل ہوجانے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

ٹرین نے وسل دی اور اپنی جگہ سے حرکت میں آئی تو چند جوشیلے نوجوانوں نے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کردیے۔ جولیٹ ان کے چہروں کی چمک اور تمتماہٹ کو دیکھ کر سوچتی رہی کہ انسان اپنے آزادانہ تشخص کے لیے کتنا دیوانہ ہوتا ہے۔ غلامی میں ظلم وجبر ہو یا سونے کا نوالہ کھانے کو ملے، بات برابر محسوس ہوتی ہے۔ جب ہی تو یہ لوگ اپنے بھرے ہوئے گھر، دوست احباب اور نہ جانے کیا کیا چھوڑ کر اتنے جوش وخروش سے اپنے اس نئے وطن کی طرف جارہے تھے جو ان کی تمناؤں اور امیدوں کا مرکز تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھے لیکن ان کی آنکھوں میں خواب سجے ہوئے تھے اور خواب زندگی کا سب سے خوب صورت حصہ ہوتے ہیں۔ خوابوں کے سہارے انسان بدترین حالات سے بھی گزر جاتا ہے۔ خواب زندگی کی تاریک راہوں کو روشن کردیتے ہیں۔ کبھی وہ بھی خواب دیکھا کرتی تھی۔ جوزفین اور جوزف کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہوئے بھی اسے کبھی کسی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کی پلکوں پر خواب جگنو بن کر چمکتے تھے۔ وہ عارف کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے کے خواب دیکھتی تھی۔ اسے عارف کے گھریلو مسائل اور کم حیثیتی نے کبھی بددل نہیں کیا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ کبھی نہ کبھی یہ وقت گزر جائے گا اور عارف اپنی بہنوں کے فرائض سے فارغ ہوکر اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنالے گا تو زندگی میں بس خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ وہ اور عارف مل کر اپنے گھر کو سجائیں اور سنواریں گے، ایک دوسرے کے ماں باپ کا خیال رکھیں گے اور ان کے بچے اپنے نانا، نانی اور دادا دادی کی محبت وشفقت کے سائے میں پل کر بڑے

ہوں گے لیکن اس کے سارے خواب بکھر گئے تھے۔ دلدار آغا کی ہوس نے اس سے اس کی آبرو ہی نہیں خواب بھی چھین لیے تھے۔ جوزف اور جوزفین کو اجل لے گئی تھی، عارف محبت کی آزمائش پر پورا نہیں اتر سکا تھا اور خود اس پر ایک بالکل غیر متوقع انکشاف ہوا تھا کہ وہ جوزف کی نہیں بلکہ اسد اللہ جیسے صاحب ثروت کی بیٹی ہے۔

وہ اپنے حقیقی باپ کے عالیشان محل میں کچھ عرصہ گزار آئی تھی۔ وہاں دنیا کی ہر نعمت تھی، یہاں تک کہ محبتوں کا نعم البدل بھی...... جوزف کی جگہ اسد اللہ اور عارف کی جگہ آصف خان پُر کرنے کو موجود تھے لیکن اس کے پاس خواب نہیں رہے تھے جن کے سہارے وہ زندگی کا سفر جاری رکھ پاتی۔ اس کے پاس صرف ایک جذبۂ انتقام تھا جو اسے یہاں سے وہاں لیے پھرتا تھا۔ اسی جذبے کو سینے سے لگائے وہ آج اس ٹرین میں سوار تھی اور انسانوں سے کھچا کھچ بھری ٹرین اپنی منزل کی طرف آہستہ خرامی سے بڑھتی جارہی تھی۔ دہلی سے لاہور تک کا فاصلہ بہت طویل نہیں تھا لیکن اول ٹرین کی روانگی میں بہت تاخیر ہوئی، دوم ٹرین کی رفتار بہت کم تھی اس لیے تاریکی نے انہیں آلیا۔ جولیٹ کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھی ہونے کے باوجود تاریکی کے باعث باہر کے مناظر سے محروم ہوچکی تھی۔ البتہ کبھی کبھی ٹکرانے والے ہوا کے جھونکوں نے گھٹن کے احساس کو قدرے کم کردیا تھا۔ روتے دھوتے بچے تھک ہار کر اپنی ماؤں کی آغوش میں سو گئے تھے اور بڑے بھی ابتدائی افراتفری سے سنبھل چکے تھے، سو اب وہ شوروغل بھی نہیں تھا جو اعصاب پر اثر انداز ہوتا پھر بھی جولیٹ کو عجیب سی گھبراہٹ اور بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اس نے رخ موڑ کر اپنے ساتھ بیٹھے جانی کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ہی غنودگی میں چلا گیا تھا۔ جولیٹ نے اس کی نیند خراب کرنے کے بجائے خود بھی آنکھیں موند لیں اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ابھی اسے آنکھیں بند کیے مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ ہی گزرا ہوگا کہ ٹرین شور مچاتی ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور فوراً ہی انسانی آوازوں کا ایک غل سا سنائی دیا۔ مسافروں میں سے اکثریت جاگ رہی تھی، کچھ کچی پکی نیند میں بھی تھے۔ ٹرین جھٹکے سے رکی تو سوئے ہوؤں کی آنکھ بھی کھل گئی۔ غل کی صورت سنائی دینے والی آوازیں بھی واضح ہونے لگیں۔ یہ وحشیانہ اور پُرجوش نعروں کی آوازیں تھیں جنہوں نے صورتِ حال کو واضح کردیا اور مسافروں کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔

ان کی ٹرین کو بلوائیوں نے روک لیا تھا، یقیناً انہوں نے آگے پٹریوں پر کوئی رکاوٹ کھڑی کردی تھی جس کی وجہ سے ڈرائیور کو ایمرجنسی بریک لگانے پڑے تھے اور بلوائی نعرے لگاتے ٹرین کے ڈبوں میں چڑھ رہے تھے۔

''کھڑکیاں اور دروازے بند کردو۔ جلدی کرو۔''

کسی نے چیخ کر ہدایت دی تو کھٹا کھٹ کی آوازوں کے ساتھ کھڑکیاں بند ہونے لگیں۔ جولیٹ اس صورتِ حال پر بھونچکی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی لیکن جانی جو جاگ چکا تھا تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے کھڑکی بند کردی لیکن یہ حکمت عملی کچھ زیادہ موثر نہیں تھی کہ کئی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور خستہ حال ٹرین کے دروازے بھی زیادہ مضبوط نہیں تھے۔ بلوائیوں نے ٹوٹی کھڑکیوں سے بھالے اور کرپانیں گھسا کر مسافروں کو نشانہ بنانا شروع کردیا۔ وہاں قیامت سی مچ گئی۔ آہوں، چیخوں اور پکاروں کے درمیان کسی کے لیے بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھنا ممکن نہیں تھا۔ جانی نے پھر بھی حاضر دماغی سے کام لیا اور جولیٹ کو گھسیٹ کر سیٹ سے نیچے ڈال دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب بلوائی ڈبے کے کمزور دروازے کو توڑنے میں کامیاب ہوکر اندر گھس آئے اور قتل عام مچادیا۔ سیٹ سے نیچے گری جولیٹ حواس باختہ انسانوں کی دردناک چیخیں، آہیں اور التجائیں سنتی رہی۔ وہ جن کی آنکھوں میں خواب سجے تھے، بے دردی سے کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ کچھ نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے پاس مقابلے کے لیے تھا ہی کیا۔ فرار کی کوشش کرنے والوں کو بھی کامیاب نہیں ہونے دیا گیا اور لاشوں پر لاشیں گرتی چلی گئیں۔ مقابلہ کرنے والوں میں جانی بھی شامل تھا۔ اڈے کے آدمیوں کی خاص نشانی، ہمہ وقت جیب میں پڑا رہنے والا چاقو باہر آیا تو بلوائیوں کے کچھ ساتھیوں کو مزہ چکھنا پڑا لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ اور ہتھیاروں سے لیس تھے۔ جلد ہی جانی کا چاقو نیچے گر گیا اور بھالوں نے اس کا جسم چھید ڈالا۔ جانی کا بے جان جسم عین جولیٹ کے اوپر آ کر گرا۔ اس نے اپنے وجود پر جانی کے گرم خون کی دھاریں سی بہتی محسوس کیں لیکن اس کے لیے اپنی جگہ سے ہلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کتنی ہی بہادر اور خود اعتماد سہی ایسی درندگی کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور بھاری پگڑ والے ایک بلوائی نے چند ماہ کے ایک بچے کو اپنے بھالے میں پرو کر اوپر اٹھا کر وحشیانہ قہقہے لگائے تو اس کے اعصاب بالکل ہی جواب دے گئے اور وہ ہوش وحواس سے بیگانی ہوتی چلی گئی۔ سنگ دل بلوائی لاشوں اور زخمیوں کے بیچ

دندناتے ان کے سامان کی پوٹلیوں پر قابض ہونے لگے۔ وہ مال وزر جو خانماں برباد نئی سرزمین پر اپنی نئی زندگی کے آغاز کے لیے ساتھ لے کر چلے تھے ہوس پرستوں کی شادمانی کا سامان بن گیا۔ جان ومال چھین لینے والے بلوائیوں کے اترنے کے بعد ٹرین نے دوبارہ اپنا سفر شروع کیا تو اس میں مشکل سے چند زندگیاں ہی باقی بچی تھیں۔

☆☆☆

ہجرت کا فیصلہ یونہی نہیں کیا جاتا۔ انسان اپنی جڑوں سے اکھڑنا یونہی قبول نہیں کرتا۔ اتنے بڑے فیصلے کے پیچھے مضبوط اسباب ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس بھی وہ اسباب تھے۔ وہ برسوں سے انگریزوں کی غلامی کی چکی میں پس رہے تھے۔ غلامی کے اس عرصے نے ان کے مذہب، معاشرت اور تہذیب سب کو متاثر کیا تھا۔ ایک طرف ان کی حیثیت حقیر کیڑوں کی سی تھی تو دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو انگریزی تہذیب میں رنگ کر اپنی اصل سے جدا ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو غلامی کی زنجیریں توڑنا تھیں، اپنا وقار بھی بحال کرنا تھا اور اپنی نسل کو مکمل تباہی سے بھی بچانا تھا چنانچہ وہ جدوجہدِ آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے اور اس جدوجہد کے مثبت نتائج سامنے آتے آتے ان پر یہ انکشاف بھی ہو گیا تھا کہ انگریزوں کے بعد ہندو انہیں اپنی غلامی میں جکڑنے کی تیاری میں ہیں چنانچہ انہوں نے دوطرفہ جنگ لڑی اور اپنے لیے ایک علیحدہ وطن کے حصول میں کامیاب ہو کر رہے۔ وطن بن گیا تو اس میں بسنا بھی ایک فطری خواہش تھی چنانچہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آزادی کے متوالے جوق درجوق ہجرت کر کے پاک سرزمین کی طرف جانے لگے۔ نواب سلیم اللہ کا خاندان ہندوستان کے ان آسودہ خاندانوں میں سے تھا جنہیں ہجرت کا خیال چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ جذبۂ ملی کے تحت بس اتنا خیال تھا کہ جب ریاست حیدرآباد کی طرف سے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا جائے گا تو وہ خود بخود مملکتِ اسلامی کے باشندے بن جائیں گے لیکن حالات کی آندھی اس زوروں سے چلی کہ پورا خاندان ہی اس کی زد میں آ گیا اور گنتی کے جو چند نفوس باقی بچے ان کے لیے ہجرت ناگزیر ہو گئی۔

بچا کھچا مال ومتاع سمیٹ کر وہ دونوں بھائی ثروت بیگ کے خاندان کے ساتھ ہجرت کے لیے تیار ہو گئے۔ دونوں ہی خاندانوں کا اثر رسوخ بہت پھیلا ہوا تھا۔ سو برے حالات میں بھی ہجرت کا عمل نسبتاً سہل انداز میں طے پانے لگا۔ صاحبِ فراش ندرت جہاں اور ثروت بیگ کے نازک مزاج زنان خانے کے لیے خصوصاً سفر کو آرام دہ بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ دہلی تک کا زمینی سفر زیادہ تر آرام دہ بڑی گاڑیوں میں طے ہوا پھر بھی عیش وآرام میں پلے جسم تھکن سے چور ہو گئے۔ کچھ وطن چھوڑنے کا دکھ بھی تھا جو بار بار آنکھوں کو نم کر دیتا تھا۔ حویلی سے نکلتے ہوئے خواتین نے باقاعدہ گریہ کیا تھا۔ ایک ندرت جہاں تھیں جن کی ویران آنکھوں میں کوئی جذبہ نہیں تھا، ورنہ دکھی تو مرد بھی تھے۔ مردوں میں صفی اللہ سب سے زیادہ نڈھال نظر آرہے تھے۔ اپنی حویلی کی وہ آخری رات ان کے دل ودماغ سے نکلتی نہیں تھی اور وہ اب تک ششدر تھے کہ کیسے اس رات انہوں نے خود ان بیبیوں کو جو انہیں دل وجان سے عزیز تھیں، جان دینے کا حکم دے ڈالا تھا۔ اس رات وہ گر کر ہوش وحواس سے بیگانے ہوئے تھے تو صرف اسی لیے کہ ہوش میں رہ کر اتنا بڑا صدمہ سہنا آسان نہیں تھا، ورنہ حملہ آوروں کی طرف سے چلائی گئی گولی تو انہیں بہت اچٹتی ہوئی ہی لگی تھی، ہاں پیروں تلے روندے جانے کی وجہ سے کچھ اثر ضرور ہوا تھا لیکن وہ جسمانی تکالیف تو ثروت بیگ کے بلائے گئے قابل ڈاکٹر کی تجویز کردہ دواؤں سے فوراً ہی ٹھیک ہو گئی تھی۔ یہ تو روح پر لگے گھاؤ تھے جن کا بھرنا دشوار تھا اور جنہوں نے ان کو نڈھال کر رکھا تھا۔ ایک تڑپ یہ بھی تھی کہ بچھڑا ہوا بیٹا مل سکے گا بھی یا نہیں۔ ثروت بیگ اور اسد اللہ نے انہیں بڑی یقین دہانی کروائی تھی کہ پاکستان پہنچ کر جیسے ہی حالات قابو میں آئے وہ اپنے رابطوں کو پوری طرح استعمال کریں گے اور محب اللہ کو لندن میں کھوج نکالیں گے لیکن ان کے دل کو قرار نہیں آتا تھا۔

شاید صفی اللہ ہجرت پر راضی نہ ہوتے لیکن اسد اللہ نے انہیں اپنی مثال دے کر قائل کر لیا تھا کہ آخر وہ بھی تو اپنی اکلوتی بیٹی کے بغیر ہجرت کے لیے تیار ہو گئے ہیں چنانچہ اب وہ سب دہلی ائرپورٹ پر موجود تھے۔ ان کے علاوہ ایک خاندان اور بھی موجود تھا جس میں کل پانچ افراد شامل تھے۔ یہ ایک مشہور کاروباری خاندان تھا جس کے چند افراد پہلے ہی پاکستان پہنچ کر اپنے قدم جمانے کی کوششیں شروع کر چکے تھے اور اب خاندان کی تین خواتین، ایک بچہ اور بچے کا بوڑھا دادا پاکستان کی طرف جارہے تھے۔ جہاز میں سوار ہوا کے دوش پر اڑتے ان ثروت مندوں نے ایک محفوظ ومامون سفر کے بعد لاہور کے ویران ائرپورٹ پر جہاز سے قدم نیچے رکھے تو وہ بھی کچھ سراسیمہ تھے۔ دورانِ سفر دونوں خاندانوں کے افراد میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی چنانچہ لاہور ائرپورٹ پر

بڑے میاں نے اپنے استقبال کے لیے آئے ہوئے بیٹوں کو حکم سنایا کہ ان کے ہم سفروں کے لیے بھی سواری کا انتظام کیا جائے۔ وہ عمر میں اسد اللہ، صفی اللہ اور ثروت بیگ تینوں سے بڑے تھے اور دورانِ سفر جان چکے تھے کہ فی الحال پاکستان میں ان کی رہائش کا کوئی انتظام نہیں ہے، اس لیے انہوں نے حکمیہ انداز میں ان سے اصرار کیا تھا کہ وہ کوئی انتظام ہونے تک ان کے ساتھ ان کی کوٹھی میں رہیں گے۔ ان کے انداز میں اتنی اپنائیت تھی کہ وہ لوگ زیادہ تکلف نہ کر سکے، ورنہ ارادہ تو یہی تھا کہ وقتی طور پر کسی ہوٹل میں قیام کرلیا جائے گا اور پھر کلیم کے کاغذات منظور ہونے تک کوئی کوٹھی کرائے پر لے لی جائے گی۔ بڑے میاں کے بیٹے فرمانبردار اور باپ کے حکم کو اہمیت دینے والے تھے چنانچہ انہوں نے خندہ پیشانی سے مزید سواریوں کا انتظام شروع کردیا اور ذرا ناک بھوں نہ چڑھائی کہ وہ لوگ خود کو ان پر بوجھ تصور کر پاتے۔

سواریوں کا انتظام ہوگیا تو وہ سب ائرپورٹ سے روانہ ہوگئے۔ فراٹے سے چلتی موٹروں نے پون گھنٹے کے اندر انہیں ایک عالیشان کوٹھی تک پہنچا دیا۔ خواتین کو فوراً اندر پہنچا دیا گیا۔ تینوں نوابین، میزبانوں کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ فوراً ملازمین کو چائے پانی کا حکم صادر کیا گیا اور بڑے بڑے نرم و آرام دہ صوفوں پر سب نے جگہ سنبھال لی۔

”کوٹھی کے طرزِ تعمیر اور دیواروں اور طاقچوں پر نقش تصویروں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ کوٹھی کسی ہندو خاندان کی ملکیت تھی۔“ اسد اللہ نے بڑے میاں کے بڑے بیٹے شجاعت کی طرف رخ کر کے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”جی ہاں بالکل درست اندازہ لگایا آپ نے۔ ہم لوگ تقسیم کے باقاعدہ اعلان سے قبل ہی یہاں آگئے تھے۔ اس وقت یہاں رہنے والے ہندو بھی دوسری طرف جانے کی تیاریاں کررہے تھے۔ اس کوٹھی میں رہنے والے خاندان سے ہم نے سودا کرلیا۔ ارادہ ہے کہ اس میں کچھ تبدیلیاں کروائی جائیں کیونکہ میری والدہ بڑی مذہبی ذہن کی خاتون ہیں اور دیوی دیوتاؤں کے ان نقوش کو قطعی قبول نہیں کرسکتیں لیکن فی الحال ہم بھائی کاروباری دنیا میں قدم جمانے کے چکر میں اتنے مصروف ہیں کہ کسی اور طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں مل رہی۔“

شجاعت نے قدرے تفصیل سے ان کی بات کا جواب دیا پھر ان سے ان کے متعلق سوال جواب کرنے لگا۔ دونوں بھائیوں اور ثروت بیگ کی شخصیت سے ان کے خاندانی وقار اور شان و شوکت جھلک رہی تھی اس لیے شجاعت کا لہجہ ذرا مؤدب تھا۔ اس سے چھوٹا بھائی سخاوت البتہ باہر کے باہر ہی رخصت ہوگیا تھا۔ اسے کوئی کاروباری مصروفیت درپیش تھی۔ نئی جگہ پر قدم جمانے کے لیے ہر ایک کو ہی بھاگ دوڑ کرنا پڑ رہی تھی۔ صفی اللہ کی قلبی و ذہنی کیفیت کے پیش نظر اسد اللہ نے اپنے ساتھ گزرے سانحے کا ذکر نہیں کیا اور بتایا کہ فی الحال ان کے اور ثروت بیگ کے خاندان نے کسی قسم کی پلاننگ نہیں کی تھی اور ایمرجنسی میں پاکستان پہنچنے کا جو مناسب انتظام ہوسکا تھا، اسے غنیمت جان کر یہاں چلے آئے تھے اور اغلب امکان یہی تھا کہ مستقل سکونت کے لیے کراچی کا انتخاب کیا جائے گا کہ زیادہ تر اعزا اور قرابت داروں کے وہیں قیام کی خبریں مل رہی تھیں۔

ثروت بیگ اور شجاعت کے والد بھی اس گفتگو میں شامل رہے۔ ساتھ ساتھ چائے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ صفی اللہ نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا۔ وہ اسی طرح خاموش رہنے لگے تھے اور براہِ راست مخاطب کیے جانے کے علاوہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ چائے کا دور ختم ہوا تو ملازم نے مہمانوں کے کمرے تیار ہوجانے کی اطلاع دی۔ چائے کا یہ دور چلایا ہی اس لیے گیا تھا کہ مہمانوں کو اس شغل کے دوران وقت گزرنے کا احساس نہ ہو اور ان کے آرام کا انتظام کرلیا جائے۔

کاروباری دنیا سے منسلک ہونے کے باوجود اس خاندان میں ایک خاص قسم کی وضع داری تھی جس کے باعث حیدرآباد کے وہ نوابین خود کو اجنبی میں نہیں پارہے تھے۔ خواتین کی طرف سے بھی انہیں اطمینان دلا دیا گیا تھا کہ وہ آرام سے ہیں اور ندرت جہاں کے لیے خاص طور پر ایک ملازمہ مخصوص کردی گئی ہے۔ خانماں بربادوں کو اس سے بڑھ کر کیا آسرا مل سکتا تھا۔ وہ اپنے دلوں میں رب کا شکر بجالائے جس نے اتنا خوب انتظام کردیا تھا کہ وہ لوگ بغیر کسی تگ و دو کے ایک محفوظ و مامون ٹھکانے پر آرام سے سر چھپائے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

بھالیہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا کہ اس کی موت پر خاموشی چھائی رہتی۔ اس کا کاروبار اور جائداد بہت پھیلی ہوئی تھی اور اسی حساب سے احباب کا بھی ایک وسیع حلقہ تھا۔ اخبارات میں اس کی موت کی خبر شائع کی گئی۔ اگرچہ ڈاکٹر نے تصدیق کردی تھی کہ موت دورۂ قلب کی وجہ سے واقع ہوئی لیکن باقی کے پراسرار حالات کی وجہ سے موت کو طبعی سمجھنے میں دشواری تھی۔ مشہور طوائف چاند بانو کی اپنے ساتھی کے ساتھ اسی روز آمد اور سیٹھ کی کٹی ہوئی چھنگلی نے صورتِ حال کو پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اخباری خبر کے مطابق ملازمین کے بیانات کی روشنی میں پولیس

نے فوری طور پر چاند بانو کی گرفتاری کے لیے زمرد بائی کے کوٹھے پر چھاپا مارا تھا لیکن وہاں سے چاند بانو کو بازیاب کروانے میں ناکام رہی تھی۔ زمرد بائی کی جگہ نائکہ کی گدی سنبھالنے والی طوائف کاجل کا کہنا تھا کہ چاند بانو پچھلے دو دن سے کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر کوٹھے سے غائب تھی، یوں فی الحال پولیس اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام رہی تھی۔ سیٹھ کے کریا کرم کا انتظام اس کے کاروباری دوستوں نے سنبھال لیا تھا کہ اس کا کوئی قریبی رشتے دار تو موجود نہیں تھا اور وہ خود اپنی برسوں کی محنت سے جمع کی ہوئی دولت کو لاوارث چھوڑ کر... خالی ہاتھ دنیا سے جا چکا تھا۔ فاروق نے یہ خبر کیتھرائن کے لائے ہوئے اخبار میں پڑھی تھی اور وجے کو بھی پڑھ کر سنائی تھی۔ چاند بانو کے سلسلے میں اس کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ وہ پہلے ہی اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی۔ وہ کہاں تھی، فی الحال ان کے پاس جاننے کا ذریعہ نہیں تھا اور نہ ہی کیتھرائن کو اس کی خبرگیری کے لیے بھیجا جا سکتا تھا کہ لازمی تھا کوٹھے پر پولیس نے نظر رکھی ہوئی ہو۔ ان حالات میں احتیاط بہت ضروری تھی۔ ان میں سے کوئی بھی گھر سے باہر تک نہیں جاتا تھا کہ مبادا کسی کی نظروں میں آ جائے۔ ان کی بنیادی ضروریات کیتھرائن کی مدد سے ہی پوری ہو رہی تھیں اور اس نے ملازمت کی پابندی کے ساتھ سودا سلف لانے کی ذمے داری بھی خود ہی سنبھال رکھی تھی۔ اتنی پابندی پر گولو بھی کبھی جھنجلا جاتا تھا اور شدت سے دادا کو یاد کرنے لگتا تھا لیکن پھر فاروق اسے سمجھا بجھا کر رام کر لیتا تھا۔

اسے اب مجو اور راٹھور پر ہاتھ ڈالنے کی فکر تھی اور یہ دونوں ہی ہدف اتنے آسان نہیں تھے۔ مجو کے بارے میں اسے بھاٹیہ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بھاٹیہ ہی کی ایک بلڈنگ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقیم تھا۔ اس کے ساتھی لازمی بات ہے کوئی شریف لوگ نہیں تھے اور ان کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ اس عددی برتری کی وجہ سے فاروق اس پر ہاتھ ڈالنے کے سلسلے میں کشمکش کا شکار تھا۔ جرأت کی اس کے اندر کمی نہیں تھی لیکن وہ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ صرف دو افراد کے لیے اتنے لوگوں سے نمٹنا مشکل ہو جاتا۔ اسے اپنے نقصان کی بھی فکر نہیں تھی لیکن وہ مجو پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا کہ مبادا وہ ہاتھ سے نکل جائے اور دوبارہ اس کا سراغ لگانا مشکل ہو۔ راٹھور کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ سیٹھ کی زبانی اس کے علم میں آیا تھا کہ راٹھور کے بنگلے پر مسلح پہرے دار موجود ہوتے ہیں اور خود راٹھور بھی ہر وقت اپنے ساتھ ریوالور رکھتا ہے۔ فاروق آتشیں ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی سے آگاہ تھا۔ ربن نے بھی چند ایسے ہتھیار جمع کر رکھے تھے لیکن اڈے والوں میں ان کے استعمال کی روایت نہیں تھی اور فی الحال تو وہ ہتھیار ان کی دسترس میں بھی نہیں تھے۔ اڈے پر چھاپے کے دوران پولیس انہیں ان کے خفیہ مقامات سے نکالنے میں کامیاب نہ بھی ہو سکی ہو تو بہرحال اڈا پولیس کی نگرانی میں تھا اور ہتھیاروں تک رسائی کی کوشش نہیں کی جا سکتی تھی۔ دوسری طرف فاروق کی نظر اس پہلو پر بھی تھی کہ مہیش اور بھاٹیہ کی موت نے دونوں طرف کے لوگوں کو چوکنا کر دیا ہوگا۔ دونوں مرنے والوں کی لاشوں میں یہ قدر مشترک تھی کہ ان کی انگلیاں کاٹی گئی تھیں اور دونوں ہی ربن کے قتل میں کسی نہ کسی طور شامل رہے تھے۔

قاتلوں کے بچ جانے والے ٹولے کے لیے یہ نکات کافی تھے کہ وہ ہوشیار ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ کوئی ہے جو ربن کے وحشیانہ قتل کا بدلہ لینے کے لیے سرگرم ہو چکا ہے اور ان کی باری بھی آیا ہی چاہتی ہے۔ چوکنے شکار پر حملہ کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے اور بہت ہوشیاری و چالاکی سے کام لینا پڑتا ہے۔ فاروق بھی کسی اچھے منصوبے کے لیے اپنا دماغ دوڑا رہا تھا اور زیادہ تر سوچ بچار میں گم دکھائی دیتا تھا۔ بظاہر اپنی دنیا میں مگن وجے کی نظریں اس کے چہرے کو کھوجتی رہتی تھیں کہ کب وہ اپنا اگلا قدم اٹھاتا ہے۔ بھاٹیہ کی موت کے تیسرے دن فاروق نے اپنا لائحہ عمل طے کر لیا اور وجے کو بھی آگاہ کر دیا کہ آج رات انہیں کارروائی کرنی ہے۔ آدھی رات گزرنے کے بعد وہ دونوں خاموشی سے اپنے ٹھکانے سے باہر نکلے۔ اپنے حلیے انہوں نے آج بھی تبدیل کر رکھے تھے اور بڑی بڑی ڈاڑھیوں اور پگڑ کے ساتھ سکھ معلوم ہوتے تھے۔ سکھوں کا سوانگ بھرنے میں یہ فائدہ ہوتا تھا کہ گھنی ڈاڑھی مونچھوں کے پیچھے چہرہ اچھا خاصا چھپ جاتا تھا اور آزادانہ گھومنے پھرنے میں بھی آسانی رہتی تھی کہ سکھوں سے کسی کو کوئی پرخاش نہیں تھی۔ ہاں مسلمانوں کا رہنا بسنا مشکل ہو گیا تھا اور ان کے لیے ہندوستان کی زمین تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

گھر سے نکل کر انہوں نے کچھ فاصلہ پیدل ہی طے کیا پھر ایک ٹیکسی رکوا کر اس میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی انہوں نے اپنی مطلوبہ عمارت سے بہت پہلے ہی ایک ایسے محلے کے قریب رکوائی جہاں سکھوں کی اکثریت مقیم تھی۔ دوران سفر بھی وہ آپس میں ایسی گفتگو کرتے رہے تھے جس سے ٹیکسی ڈرائیور کو یہ گمان ہو کہ وہ بے تکلف دوستوں کی محفل میں بہت سا وقت گزار کر آ رہے ہیں اور تھوڑا بہت پیے ہوئے بھی ہیں۔

ان کے پاس موجود گہرے رنگ کے شیشے کی بوتلوں پر ٹیکسی ڈرائیور کو شراب کی بوتلوں کا گمان ہوا ہوگا۔ بہرحال وہ کرایہ ادا کر کے ٹیکسی سے اترے اور ٹیکسی کے روانہ ہوجانے کے بعد اپنی منزل کی طرف پیدل چل پڑے۔ رات کے اس پہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جس عمارت میں مجو اور اس کے ساتھی رہائش پذیر تھے، اس کا طرزِ تعمیر ویسا ہی تھا جیسی عمارت کے ایک سیلن زدہ کمرے میں فاروق نے ربن کی ہدایت پر کچھ وقت گزارا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس عمارت میں متفرق لوگ کرائے پر الگ الگ کمروں میں مقیم تھے اور یہاں پوری عمارت مجو اور اس کے گرگوں کے لیے مخصوص تھی۔ وہ دونوں احتیاط سے چلتے ہوئے عمارت کے دونوں الگ الگ پہلوؤں میں چلے گئے۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک بوتل تھی اور انہوں نے ان کے ڈھکن کھول دیے تھے۔ بوتلوں میں موجود محلول کو کھڑکیوں کی چوکھٹ پر پھیلاتے ہوئے وہ اس طرح آگے بڑھتے رہے کہ عمارت کی پشت پر آ کر ایک دوسرے سے آملے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور جیبوں سے ماچس نکال کر جلتی تیلیاں کھڑکیوں پر پھینکتے دونوں پہلوؤں سے بھاگتے ہوئے عمارت کے سامنے والے رخ پر آگئے۔

کھڑکیوں کی چوکھٹوں پر ڈالا جانے والا محلول اصل میں مٹی کا تیل تھا جس کی وجہ سے لکڑی کی کھڑکیوں نے فوری طور پر آگ پکڑ لی۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ آگ اتنی ہلاکت خیز نہیں جتنی دہشت زدہ کر دینے والی ہے۔ سوئے ہوئے لوگ آگ کی لپٹوں کو دیکھیں گے تو سب سے پہلے بھاگ نکلنے کا سوچیں گے اور دہشت زدہ انسان جب اپنی جان بچا کر بھاگتا ہے تو اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہیں رہتا۔ اسے باقی لوگوں سے اتنی غرض نہیں تھی اور اصل مقصد مجو اور فیکے کو ان کے بل سے باہر نکالنا تھا، عمارت کے اگلے حصے میں آگ نہ لگانے کا مقصد یہی تھا کہ بھاگنے والوں کے پاس صرف ایک راہِ فرار ہو اور انہیں نظر رکھنے میں آسانی ہو۔

عمارت کے دائیں بائیں موجود وہ شکار پر جھپٹنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ حسبِ توقع تھوڑی دیر میں آگ آگ کی صداؤں کا شور اٹھا اور مرکزی دروازہ کھول کر ہڑبڑائے ہوئے لوگ باہر آنا شروع ہوگئے۔ ممکن تھا کہ عمارت سے نکلنے کے بعد وہ لوگ باہر ہی ٹھہر جاتے اور آگ بجھانے کا انتظام کرنے کی کوشش کرتے مگر فاروق کے منصوبے میں مجمعے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کا اصل نشانہ مجو اور فیکا تھے اور وہ انہیں تسلی سے ان کے کیے کی سزا دینا چاہتا تھا

چنانچہ جیسے ہی لوگ باہر آنا شروع ہوئے، طے شدہ منصوبے کے تحت اس نے اور وجے نے اپنی جیبوں میں رکھے پٹاخے نکال کر پھاڑنا شروع کر دیے۔

آگ کی اپنی دہشت ہی کم نہیں ہوتی، اس پر پٹاخوں کی زوردار آوازوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ملکی حالات اپنی جگہ دگرگوں تھے۔ مختلف علاقوں سے خون خرابے کی خبریں مسلسل سننے میں آرہی تھیں۔ ایسے میں کون فرق کر پاتا کہ وہ پٹاخوں کی آوازیں تھیں یا گولیاں چلنے کی۔ بوکھلائے ہوئے لوگوں نے سرپٹ دوڑ لگادی۔ وہ دونوں گھات لگائے اپنے اصل شکار کو بھاگتے لوگوں میں تلاشتے رہے۔ مجو دادا اپنے جثے سے یوں بھی الگ ہی پہچانا جاتا تھا چنانچہ جب اس نے ایک ٹھگنے، موٹے اور کالے آدمی کو دھوتی سنبھالے بھاگتے ہوئے دیکھا تو فوراً اس کے پیچھے لپکا۔ وہ بھاگتا ہوا ایک بغلی گلی میں جا گھسا تھا۔ فاروق نے دیکھا اس کے پیچھے اس کا چمچۂ خاص فیکا بھی موجود تھا۔ ان دونوں کے پیچھے وہ خود بھی اس گلی میں گھس گیا۔ اس نے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سن کر مڑ کر دیکھا تو وجے بھی اسی طرف آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک آدمی اور تھا جو یقیناً مجو دادا کا ساتھی تھا۔ اس نے وجے کو اشارہ کیا تو وہ اپنی جگہ رک گیا۔ فاروق خود اس لمبی تپلی گلی میں بھاگتا چلا گیا جہاں روشنی بس گھروں کے اندر سے چھن کر آرہی تھی اور گلی کو پوری طرح روشن کرنے میں ناکام تھی۔ اس نے تیزی سے بھاگتے ہوئے مجو اور فیکے سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کیا۔ سناٹے میں ان کے بھاگتے قدموں کی آوازیں نمایاں تھیں۔ اس نے بھاگتے بھاگتے مجو اور فیکے کو ان کے ناموں سے پکارا تو اس کی آواز واضح طور پر ان تک پہنچی اور ردعمل میں وہ دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔ یوں بھی اب پٹاخوں کی آوازیں نہ آنے سے وحشت میں کمی ہوگئی تھی اور انہوں نے شاید یہ سمجھا تھا کہ ان کا اپنا کوئی ساتھی انہیں پکار رہا ہے۔

''کون......'' وہ رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھنے لگے اور نیم تاریکی میں شکل واضح نہ ہونے پر فیکے نے سوال کیا۔

''موت!'' فاروق ان دونوں سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور سنگین لہجے میں جواب دیا۔ اسی پل وجے بھی اس سے آن ملا۔ وہ یقیناً پیچھے آنے والے سے نہایت پھرتی سے نمٹ کر فارغ ہو چکا تھا۔

''اوہ...... فاروق استاد! تو نکل آئے تم اپنے بل سے۔'' فیکے نے اسے پہچان کر تحقیر بھرے لہجے میں کہا۔

''نکالا تو میں نے ہے تمہیں تمہارے بلوں سے۔''

فاروق نے چھوٹا سا زہر آلود قہقہہ لگایا۔

''وہ دیکھو تمہارا چوہا دادا ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کررہا ہے۔'' اس نے مجو کی طرف اشارہ کیا جو بیچ بچ بھاگنے کی کوشش میں تھا لیکن وجے زقند بھر کر اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا تھا اور اس پتلی سی گلی میں ہاتھ میں چاقو تھامے کھڑے آدمی سے پہلو بچا کر نکل بھاگنا وہ بھی مجو جیسے جثے کے آدمی کے لیے آسان نہیں تھا۔

''مت بھولو کہ یہ اپن ہی تھے جنہوں نے تمہارے دادا کو بمبئی کی سڑکوں پر کتے کی موت مارا تھا۔'' فیکے نے اسے طنز کا نشانہ بنایا۔

''پوری فوج لے کر آئے تھے تم اس اکیلے بندے کو قابو میں کرنے کے لیے اور پھر بھی چاقو کے بل پر اس کا مقابلہ نہیں کرسکے تھے۔ تمہارا وہ...... راٹھور گولی نہ چلاتا تو تم میں سے کئی اب بھی اپنے زخم چاٹ رہے ہوتے۔'' فاروق نے راٹھور کے لیے ایک بڑی سی گالی کا استعمال کیا۔ وہ گالی دینے والا بندہ نہیں تھا۔ اس کی تربیت نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ہوئی تھی جہاں بچوں کو اٹھتے بیٹھتے تمیز و تہذیب سکھائی جاتی تھی۔ بچپن کی اس تربیت کا اثر تھا کہ برسوں اڈے پر گزارنے کے باوجود وہ گالی دینا نہیں جانتا تھا لیکن ربن کے قاتلوں کے لیے اس کے دل میں اتنی نفرت تھی کہ وہ انہیں گالی دینے سے لے کر قتل کرنے تک سب کرسکتا تھا اور کررہا تھا۔

''تم جو بھی بولو پر سچ یہ ہے کہ اب ربن اس سنسار میں نہیں ہے اور اسے اپن لوگ نے مارا ہے۔'' فیکا بات کرتے ہوئے ادھر ادھر نظریں بھی دوڑا رہا تھا۔ شاید کسی موقع کی تلاش میں تھا یا اپنے ساتھیوں کے ادھر آنکلنے کا انتظار کررہا تھا۔ اس گلی سے باہر ذرا فاصلے پر جہاں وہ عمارت تھی جس میں فاروق اور وجے نے آگ لگائی تھی، کافی شور محسوس ہورہا تھا اور اندازہ ہورہا تھا کہ لوگ آگ بجھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اصل میں کھڑکیوں کے پٹ جلنے کے ساتھ ان پر لٹکے پردے بھی جل گئے تھے اور پھر آگ نے بجلی کی وائرنگ تک رسائی حاصل کرلی تھی اسی لیے آگ بہت زیادہ پھیل گئی تھی اور بھڑ بھڑ جلتی عمارت سے اٹھتے شعلوں نے اس کے رہائشیوں کے علاوہ کئی دوسرے افراد کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول کرلی تھی، ایسے میں ایک تاریک اور تنگ گلی میں جاری اس کشمکش کی کسے خبر ہوپاتی۔

''کاش تم ربن کو مارتے ہوئے ایک بار اپنے انجام کا بھی سوچ لیتے۔'' فاروق نے اس سے کہا اور یکدم چھلانگ لگا کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ فیکا اپنا چاقو پہلے ہی نکال چکا تھا۔ وہ اڈے کی دنیا کا آدمی تھا اس لیے نیند سے اٹھ کر اچانک باہر نکلنے کے باوجود اس کا چاقو اس کی جیب میں موجود تھا۔ فاروق اس کے قریب پہنچا تو اس نے چاقو والے ہاتھ کو تیزی سے حرکت دی اور بالکل یوں لگا کہ اس کا چاقو ابھی فاروق کے سینے میں اتر جائے گا لیکن فاروق عین وقت پر جھکائی دے گیا اور بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ بدلتے ہوئے فیکے کے بائیں پہلو میں پہنچ کر اس کی کمر پر عین گردے کے مقام پر اپنے پاؤں سے زوردار ضرب لگائی۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ فیکا بلبلا گیا اور پلٹ کر ایک بار پھر چاقو سے اس پر وار کیا۔ اس بار بھی فاروق نے اس کے وار سے خود کو بچالیا اور اس کی پسلیوں میں کھڑی ہتھیلی کی ایک تیز اور شدید ضرب لگائی۔

''میں بغیر چاقو نکالے ہی تجھے خاک چٹا کر یہ ثابت کروں گا کہ جب دادا کا ایک معمولی شاگرد ایسا ہے تو خود دادا کیا چیز ہوگا۔'' فاروق نے اس کے تیسرے وار سے بچ کر اس کی ناک پر ایک گھونسا رسید کرتے ہوئے اس سے کہا۔

ادھر مجو اور وجے میں بھی مقابلہ شروع ہوچکا تھا۔ مجو، ربن کے ہاتھوں ماضی میں اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کھوچکا تھا اور چاقو تھامنے کا اہل نہیں تھا اسی لیے وجے اس کی طرف سے ذرا بے فکر تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ حال ہی میں راٹھور کے مشورے سے اس نے اپنی معذوری کا ایک حل تلاش کرلیا ہے۔ یہ ایک دستانے نما آہنی خول سا تھا جس کی سطح پر لوہے کے نکیلے کانٹے سے ابھرے ہوئے تھے۔ اس نے اچانک ہی اپنا ہاتھ چلایا اور وجے کے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ وجے بے ساختہ ہی رخ پھیر گیا لیکن خود کو مکمل طور پر نہیں بچاسکا اور کئی آہنی کانٹے اس کی گردن کی پشت میں اتر کر اس کی کھال ادھیڑنے کا سبب بن گئے۔

وجے نے ایک سسکاری لی اور پلٹ کر مجو کے پیٹ میں ایک زوردار گھونسا مارا۔ مجو کے چربی دار پیٹ پر اس گھونسے کا بہت زیادہ اثر نہیں ہوا اور اس نے اپنے آہنی خول والے ہاتھ کو دوبارہ حرکت دی۔ اس بار وجے کا شانہ اس کی زد میں آیا لیکن وجے کے چوکنا ہونے کی وجہ سے وار چھلتا ہوا پڑا اور مجو اسے پہلے جتنا نقصان نہیں پہنچا پایا۔

اس بار وجے کی پھرتی بھی قابلِ دید تھی۔ اس نے دائیں ٹانگ کی زوردار ضرب مجو کی دونوں ٹانگوں کے درمیان نازک مقام پر اس قوت سے ماری کہ مجو اپنی چیخ کو نہ روک سکا اور بلبلا کر اسے ننگی ننگی گالیاں دینے لگا۔ ایک قابلِ نفرت شخص گالیاں دے تو اس کا نتیجہ نفرت اور غصے میں اضافے کی

صورت میں ہی نکلتا ہے۔ وجے کا غصہ بھی اس انتہا کو پہنچا کہ مجو کے لیے اس کے تابڑ توڑ حملوں سے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی اور اس کا کانٹے دار آہنی خول والا ہاتھ حملہ کرنا تو دور کی بات اپنا دفاع کرنے کے لائق بھی نہیں رہا۔ ادھر فیکے کی بھی فاروق کے ہاتھوں درگت بن رہی تھی۔ اس کا چاقو کب کا گر چکا تھا اور وہ فاروق کے ہاتھ پیروں کے تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا کر مدد کے لیے چیخیں مار رہا تھا۔ مجو دادا اور اس کی چیخیں سن کر گلی کے کئی مکانوں کی کھڑکیاں کھلیں۔ کہیں سے کسی نے پکار کر پوچھا بھی کہ کون ہے اور یہاں کیا ہو رہا ہے۔

جواب میں فاروق زوردار آواز میں غرایا۔

''ہمارا ان دو آدمیوں کے سوا کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے لیکن اگر کوئی ان سے ہمدردی کرنے آیا تو اس کا انجام بھی ان دونوں جیسا ہی ہوگا۔'' ردعمل میں وہاں سناٹا چھا گیا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے خون خرابے نے ویسے ہی لوگوں کو سہار رکھا تھا۔ ایسے میں کس کی ہمت تھی کہ اپنے گھروں کی محفوظ چاردیواری سے نکل کر پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاتا۔ مجو اور فیکے کے اپنے ساتھیوں میں سے کسی نے اس گلی کا رخ نہیں کیا تھا۔ پیچھے آنے والا واحد شخص پہلے ہی وجے کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ باقی شاید نکل بھاگے تھے یا عمارت میں لگی آگ بجھانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ ان کے سرغنہ یوں بے بسی کے عالم میں خاک و خون میں لوٹیں لگا رہے ہیں۔ ایک عرصے تک اپنی سازشوں اور اوچھے ہتھکنڈوں سے اڈے کے لوگوں کو پریشانی اور دکھ میں مبتلا کرنے والے زمین پر پڑے کسی حقیر کیچوے کے مانند لگ رہے تھے۔ فاروق اور وجے ان کے سروں پر کھڑے انہیں کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ فاروق نے اپنا پیر فیکے کی گردن پر رکھا اور حقارت سے اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولا۔

''دیکھا گلی کے آوارہ کتے...... دیکھا تُو نے کہ ربن کے دو معمولی گرگوں نے کیسے بغیر چاقو نکالے تم سورماؤں کو خاک چٹا دی۔ کیا اب بھی تم نہیں مانو گے کہ وہ شیر تھا جسے تم گیدڑوں نے دھوکے اور فریب سے گھیر کر مارا اور شادیانے بجاتے پھرے۔''

''اپن کو معاف کردو استاد۔ اپن سے واقعی غلطی ہوگئی۔ اپن تو بس مجو دادا سے وفاداری نبھانے کے لیے اس چکر میں پڑ گیا ورنہ اپن کی دادا سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔'' موت سر پر دیکھ کر فیکے نے رنگ بدل لیا اور معافی کے لیے گڑگڑانے لگا۔

''چل...... کی اولاد۔ تو کیا کسی سے وفاداری نبھائے گا۔ تُو تو خود ربن کے حکم پر بیچ چوراہے پر پٹنے کے بعد بلبلاتا ہوا اپن کے پاس آیا تھا کہ دادا مل کر ربن سے اپنی اپنی بے عجتی کا بدلہ لینا ہے۔ اب گرگٹ کے مانند رنگ بدلتا ہے۔''

مجو نے غصے میں آ کر فیکے کو ڈپٹا۔ فاروق کو ان کے آپس کے بحث مباحثے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے اپنا کام کرنا تھا چنانچہ جیب سے چاقو برآمد کرتے ہوئے بولا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے صرف ایک بات معلوم ہے اور وہ یہ کہ دادا کے قتل کے کسی ذمے دار کے لیے میرے پاس کوئی معافی نہیں ہے۔ تم میں سے ہر ایک کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی۔'' اپنا جملہ مکمل کر کے اس نے پاؤں کو حرکت دی اور فیکے کی گردن سے پاؤں ہٹا کر اس کے سینے پر گھٹنے کا زور ڈال کر بیٹھنے کے بعد اس کا دایاں ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکے سے اس کی چار کی چار انگلیاں ایک ساتھ کاٹ ڈالیں۔ فیکے کی دلدوز چیخوں نے لوگوں کے دل لرزا دیے۔ دہشت زدہ ناظرین میں سے کئی نے گھبرا کر کھڑکیوں کے پٹ بند کر لیے لیکن فاروق کے لیے وہ چیخیں اور بہتا خون اس پھوار کے مانند تھا جو اس کے دل میں دہکتی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر رہا تھا۔ آج وہ نواب زادہ محب اللہ نہیں تھا، وہ نرم خو فاروق بھی نہیں تھا، وہ صرف سراپا انتقام تھا جس کے دل میں ربن کے قاتلوں کے لیے رحم کی معمولی سی رمق بھی نہیں تھی۔ یہی حال وجے کا تھا۔ اس نے بھی بنا رحم کھائے کٹی ہوئی انگلیوں والے فیکے کے دل میں چاقو کا وار کر کے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ دوسری طرف فاروق مجو دادا کو اس کی بچی کھچی انگلیوں سے محروم کرتا رہا۔ مجو نے فیکے کی طرح اس سے رحم کی التجا نہیں کی تھی لیکن منہ بھر بھر کے گالیاں ضرور دیتا رہا تھا۔ فاروق کے لیے گالیاں اور التجائیں دونوں برابر تھیں کہ وہ ربن کے قاتلوں کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ وہ اپنا کام مکمل کر کے پیچھے ہٹا تو وجے نے بری طرح تڑپتے مجو کو بھی مکتی دلا دی۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے گلی کے دوسرے سرے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ان کا پیچھا کرتا لیکن یکدم ہی سنائی دینے والی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن نے انہیں چوکنا کر دیا تھا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور محبت کی فریب کاریوں کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

صبح سویرے اینڈریو کا فون آیا تو مجھے لگا جیسے وہ مجھے کوئی راز کی بات بتانے کے لیے بے قرار ہے۔ آدھ گھنٹے بعد میں اس کے گھر پہنچا تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ اس نے چند منٹ کی رسمی گفتگو کے بعد ایک بالکل مختلف موضوع چھیڑ دیا۔ میں حیران تھا کہ وہ مجھے اس وعظ کے بارے میں کیوں بتا رہا ہے جس کی تیاری وہ آنے والے اتوار کی عبادت کے لیے کر رہا تھا۔

''پلیز......'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

احساسِ جرم

بابر نعیم

کوئی لاکھ کوشش کرلے، ضمیر سے فرار پانے کے لیے ہر جتن ناکام ہوجاتا ہے... کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ہر مجرم کو ایک ایسی ٹھوکر ضرور لگتی ہے جو ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی لمحے کی گرفت میں آچکا تھا جب وہ حقیقت سے نظریں چرا نہیں پایا۔

انتہائی احتیاط سے کی جانے والی انتقامی کارروائی کا ماجرا

"مطلب کی بات کرو۔"

"یہ ممنوعہ پھل کی تھیوری ہی تھی جس نے میری آنکھیں کھول دیں اور یہ سمجھنے میں مدد دی کہ انیس سو چونتیس میں اور نیلوم میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ غالباً تم نے بھی اس حادثے کے بارے میں سنا ہوگا۔"

"کچھ زیادہ نہیں کیونکہ اس وقت تک میں وہاں سے آچکا تھا اور اس کے بعد میرے والد نے اس بارے میں زیادہ بات نہیں کی۔"

"کیونکہ وہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکے اور انہیں ناکامی ہوئی۔ اس لیے اس کا تذکرہ باعثِ شرمندگی ہوگا۔"

"ایک منٹ۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت اچھے پولیس افسر تھے اور......"

"ہاں لیکن...... بہرحال میں نے گزشتہ روز یہ معما حل کرلیا۔"

اس کہانی کے پڑھنے والوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیسا کا شہر سویڈن کے جنوب مشرق میں واقع ہے اور ہم دونوں یعنی میں اور اینڈریو وہیں پلے بڑھے۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہم نے مختلف راستے اختیار کیے۔ اینڈریو نے باپ دادا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دینی تعلیم حاصل کی اور میں نے اپنے باپ کی تقلید میں پولیس کی ملازمت اختیار کرلی۔ میں پولیس کمشنر کے عہدے پر ریٹائر ہوا اور دس سال قبل بیوی سے طلاق ہونے کے بعد جب اپنے آبائی شہر واپس آیا تو ایک بار پھر اینڈریو سے ملاقات ہوگئی جو ابھی تک کنوارا تھا۔

میں نے اینڈریو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ بہت پرانی بات ہے جب ایک جمعے کو دوپہر کے کھانے کے بعد جاگیردار اور سابق کرنل راجر وان اپنے گھر میں مردہ پایا گیا۔ وہ کافی عمر رسیدہ تھا لیکن اس کی زندگی سکون سے گزر رہی تھی مگر بعد میں ملنے والی اطلاعات نے اس کی موت کو پیچیدہ بنا دیا۔ وہ ایک انتہائی قدامت پسند سخت مزاج اور سخت گیر شخص تھا اور علاقے میں تقریباً سبھی لوگوں سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے گو کہ اس کی نوجوان بھتیجی ایلس اس کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کا پورا خاندان حوادثِ زمانہ کا شکار ہوکر تتر بتر ہوچکا تھا۔ وہ اکثر گھوڑے پر سوار ہوکر جاگیر کے دورے پر نکل جاتی اور بقیہ وقت میں شاعری پڑھا کرتی۔

"اس خاندان کا تیسرا فرد کلاز بھی ایلس کی طرح بیگانہ اور الگ تھلگ رہا کرتا تھا۔ وہ راجر کا دور پرے کا رشتے دار تھا اور عادی نشے باز ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر ہوش وحواس کھو بیٹھتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک خانساماں اور ہرکارہ آئیور بیک بھی اس چھت کے نیچے رہا کرتے تھے۔ آئیور جو کسی زمانے میں راجر وان کے ساتھ فوج میں اردلی ہوا کرتا تھا۔ اسے راجر کے معتمدِ خاص کا درجہ حاصل تھا۔

"اس کہانی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جاگیر پر روزانہ کی اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ راجر کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ وہ عارضی اور مستقل ملازمین کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا کرتا تھا۔ خاص طور سے وہ سائیس یعنی گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والوں سے بہت ناراض رہتا تھا۔ ان میں سے ایک کو اس نے گزشتہ مہینے ہی نوکری سے فارغ کیا تھا۔

"گزشتہ چند مہینوں سے اس نے اپنے باغ میں سیب کے درخت کے نیچے بیٹھنے کو اپنا معمول بنا لیا تھا۔ ہر روز صبح سویرے وہ نزلہ زکام سے نجات حاصل کرنے کے لیے لڑکھڑاتا ہوا وہاں تک جاتا جس نے چند دنوں سے اسے بری طرح پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس وگ سمیت درخت کے پتوں کے سائے میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ جاتا اور دھوپ سے لطف اندوز ہوتا۔ وہ وہیں بیٹھ کر ناشتا کیا کرتا جو عموماً سینڈوچز، انڈوں اور کافی پر مشتمل ہوتا۔ کھانے کے بعد وہ آنکھیں بند کرکے اپنے خیالوں میں کھو جاتا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

"وگ لگانے کی وجہ یہ تھی کہ بہت عرصہ پہلے وہ مکمل طور پر گنجا ہوچکا تھا۔ یہ پرکشش نظر آنے اور صنفِ نازک کو متاثر کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔ وہ فطری طور پر عیاش واقع ہوا تھا اور خادماؤں کے علاوہ اس نے ہر اس عورت سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جو اس کی دسترس میں تھی۔ اس روز بھی گھر کے کسی فرد نے اس کی جانب توجہ نہیں دی کیونکہ وہ اس کے قریب جانے سے احتراز کرتے تھے تاکہ اس کے نازیبا تبصروں اور بے جا غصے سے بچے رہیں۔

"اس گھر میں ایک پالتو کتا کیرون بھی تھا جو اپنے مالک کے قیلولہ کرنے کے دوران خود بھی ٹانگیں پسارے پچھلے صحن میں لیٹا اونگھتا رہتا لیکن کسی اجنبی کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اس کی بو سونگھ کر بھونکنا شروع کردیتا اور اسے کاٹنے کے لیے تیزی سے اس کی جانب لپکتا لیکن اس روز

کیرون بھی خاموش رہا۔ یہاں تک کہ اس کی ہلکی سی غراہٹ بھی نہیں سنائی دی۔

''شاید کرنل کچھ دیر اسی طرح پڑا رہتا اگر شدید تیز ہوا اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ ایلس اور کلاز کو باہر آنے اور کرنل کو بادل ناخواستہ دیکھنے پر مجبور نہ کردیتی۔ انہوں نے اسے ترچھا بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کا دایاں بازو نیچے کی جانب جھول رہا تھا اور شراب کا گلاس اسی طرح بھرا ہوا رکھا تھا جیسے اسے کسی نے ہاتھ ہی نہ لگایا ہو۔

''آئیور بیک نے فوری کارروائی کرتے ہوئے وہاں سے میز ہٹائی اور راجروان کو لے جاکر دیوان خانے میں لٹادیا پھر اس نے ڈاکٹر کو لانے کے لیے آدمی بھیجا جو آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا اور اسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی چنانچہ اس نے فیصلہ صادر کردیا کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں اسے قدرتی موت قرار دیا۔ پھر ایک غیر متوقع بات ہوئی اور وہ یہ کہ ایک پولیس آفیسر وہاں پہنچ گیا۔''

''تمہارا اشارہ ڈیڈی کی طرف ہے۔'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک سمجھے لیکن اس نے بڑا عجیب وغریب رویہ اختیار کیا۔ اسے اس موت کی خبر کسی غیر مصدقہ ذریعے سے ملی تھی۔ اس نے بڑے غور سے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ اپنی ٹھوڑی کھجائی اور خلا میں دیکھنے لگا پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔''

''بڑی عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا انہیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ راجروان کی موت کیسے واقع ہوئی؟''

''ہاں۔ تمہارے والد کے وہاں آنے کی وجہ وہ افواہ تھی جو اس نے سنی۔ ایک نوجوان شرابی بار میں بہ آوازِ بلند کرنل کے قتل کے بارے میں بات کررہا تھا چنانچہ جب اس کی موت کی افواہ تمہارے باپ تک پہنچی تو وہ فوراً ہی جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کرنل کو تشدد کرکے مارا گیا ہے لیکن جب اسے وہاں کسی جرم کا نشان نظر نہیں آیا تو اس کا شک بھی دور ہوگیا۔''

''جس شخص نے یہ ادھم مچایا تھا، وہ کوئی اور نہیں بلکہ اصطبل میں کام کرنے والا لڑکا تھا جسے حال ہی میں راجروان نے ملازمت سے برخاست کیا تھا لیکن جب اسے پکڑا گیا تو

چند بڑی حکایتیں

☆ موت یقیناً انسان کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ اسے ایک خاص لمحے، ایک خاص مقام پر اس انسان کو اپنے قبضے میں لینا ہوتا ہے۔ نہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے نہ بعد میں اور نہ اس مقام سے ایک سینٹی میٹر آگے پیچھے۔ اسی لیے وہ ان تمام لمحوں میں اس کی حفاظت کرتی ہے جو اس لمحے کے علاوہ ہوتے ہیں اور ان تمام مقامات پر اس کو بچائے رکھتی ہے جو اس مقام سے دور ہوتے ہیں۔

☆ انسان بھی پودوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آب وہوا اپنا آس پاس چھوڑ کر چاہے بہتر جگہ ہی کیوں نہ چلے جائیں، وہ خوش نہیں رہتے اور اکثر مرجھا جاتے ہیں۔ صرف اپنے وطن کی مٹی سے ہی انہیں طاقت اور عزت ملتی ہے۔

☆ دکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہوجاتی ہیں لیکن وہ انسان کے اندر اتر کر اس ایک گوشے کو ویران کردیتی ہیں جو کسی ایک شخص کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

☆ شہرت ایک بے وفا محبوبہ ہوتی ہے لیکن اس کا حسن، اس کی ادائیں انسان کو اس غلط فہمی میں مبتلا کردیتی ہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے پہلو میں ہی رہے گی۔ (مستنصر حسین تارڑ)

انتخاب۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

اس نے ثابت کردیا کہ وہ نشے کے زیر اثر اپنی ماں کے مکان میں گزشتہ چوبیس گھنٹے سے سو رہا تھا۔ قصہ مختصر لاش کو وہاں سے ہٹا دیا گیا اور جاگیر کا پرچم سرنگوں ہوگیا۔ پالتو کتے کیرون کے علاوہ کسی نے بھی مرنے والے کا سوگ نہیں منایا۔ سب کچھ اطمینان بخش طریقے سے اپنے انجام کو پہنچ

جاتا اگر وہ واقعہ پیش نہ آتا۔''

''وہ کیا؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اسی شام راجروان کے پڑوسی نے خودکشی کرلی اور ایک خط چھوڑا جس میں راجروان کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔'' اینڈریو نے کہا۔ ''یہ ایک غیر مبہم اعتراف تھا جس کی سچائی پر کسی کو شک نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قتل کا محرک کیا تھا۔ یہ کیوں اور کیسے ممکن ہوا۔ خاص طور پر وہ کیرون کی نظروں سے بچ کر کس طرح راجر تک پہنچا جس کی طاقتور ناک کسی بھی نامانوس اجنبی کی بُو فوراً سونگھ لیتی ہے؟''

''یہ واقعی ایک معما ہے۔''

''تمہارے والد اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے رہے لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا چنانچہ تحقیقات ختم کردی گئی۔''

اس مرحلے پر اینڈریو کو آداب میزبانی یاد آئے۔ اس نے میز پر سیبوں سے بھرا ہوا باؤل رکھا اور اسے میری طرف بڑھانے کے بعد پیچھے کی طرف جھکا۔ اچانک ہی اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے اپنی کمر پکڑلی۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کمر کا درد مجھے مار ڈالے گا۔ میں ایک انچ بھی حرکت نہیں کرسکتا۔ تم مہربانی کرکے ایک سیب میری طرف پھینک دو۔ میں اسے کیچ کرلوں گا۔''

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے سیب پکڑلیا اور اس کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

''اب میں اس ڈرامے کے دوسرے ایکٹ کی جانب آتا ہوں جو انیس سو چونتیس کی اس رات کھیلا گیا۔ میں اور تمہارے والد اس معاملے پر اکثر و بیشتر گفتگو کرتے رہے لیکن انہیں حقیقت کا علم نہیں ہوسکا کیونکہ وہ کبھی بھی اس اہم سراغ تک رسائی حاصل نہ کرسکے جو ہر چیز کو واضح کرتا۔ وہ سراغ جو گزشتہ روز سپر مارکیٹ میں میرا انتظار کررہا تھا جس نے میری آنکھیں کھول دیں لیکن بہتر ہوگا کہ اس سے پہلے میں تمہیں ڈیوڈ مینڈل کے بارے میں بتادوں۔''

''یہ کون ہے؟ میرے لیے یہ نام اجنبی ہے۔''

''ہاں لیکن حیرت انگیز طور پر اس سے یہ معما حل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جس شخص نے اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرایا، اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ شاید وہ کوئی تارکِ وطن تھا اور چہرے کے نقوش سے ... یہودی لگ رہا تھا۔ ایسی صورت میں وہ جرمنی سے آیا ہوگا جہاں اس سمیت دوسرے یہودیوں کے لیے کڑا وقت تھا۔ تیس سال کی عمر میں اس نے خدا سے لو لگالی اور مزید اصلاح کے لیے اس کی ملاقات میرے والد سے ہوئی۔ اس نے جسمانی تربیت کے ذریعے اپنے جسم اور روح کو سنوارنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے اس نے جمناسٹک، وزن اٹھانے اور ٹینس کھیلنے کی مشق کی لیکن روحانی پہلو اس کے لیے زیادہ اہم تھا جس میں میرے والد نے اس کی مدد کی۔ وہ دونوں باقاعدگی سے ملتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے والد کو فوراً ہی مینڈل کی موت کا علم ہوگیا جو ... اور نیلوم اسٹیٹ کے قریب ایک کاٹیج میں ہوئی۔ یہ اس سے پہلے جنگل کے محافظوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس حادثے سے کافی پہلے وہ مینڈل کے بارے میں بہت سی باتیں جان چکا تھا۔ ان میں سے ایک یہ کہ وہ مس ایلس کی محبت میں بری طرح گرفتار ہوچکا تھا اور وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی لیکن راجروان کو ان دونوں کا ملاپ پسند نہ تھا۔ اس نے سختی سے اس تعلق کی مخالفت کی اور لڑکی کی شدید خواہش کے باوجود اپنے کان بند کرلیے۔ یہاں تک کہ اس نے ایلس کو اس کے محبوب سے ملنے سے بھی منع کردیا۔''

''کیا ایلس نے اس پابندی پر عمل کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ ایلس ایک نیک سیرت لڑکی تھی اور ڈیوڈ بھی بڑے مہذب انداز میں اس سے ملتا تھا تاہم یہ ملاقاتیں خفیہ تھیں اور وہ عموماً شام کے وقت چہل قدمی کے بہانے ملا کرتے تھے۔ بہرحال وہ دونوں بے چینی سے راجروان کے مرنے کا انتظار کررہے تھے تاکہ وہ اپنے تعلق کو قانونی شکل دے سکیں۔''

''لیکن مینڈل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے......''

''نہیں۔ یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے۔'' اینڈریو نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم غلط سوچ رہے ہو۔ اب میری بات غور سے سنو۔ جمعے کی شام ان دونوں نے ملنے کا پروگرام بنایا تھا تاہم ایلس کو یہ موقع قدرت نے فراہم کردیا کہ وہ ڈیوڈ سے مل کر اسے یہ خوش خبری سنا دے لیکن عین وقت پر کلاز نے یہ کہہ کر اس کا پروگرام چوپٹ کردیا کہ وہ بیک کے ساتھ قریبی قصبے جاکر کچھ رشتے داروں کو

میموریل سروس میں شرکت کی دعوت دے۔

''ایلس نے اپنے سرپرست کی موت کو بڑے سکون سے قبول کرلیا لیکن جب اسی شام اسے ڈیوڈ کی موت کی اطلاع ملی تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور اس کی حالت دیکھ کر کسی کو بھی شبہ نہ رہا کہ مرنے والا اس کے لیے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ مینڈل کی لاش بھی اسی کی وجہ سے دریافت ہوئی۔ دن کے اختتام پر جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہوئی تو اس نے ملازمہ کے ذریعے ایک سربمہر خط مینڈل کو بھیجا۔ ملازمہ نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور جب کسی نے اس کی دستک کا جواب نہیں دیا تو وہ گھر کے اندر داخل ہوگئی جہاں اسے ڈیوڑھی میں ایک خط پڑا ہوا ملا اور اس نے مدد کے لیے دوڑ لگادی۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا۔''

''پیاری ایلس۔ میں کبھی بھی اپنے جرم کا ازالہ... نہیں کرسکتا صرف خدا ہی میرا گناہ کبیرہ معاف کرسکتا ہے۔ تم میری زندگی میں آنے والی عزیز ترین ہستی تھیں۔ دعا کرنا کہ میری روح کو سکون ملے..... تمہارا ڈیوڈ۔''

جب اینڈریو نے ڈیوڈ کے خط کا متن بالکل درست انداز میں ادا کیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ معلومات اس کے مرحوم باپ نے اسے دی ہوں گی۔ اس کی یادداشت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے ایلس کے خط کا متن بھی لفظ بہ لفظ صحیح پڑھا جو اس نے ملازمہ کے ذریعے ڈیوڈ مینڈل کو بھیجا تھا۔

''میرے محبوب! بالآخر ہم آزاد ہوگئے...... ہمیشہ کے لیے۔ تمہاری ایلس۔''

اینڈریو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس پیغام کے بھیجنے سے پہلے ہی ڈیوڈ کو اس واقعے کے بارے میں معلوم ہوچکا تھا۔ جاگیر میں ہونے والی ہلچل اور جھنڈا سرنگوں ہونے سے اس کے بدترین شبہات کی تصدیق ہوگئی اور جب ایلس کا خط اس تک پہنچا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔

''اسی شام تمہارے والد نے مینڈل کی موت کی تحقیقات کرنے کے بعد تعین کیا کہ اس نے اپنے پیٹ میں چھرا گھونپ کر خودکشی کی ہے اور اس کی خون آلود لاش کچن میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے کاٹیج اور قرب وجوار کا معائنہ صبح تک کے لیے ملتوی کردیا کیونکہ اندھیرا پھیل چکا تھا اور بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس اندھیرے میں لالٹین کی مدد سے جائے وقوعہ کا معائنہ کرنا بے سود ہوتا۔ خوش قسمتی سے صبح تک بارش رک گئی لیکن اسے کوئی ایسا سراغ نہ ملا جس سے کوئی مدد مل سکتی۔

''میڈیکل آفیسر بہ مشکل نیند سے بیدار ہوا۔ وہ کافی جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے ایک دن پہلے ہی وان کی لاش کا معائنہ کیا تھا اور اسے وان کے جسم پر کوئی بیرونی چوٹ، خراش، زخم یا سوجن نظر نہیں آئی۔ البتہ اس کا پورا جسم نیلا ہوگیا تھا اور اس کی وجہ جسم کے نچلے حصے میں خون کا جمع ہوجانا تھا اور یہ بات چند گھنٹوں میں پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوئی۔

''ڈاکٹر کی رپورٹ سے کوئی بھی مطمئن نہیں تھا کیونکہ اس طرح گھر کے بھی افراد شک کی لپیٹ میں آرہے تھے۔ خانساماں کا خیال تھا کہ ایلس نے کسی نامعلوم شخص کے کہنے پر اس کے مالک کی کافی میں کوئی چیز ملادی تھی لیکن یہ محض الزام تھا کیونکہ اس نے خود بھی اسی جگ میں سے اپنے لیے ایک کپ میں کافی نکالی تھی اور اس کے مالک کے لیے جو تین سینڈوچز بنائے گئے تھے، اس میں سے ایک خود بھی کھایا تھا۔

''ایلس یہ سن کر اتنی چراغ پا ہوئی کہ اس نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دی اور کہا...... میرے بجائے کلاز کو پکڑو۔ جو ہر وقت شراب کے گھونٹ کی تلاش میں رہتا ہے پھر اس نے انکشاف کیا کہ ایک روز قبل اس نے خود کلاز کو

لطیفہ

ایک شخص پی سی او کے اندر گیا۔ جیب سے موبائل نکلا اور بات کرتے ہوئے باہر آگیا۔ ایک آدمی نے پوچھا۔ ''جناب! موبائل سے کال کرنی تھی تو پی سی او میں کیوں گئے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میرے دوست نے کہا تھا کہ پی سی او سے کال کرنا، پیسے کم لگیں گے۔''

اقوال زریں

☆......اپنے اندر پرندے کے مانند عاجزی پیدا کرو جو آسمان کی بلندیوں کو چھو کر بھی گردن جھکائے رکھتا ہے۔

☆......عورت کو جتنا بھی پیار کرلو، عورت یہی کہے گی کہ تم مجھ سے پیار نہیں کرتے۔

مرسلہ۔ محمد شہباز ناز، گجر کالونی، سرگودھا

شراب کا ایک گلاس چوری چھپے اٹھاتے دیکھا جسے وان نے ہاتھ لگائے بنا چھوڑ دیا تھا۔''

''کیا ایلیکسن نے اس کے شور شرابے پر کوئی توجہ دی یا نظر انداز کر دیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے ایلس سے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے ایک پیالی کافی کی فرمائش کی اور چلا گیا۔

''کلاز پر اس لیے شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ خود بھی چرائی ہوئی شراب پینے کے بعد زندہ رہا، اگر اس نے شراب میں زہر ملایا ہوتا تو وہ اسے خود کیوں پیتا۔ اس لیے ایلیکسن گومگو کی کیفیت میں تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مینڈل کس طرح قاتل ہو سکتا ہے۔ پالتو کتے کیمرون کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ وان کی ناشتے کی میز تک پہنچ سکے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مینڈل کے دماغ میں پہلے سے کوئی چیز پک رہی تھی اور اس نے کسی غلط فہمی کے سبب اپنے آپ کو مجرم تصور کر لیا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ اس کا وہم تھا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے اعتراف کے باوجود اس کے پاس یہ جرم کرنے کا کوئی موقع یا طریقہ نہیں تھا۔ جہاں تک اس قتل کے محرک کا تعلق ہے تو بہت سے لوگ وان کی غیر طبعی موت چاہتے ہوں گے۔ ان میں زیادتی کا شکار عورتیں، ناجائز بچے جنہیں وان نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بدسلوکی کے شکار ماتحت، دھوکا کھانے والے کاروباری ساتھی اور برطرف ملازمین سبھی شامل تھے۔''

اینڈریو نے بتایا کہ اس نے صرف ایک ہفتہ قبل اس جگہ کا دورہ کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ وہاں جا کر اس معمے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اسے یہ دیکھ کر شدید مایوسی ہوئی کہ پوری عمارت گرا دی گئی تھی اور اس کی جگہ کانفرنس سینٹر تعمیر ہو گیا تھا۔ نئے مالک نے وہ پوری جگہ خرید لی اور وہاں گالف کورس بنا دیا۔ اب وہاں سیب کا ایک درخت بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''اس گھر کے بقیہ افراد کہاں گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایلس تو فوراً ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔ افواہ یہ ہے کہ وہ سوئٹزرلینڈ کے کسی صحت افزا مقام پر چلی گئی۔ کھانا پکانے والی عورت واپس اپنے گاؤں چلی گئی۔ آئیوربیک نے ایک ہوٹل میں ملازمت اختیار کر لی اور کلاز نے اپنے آپ کو ایک محتاج خانے تک محدود کر لیا تھا۔''

''جانوروں کا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''دو اصیل گھوڑے ایک قرض خواہ نے اس رقم کے عوض لے لیے جو اس نے وان کو ادھار دی تھی اور گاڑی میں جوتنے والا گھوڑا سلاٹر ہاؤس کو دے دیا گیا۔ البتہ اس کتے کیمرون کی کسی نے پروا نہیں کی۔ جب جاگیر کو منہدم کیا گیا تو وہ ڈرگ ہاؤس میں مردہ پڑا ہوا تھا۔''

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قاتل نے اپنا کام کس طرح کیا؟''

''ہم تصور کی آنکھ سے دیکھیں تو گیارہ اکتوبر انیس سو چونتیس کا منظر بڑا واضح ہو جاتا ہے۔ فرض کرو کہ تم ڈیوڈ مینڈل ہو۔ سہ پہر دو یا تین بجے کا وقت ہے۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے اور تیز ہوا ابھی چل رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد محبوبہ سے تمہاری ملاقات ہونے والی ہے لیکن موسم کی صورت حال دیکھ کر تم پریشان ہو جاتے ہو کہ کہیں یہ ملاقات منسوخ نہ ہو جائے۔ جب تم باہر نکل کر جائزہ لیتے ہو تو آسمان پر سیاہ گہرے بادل نظر آتے ہیں۔ تم باڑ کے پار دیکھتے ہو تو پچاس میٹر کے فاصلے پر تمہارا بدترین دشمن وان بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ بظاہر وہ سویا ہوا لگ رہا ہے اور ایلس کے کہنے کے مطابق بیماری نے اسے ادھ موا کر دیا ہے۔ ایسے میں تمہارے ذہن میں کیا بات آئے گی؟''

''میں......''

اینڈریو نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روک دیا اور کہنے لگا۔ ''یہی کہ یہ بوڑھا جلد از جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ اگر یہ کچھ دیر اور اسی طرح بیٹھا رہا تو اسے ٹھنڈ لگ جائے گی جس سے اسے نمونیہ ہو سکتا ہے پھر......''

اس نے تھوڑا سا توقف کیا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ وہ بات کرتے کرتے رک جاتا تھا پھر چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''لیکن جلد ہی تم اس خیال کو جھٹک دیتے ہو کیونکہ یہ یسوع مسیح کی تعلیمات اور تمہاری اپنی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور تم اس کی تلافی کے طور پر اسے آنے والے خطرے سے خبردار کرنا چاہتے ہو کیونکہ اس وقت تمہارے علاوہ وہاں کوئی اور نہیں تھا جو ایسا کر سکتا...... لیکن کس طرح؟ تم وہاں جا کر اسے نہیں جگا سکتے تھے کیونکہ اس کا کتا کیمرون فوراً ہی تم پر حملہ کر دیتا اور نہ ہی تم اس بوڑھے شخص کو چلا کر نیند سے بیدار کر سکتے تھے جو ویسے ہی اونچا سنتا

تھا پھر اس کے علاوہ کون سا طریقہ تھا؟''

میرے ذہن میں ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا اس لیے میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میکسی...... میرے دوست۔ تمہیں اس کو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اٹھانا ہوگا۔''

''وہ کیسے؟'' میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔

''تم صورتِ حال پر غور کرو۔ تم اپنے گھر کی باڑ کے پاس کھڑے ہو کہ تمہاری نظر وان کے بالکل قریب گھاس پر پڑے ہوئے چھوٹے سرخ سیبوں پر جاتی ہے جو تیز ہوا کی وجہ سے درخت سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑے تھے۔ اچانک ہی تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے۔ اس علاقے میں سبھی لوگ گھروں میں سیب کے درخت لگاتے ہیں اور خزاں کے موسم میں سیبوں کی فصل تیار ہو جاتی ہے۔ اگر تم وان کے درخت کا نشانہ لے کر ایک سیب تاک کر مارو تو اس درخت سے مزید چند سیب نیچے گر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہارا پھینکا ہوا سیب درخت کی شاخوں کی سمت بھی تبدیل کر سکتا ہے اور ان کے ہلنے سے بھی سیب گر سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک سیب بھی وان کے سر پر لگا تو وہ جاگ جائے گا کیونکہ درخت کی اونچائی صرف چند میٹر ہی ہے اس لیے وان کے سر پر چوٹ لگنے کا امکان نہ تھا۔ ویسے بھی وہ وگ لگاتا تھا اور اس سے بچت ہو سکتی تھی۔''

''تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔ کوئی بھی شخص پچاس میٹر کے فاصلے سے نشانہ نہیں لے سکتا۔''

''اوہ ہاں۔ ٹینس کے کھلاڑی کا جسم مضبوط ہوتا ہے اور وہ درست نشانہ لگا سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے تم ناکام رہے۔ تمہارا پھینکا ہوا سیب نیچا رہا اور وہ سیدھا وان کو جا کر لگا۔ جب تم نے اسے ایک طرف گرتے ہوئے دیکھا تو فوراً وہاں سے ہٹ گئے تاکہ وہ تمہیں دیکھ نہ لے۔''

''ایک منٹ۔'' میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اگر اسے زور سے سیب لگا ہوتا تو یقیناً اس کے جسم کے کسی حصے پر چوٹ ضرور لگتی۔''

''نہیں میرے دوست! وان نے بہت موٹا ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی کھال محفوظ رہی۔ اگر دل کی دھڑکن بند ہو یا خون کی گردش رک جائے تو لاش پر کوئی چوٹ یا خراش نہیں آتی۔

''پہلے تو ڈیوڈ یہ سمجھا کہ اس کا مشن پورا ہو گیا اور یہ چوٹ لگنے کے بعد وان فوراً وہاں سے اٹھ جائے گا لیکن

زیرِ غور

☆...... تمہارا چال چلن اس بات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تم کس چیز کو دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔

☆...... عمدہ چیز کو حاصل کرنا خوبی نہیں بلکہ اس کو عمدہ طریقے سے استعمال کرنا خوبی ہے۔

☆...... عقل مند کے سامنے زبان کو، حاکم کے سامنے آنکھ کو اور بزرگوں کے سامنے دل کو قابو رکھنا چاہیے۔

☆...... حقیقی خوب صورتی کا چشمہ دل ہے۔ دل اگر سیاہ ہو تو چمکتی آنکھ کچھ کام نہیں دیتی۔

☆...... دولت اس کی ہے جو اسے کھاتا ہے۔ اس کی نہیں جو اسے کماتا ہے۔

☆ عقل کی حد ہو سکتی ہے لیکن بے عقلی کی نہیں۔

☆ بے کار ہے وہ انسان جس میں انسانیت نہ ہو۔

☆ بے کار ہے وہ کمائی جو حلال کی نہ ہو۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ایک دو گھنٹے بعد اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا لہٰذا اس نے ایک بار پھر جھانک کر دیکھا اور اس بار اسے ایک بالکل مختلف منظر نظر آیا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا اور ایک باوردی پولیس آفیسر جائے وقوعہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جا گیر کا پرچم بھی سرنگوں ہو رہا تھا۔ یہ سب باتیں اشارہ کر رہی تھیں کہ وان اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ اس نے وان کو قتل کر دیا تھا۔''

''گویا وان کو جگانے کے بجائے اسے ہمیشہ کے لیے سلا دیا؟'' میں نے کہا۔

''اسے شدت سے اپنے جرم کا احساس ہونے لگا۔ اگر وہ پکڑا گیا تو بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی۔ اس کی عزت، خود اعتمادی اور مستقبل سب داؤ پر لگ جائے گا۔ سب سے بڑھ کر اسے اپنی محبوبہ کی نظروں میں ذلیل ہونے کا ڈر تھا۔ گو کہ اس نے بھی وعدے کے مطابق نہ آ کر اسے نادانستہ طور پر دھوکا دیا تھا چنانچہ اس نے چاقو اٹھایا اور خودکشی کر لی۔''

ڈیوڈ کا یہ عمل جاپانی سمورائی کی طرح تھا۔ جب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے تو وہ رسوائی اور ذلت سے بچنے کے لیے یہی روایتی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔

ایک طویل خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ''میرے

ذہن میں ایک اور بات آرہی ہے۔''

''ہاں کہو۔''

''نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ سیب پھینکے جانے سے بہت پہلے وان کی موت واقع ہوچکی تھی ورنہ اس کے جسم میں اکڑاہٹ اور نیلا پن نہ ہوتا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔''وان غالباً کئی گھنٹے پہلے مرچکا تھا اور اس نے ڈیوڈ کی غلطی کو دردناک بنا دیا۔ سب کچھ ٹھیک رہتا اگر وہ صرف اتنا سمجھ لیتا کہ اس کے چھوٹے سے ہتھیار نے صرف کرسی پر بیٹھے ہوئے وان کی پوزیشن تبدیل کی ہوگی۔ اس نے جو دیکھا، وہ کسی زندہ انسان کی اچانک حرکت نہیں تھی بلکہ سیب لگنے سے لاش تھوڑی سی ہل گئی تھی۔ اس لیے بازو ایک طرف لٹک گیا اور لاش کا مرکزِ ثقل بھی اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔''

''اگر میرے والد نے اس جگہ کا انتہائی باریک بینی سے معائنہ کیا تھا تو پھر تم کس ثبوت کی بات کررہے تھے؟''

''اس نے اس پر توجہ نہیں دی کیونکہ وہ رنگوں میں تمیز نہیں کرسکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس معمولی خامی کے بارے میں جانتے ہوگے۔''

''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''جب سے مجھے یہ احساس ہوا کہ تم بھی اس بیماری میں مبتلا ہو۔ کئی سال پہلے اسکول ڈانس کے دوران دو... لڑکیوں میں ہمیں کشش محسوس ہوئی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم انہیں رقص کی دعوت دیتے ہیں۔ تم سبز بلاؤز والی کے پاس جاؤ، تمہارا جواب آج تک میرے ذہن میں گونج رہا ہے 'ٹھیک ہے وہی سب سے خوب صورت ہے'...... لیکن میں اس وقت حیران رہ گیا جب تم نے سرخ بلاؤز والی لڑکی سے رقص کی درخواست کی کیونکہ اس وقت تک میں رنگوں کے اندھے پن کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ ابھی میں نے دس منٹ پہلے تم سے ڈش میں سے ایک سرخ سیب اٹھانے کے لیے کہا اور تم نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد ایک سیب مجھے دے دیا جبکہ اس ڈش میں تمام سیب سبز رنگ کے تھے...... کیا تم کچھ پینا چاہو گے؟''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کچن میں چلا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے سب کے سامنے برہنہ ہوگیا ہوں اور میرے چہرے پر سے نقاب ہٹ گیا ہے۔ وہ میرے اس راز سے واقف ہوگیا جسے میں نے گزشتہ ساٹھ سال سے چھپا رکھا تھا۔ میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا کہ اس نقص کے باوجود مجھے پولیس میں کیسے لے لیا گیا۔ روزمرہ زندگی میں تو یہ ایک غیر اہم بات تھی لیکن پولیس کی ملازمت میں نہیں۔ ممکن ہے کہ میرے والد کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔

اینڈریو کے آجانے سے میری سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے ساتھ مشروب کی ایک بوتل اور دو گلاس لے کر آیا تھا۔

''تم کس ثبوت کی بات کررہے تھے؟'' میں نے سختی سے پوچھا۔

''یاد دلانے کا شکریہ۔ ڈیوڈ کو احساس ہوگیا کہ زمین پر پڑے ہوئے سرخ سیبوں کے درمیان ایک سبز سیب کی موجودگی اسے مجرم ثابت کرسکتی ہے جو اس نے اپنے درخت سے توڑ کر وان کی طرف پھینکا تھا اس کے علاوہ کوئی اور شخص اس فاصلے پر موجود نہیں تھا چنانچہ اس نے یہ فرض کرلیا کہ وان کی موت اس کے پھینکے ہوئے سیب سے ہوئی ہے اور اس نے اپنے آپ کو مجرم سمجھ لیا۔''

اینڈریو نے ایک گہری سانس لی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''لیکن اپنی معذوری کے سبب تمہارے والد سرخ اور سبز سیب میں فرق محسوس نہ کرسکے۔ اس لیے ڈیوڈ پر کسی کو شبہ نہیں ہوا ہوگا جبکہ تمہارے والد کو پہلے ہی شک ہوا تھا کہ وان کی موت غیر طبعی ہے لیکن انہوں نے قتل کی تحقیقات اس وقت ختم کردی جب اصطبل میں کام کرنے والے شخص کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی ثابت ہوگئی۔ ڈیوڈ کو یہ سب معلوم نہیں تھا۔ لہٰذا وہ یہی سمجھتا رہا کہ اس نے وان کو قتل کیا ہے اور اسے یقین ہوگیا کہ بہت جلد وہ گرفتار ہوجائے گا کیونکہ اس کے پاس اس قتل کا جواز بھی تھا۔ یقیناً وہ خوفزدہ ہوا ہوگا۔ وہ احساسِ جرم کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور اس کا ایک ہی حل تھا کہ وہ خود بھی موت کو گلے لگالے...... کیوں نہ ایک اور دور ہوجائے؟''

یہ ایک ایسی پیشکش تھی جس سے میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ مے نوشی کے دوران اینڈریو نے ریکارڈ پلیئر آن کردیا اور ایک محبت بھرا گیت ہماری سماعت سے ٹکرایا جس کے بول تھے ''لعل گرین اپیلز......'' گو کہ اس کا تعلق ایلس اور ڈیوڈ کی کہانی سے نہیں تھا لیکن یہ ہمارے موضوع سے ضرور مطابقت رکھتا تھا۔ ہم نے اس گیت کو بار بار سنا۔ اینڈریو کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے اور میں بھی اپنے اندر بے چینی محسوس کرنے لگا۔ کیا اسے اپنی کوئی محبت یاد آگئی تھی جبکہ میرے خیالات اپنی سابقہ بیوی پر مرتکز ہوگئے جو بھی میری

آنکھ کا تارا ہوا کرتی تھی۔

اینڈریو نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ امید ہے کہ تمہیں اچھی نیند آئے گی۔''

''ایک منٹ۔'' میں نے رخصت ہونے سے پہلے کہا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال آیا تھا۔

''ہاں کہو۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ پچاس میٹر کے فاصلے سے پھینکا گیا سیب اتنی قوت سے جا کر لگے کہ آدمی کی موت واقع ہو جائے؟''

''تمہارا سوال اپنی جگہ صحیح ہے لیکن یاد کرو کہ بائبل میں بھی ڈیوڈ کا ذکر موجود ہے جس نے گولائتھ کو ایک پتھر سے گرا دیا تھا۔''

''لیکن اس نے اس کے لیے رسی استعمال کی تھی۔''

''اوہ...... اتنی گہرائی میں مت جاؤ۔ انسان کمزور اور نامکمل ہوسکتا ہے لیکن کسی بھی لمحے اسے غیر معمولی طاقت حاصل ہوسکتی ہے۔ بعض اوقات یہ عطیۂ خداوندی ہوتا ہے اور کبھی ہم کوئی دوسرا ذریعہ استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال اس کا اصلی نام ڈیوڈ مینڈل نہیں بلکہ جان کارلسن تھا۔ ڈیوڈ کا فرضی نام میں نے تمہیں بھٹکانے کے لیے استعمال کیا تھا۔''

''میرے والد کے کہنے کے مطابق وان نے اپنے نسلی تعصب کی بنا پر کارلسن کے حسب نسب کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ دراصل وہ بحری جہاز پر کام کرنے والی لینا کارلسن اور ایک تاجر پیورٹو ریکو کا بیٹا تھا۔''

''ان الفاظ کے ساتھ ہی میں اپنی کہانی ختم کرتا ہوں۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اب ہمیں آرام کرنا چاہیے۔''

میں تقریباً ساڑھے نو بجے گھر واپس آیا اور کسی تاخیر کے بغیر یہ رپورٹ لکھنا شروع کردی کیونکہ بعد میں بہت سی باتیں شامل ہونے سے رہ جاتیں۔ ویسے بھی ان دنوں میری یادداشت قابل بھروسا نہیں رہی ہے۔

اس کہانی کو مکمل کرنے کے بعد میں مسلسل ایک ہی بات سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے والد جائے وقوعہ کے معائنے کے دوران سبز اور سرخ سیب میں فرق محسوس کر لیتے اور اس بنیاد پر تفتیش کو آگے بڑھاتے تو ڈیوڈ یا کارلسن کی بے گناہی ثابت ہوجاتی۔ اسے بھی معلوم ہوجاتا کہ وان کی موت اس کے پھینکے ہوئے سیب سے نہیں ہوئی اور وہ بھی موت کو گلے نہ لگاتا۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ دوسروں کے چراغ سے روشنی ڈھونڈنے والے ہمیشہ اندھیروں میں رہتے ہیں۔

☆ پھولوں کی طلب کرو گے تو کانٹوں سے بھی واسطہ پڑے گا۔

☆ عقل کو خواہش پر فضیلت حاصل ہے۔ عقل زمانے کو آپ کے ہاتھوں میں دے دیتی ہے جبکہ خواہش آپ کو زمانے کا غلام بنا دیتی ہے۔

☆ ہماری آنکھیں اکثر وہی لوگ کھولتے ہیں جن پر ہم آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتے ہیں۔

☆ دوست دنیا کے ہر دکھ کی دوا ہے لیکن جو دکھ دوست کی طرف سے ملے، اس کی دوا پوری دنیا میں نہیں۔

☆ جب غصہ آئے تو کوئی فیصلہ مت کرنا اور جب خوش ہو تو کوئی وعدہ مت کرنا۔

☆ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ برے وقت پر بدل جاتے ہیں اور کچھ بُرے وقت کو بدل دیتے ہیں۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا۔ پاک پتن شریف

ناکافی شہادت

جج گواہ سے۔ ''تم نے بندوق سے گولی نکلتے خود دیکھی تھی؟''

گواہ۔ ''نہیں جناب! میں نے صرف آواز سنی تھی۔''

جج۔ ''ناکافی شہادت۔ بیٹھ جاؤ۔''

گواہ اپنی نشست پر واپس جانے کے لیے مڑا۔ اس کی پیٹھ جج کی طرف تھی۔ معاوہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

جج غصے سے۔ ''میں تم پر توہینِ عدالت کا جرم عائد کرتا ہوں۔''

گواہ۔ ''کیا آپ نے مجھے ہنستے ہوئے دیکھا؟''

جج۔ ''نہیں۔ میں نے تمہارے ہنسنے کی آواز سنی ہے۔''

گواہ۔ ''ناکافی شہادت جنابِ عالی!''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

لاتوں کے بھوت

مرزا امجد بیگ

بھوت چاہے باتوں کے ہوں یا لاتوں کے... بگڑ جانے والے کام تو بگڑ ہی جاتے ہیں۔ اس کے معاملات نے بھی ایسا ہی پلٹا کھایا تھا اور اس کی وجہ کوئی بھوت نہیں بلکہ ایک خوب صورت اور عقلمند چڑیل تھی جو بے وقوفوں کے ہوتے بھوکی نہیں مر سکتی تھی۔ بلکہ لہو کا ایک ایک قطرہ اپنے تصرف میں رکھنا چاہتی تھی مگر... یہ جو مقدر نامی شے ہے کبھی کسی دوسرے کو اپنی بساط پر چال چلنے نہیں دیتا۔ بعض اوقات ایسی جگہ لا کرمات دیتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہ ملے... بالکل ایسا ہی دلچسپ تماشا اس عدالت میں بھی ہوا جہاں بیگ صاحب کبھی پُرجوش اور کبھی جوش دلانے والے انداز میں... دلائل دے رہے تھے... اور پھر ان کے پھیلائے ہوئے جال سے مجرم نکل بھاگے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اور کچھ یہی حال ان شکاریوں کا بھی ہوا جو دوسروں کا شکار کرنے نکلے تھے اور شاید ایسا ہی کوئی ایک لمحہ ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کے لیے بھی سبق آموز ثابت ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والا جب خود ہی لڑکھڑا کر اس میں گرتا ہے تو کوئی ہنستا ہے اور کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔

بے حیائی اور ذلت کا کاروبار کرنے والوں کا عبرت اثر واقعہ

منگل کے روز دو افراد میرے آفس میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک مرد اور دوسری ایک عورت تھی۔ وہ اپنے پہناوے سے مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ میری میز کے سامنے موجود کرسیوں کو کھینچ کر بیٹھ گئے۔ مرد کی عمر پچاس سے متجاوز تھی جبکہ عورت چالیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ پہلی نظر میں، میں نے یہی اندازہ قائم کیا کہ وہ میاں بیوی ہوں گے اور اپنے کسی گھریلو مسئلے کے سلسلے میں میری خدمات لینے آئے ہوں گے لیکن بعد ازاں میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔

''جی فرمائیے۔'' میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''وکیل صاحب! میرا نام اکرم ہے...... ڈاکٹر اکرم......'' مرد نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ عالیہ ہیں۔ عالیہ ایک مصیبت میں پھنس گئی ہیں اور ہم اس سلسلے میں آپ سے قانونی مدد لینے آئے ہیں۔''

''اکرم صاحب!'' میں نے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جاننا چاہوں گا کہ عالیہ صاحبہ کس نوعیت کی مصیبت میں پھنس گئی ہیں۔ اس کے بعد ہی میں آپ لوگوں کو کوئی مشورہ دے سکوں گا۔''

''عالیہ ایک بیوہ عورت ہے وکیل صاحب۔'' اکرم نے بتایا۔ ''ان کے جیٹھ نے ان لوگوں پر بڑا ستم ڈھایا ہے۔ یہ ماں بیٹی کل رات سے دربدر ہیں۔''

''اس ستم کی تفصیلات کیا ہیں؟'' میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے، عالیہ اپنی کہانی خود آپ کو سنائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔'' اکرم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر عالیہ کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔ ''بہن! میں تھوڑی دیر

کے لیے باہر بیٹھ جاتا ہوں۔ آپ وکیل صاحب کو اپنے مسئلے سے آگاہ کردیں پھر آ کر میں بھی مزید بات کرلوں گا۔''

''نہیں بھائی.....'' وہ ڈاکٹر اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے، ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''آپ ادھر ہی بیٹھیں، آپ سے کیا پردہ۔ آپ تو اس مشکل گھڑی میں ہمارے کام آرہے ہیں۔ آپ میرے خیر خواہ ہیں۔ میں آپ کے سامنے ہی بات کروں گی۔''

اکرم نے اٹھ کر جانے کا ارادہ ترک کردیا تو میں عالیہ کی جانب متوجہ ہوگیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جی خاتون...... اب آپ مجھے اپنے مسئلے کے بارے میں بتائیں۔''

''وکیل صاحب! گزشتہ رات میں اور میری بیٹی شادی کی ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے۔'' عالیہ نے بتانا شروع کیا۔ ''نصف شب کے قریب جب ہم واپس آئے تو ایک افسوس ناک صورتِ حال ہماری منتظر تھی۔ ہمارا سارا سامان بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں ایک ڈھیر کی صورت رکھا تھا۔ ہم نے اوپر جا کر دیکھا تو ہمارے فلیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ یہ کارروائی ماجد بھائی کے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی تھی۔''

''کون ماجد؟'' وہ سانس لینے کے لیے رکی تو میں نے استفسار کیا۔

''ماجد میرے جیٹھ کا نام ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ رضوان کے بڑے بھائی ہیں۔''

''اور رضوان کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک سال پہلے رضوان کا انتقال ہوگیا تھا۔'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''رضوان بجلی کے محکمے میں ملازم تھے۔ وہ زیادہ تر کمپلین وغیرہ پر جایا کرتے تھے۔ ایک سال پہلے برسات کے موسم میں وہ ایک کھمبے پر چڑھ کر کوئی خرابی ٹھیک کررہے تھے کہ انہیں شدید کرنٹ لگا اور وہ بلندی سے نیچے آکر گرے اور......''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اپنے شوہر کی موت کی خبر سناتے ہوئے وہ آب دیدہ ہوگئی تھی۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''عالیہ جی! مجھے آپ کے شوہر کی ناگہانی موت کا بہت دکھ ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

''صرف ایک بیٹی۔'' وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ہماری فیملی میں بس میں اور مصباح ہی ہیں۔ مصباح کی عمر اٹھارہ کے قریب ہے۔ وہ بی اے کررہی ہے۔''

''لیکن آپ کا جیٹھ ایسی دشمنی کیوں کررہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس نے آپ کے گھر کا سامان نیچے پہنچا کر آپ کے فلیٹ پر تالا کیوں لگوادیا؟''

''اصل میں ہم جس فلیٹ میں رہتے ہیں وہ میرے جیٹھ ماجد کی ملکیت ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور وہ ہمیں اپنے سامنے برداشت نہیں کررہا۔''

''اپنے سامنے.....کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہم ''النور اپارٹمنٹس'' کے فلیٹ نمبر تین سو دو میں رہتے ہیں اور ماجد کی رہائش فلیٹ نمبر تین سو پانچ میں ہے۔'' عالیہ نے بتایا۔ ''اور برداشت نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ ماجد ہم ماں بیٹی سے سخت ناراض ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اس کا گھر چھوڑ کر کہیں بھی دفع ہوجائیں۔ جب ہم نے اس کی خواہش پوری نہیں کی تو موقع ملتے ہی اس نے ہمارا سامان نیچے پھنکوا کر فلیٹ پر تالا لگوادیا۔''

''النور اپارٹمنٹس'' تیس فلیٹس کی ایک رہائشی عمارت تھی جس کے ہر فلور پر چھ فلیٹ تھے۔ مکانیت کے لحاظ سے یہ فلیٹ ایک دوسرے سے مختلف تھے یعنی فلیٹ نمبر ایک، تین، چار اور پانچ دو کمروں والے تھے۔ فلیٹ نمبر چھ کے تین کمرے تھے جبکہ فلیٹ نمبر دو کا صرف ایک کمرا تھا یعنی یہ ڈیڑھیا فلیٹ تھا۔ عالیہ اپنی بیٹی مصباح کے ساتھ فلیٹ نمبر تین سو دو میں رہتی تھی یعنی تھرڈ فلور والا ڈیڑھیا فلیٹ اور ماجد بالکل اس کے سامنے فلیٹ نمبر تین سو پانچ میں رہائش پذیر تھا۔ یہ تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس مسئلے کو آسانی سے سمجھ جائیں۔

''عالیہ جی!'' میں نے اپنے سامنے بیٹھی پریشان حال عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کا جیٹھ ماجد کس بات پر آپ سے ناراض تھا کہ اس نے آپ کی غیر موجودگی میں گھر کا سامان اٹھوا کر تھرڈ فلور سے نیچے بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں پھینک دیا۔ وہ کیوں چاہتا تھا کہ آپ اس کا گھر چھوڑ کر کہیں دفع ہوجائیں؟''

''وکیل صاحب! یہ سارا فساد جہاں آرا کی وجہ سے برپا ہوا ہے۔'' عالیہ نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''وہی نامراد ماجد کے کان بھرتی ہے اور ماجد پوری طرح اس چالاک عورت کی مٹھی میں ہے۔''

''غالباً آپ ماجد کی بیوی کی بات کررہی ہیں۔'' میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کی خاطر پوچھا۔

''جی بالکل۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے

بولی۔ ''جہاں آرا ماجد کی دوسری بیوی ہے۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی ماجد نے جہاں آرا سے شادی کی ہے۔''

''گویا ماجد دو کمروں کے فلیٹ میں اپنی دو بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔'' میں نے عالیہ کی کہانی میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''ماجد کی کتنی اولادیں ہیں؟''

''وہ بے اولاد ہے۔'' عالیہ نے جواب دیا۔ ''اور وہ اس وقت صرف جہاں آرا کے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔ اس کی پہلی بیوی صفیہ کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ صفیہ سے اولاد نہ ہونے کا سبب خود صفیہ تھی یا ماجد میں کوئی کمی تھی، یہ فیصلہ نہیں ہوسکا۔ بہرحال اس عورت نے لگ بھگ پندرہ سال ماجد کے ساتھ گزارے اور پھر مٹی اوڑھ کر سوگئی۔''

''اوکے......'' میں نے نوٹ پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ جہاں آرا کی آپ سے کیا دشمنی ہے جو وہ آپ کے خلاف ماجد کے کان بھرتی رہتی ہے؟''

''جہاں آرا کا ایک بھانجا ہے۔'' عالیہ نے بتایا۔ ''اس کی خواہش تھی کہ میں اپنی بیٹی مصباح کی شادی اس کے بھانجے سے کردوں۔ وہ لڑکا کسی بھی طرح میری مصباح کے لائق نہیں لہٰذا میں نے صاف انکار کردیا۔ میرا انکار جہاں آرا کو برداشت نہیں ہوا اور وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑگئی۔ جب سے ماجد نے جہاں آرا سے شادی کی ہے، اس کے تیور ہی بدل گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے، اس چالاک عورت نے ماجد کو الو کا گوشت کھلا دیا ہے۔''

''الو کے گوشت'' کے ذکر پر میں مسکرا کر رہ گیا تاہم میں نے عالیہ کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پوچھا۔

''آپ نے بتایا ہے کہ النور اپارٹمنٹس کے تھرڈ فلور پر واقع ڈیڑھیا فلیٹ نمبر تین سو دو ماجد کی ملکیت ہے۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی کہ آپ اس فلیٹ میں کس حیثیت سے رہ رہی ہیں؟ کیا آپ نے وہ فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے؟''

''جی نہیں۔ ہم ماجد کے کرائے دار نہیں ہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماجد نے وہ فلیٹ ایسے ہی آپ لوگوں کو رہنے کے لیے دیا ہوا ہے؟'' میں نے معاملے کی تہ میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''جیسے کوئی بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کا احساس کرتے ہوئے اپنا گھر رہنے کے لیے دے دے......''

''وکیل صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ ماجد ہم سے کرایہ نہیں لیتا لیکن اس فلیٹ میں رضوان کی رقم بھی لگی ہوئی ہے۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس فلیٹ میں آنے سے پہلے ہم نے ساری زندگی کرائے کے گھروں میں گزاری تھی۔ آج سے کم و بیش نو سال پہلے ماجد نے رضوان سے کہا کہ اس کے فلیٹ کے سامنے والا ڈیڑھیا فلیٹ ایک لاکھ تیس ہزار کا بک رہا ہے۔ میرے پاس ایک لاکھ روپے ہیں۔ اگر تم کہیں سے تیس ہزار ارینج کرلو تو وہ فلیٹ میں خرید لیتا ہوں اور تم اس فلیٹ میں رہنا شروع کردو۔ اس طرح تمہیں کرائے کے گھروں سے نجات مل جائے گی۔ بس پچھلے نو سال سے ہم اسی فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔''

''مذکورہ فلیٹ نو سال پہلے ایک لاکھ تیس ہزار میں خریدا گیا تھا؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے عالیہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس رقم میں ایک لاکھ ماجد کے اور تیس ہزار روپے رضوان کے تھے لیکن فلیٹ کی ملکیت کے کاغذات ماجد کے نام ہیں اور ان نو سالوں میں ماجد نے آپ سے اس فلیٹ کا کرایہ نہیں لیا اور اب آپ کی عدم موجودگی میں آپ کا سامان فلیٹ سے باہر پھینک کر وہاں ماجد نے اپنا تالا لگا دیا ہے۔ ایم آئی رائٹ؟''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے کہا۔ ''جب یہ فلیٹ خریدا گیا تھا تو کیا اس وقت دونوں بھائیوں کے بیچ کوئی تحریری معاہدہ بھی ہوا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ مذکورہ فلیٹ میں کس بھائی کی کتنی رقم لگی ہوئی ہے؟''

''ایسی کوئی تحریر نہیں لکھی گئی وکیل صاحب۔'' وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''حالانکہ میں نے رضوان سے کہا بھی تھا کہ وہ کوئی ایگریمنٹ تیار کروا لے لیکن وہ نہیں مانا۔ میں نے جب بھی زور دیا تو رضوان یہ کہہ کر ٹال گیا کہ ماجد میرے بڑے بھائی ہیں۔ انہوں نے مجھے آسانی فراہم کرنے کے لیے یہ فلیٹ خریدا ہے اور پھر میرے تو صرف تیس ہزار لگے ہوئے ہیں مگر ماجد کے تو پورے ایک لاکھ روپے لگے ہیں اس فلیٹ میں اور وہ ہم سے کرایہ بھی نہیں مانگ رہے۔ تیس ہزار دے کر مفت کے فلیٹ میں ہم بے فکری سے تو رہ رہے ہیں۔ تم اس قسم کے وہم اور پریشانی میں مبتلا نہ ہوا کرو۔ یہ ہم بھائیوں کا معاملہ ہے۔ تمہیں اس میں پڑنے کی ضرورت نہیں...... بس تو پھر میں خاموش ہو کر بیٹھ گئی اور آج......'' اس کا گلا رندھ گیا۔ لمحاتی توقف کے بعد اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''آج بھائیوں کے اس ''معاملے'' کی وجہ سے ہم

ماں بیٹی فٹ پاتھ پر آ گئے ہیں۔ مجھے چھوڑیں، میں تو غیر ہوں۔ اس ظالم تایا کے دل میں اتنا رحم بھی نہ آیا کہ جب آدھی رات کو اس کی سگی بھتیجی مصباح واپس آئے گی تو یہ صورت حال دیکھ کر اس پر کیا گزرے گی۔ اگر ماجد کے اندر ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو وہ ایسی حرکت نہ کرتا۔ میں نے اور میری بچی نے پورے دو سال تک اس کی جو خدمت کی، اس کا یہ صلہ دیا ہے ماجد نے۔ آپ یقین کریں وکیل صاحب! صفیہ کے انتقال کے بعد ماجد بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔ میں نے اور میری مصباح نے اس کا بہت خیال رکھا ہے۔ وہ تینوں وقت کا کھانا ہمارے گھر میں کھاتا تھا۔ کپڑں کی دھلائی میں کرتی رہی ہوں۔ اس کے فلیٹ کو بھی ہم نے شیشے کی طرح چمکا رکھا تھا۔ گویا ہم تو اس کے لیے بس... نوکرانیاں ہی بن گئی تھیں مگر اس قدر ناشناس شخص نے ہمارے سامان کو کوڑے کی طرح اٹھا کر فلیٹ سے باہر پھینک دیا ہے۔''

بات کے اختتام پر وہ دوبارہ دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو خشک کرنے لگی۔

''آپ پولیس کے پاس نہیں گئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ تو سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ آپ کو ماجد کی اس زیادتی کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہیے تھی۔''

''وکیل صاحب! عالیہ آج دوپہر میں تھانے گئی تھیں۔'' ڈاکٹر اکرم نے بتایا۔ ''مگر پولیس والوں نے ان کی رپورٹ درج کرنے سے انکار کر دیا۔''

''انکار کا سبب بھی تو بتایا ہوگا انہوں نے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ ماجد نے یہ حرکت سوچ سمجھے منصوبے کے تحت کی ہے۔'' اکرم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک طرف اس نے پولیس والوں کی مٹھی گرم کی اور دوسری جانب اس نے بھاوج اور بھتیجی کا سامان اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس والوں نے ان مصیبت زدہ ماں بیٹی سے ہمدردی جتانے کے بجائے الٹا انہی سے تفتیش شروع کر دی۔ انہوں نے کہا..... بی بی! اگر تم کرائے دار ہو تو پہلے کرائے کی رسید دکھاؤ پھر ہم ماجد کے خلاف رپورٹ درج کریں گے اور اگر فلیٹ کی مالک ہو تو ملکیت کے کاغذات لے کر آؤ۔ ہم یوں خالی خولی باتوں پر رپورٹ درج نہیں کر سکتے۔''

''ہم کہاں سے لائیں کرائے کی رسیدیں اور فلیٹ کی ملکیت کے کاغذات۔'' عالیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''پولیس والے کہتے ہیں کوئی ثبوت لے کر آؤ۔ بغیر ثبوت کے کارروائی نہیں ہو سکتی۔''

''سب سے بڑا ثبوت تو آپ کے پڑوسی ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاتیں۔ وہ آپ کی حمایت میں ضرور بولتے۔ اگر کسی کرائے دار سے بھی مکان خالی کرانا ہو تو اس کے لیے باقاعدہ ایک ماہ پہلے نوٹس دیا جاتا ہے۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے کہ کسی مکین کی عدم موجودگی میں اس کا سامان باہر پھینک کر گھر پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں تو ماجد پر سیدھا سیدھا کیس بھی بن سکتا ہے۔''

''وکیل صاحب! آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ کس کے خلاف کیا کیس بن سکتا ہے۔'' اکرم نے کہا۔ ''فی الحال تو پیش آمدہ صورت حال سے نمٹنا ہے کیونکہ آج صبح ماجد نے کورٹ سے اسٹے آرڈر لے لیا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ شاطر شخص تو کچھ زیادہ ہی تیز بھاگ رہا ہے۔''

''آپ اس شخص کی ٹانگیں توڑ سکتے ہیں وکیل صاحب۔'' ڈاکٹر اکرم نے کہا۔ ''کوئی ایسا قانونی آنکڑا لگائیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی محفوظ رہے۔ ان ماں بیٹی نے پچھلی رات میرے گھر میں گزاری ہے۔''

''کیا آپ بھی ''النور اپارٹمنٹس'' ہی میں رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں اس اپارٹمنٹس بلڈنگ کی سامنے والی لین میں رہتا ہوں۔ یعنی اس کے سامنے ہی میرا گھر ہے۔ اس علاقے میں فلیٹس والی بلڈنگ بہت کم ہیں اور زمین والے گھر زیادہ ہیں۔ جب رات مجھے پتا چلا کہ عالیہ اور مصباح گلی میں پریشان کھڑی ہیں تو میں انہیں اپنے گھر لے گیا تھا اور جبھی مجھے ان کی کہانی پتا چلی۔''

''آپ نے اسی وقت رات میں ماجد کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ آپ کا محلے دار بھی تو ہے۔''

''جی بالکل، وہ میرا محلے دار ہے مگر میں نے اسے خاصا بد مزاج پایا ہے لہٰذا میں نے اس کے منہ لگنے کی کوشش نہیں کی۔''

''او کے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ ماجد نے اسٹے لے لیا ہے؟''

''اتفاق سے آج صبح میں اپنے ایک ذاتی کام سے کورٹ گیا ہوا تھا تو وہاں میں نے ماجد کو دیکھا۔'' ڈاکٹر اکرم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ماجد پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ وہ کسی وکیل کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ وہ

مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا میں چپکے سے اس کے عقب میں ایک ستون کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور جبھی میں نے اس وکیل کو کہتے ہوئے سنا..... ''ماجد صاحب! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسٹے آرڈر مل گیا ہے۔ اب اگر وہ ماں بیٹی کسی بھی حوالے سے آپ کو تنگ کرنے کی کوشش کریں یا فلیٹ میں گھسنے کا کوئی جتن کریں تو آپ فوراً پولیس کو فون کر دیجیے گا۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں صبح چونکہ اسٹے آرڈر کے بارے میں جان چکا تھا اور مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ پولیس نے اس افسوس ناک واقعے کی رپورٹ درج کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے تو پھر مجھے یہی مناسب محسوس ہوا کہ عالیہ کو بھی کسی وکیل ہی سے مدد لینا چاہیے تاکہ اس معاملے کو بہ احسن طریق نمٹایا جا سکے۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کیا ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کا کلینک کہاں پر ہے اور کیا آج آپ کلینک نہیں گئے؟''

''میرا کلینک لسبیلہ چوک کے نزدیک ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور اس وقت میرا بیٹا کلینک پر موجود ہے۔ آپ سے فارغ ہونے کے بعد میں سیدھا کلینک ہی جاؤں گا۔ ہم دونوں باپ بیٹا مل کر کلینک چلاتے ہیں۔''

''بہت خوب۔ گویا کلینک گھر کے نزدیک ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''النور اپارٹمنٹس۔'' گارڈن ویسٹ کے علاقے البیلہ کے قریب واقع تھے۔ دونوں مقامات میں واکنگ ڈسٹینس تھا۔ ڈاکٹر اکرم نے بتایا۔

''میرا تعلق بنیادی طور پر سکھر سے ہے لیکن پچھلے پچیس سال سے میں کراچی میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ میں شفا رکھی ہے۔ سید زادہ ہوں۔ اللہ کے کرم سے معاملہ چل رہا ہے۔ ہومیوپیتھی ویسے بھی روحانیت کی ایک شاخ ہے۔''

شاید میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ ڈاکٹر اکرم ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھا۔ میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر بھی ہومیوپیتھی کا معترف ہوں۔ اس سے بڑا کوئی طریقۂ علاج نہیں ہے۔ بشرطیکہ ڈاکٹر قابل ہو......''

''یہ تو بنیادی شرط ہے وکیل صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شعبہ چاہے ڈاکٹری کا ہو یا کوئی اور، اگر بندہ قابل نہیں ہے تو پھر وہ جھک ہی مارے گا اور لوگوں کو دھوکا ہی دے گا۔''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''آپ میرا کیس تو سمجھ گئے ہیں نا؟'' عالیہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ نہ تو آپ کرائے دار ہیں اور نہ ہی مالک مکان لہٰذا یہ کیس اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ اوپر سے ماجد نے آج عدالت جا کر اسٹے آرڈر بھی حاصل کر لیا ہے جس کے مطابق آپ کو اور آپ کی بیٹی کو فلیٹ نمبر تین سو دو، النور اپارٹمنٹس میں داخل ہونے سے قانوناً روک دیا گیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتے......'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی عالیہ صاحبہ۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی ناامید یا مایوس نہیں ہوتا۔ اس وقت شام ہو رہی ہے لہٰذا عدالت میں جا کر تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں کل صبح عدالت جا کر اس کیس کی تفصیلات جاننے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ پتا چلے کہ ماجد نے کس نوعیت کی درخواست دائر کی ہے جس پر عدالت نے حکم امتناعی جاری کر دیا ہے۔ یہ باتیں میرے علم میں آ جائیں تو میں عملی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں آ سکوں گا۔''

''جب تک ہم ماں بیٹی کا کیا ہوگا؟ ہم کہاں جائیں؟'' عالیہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''ہم گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ ہمارا سامان ادھر بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں پڑا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔''

''بہن! انسان کی زندگی میں ہر طرح کا وقت آتا ہے۔'' اکرم صاحب نے کہا۔ ''انسان کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ اگر انسان ہمت کو جوان رکھے تو مشکل سے مشکل وقت بھی گزر ہی جاتا ہے۔ آپ خود کو بے گھر نہ سمجھیں۔ جب تک آپ کی رہائش کا مسئلہ مستقل طور پر حل نہیں ہو جاتا، آپ دونوں ماں بیٹی میرے گھر نہایت سکون سے رہ سکتی ہیں۔''

''آپ کی مہربانی ہے ڈاکٹر صاحب جو آپ ہم لوگوں کے لیے اتنا بھی کر رہے ہیں۔'' عالیہ، اکرم کی جانب دیکھتے ہوئے ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''ہم آپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے۔''

''یہ کیا بات کر دی آپ نے...... بوجھ کیسا؟'' اکرم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پڑوسی اور محلے دار آخر کس مرض کی دوا ہوتے ہیں۔''

''عالیہ جی! عدالت کے حکمِ امتناعی کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، اس کے مطابق آپ کو کچھ عرصے کے لیے تو اپنی رہائش کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ آپ اگر زبردستی اپنے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کریں گی تو قانون کی نظر میں مجرم ہو جائیں گی۔ اس معاملے سے نمٹنے اور ماجد کو نکیل ڈالنے کے لیے اب ہمیں باقاعدہ مقدمہ لڑنا پڑے گا۔ مجھے کل عدالت جا کر ماجد کی درخواست کا جائزہ لینے دیں پھر دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''عالیہ بہن! اگر آپ چاہیں تو اپنا سامان بھی میرے گھر میں رکھوا دیں۔'' اکرم نے پیشکش کی۔ ''وکیل صاحب نے باقاعدہ کیس لڑنے کی بات کی ہے تو اب آپ کو مطمئن ہو جانا چاہیے۔ میرے گھر میں انشاء اللہ! آپ کو کوئی تکلیف یا کمی محسوس نہیں ہوگی۔''

''سید صاحب! میں آپ کے خلوصِ نیت اور جذبۂ ہمدردی کی قدر کرتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اب تک عالیہ صاحبہ کے لیے جو کیا اور آئندہ جو کرنا چاہتے ہیں، میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن سامان اٹھانے کی ابھی غلطی نہیں کیجیے گا۔''

''میں سمجھا نہیں وکیل صاحب۔'' ڈاکٹر اکرم نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ ''اس میں غلطی والی کون سی بات ہے؟''

''ماجد عدالت سے اسٹے آرڈر لے چکا ہے، جیسا کہ آپ نے مجھے بتایا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''جی، یہ تو ہے مگر اسٹے آرڈر سے سامان اٹھانے کا کیا تعلق ہے؟'' اس کے لہجے میں الجھن در آئی۔

''بڑا گہرا تعلق ہے سید صاحب۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ لوگوں کا تھانہ کون سا لگتا ہے؟''

''سولجر بازار پولیس اسٹیشن۔'' ڈاکٹر اکرم نے جواب دیا۔

میں نے اکرم سے مزید کوئی بات کرنے سے پہلے تھانہ سولجر بازار کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری جانب جس بندے نے فون اٹینڈ کیا، میں نے اس سے کہا۔

''اپنے انچارج صاحب سے بات کرا دیں۔''

''آپ کون؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''او کے سر! ایک منٹ ہولڈ کریں۔''

میں نے ہولڈ کر کے باری باری اکرم اور عالیہ کی جانب دیکھا۔ اسی دوران میں میرا رابطہ تھانہ انچارج سے کروا دیا گیا۔

میں نے ماجد والے اسٹے آرڈر کی تفصیلات بتانے کے بعد پوچھا۔ ''آپ مذکورہ فلیٹ کا جائزہ لینے کب جا رہے ہیں؟''

''یہ اسٹے آرڈر کب جاری کیا گیا ہے؟'' تھانہ انچارج نے مجھ سے پوچھا۔

''آج صبح۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ کل تک آپ کو عدالت کی چٹھی موصول ہو جائے گی۔''

''اچھی بات ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔ ''جب چٹھی ملے گی تو دیکھا جائے گا۔''

تھانہ انچارج کے انداز سے میں نے محسوس کر لیا کہ یہ کیس اس کے ذہن میں ضرور تازہ ہو گیا ہوگا۔ آج عالیہ بھی اپنی فریاد لے کر تھانے گئی تھی لیکن تھانے والوں نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔

میں نے کہا۔ ''انچارج صاحب! میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کا بندہ میری موجودگی میں جائے وقوعہ کا جائزہ لینے جائے۔''

''اور میں یہ چاہتا ہوں کہ وکیلوں سے دور ہی رہا جائے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خصوصاً آپ جیسے ہوشیار وکیلوں سے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔

''تو آپ نے اس عورت کا کیس پکڑ لیا ہے؟''

''آپ کس عورت کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''آپ اتنے بھی بھولے نہیں ہیں بیگ صاحب اور نہ ہی اتنے فارغ کہ کیس کنفرم کیے بغیر آپ کسی کے معاملے میں دلچسپی لیں۔'' اس نے مجھ پر چوٹ کی۔ ''میں اسی عورت کا ذکر کر رہا ہوں جس کے خلاف ہونے والے اسٹے آرڈر کے لیے آپ بے قرار ہو رہے ہیں۔''

''آپ بھی سادگی کا لبادہ اتار دیں انچارج صاحب۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''یہی مظلوم عورت فریاد لے کر تھانے آئی تھی مگر آپ نے اس کی دادرسی نہیں کی۔''

''ہماری بعض محکمہ جاتی مجبوریاں ہوتی ہیں وکیل صاحب جنہیں آپ لوگ سمجھ نہیں سکتے۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''رپورٹ لکھنے کے لیے بھی بنیادی طور پر کچھ چیزوں

کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ عورت نہ تو کرائے دار ہے اور نہ ہی مالک مکان اور آپ کو شاید پتا نہیں کہ فلیٹ کے مالک نے اپنی درخواست میں کس قسم کی شکایات درج کی ہیں۔''

''وہ پتا میں کرلوں گا۔'' میں نے کہا۔''آپ سے جس تعاون کی درخواست کی ہے، آپ ذرا غور فرمائیں۔''

''اگر کل ہمیں عدالت کا آرڈر موصول ہوگیا تو میں تقریباً چار بجے اپنے کسی اہلکار کو موقع پر بھیجوں گا۔'' انچارج نے جواب دیا۔

میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

عالیہ نے کہا۔''وکیل صاحب! آپ سے تو تھانے دار بڑے اچھے انداز میں بات کررہا تھا۔ ہمیں تو اس نے کوئی لفٹ نہیں کرائی تھی۔''

''یہ سب وقت، وقت کی اور حالات کی بات ہوتی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔''ویسے میں آپ کی ایک بات سے اتفاق کرتا ہوں۔''

''کون سی بات وکیل صاحب؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''کہ ماجد نے پولیس والوں کی مٹھی بھی گرم کررکھی ہے۔'' میں نے بڑے وثوق سے کہا۔''میں نے تھانہ انچارج کی گفتگو سے یہ بات محسوس کی ہے۔''

''یہ پولیس والے ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت تو نہیں کھڑی کردیں گے'' وہ دہشت بھرے لہجے میں بولی۔

''آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔''کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ میں ان معاملات سے نمٹ لوں گا۔ بس ایک بات دھیان میں رکھیں کہ آپ کو من وعن میری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔''

''جی، میں عمل کروں گی۔'' وہ فرماں برداری سے بولی۔

''جیسا کہ ابھی تھانہ انچارج نے بتایا ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو کل چار بجے موقع کا جائزہ لینے کے لیے بھیجے گا۔'' میں نے کہا۔''ماجد نے جو رپورٹ درج کرائی ہے اور جس کے نتیجے میں عدالت نے اسٹے آرڈر جاری کیا ہے، اسی سلسلے میں پولیس تفتیش کرنے آپ کی بلڈنگ تک پہنچے گی۔ آپ ایسا کریں کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں رہتے ہوئے باہر گلی میں دیکھتی رہیے گا۔ جیسے ہی پولیس افسر نظر آئے، آپ فوراً اپنے سامان کے پاس پہنچ جائیں اور سامان میں سے کوئی چیز نکالنا شروع کردیں اور اسی دوران میں موقع پاکر اس پولیس والے کو اپنے حالات سے آگاہ کردیں۔ گھبرانے یا ہچکچانے کی ضرورت نہیں۔ میں وہیں آس پاس موجود رہوں گا۔''

''اب میں سمجھ گیا کہ آپ نے عالیہ بہن کے سامان کو نہ اٹھوانے کی بات کیوں کی تھی۔'' ڈاکٹر اکرم نے کہا۔

''سید صاحب! آپ ہی کوئی ایسا بندوبست کردیں کہ جیسے ہی پولیس کا کوئی اہلکار النور اپارٹمنٹس پہنچے، عالیہ کو خبر ہوجائے۔'' میں نے ڈاکٹر اکرم سے کہا۔''یہ ایک سنہری موقع ہوگا۔ اس سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری ہے۔ اگر عالیہ پولیس کے تفتیشی افسر کو اپنی بپتا سنانے میں کامیاب ہوگئیں تو باقی کے معاملات کو میں سنبھال لوں گا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ماجد بہت کائیاں شخص ہے۔ اسے گھیرنے کے لیے چاروں جانب سے اٹیک کرنا ہوگا، آپ یقیناً میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔''

''بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں وکیل صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''یہ بندوبست ہوجائے گا۔ میں شام میں کلینک جاتا ہوں اور چار بجے تو میں اپنے گھر پر ہی ہوتا ہوں۔ میں گلی میں کسی بچے کی ڈیوٹی لگادوں گا۔ جیسے ہی کوئی پولیس والا النور اپارٹمنٹس کی بلڈنگ کے سامنے پہنچے گا، مجھے اطلاع ہوجائے گی۔''

''گڈ......!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب ہمارے لیے کیا حکم ہے وکیل صاحب؟''

ڈاکٹر اکرم اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنے کلینک جانے کے لیے بے چین ہورہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب آپ لوگ جاسکتے ہیں۔ میں نے تمام پوائنٹس نوٹ کرلیے ہیں۔ کوئی بات اگر رہ گئی تو میں کل آپ سے پوچھ لوں گا۔ میں صبح ہی عدالت جاکر اس معاملے کو نمٹانے کی کوشش شروع کردیتا ہوں۔ چند دن تو لگ جائیں گے لیکن آپ لوگوں کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں صورتِ حال کو سنبھال لوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ وکیل صاحب!'' عالیہ نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔''آپ نے میرے ذہن کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا کردیا ہے۔''

پھر میں نے اپنی میز کی دراز میں سے وکالت نامہ نکال کر اس میں متعلقہ اندراج کیا اور عالیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔''آپ اس پر دستخط کردیں۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''وکیل صاحب! وکالت نامہ تو سائن ہوگیا۔ اب آپ اپنی فیس بھی بتا دیں تاکہ ہم یہاں سے پورے اطمینان کے ساتھ رخصت ہوں۔''

میں نے انہیں فیس کی رقم بتائی۔ عالیہ نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر اکرم نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا اور مطلوبہ رقم گن کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے گنے بغیر وہ رقم اپنی میز کی دراز میں رکھی اور فیس کی وصولی کی رسید لکھ کر انہیں دے دی۔

''وکیل صاحب! آپ پیسے گن لیتے تو اچھا تھا۔'' عالیہ نے کہا۔

''میں نے گن لیے ہیں۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''کب گنے آپ نے؟''

''ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ.....'' میں نے جواب دیا۔

''عالیہ بہن! یہ وکیل صاحب ہیں۔'' ڈاکٹر اکرم نے کہا۔ ''اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔''

اکرم کے تبصرے پر عالیہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان محسوس ہوا کہ اس کی پریشانی میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی تھی اور...... یہ میری کامیابی کا پہلا زینہ تھا۔

''عالیہ صاحبہ! کل جب میں آپ کے پاس آؤں گا تو پھر آپ سے ماضی کے حوالے سے بھی اہم سوال کروں گا تاکہ ہمارے کیس میں جان پڑ جائے۔'' میں نے کہا۔ ''میری آمد کا مقصد بھی یہی ہے کہ میں آپ کے پڑوسیوں سے بھی پوچھ تاچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے دو تین ایسے افراد مل گئے جو آپ کی حمایت میں بول سکتے ہوں تو یہ آپ کے حق میں بہتر رہے گا۔''

ان دونوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوگئے۔

اسی رات جب میں سونے کی تیاری کر رہا تھا تو میرے گھریلو فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور کہا۔ ''ہیلو!''

''بیگ صاحب! السلام علیکم.....'' دوسری جانب ڈاکٹر اکرم تھا۔

میں نے کہا۔ ''وعلیکم السلام!''

''اس وقت فون کرنے کے لیے بے حد معذرت خواہ ہوں۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''لیکن بات ہی ایسی ہے کہ آپ کے علم میں لانا بہت ضروری ہے۔''

''جی بتائیں سید صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''جناب! میں کلینک سے گھر آیا ہوں تو مجھے پتا چلا ہے کہ ماجد نے عالیہ والے گھر میں کسی کو بسا لیا ہے۔'' اس نے پریشانی بھرے لہجے میں بتایا۔

''مطلب کوئی کرائے دار آگیا ہے اس فلیٹ میں؟''

''پتا نہیں جناب، وہ کوئی کرائے دار ہے یا ماجد کی گہری چال'' وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''میں نے اڑتی اڑتی سنی ہے کہ وہ لوگ جہاں آرا کے کوئی رشتے دار ہیں۔''

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، اس تمام تر سازش کے پیچھے ماجد کی دوسری بیوی جہاں آرا کا ہاتھ ہے۔ ساری ڈوریاں وہی ہلا رہی ہے۔ ماجد تو ایک پپٹ کی طرح ناچ رہا ہے۔''

''آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے بیگ صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''جب تک ماجد نے دوسری شادی نہیں کی تھی، تمام معاملات نارمل انداز میں چل رہے تھے۔ ماجد اور عالیہ میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن اس عورت کے آتے ہی سب کچھ الٹ کر رہ گیا۔ پہلے اس نے اپنے کسی بھانجے کے لیے عالیہ کی بیٹی کا رشتہ مانگ لیا۔ جب عالیہ نے انکار کیا تو وہ ان ماں بیٹی کی دشمن ہوگئی۔ اس نے ماجد کی اس طرح برین واشنگ کی کہ اس نے بھاوج سے فلیٹ خالی کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ یہ مطالبہ دو چار بار دبی زبان میں دہرایا گیا اور پھر ایک رات موقع ملتے ہی ان ماں بیٹی کی عدم موجودگی میں ان کا سامان فلیٹ سے باہر پھینک کر فلیٹ کو لاک کر دیا گیا۔''

''یہ بات آپ نے پہلے نہیں بتائی تھی کہ ماجد نے عالیہ سے گھر خالی کرنے کا مطالبہ بھی کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ یہ بات بتانا ہم بھول گئے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''عالیہ کے انکار کے بعد جہاں آرا نے اس کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی تھی۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے شوہر کو عالیہ کے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی جس کے نتیجے میں ماجد نے عالیہ کو فلیٹ خالی کرنے کا کہہ دیا تھا۔''

''اوکے!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''گویا، ماجد سے زیادہ ہمارا فوکس جہاں آرا پر ہونا چاہیے کیونکہ اس سارے فساد کی جڑ یہی عورت ہے۔''

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرپیکار رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اس عورت کا زہر نکالنے کے لیے ہمیں اس کے ماضی سے اچھی طرح آگاہی حاصل کرنا ہوگی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اور اس سلسلے میں آپ کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔''

''کیسا کردار بیگ صاحب؟'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''کل تک صبر کریں۔ میں آج رات آپ کے لیے کوئی کردار سوچتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ نے میری ہدایات پر عمل کیا تو اس کیس پر گہرے مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔''

''انشاءاللہ......!'' وہ خلوصِ دل سے بولا۔

دو چار رسمی باتوں کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہوگیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں عدالت میں پیش ہوا۔ مطلب یہ کہ عالیہ والے معاملے کے سلسلے میں پیش کار سے جا کر ملا۔ میں نے اسے اپنا وکالت نامہ دکھایا اور عالیہ کی مظلومیت کے بارے میں مختصراً زبانی بھی بتایا پھر وکالت نامہ عدالت میں داخل کر دیا۔ وکالت نامہ تو مجھے داخل کرنا ہی تھا جو کہ اسی مقصد سے میں نے گزشتہ روز عالیہ سے سائن کروالیا تھا۔ پیش کار کو اس واقعے کی حقیقت سے آگاہ کرنا میرے منصوبے کا پہلا قدم تھا بلکہ دوسرا قدم تھا۔ پہلے قدم کے سلسلے میں، میں نے عالیہ کو ہدایات دے دی تھیں کہ تفتیشی افسر کی موجودگی میں اسے کیا کرنا ہے۔ اصل میں زمینی حقائق کو اگر دیکھا جاتا تو اس کیس میں ماجد کی پوزیشن زیادہ مضبوط تھی۔ متنازع فلیٹ اس کی ملکیت تھا اور اس وقت ماجد نے مذکورہ فلیٹ میں کسی فیملی کو بھی بسالیا تھا۔ آپ نے سن رکھا ہوگا...... دعویٰ جھوٹا، قبضہ سچا!...... اور عالیہ کے پاس جھوٹا دعویٰ کرنے کا بھی کوئی جواز یا کوئی ثبوت نہیں تھا، نہ ہی وہ کسی طرح یہ ثابت کرسکتی تھی کہ وہ کرائے دار کی حیثیت سے دو روز پہلے تک وہاں رہائش پذیر تھی۔ جو کچھ بھی ثابت کرنا تھا، مجھے ہی ثابت کرنا تھا اور میں نے اس سلسلے میں اپنا ذہن بنالیا تھا۔

پیش کار سے میں اسٹے آرڈر کی ایک نقل حاصل کرنا نہیں بھولا تھا۔ ویسے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ پیش کار کو میں ماجد کی کمینگی اور عالیہ کی بے بسی کا احساس دلانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

میں نے مذکورہ اسٹے آرڈر کی نقل کو بغور پڑھا۔ ماجد نے اپنی درخواست میں عالیہ کو ایک عیار اور چالباز عورت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق، متنازع فلیٹ ماجد کی ملکیت تھا۔ یہ فلیٹ اس نے اپنے ذاتی پیسوں سے خریدا تھا۔ اس فلیٹ میں نہ تو کوئی شراکت دار تھا اور نہ ہی یہ موروثی فلیٹ تھا۔ مطلب یہ کہ مذکورہ فلیٹ ان کے والد کی ملکیت نہیں تھا جو کسی بھی زاویے سے عالیہ وراثت کے حوالے سے اپنے مرحوم شوہر رضوان کے لیے کسی حق کی دعوے داری کرتی۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ماجد نے اس فلیٹ کی ملکیت کے کاغذات کی نقول بھی ساتھ منسلک کر دی تھیں جن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مذکورہ فلیٹ کا اصل مالک ماجد ہی تھا۔

ماجد نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی درخواست میں بتایا تھا کہ رضوان اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ رضوان کے پاس اپنا گھر نہیں تھا اور نہ ہی اس کی ایسی پوزیشن تھی کہ کبھی اپنا گھر بنوا سکے۔ اس صورت حال میں ترس کھا کر اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو اس فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ در در کی ٹھوکریں کھانے سے محفوظ ہوجائے۔ یہ لوگ ایک طویل عرصے تک اس فلیٹ میں مقیم رہے پھر جب ماجد کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوا تو اس کے بعد عالیہ کا مزاج بالکل بدل گیا اور وہ اکثر ماجد کے ساتھ بدتمیزی کا رویہ بھی اختیار کرنے لگی۔ ماجد اپنے بھائی کے رشتے کی وجہ سے خاموش تھا۔ اس طویل عرصے کے دوران میں ماجد نے نہ تو کبھی ان لوگوں سے کوئی کرایہ لیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی اور مطالبہ کیا تھا لیکن عالیہ کے بدلتے ہوئے رویے نے ماجد کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے خود سے دور کردے۔ یہ صورتِ حال اس وقت مزید سنگینی اختیار کرگئی جب ماجد نے جہاں آرا سے شادی کی۔ عالیہ بات بات پر جہاں آرا سے جھگڑا کرنے لگی تھی۔ دونوں فلیٹس کے دروازے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے لہٰذا صرفِ نظر ممکن نہیں تھا۔ ماجد، عالیہ اور جہاں آرا کے جھگڑوں سے اتنا تنگ آگیا کہ اس نے عالیہ سے کہا۔ ''بھابی...... برائے مہربانی آپ میرا فلیٹ خالی کردو۔ میں مزید برداشت نہیں کرسکتا۔'' اس پر عالیہ بپھر گئی اور دعویٰ کرنے لگی کہ یہ فلیٹ جتنا ماجد کا ہے، اتنا ہی رضوان کا بھی ہے کیونکہ اس فلیٹ کی خریداری کے وقت رضوان نے بھی کافی رقم ملائی تھی لہٰذا عالیہ اپنے مرحوم شوہر کی بیوہ کی حیثیت سے وہاں رہائش اختیار کرنے کا حق رکھتی ہے۔ ماجد کے مطابق، وہ اپنی

بھاوج کے تیور دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ اسے اس خدشے نے گھیر لیا کہ کہیں یہ چال باز عورت اس کے فلیٹ پر قبضہ ہی نہ کر بیٹھے لہٰذا جب زبان سے بار بار سمجھانے کا کوئی اثر عالیہ پر نہ ہوا تو پھر ماجد نے بہ زورِ بازو اپنا فلیٹ خالی کروالیا۔

مذکورہ درخواست میں کئی ایک ضمنی باتیں بھی تھیں لیکن میں نے آپ کو وہی بتائی ہیں جو ضروری تھیں۔ ماجد نے فلیٹ کو ”بہ زورِ بازو“ خالی کرانے والے معاملے کی وضاحت نہیں کی تھی جس کا سلیس اردو میں یہ مطلب تھا کہ..... میں نے اپنی بھاوج کی عدم موجودگی میں ان کا سامان اٹھا کر نیچے پھینک دیا تھا۔

اگر اس درخواست کے دائر ہونے سے پہلے عالیہ کی جانب سے کوئی وکیل عدالت میں پیش ہو جاتا اور جج پر عالیہ کی پوزیشن کو واضح کرنے کے بعد اس اسٹے آرڈر کو رکوانے کے حق میں دلائل دیتا تو عالیہ عدالت کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی کیونکہ بفرضِ محال، اگر عالیہ نے مذکورہ فلیٹ پر قبضہ کر رکھا تھا اور کسی بھی صورت وہ فلیٹ خالی کرنے کو تیار نہیں تھی تو ان حالات میں بھی قانون مالک مکان کو اپنے ”بازو کی قوت“ آزمانے کی اجازت نہیں دیتا۔ انصاف حاصل کرنے کے لیے ماجد کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے تھا۔ یہ فیصلہ عدالت کو کرنا تھا کہ مذکورہ فلیٹ کا اصل مالک کون ہے اور اگر کوئی غیر متعلق شخص اس فلیٹ پر قابض ہو بیٹھا ہے تو اسے خالی کروانے کا طریقۂ کار بھی عدالت ہی کو طے کرنا تھا۔ عدالت کسی بھی صورت میں، کسی شخص کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

لیکن یہاں صورتِ حال آپوں آپ عالیہ کے خلاف چلی گئی تھی۔ اول، اس کی جانب سے رپورٹ درج نہیں کی گئی تھی کیونکہ ماجد پولیس کی مٹھی گرم کر کے ان لوگوں کی ہمدردی اپنے حق میں ہموار کر چکا تھا۔ دوم، عالیہ کے عدالت پہنچنے سے پہلے ماجد اسٹے آرڈر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سوم، عالیہ کا مذکورہ فلیٹ پر سے قبضہ ختم ہو گیا تھا۔

موجودہ صورتِ حال عالیہ کے خلاف تھی لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے اپنے اسٹروکس کس ایریا میں کھیلنا ہوں گے۔ میں نے فیلڈ کا جائزہ لے لیا تھا۔ ماجد کی رپورٹ میں بہت سے گیپ مجھے دکھائی دے رہے تھے جہاں میں بڑی آسانی کے ساتھ چوکے چھکے لگا سکتا تھا۔ ماجد نے جس قسم کی درخواست دائر کی تھی، اس میں بعض مقامات پر وہ خود پھنستا نظر آتا تھا۔

میں یہ تو معلوم کر چکا تھا کہ پولیس تفتیش کرنے چار بجے جائے وقوعہ پر پہنچے گی لہٰذا عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں لنچ کیا پھر النورا پارٹمنٹس کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں نے گزشتہ روز عالیہ سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ پولیس کے سامنے اپنا کردار ادا کرے گی تو میں بھی موقع پر موجود ہوں گا لہٰذا میں کچھ دیر پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ تفتیشی افسر کی آمد سے قبل مجھے تھوڑا ہوم ورک کرنا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی ایک مناسب مقام پر پارک کی اور سبک قدموں سے چلتے ہوئے النورا پارٹمنٹس کی جانب بڑھ گیا۔ بلڈنگ کے دروازے پر ہی چوکیدار سے میری ملاقات ہو گئی۔ اس کا نام داؤد تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”مجھے ماجد صاحب کے گھر جانا ہے۔“

”وہ اوپر تین سو پانچ میں رہتے ہیں۔“ داؤد نے جواب دیا۔ ”لیکن اس وقت ماجد صاحب خود گھر میں نہیں ہوں گے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ”میں ان کی وائف سے بات کر لوں گا۔“

چوکیدار نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اگر میں عالیہ سے ملاقات کی بات کرتا تو شاید وہ مجھے اوپر جانے کی اجازت نہ دیتا اور یہ کہہ کر روک لیتا کہ عالیہ اب اس فلیٹ میں نہیں رہتی۔ میں نے زینے کی جانب بڑھتے ہوئے بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں عالیہ کے سامان کا ڈھیر بھی دیکھ لیا تھا۔ النورا پارٹمنٹس کا کمپاؤنڈ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہاں دس بارہ موٹر سائیکلوں کے علاوہ دو تین گاڑیاں پارک کی جاسکتی تھیں۔ اسی کمپاؤنڈ کے ایک کونے میں داخلی دروازے کے قریب عالیہ کا سامان ڈھیر کیا گیا تھا۔ تھرڈ فلور کے تمام رہائشیوں کے بارے میں، میں نے عالیہ سے معلومات حاصل کر رکھی تھیں لہٰذا مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

فلیٹ نمبر تین سو ایک میں ایک ہندو فیملی رہتی تھی لیکن اس وقت مذکورہ فلیٹ بند تھا۔ یہ لوگ کسی تقریب میں شرکت کے لیے حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ فلیٹ نمبر تین سو چار پر بھی تالا پڑا ہوا تھا۔ یہ کسی بٹ صاحب کا فلیٹ تھا جو آج کل پنجاب کے دورے پر نکلے ہوئے تھے۔ باقی بچتے تھے چار فلیٹ۔ تین سو پانچ جہاں ماجد کی رہائش تھی۔ تین سو دو جہاں سے ماجد نے عالیہ کو بے دخل کر کے وہاں اپنی نئی بیوی کے کسی رشتے دار کو آباد کر لیا تھا۔ تین سو تین میں مجاہد علی نامی ایک شخص رہتا تھا جو یونیفارم کے ایک اسٹور پر ملازم تھا جبکہ تین سو چھ میں انیس عباسی رہتے تھے جو ایک ریٹائرڈ افسر

تھے اور آج کل گھر ہی میں آرام کرتے تھے۔ میں نے عباسی کے دروازے کی گھنٹی بجادی۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بچے نے باہر جھانکا۔ اس کے پیچھے کوئی عورت بھی تھی جو میرے اندازے کے مطابق عباسی کی بیوی ہوسکتی تھی۔ اس عورت نے اجنبی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''جی فرمائیے، آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''عالیہ صاحبہ کس گھر میں رہتی ہیں؟'' میں نے شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔

''وہ سامنے تین سو دو میں۔'' اس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ''لیکن......''

وہ کچھ بولتے بولتے رک گئی۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''وہ اب اس فلیٹ میں نہیں ہے۔'' وہ مبہم انداز میں بولی۔ ''اگر آپ نے اس سے ملنا ہے تو بلڈنگ کے باہر سامنے والے گھر میں چلے جائیں۔ وہ آپ کو ڈاکٹر اکرم کے گھر میں ملے گی۔''

''کیا مطلب......'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ گھر انہوں نے کب چھوڑا ہے؟''

''چھوڑا نہیں...... چھڑوا دیا گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''دو روز پہلے اس کا سامان باہر پھینک دیا گیا تھا۔''

عورت کے لہجے میں مجھے عالیہ کے لیے ہمدردی محسوس ہوئی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''کس نے عالیہ کا سامان باہر پھینکا ہے......؟'' پھر میں نے ایسی اداکاری کی جیسے مجھے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ''میں نے گیٹ کے قریب کسی کے سامان کا ڈھیر لگا دیکھا ہے۔''

''جی، وہ عالیہ ہی کا سامان ہے۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ نیک کام عالیہ کے جیٹھ نے کیا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی، آپ کون ہیں اور مجھے آپ سے یہ بات کرنا چاہیے یا نہیں۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔ ''لیکن آپ نے ''خون سفید ہوجانا'' کا محاورہ ضرور سنا ہوگا۔''

وہ خاتون تعلیم یافتہ اور خوش ذوق معلوم ہوتی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کا اشارہ ماجد کے خون سفید ہوجانے کی طرف تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی اور سوال کرتا، فلیٹ کے اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

''شگفتہ! کون ہے دروازے پر؟''

''کوئی صاحب عالیہ سے ملنے آئے ہیں۔'' شگفتہ نے جواب دیا۔

''اس بدنصیب عورت سے ملنے کے لیے اب اس بلڈنگ میں آنا ضروری نہیں۔'' مردانہ آواز نزدیک آتی سنائی دی۔

پھر وہ شخص دروازے پر موجود تھا، گویا میں اس وقت انیس عباسی کے روبرو کھڑا تھا۔ اس ریٹائر افسر کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ بعدازاں مجھے پتا چلا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے کسی محکمے سے ریٹائر ہوا تھا۔ مذکورہ محکمے میں وہ سیکشن آفیسر ہوا کرتا تھا۔

عباسی کو دیکھ کر اس کی بیوی شگفتہ گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ اب عباسی براہِ راست مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''جناب! یہ کیسے ہوگیا۔ عالیہ کو اس گھر سے کیوں بےدخل کردیا گیا؟''

''بھائی صاحب! ان لوگوں کا کوئی گھریلو معاملہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''رضوان تو اب اس دنیا میں نہیں رہا لیکن جب سے ماجد نے دوسری شادی کی ہے، دونوں بھائیوں کی بیویوں میں اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا پھر موقع پا کر ماجد نے بھاوج کا سامان باہر پھنکوادیا۔''

''عباسی صاحب! جب آپ کو پتا ہے کہ ماجد نے اپنی بیوہ بھاوج کے ساتھ ظلم کیا ہے تو آپ نے اس زیادتی پر احتجاج کیوں نہیں کیا؟''

''بھائی صاحب! یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے۔ میں کیسے دخل دے سکتا ہوں۔'' وہ بےبسی سے بولا۔

''حقِ ہمسائیگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے عباسی صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''عالیہ پچھلے نو سال سے اس فلیٹ میں رہ رہی تھی اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ بےقصور بلکہ مظلوم ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ رسان سے بولا۔ ''لیکن مجھے کسی کے گھریلو معاملات میں ٹانگ اڑانے کا کوئی شوق نہیں۔''

اپنی بیوی کی نسبت وہ خاصا روکھا اور اکھڑ مزاج نظر آتا تھا۔ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔

''عباسی صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ عالیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ان لوگوں کا گھریلو معاملہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کھلی غنڈا گردی بھی ہے۔ آپ اپنی خاموشی سے ماجد جیسے غنڈوں کی حوصلہ افزائی کریں گے تو ایک دن آپ بھی

کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ جس وقت عالیہ کی عدم موجودگی میں ماجد اس کے سامان کو باہر پھنکوا رہا تھا، آپ سب پڑوسی باہر نکل آتے اور اس کی اس ظالمانہ کارروائی پر احتجاج کرتے تو اسے اس حرکت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔''

''جناب! آپ کی بات میں وزن تو ہے۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا۔ ''لیکن اس نفسانفسی کے دور میں کون کسی کی پروا کرتا ہے.....''

عباسی جیسے بے حس شخص سے مزید کوئی بات کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا لہٰذا میں واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اسی لمحے فلیٹ نمبر تین سو دو کا دروازہ کھلا اور ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان نے باہر جھانکا۔ یہ وہی فلیٹ تھا جہاں دو روز پہلے تک عالیہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھی لیکن اب یہاں ماجد نے اپنے سسرالی رشتے داروں کو آباد کر دیا تھا۔

اس نوجوان کا حلیہ عجیب سا تھا۔ سانولی رنگت، سیاہ فام افریقی باشندوں کی طرح موٹے موٹے ہونٹ اور چہرے کے نقوش میں تناسب کا فقدان۔ اس کی آنکھوں کے زاویے میں بھی تضاد تھا۔ وہ بیک وقت مشرق و مغرب میں دیکھتا نظر آتا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بڑے بھونڈے انداز میں مسکرایا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔

''آپ آنٹی عالیہ سے ملنے آئے ہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر تم کون ہو...... اور عالیہ کے گھر میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''میرا نام فیض ہے۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''عالیہ آنٹی کی بیٹی سے میری شادی ہونے والی ہے اس لیے ہم یہاں آئے ہیں اور عالیہ آنٹی دوسرے گھر میں چلی گئی ہیں۔ میں اپنی مما کے ساتھ اس فلیٹ میں رہتا ہوں لیکن مما اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ وہ آنٹی جہاں آرا کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہیں......''

وہ سوچے سمجھے بغیر بولتا چلا گیا تھا جس سے مجھے اس کی ذہنی صحت پر شک ہوا۔ اس کے ابنارمل ہونے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں چنداں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ فیض، جہاں آرا کا وہی بھانجا تھا جس کے لیے اس نے عالیہ کی بیٹی مصباح کا رشتہ مانگا تھا۔ عالیہ نے اس رشتے سے انکار کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ پاگل تو شادی ہی کے قابل نہیں تھا۔

''انکل! آپ میری شادی میں آئیں گے نا؟'' فیض نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

مجھے اس کی ذہنی کیفیت پر افسوس ہوا۔ جہاں آرا نے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ مصباح سے اس کی شادی کروا کر ہی دم لے گی۔ میں نے فیض سے پوچھا۔

''کیا عالیہ کی بیٹی تمہیں بہت اچھی لگتی ہے؟''

''جی، بہت اچھی لگتی ہے۔'' وہ چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے مصباح سے محبت ہو گئی ہے۔''

میں نے فیض کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے چلاتے ہوئے زینے کی طرف لے آیا۔ اس کارروائی کے دو مقاصد تھے۔ نمبر ایک، میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری گفتگو سن کر تین سو پانچ میں سے کوئی نکل آئے۔ نمبر دو، زینے کے ساتھ ہی گیلری بنی ہوئی تھی جہاں سے بلڈنگ کا کمپاؤنڈ نظر آتا تھا۔ میں وہاں کھڑے کھڑے کمپاؤنڈ پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ ویسے فیض مجھے بتا چکا تھا کہ جہاں آرا اور اس کی مما شاپنگ کے لیے گئی ہوئی ہیں اور چوکیدار داؤد کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ ماجد اس وقت گھر میں موجود نہیں ہے تاہم فیض کی فراہم کردہ معلومات پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''دیکھو پیارے......!'' میں نے فیض کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''یہ محبت بڑی عجیب چیز ہے۔ اس میں انسان کو مجنوں بننا پڑتا ہے، جنگلوں کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔''

''جی......'' اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ''میں جنگلی بن جاؤں گا۔'' وہ مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں مصباح کی خاطر جنگلوں کی خاک بھی چھانوں گا اور مجنوں بھی بن جاؤں گا۔''

''اور...... اس کام میں انسان کو لات جوتا بھی پڑ سکتا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لوگ بہت بری طرح مارتے ہیں۔''

''میں مصباح کے لیے لوگوں کے جوتے بھی کھا لوں گا۔'' وہ سینہ پھلا کر بڑے عزم سے بولا۔

اسی وقت ایک باوردی پولیس اہلکار بلڈنگ میں داخل ہوا۔ مجھے اسی بندے کا انتظار تھا جبھی میں فیض سے بات کرتے ہوئے گیلری سے مسلسل نیچے جھانک رہا تھا۔

میں نے فیض سے کہا۔ ''اب تم اپنے گھر میں جاؤ۔ جب تک تمہاری مما نہ آ جائیں، تم باہر نہیں نکلو گے۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''جی، میں سمجھ گیا۔'' وہ سر کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''انکل! آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں تمہاری آنٹی عالیہ سے ملنے جا رہا ہوں۔'' میں

نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان سے تمہارے رشتے کی بات جو کرنا ہے۔''

وہ فرطِ جذبات سے ننھے بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگا پھر بڑی امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''انکل! آپ مصباح سے میری شادی کے لیے عالیہ آنٹی کو راضی کرلیں گے نا؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بس سمجھ لو، آج تمہارا کام ہوگیا۔''

وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے فلیٹ کے اندر چلا گیا اور میں جلدی سے بلڈنگ کے کمپاؤنڈ کی جانب بڑھنے لگا۔ فیض ایک ایسا بندہ تھا کہ مصباح کیا، اس کی کسی بھی نارمل لڑکی سے شادی نہیں کی جاسکتی تھی۔

میں نیچے پہنچا تو ایک اے ایس آئی کو چوکیدار داؤد سے بات کرتے دیکھا۔ داؤد اسے کچھ بتا رہا تھا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اے ایس آئی سے کہا۔

''آپ اسٹے آرڈر پر تفتیش کے لیے آئے ہیں نا؟''

اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی بالکل، میں اسی مقصد سے آیا ہوں مگر آپ کون......؟''

''یہ سامان اسی مظلوم عورت کا ہے جو کل اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کی رپورٹ درج کرانے آپ کے تھانے پہنچی تھی۔'' میں نے اے ایس آئی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے گیٹ کے نزدیک رکھے عالیہ کے سامان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے جیٹھ ماجد نے عالیہ کی عدم موجودگی میں اس کے سامان کو یہاں رکھ کر فلیٹ پر تالا لگا دیا تھا اور اگلے دن مذکورہ فلیٹ میں ایک فیملی کو آباد بھی کردیا ہے۔''

''لیکن ہمیں تو یہ بتایا گیا ہے کہ عالیہ نے زبردستی ماجد کے فلیٹ پر قبضہ کر رکھا تھا۔'' اے ایس آئی نے الجھن زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

''آپ کو سراسر غلط بتایا گیا ہے۔'' میں نے تفتیشی افسر کے دل میں عالیہ کے لیے ہمدردی کا گوشہ وا کرنے کی غرض سے کہا۔ ''ماجد بہت ہی ٹیڑھا شخص ہے اور دو ماہ پہلے اس نے ایک چالباز عورت سے شادی کرلی ہے اور یہی عورت اصل فساد کا سبب ہے۔ اسی کے کہنے پر ماجد نے اپنی بھاوج کو بے گھر کردیا ہے اور رانٹ کا شنٹ درخواست میں بھر کر عدالت سے اسٹے آرڈر لے لیا ہے۔ دراصل یہ خالصتاً گھریلو معاملہ ہے جو ایک رشتے کے انکار سے شروع ہوا ہے۔''

''رشتے سے انکار؟'' اے ایس آئی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''ماجد کی بیوی یعنی دوسری بیوی جہاں آرا کا ایک خبط الحواس بونگا سا بھانجا ہے۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں آرا اپنے اس بھانجے کی شادی عالیہ کی اکلوتی بیٹی مصباح سے کرنا چاہتی ہے۔ مصباح، جہاں آرا کے بھانجے سے عمر میں بہت کم ہے۔ وہ ایک خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ بھانجے صاحب کسی بھی طور مصباح کے قابل نہیں ہیں لہٰذا اس نے اس رشتے سے صاف انکار کردیا جس پر جہاں آرا عالیہ کی دشمن ہوگئی اور اس نے ماجد کو مجبور کردیا کہ وہ عالیہ کو اس فلیٹ سے بے دخل کردے حالانکہ اس رشتے کی بات چلنے سے پہلے تک ہر طرف امن وامان تھا اور ماجد کو اپنی بھاوج سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں تھی اور اب.....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور اب عالیہ کا سامان آپ کے سامنے پڑا ہے اور وہ دونوں ماں بیٹی ایک خدا ترس پڑوسی ڈاکٹر اکرم کے گھر میں پناہ گزین ہیں۔ اگر آپ جہاں آرا کے بھانجے سے شرفِ ملاقات کی خواہش رکھتے ہوں تو اوپر فلیٹ نمبر تین سو دو میں تشریف لے جاسکتے ہیں۔ وہ مضحکہ خیز بندہ ادھر ہی موجود ہے۔''

''وہ وہاں کیا کررہا ہے؟'' اے ایس آئی نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تین سو دو نمبر فلیٹ تو وہی ہے جس کے لیے کورٹ سے اسٹے آرڈر حاصل کیا گیا تھا۔''

''جی، یہ بالکل وہی فلیٹ ہے؟'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اب آپ ماجد اور جہاں آرا کی عیاری کو خود ہی ملاحظہ کرلیں۔ ایک طرف ان لوگوں نے عالیہ کو دربدر کرکے کورٹ سے اسٹے آرڈر لیا اور دوسری جانب جہاں آرا نے اپنے بھانجے اور بہن کو اسی متنازع فلیٹ کے اندر آباد کردیا ہے۔''

''آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا۔'' وہ میری بیان کردہ تفصیل سے متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے، آپ بھی اسی بلڈنگ میں رہتے ہیں جو ان لوگوں کے حالات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔''

اسی وقت عالیہ بلڈنگ میں داخل ہوئی اور میں ایک بار پھر اے ایس آئی کے سوال کا جواب دینے سے بچ گیا۔

میں نے عالیہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''لیں، وہ مظلوم عورت بھی آ گئی۔ باقی کی باتیں آپ اسی سے پوچھ لیں انسپکٹر صاحب!''

عالیہ نے آتے ہی (میری ہدایات کے مطابق) اپنے سامان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے رونا دھونا شروع کر دیا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے اے ایس آئی کو نہ دیکھا ہو۔ اس وقت مصباح بھی عالیہ کے ساتھ تھی۔ میں نے اے ایس آئی کے کان میں کہا۔

''آپ عالیہ کی بیٹی مصباح کو بھی دیکھ لیں انسپکٹر صاحب اور اوپر جا کر اس ابنارمل بھانجے کا بھی جائزہ لے لیجیے گا۔ پھر آپ کے ضمیر کی جو آواز ہو، اس کے مطابق رپورٹ لکھ کر اپنا فرض پورا کر لیجیے گا۔''

اے ایس آئی نے اثبات میں گردن ہلائی اور عالیہ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''بی بی! تمہارا نام عالیہ ہے؟''

''جی انسپکٹر صاحب!'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''میں ہی وہ بدنصیب عورت ہوں جسے میرے جیٹھ نے گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔ ہم ماں بیٹی اوپر فلیٹ نمبر تین سو دو میں رہتی تھیں۔ ایک رات ہم دونوں ایک شادی میں گئی ہوئی تھیں کہ ماجد نے ہمارے فلیٹ کا تالا توڑا اور ہمارا سامان اٹھوا کر یہاں پھنکوا دیا۔''

''مگر تمہارے خلاف ماجد نے یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ تم نے زبردستی اس کے فلیٹ پر قبضہ کر رکھا ہے۔'' اے ایس آئی نے عالیہ سے کہا۔

''ماجد جھوٹ بولتا ہے انسپکٹر صاحب۔'' وہ فریادی لہجے میں بولی۔ ''ہم لوگ نو سال سے اس فلیٹ میں رہ رہے۔ ایک سال پہلے میرے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹی کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔''

''انسپکٹر صاحب!'' میں نے عالیہ کی حمایت میں کہا۔ ''آپ ماشاء اللہ قانون کے رکھوالے ہیں لہٰذا قانون کی پیچیدگیوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اگر ایک لمحے کے لیے ماجد کی بات کو درست بھی مان لیا جائے کہ عالیہ نے زبردستی اس کے فلیٹ پر قبضہ کر رکھا ہے تو اس فلیٹ کو واگزار کرانا عدالت کا کام ہے۔ عدالت ماجد کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ بہ زورِ بازو کسی کے بند گھر کا تالا توڑ کر اس کا سامان باہر پھنکوا دے اور گھر پر اپنا تالا ڈال دے پھر جب کورٹ نے اسٹے آرڈر دے دیا تھا تو آپ کی تفتیش مکمل ہونے سے پہلے اس گھر کو بند ہی رہنا چاہیے تھا جبکہ ماجد تو اپنی بیوی کا بے دام کا غلام بنا ہوا ہے کہ اگلے ہی روز اس نے مذکورہ متنازع فلیٹ میں اپنی سالی اور اس کے ابنارمل بیٹے کو آباد بھی کر دیا ہے۔''

اسی لمحے ماجد بہ نفسِ نفیس بلڈنگ میں داخل ہوا۔ عالیہ اور مصباح پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ ''تم دونوں یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہیں وارننگ دی تھی نا، اب اس بلڈنگ میں قدم بھی نہیں رکھنا اور.....'' اس نے عالیہ کے سامان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ابھی تک اپنا کاٹھ کباڑ نہیں اٹھایا؟'' ایک لمحہ رک کر اس نے گہری سانس لی پھر چوکیدار داؤد سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''لالہ! اگر شام تک اس عورت نے اپنا سامان نہیں اٹھایا تو تم اس کے سامان کو بلڈنگ سے باہر نکلوا دینا۔''

ماجد کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ چہرے ہی سے کمینہ اور کینہ پرور دکھائی دیتا تھا۔ میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ عالیہ کو ڈانٹ پھٹکار کرنے کے بعد وہ اے ایس آئی کی جانب متوجہ ہوا۔

''انسپکٹر صاحب! میرا نام ماجد ہے اور میں ہی فلیٹ نمبر تین سو دو کا مالک ہوں۔ اپنے فلیٹ پر قبضے کی رپورٹ میں نے ہی درج کرائی تھی۔ میں آپ کے انچارج صاحب کو ساری بات سمجھا چکا ہوں......''

ماجد نے واضح طور پر اشارہ دیا تھا کہ اس نے انچارج صاحب کی ''مٹھی'' ٹھیک ٹھاک گرم کر رکھی ہے لہٰذا وہ رسمی سی کارروائی کر کے واپس لوٹ جائے لیکن میں نے ماجد کی آمد سے پہلے اے ایس آئی کی ایسی برین واشنگ کر دی تھی کہ وہ اپنا ایک ذہن بنا چکا تھا۔

''جناب! آپ ذرا اطمینان سے ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔'' اے ایس آئی نے ماجد سے کہا۔ ''میں تفتیش کرنے آیا ہوں تو مجھے میرا کام کرنے دیں۔ یہ بتائیں کہ عالیہ اور مصباح آپ کی کیا لگتی ہیں؟''

''ان کو گولی ماریں جناب۔'' ماجد برہمی سے بولا۔ ''چلیں اوپر چل کر بیٹھتے ہیں پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' انسپکٹر نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے ان ماں بیٹی کو قتل کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ نہ بابا، میں انہیں گولی نہیں مار سکتا اور جہاں تک اوپر جانے کا تعلق ہے......'' وہ معنی خیز انداز میں رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو میں ضرور جاؤں گا۔ مجھے آپ کی سالی کے بیٹے سے ملاقات کرنا ہے۔ میں نے سنا ہے، وہ بڑا ذہین اور باکمال لڑکا ہے۔''

ماجد شک بھری نظر سے انسپکٹر کو تکنے لگا۔ اس کائیاں شخص کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی کہ یہ تفتیشی افسر یہاں کے معاملات کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہے۔ وہ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''شاید انچارج صاحب نے آپ کو میرے بارے میں نہیں بتایا۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے اچھی طرح آگاہ کردیا تھا۔'' پھر وہ عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے بولا۔

''میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا نا مگر تم کو ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ چلو، جاؤ یہاں سے۔''

''ماجد بھائی! ذرا سوچ سمجھ کر بات کریں۔'' عالیہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اگر آپ کا احترام کرتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ہمیں اپنی زرخرید کنیزیں سمجھنے لگیں۔ گھر سے تو آپ نے ہمیں نکال ہی دیا ہے۔ اب اور کیا چاہتے ہیں؟'' پھر وہ تفتیشی افسر کی طرف دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں بولی۔

''انسپکٹر صاحب! آپ ان کے تیور دیکھ رہے ہیں نا۔ ان کا بس چلے تو یہ ہمارا گلا گھونٹ دیں۔ میں تو بہت بری ہوں، غیر ہوں مگر مصباح تو ان کے سگے چھوٹے بھائی کا خون ہے نا...... '' وہ آب دیدہ ہوگئی۔ ''آج انہیں رشتہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ انہوں نے ابھی تک آپ کے سوال کا جواب نہیں دیا کہ...... میں اور میری بیٹی ان کی کیا لگتی ہیں......''

اسی دوران میں ڈاکٹر اکرم بھی وہاں پہنچ گیا۔ ماجد نے ڈاکٹر اکرم کی جانب ناپسندیدہ نظر سے دیکھا پھر وہ عالیہ سے بولا۔

''جاؤ، اپنا راستہ ناپو۔ تمہاری فضول بکواس سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میرا تم لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ شرافت سے اپنا سامان اٹھالو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' پھر وہ اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ اس عورت کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ مجھے تو لگتا ہے، اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔''

''ماجد صاحب! یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے۔'' اے ایس آئی نے کھرا سا جواب دیا۔ ''میرا آپ کے معاملات میں دخل دینا مناسب نہیں ہوگا۔''

''لیکن میں ضرور اس معاملے میں دخل دوں گا۔'' ڈاکٹر اکرم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ایک محلے دار ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ آپ کو حقیقت سے آگاہ کروں۔''

''آپ کون ہیں؟'' اے ایس آئی نے اکرم سے سوال کیا۔

''میرا نام ڈاکٹر اکرم ہے اور میں سامنے والے گھر میں رہتا ہوں۔'' اکرم نے اپنے مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''اور یہ ماں بیٹی اپنے فلیٹ سے بے دخل ہونے کے بعد میرے ہی گھر میں پناہ گزیں ہیں۔''

اے ایس آئی ڈاکٹر اکرم کی بات سے خاصا متاثر نظر آیا۔ اس نے سوال کیا۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ ان ماں بیٹی کو اچھی طرح جانتے ہیں؟''

''جی بالکل جانتا ہوں۔'' اکرم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''عالیہ، ماجد کی بھابی ہیں اور مصباح ماجد کی بھتیجی ہیں اور یہ لوگ پچھلے نو سال سے فلیٹ نمبر تین سو دو میں رہ رہے ہیں۔ ایک سال پہلے عالیہ کے شوہر یعنی ماجد کے چھوٹے بھائی رضوان کا انتقال ہوگیا تھا۔''

''جب یہ لوگ امن وسکون سے اس فلیٹ میں رہ رہے تھے تو پھر اچانک یہ فساد کیوں برپا ہوگیا؟'' اے ایس آئی نے ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اکرم سے سوال کیا۔

''یہ فساد زیادہ پرانا نہیں ہے انسپکٹر صاحب۔'' اکرم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس فتنے کی عمر زیادہ سے زیادہ دو ماہ ہے...... جب سے ماجد نے نئی شادی کی ہے۔''

انسپکٹر کی آنکھوں میں ایک چمک سی نمودار ہوئی۔ اکرم سے پہلے میں اسے یہ ساری کہانی سنا چکا تھا۔ اکرم کی بات نے میرے بیان پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی۔

ماجد نے گھور کر ڈاکٹر اکرم کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ آپ اچھا نہیں کررہے ہو ڈاکٹر صاحب۔ میں نے کبھی آپ کے گھریلو معاملات میں جھانکنے کی کوشش کی ہے؟''

''میرے گھر میں ایسا کوئی فتنہ ہے بھی نہیں کہ محلے والوں کو اس قسم کی مداخلت کی بھی زحمت کرنا پڑے۔'' ڈاکٹر اکرم نے ناگواری سے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا بھائی رضوان بہت شریف آدمی تھا۔ وہ آج اس دنیا میں نہیں ہے اور تم اس کی بیٹی مصباح کو ایک پاگل شخص کے پلّے باندھنے کا سوچ رہے ہو اور وہ بھی اپنی نئی نویلی چہیتی بیوی کے ایما پر۔ لگتا ہے، تمہارا خون سفید ہوگیا ہے۔'' غصے کی شدت کے باعث اکرم ''آپ'' سے ''تم'' پر

آ گیا تھا۔ ''میں نے تم جیسا بے غیرت انسان اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا جسے اپنی سگی بھتیجی کی عزت کا بھی کوئی خیال نہیں ہے۔''

''آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں انسپکٹر صاحب۔'' ماجد اے ایس آئی کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔''

اسی لمحے جہاں آرا اور اس کی بڑی بہن شبانہ یعنی فیض کی مما بلڈنگ میں داخل ہوئیں۔ عالیہ نے جہاں آرا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گہری چوٹ کی۔

''انسپکٹر صاحب..... آ گئی ہیں اس فساد کی جڑ۔''

جہاں آرا کی عمر تیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ کوئی حسین و جمیل عورت تو نہیں تھی تاہم اس کے سراپا میں مخصوص قسم کی کشش پائی جاتی تھی جو صنفِ مخالف کو فوراً اپنی جانب کھینچتی تھی۔ اگر ماجد تیکھے نقوش والی جہاں آرا پر فریفتہ تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔

''ماجد! یہ کیا ہو رہا ہے۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ''یہ عورت ابھی تک یہاں کیوں نظر آ رہی ہے؟''

''یہ بلڈنگ تمہارے باپ کی ملکیت نہیں ہے۔'' عالیہ نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم اپنی اوقات میں رہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

جہاں آرا، عالیہ کی جانب سے ایسے جارحانہ رویے کی توقع نہیں کر رہی تھی لہٰذا وہ بھی تھے سے اکھڑ گئی۔ دونوں نے خوب ایک دوسرے کو سنائیں۔ وہاں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ تماشائیوں کی تعداد میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جہاں آرا کے منہ سے جوشِ جذبات میں بعض ایسی باتیں بھی نکل رہی تھیں جو بعد ازاں عدالت میں اس کے خلاف استعمال ہو سکتی تھیں۔

ماجد اپنی بھڑکی ہوئی بیگم کو اوپر بھیجنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم اوپر جاؤ، میں ہوں نا یہاں بات کرنے کے لیے۔''

''تم کیا بات کرو گے۔'' جہاں آرا ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''یہ بڑی مکار اور چالباز عورت ہے۔ اس سے نمٹنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ تم نے بھی مفت میں کسی کے بیوی بچے پالنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ جب تک تمہارے دل سے ان احسان فراموشوں کی محبت نہیں نکلے گی، تم ڈھنگ کی کوئی بات نہیں سوچ سکو گے۔ اگر تمہارے بھائی اور بھاوج کی کھوپڑی میں مغز نام کی کوئی چیز ہوتی تو یہ لوگ کب کے اپنا گھر بنا چکے ہوتے لیکن وہی بات ہے نا...... جب منہ کو مفت کی لگ جائے تو پھر کوشش کرنے کو کس کا دل چاہے گا۔''

''بس کر لی بکواس۔'' عالیہ نے تنتناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب اگر تمہاری زبان سے میرے اور میری بچی کے بارے میں ایک لفظ بھی نکلا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی اور سنو......'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں بولی۔

''یہ تم نے مفت خوری کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ کچھ تو شرم کرو۔ اتنا جھوٹ بولتے ہوئے تمہاری زبان میں کیڑے کیوں نہیں پڑ گئے۔ ایک دن تمہیں اللہ کو جان دینا ہے...... دینا ہے یا نہیں......؟ ہم ایک دن بھی اس فلیٹ میں مفت میں نہیں رہے۔''

''تو کیا تم فلیٹ کا کرایہ دیتی رہی ہو یا یہ فلیٹ تم جہیز میں لے کر آئی تھیں؟'' جہاں آرا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جب نو سال پہلے یہ فلیٹ خریدا گیا تو اس میں میرے شوہر نے بھی رقم ڈالی تھی۔'' عالیہ نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔ ''اور پچھلے دو سال سے ہم ماجد کا تمام خرچہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ تین وقت کا کھانا ہمارے گھر پر کھاتے ہیں۔ مجال ہے جو ہم نے کبھی ان سے ایک روپیہ بھی لیا ہو۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' ماجد نے نفرت انگیز نظر سے عالیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری یہ بکواس پہلے بھی کئی بار سن چکا ہوں۔ میرا دماغ پک گیا ہے۔''

''تو اس میں غلط کیا ہے ماجد بھائی۔'' عالیہ نے اس کے غصے کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی پہلی بیوی صفیہ کا انتقال دو سال پہلے ہوا تھا۔ اس کے بعد آپ کے گھر میں ایک دن بھی چولہا نہیں جلا۔ آپ تین وقت کا کھانا ہمارے گھر میں کھاتے رہے ہیں اور خرچے کے نام پر ہم نے آپ سے کبھی ایک پیسا بھی وصول نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں ماں بیٹی آپ کی ہر خدمت میں لگی رہی ہیں۔ قسم کھا کر بتائیں، میں نے کیا غلط کہا ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے دوبارہ رکی پھر غضب ناک لہجے میں بولی۔

''ماجد بھائی! جب سے آپ کو یہ کٹنی ملی ہے، سب کچھ بدل کر رہ گیا ہے۔'' اس کا اشارہ جہاں آرا کی طرف تھا۔ ''آپ نے جس طرح دھوکے سے ہمارے فلیٹ پر قبضہ کیا ہے نا، اس کا بدلہ قدرت آپ سے ضرور لے گی۔ دیکھ لیجیے گا، آپ کو ہماری بددعائیں ضرور لگیں گی۔ اللہ ہمارے ساتھ انصاف کرے گا۔''

''دیکھو عالیہ!'' ماجد نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''اگر

تمہیں انصاف اور حساب کا اتنا ہی شوق ہے نا تو پھر مکان کے کرائے کا بھی حساب ہوگا۔ تم لوگ پچھلے نو سال سے کرایہ ادا کیے بغیر میرے فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ علاوہ ازیں ان چیزوں کا بھی حساب ہوگا جو ان نو سالوں میں وقتاً فوقتاً میں تمہارے اور تمہاری بیٹی کے لیے لاتا رہا ہوں۔ اس حساب کتاب میں تو میرا ہی پیسا تمہاری طرف نکلے گا اس لیے بہتر ہے کہ اپنا سامان اٹھاؤ اور چلتی پھرتی نظر آؤ اور...... آئندہ کے لیے بھی اپنی زبان پر خاموشی کا تالا ڈال لو۔"

"میں خاموش نہیں رہوں گی۔" عالیہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "حق سچ بات کہنے پر اگر میری زندگی بھی چلی جائے تو مجھے پروا نہیں ہوگی۔"

"تو اپنا خون ہمارے ہاتھوں پر کیوں مل رہی ہو۔" جہاں آرا نے حقارت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر تمہیں انصاف کی اتنی ہی طلب محسوس ہو رہی ہے تو جا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ...... تمہارے پاؤں میں کوئی مہندی تو نہیں لگی ہوئی۔"

"نہ تو عالیہ کے پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے اور نہ ہی یہ گونگی ہے۔" میں نے اچانک ان دونوں کی منہ ماری میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ انصاف کے حصول کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا چکی ہے۔"

سب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ سب سے زیادہ حیرت ماجد کی نظر میں تھی۔ اس نے اضطراری لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"آپ کی تعریف؟"

"مجھے مرزا امجد بیگ کہتے ہیں، ایڈووکیٹ مرزا امجد بیگ۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ "میں نے عالیہ کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ باقی باتیں عدالت میں ہوں گی۔"

"آپ وہی وکیل صاحب ہیں جنہوں نے کل ہمارے انچارج صاحب کو فون کیا تھا؟" اے ایس آئی نے تصدیق طلب نظر سے میری جانب دیکھا۔

"جی، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے انسپکٹر صاحب۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "جس وقت میں نے کل آپ کے انچارج صاحب کو فون کیا، عالیہ میرے آفس میں بیٹھی ہوئی تھی، جبھی مجھے پتا چلا تھا کہ آج چار بجے آپ کے تھانے سے کوئی پولیس اہلکار یہاں تفتیش کرنے آئے گا لہٰذا میں پولیس کے استقبال کے لیے پہلے سے یہاں موجود تھا۔"

"اوہ......!" تفتیشی افسر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"آپ میری بات سنیں آفیسر۔" ماجد نے ایک مرتبہ پھر اے ایس آئی کو رام کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اصل کہانی کیا ہے۔"

"اصل کہانی میری سمجھ میں آچکی ہے بڑے صاحب۔" اے ایس آئی نے سخت لہجے میں کہا۔ "اب بہتر یہی ہوگا کہ آپ میرے تفتیشی کام میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔"

ماجد اگرچہ پولیس والوں کی مٹھی گرم کر چکا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ عالیہ اور مصباح کے لیے اے ایس آئی کے دل میں ہمدردی کے جذبات جاگ چکے تھے لہٰذا اس نے ماجد اور جہاں آرا کی ایک نہ سنی اور اپنی تفتیش کا عمل جاری رکھتے ہوئے بعض لوگوں کے بیانات بھی قلم بند کیے اور اپنا کام مکمل کر کے وہاں سے رخصت ہوگیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے اتنا بتا دوں کہ اے ایس آئی نے جو رپورٹ تیار کی تھی، وہ ستر فیصد عالیہ کے حق میں اور تیس فیصد ماجد کے حق میں جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بھی معقول لوگ پائے جاتے ہیں جو رشوت کے دباؤ کو نظرانداز کر کے انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہیں جیسا کہ اس تفتیشی افسر نے کیا تھا۔

☆☆☆

آئندہ دو روز میں، میں نے کیس تیار کیا اور عالیہ کی جانب سے جوابِ دعویٰ عدالت میں داخل کر دیا۔ جب عدالت کی جانب سے ماجد کو میری کارروائی کی اطلاع موصول ہوئی تو وہ گھبرا گیا۔ وہ تو اسٹے آرڈر حاصل کرنے کے بعد مطمئن ہوگیا تھا کہ اب عالیہ کسی بھی قیمت پر اس فلیٹ میں واپس نہیں آسکے گی۔ اس تازہ ترین صورتِ حال نے ان میاں بیوی کے چھکے چھڑا دیے لہٰذا اس سے اگلے روز وہ دونوں میرے آفس میں بیٹھے تھے۔

میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں ان کا مخالف وکیل ہوں۔ میں نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور پوچھا۔ "میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وکیل صاحب! میری بھاوج کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" ماجد نے بیزاری سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے سمجھائیں کہ مقدمے بازی میں کچھ نہیں رکھا۔ جو معاملہ افہام و تفہیم سے حل ہو جائے اس کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کمینے کی ذلالت پر مجھے ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ کم ظرف لوگوں کی طرف سے انسان کو ہر وقت گھٹیا پن کی توقع رکھنا چاہیے۔ ماجد کے ''زرّیں خیالات'' کو بہ دقت تمام ہضم کرنے کے بعد میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''ماجد صاحب! اس عمل کی شروعات آپ کی طرف سے ہوئی تھی۔ مقدمے بازی کا خیال پہلے آپ کے ذہن میں پیدا ہوا تھا اور عدالت کا دروازہ بھی پہلے آپ ہی نے کھٹکھٹایا تھا لیکن میں آپ کی اس بات سے صد فیصد متفق ہوں کہ اگر کوئی معاملہ عدالت سے باہر طے کیا جاسکتا ہو تو اس کے لیے کورٹ کچہری کے چکر میں پڑنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔''

اس نے اطمینان بھری نظر سے میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ عالیہ کو سمجھا سکتے ہیں؟''

''بالکل سمجھا سکتا ہوں۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے پتا چلنا چاہیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور ایک بات کی میں وضاحت کردوں کہ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں فیس لیے بغیر کسی کی بات سنتا ہوں اور نہ ہی کسی کے کیس کی ہامی بھرتا ہوں۔''

''فیس کی آپ فکر نہ کریں وکیل صاحب۔'' جہاں آرا بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ''فیس ہم آپ کو پوری دیں گے بلکہ کچھ زیادہ ہی دیں گے لیکن ہمارا کام ہوجانا چاہیے۔''

جہاں آرا کے انداز میں خاصی بے باکی پائی جاتی تھی۔ وہ یک ٹک ایسی نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی شکاری، شکار کرنے سے پہلے اپنے شکار کو نگاہ ہی نگاہ میں تولتا ہے۔

''اب آپ کام کی وضاحت بھی کردیں۔'' میں نے جہاں آرا کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! عالیہ نے معمولی سی بات کو بہت بڑھا دیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جس کی وجہ سے ماجد ناراض ہوگئے اور عالیہ کو یہ دن دیکھنا پڑا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں تو مصالحت کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔''

''اگر میرے تعاون سے آپ لوگوں کا کوئی مسئلہ حل ہوسکتا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔'' میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں اس کے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھ چکا ہوں۔ ''بتائیں، آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتی ہیں اور یہ بھی ضرور بتائیں کہ وہ معمولی سی بات کیا ہے جس کی وجہ سے ماجد صاحب اس قدر برہم ہوئے کہ عالیہ کی عدم موجودگی میں انہوں نے اس کا سامان باہر پھنکوا کر فلیٹ پر اپنا تالا ڈال دیا؟''

''میں بتاتا ہوں وکیل صاحب۔'' ماجد نے بڑی رسان سے کہا۔ ان لحات میں اس کے لہجے کی فرعونیت کہیں گھاس چرنے گئی ہوئی تھی۔ ''جہاں آرا نے اپنے بھانجے کے لیے مصباح کا رشتہ مانگا تھا لیکن عالیہ نے بڑے برے انداز میں اس رشتے کو ٹھکرا دیا۔ یہی نہیں، اس نے جہاں آرا کو بہت گالیاں بھی دی ہیں۔ بس اسی بات پر مجھے طیش آگیا۔ عالیہ کی احسان فراموشی دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا تھا۔''

''اگر عالیہ اپنی بیٹی کا رشتہ میرے بھانجے کو دینے کے لیے تیار ہوجائے تو ماجد اسے دوبارہ فلیٹ میں رہنے کی اجازت دے سکتا ہے۔'' جہاں آرا نے مطلب کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''اور اس نیک کام کے لیے آپ عالیہ کو راضی کرسکتے ہیں۔''

''واقعی، یہ تو بہت معمولی سی بات ہے۔'' میں نے جہاں آرا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ عالیہ ایسی بے وقوف عورت ہے۔ آج کل تو لوگ اپنی بیٹیوں کے رشتوں کے لیے سخت پریشان ہیں اور اس کو دیکھو، گھر آئے ہوئے رشتے کو لات ماردی۔''

''مجھے خوشی ہے کہ آپ ہمارے مسئلے کو سمجھ گئے ہیں۔'' جہاں آرا نے ایک ادا سے کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ آپ عالیہ کو بھی سمجھانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔''

''جی، آپ مجھے ایک دن کی مہلت دے دیں۔'' میں نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آج کسی وقت عالیہ سے بات کرتا ہوں اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''آپ نے یہ کام کرنا ہے۔'' وہ اس طرح زور دیتے ہوئے بولی جیسے دھانسو قسم کی بیویاں اپنے دبو شوہروں سے بات کرتی ہیں۔

''ویسے آپ کا بھانجا تو ٹھیک ٹھاک ہے نا۔'' میں نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی کام وام تو کرتا ہے نا؟''

''ماشاء اللہ فیض تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ''اس کے پاس سرکاری ملازمت ہے۔''

اگر میں فیض سے مل نہ چکا ہوتا تو شاید جہاں آرا کی بات کا یقین کرلیتا لیکن میں نے یہی ظاہر کیا جیسے میں اس کے بیان پر ایمان لے آیا ہوں۔ اس روز میں نے فیض سے جو ملاقات کی تھی اس کا علم ان میاں بیوی کو نہیں تھا البتہ یہ بات میرے لیے کسی انکشاف سے کم نہیں تھی کہ فیض کے

پاس کوئی سرکاری ملازمت بھی تھی۔ اسی لمحے میں نے اس سرکاری ملازمت کی چھان بین کا بھی فیصلہ کرلیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں کا ارادہ نیک ہے لہٰذا میں آپ سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کل کسی وقت فون کرلیجیے گا۔''

انہوں نے یہی سمجھا کہ میں ان کی اسکیم سے متاثر ہوگیا ہوں۔ میں نے بھی ان کی خوش فہمی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی اور وہ میری فیس ادا کرنے کے بعد رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر اکرم کو فون کرکے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ نے فیض کو دیکھا ہے۔ یقیناً آپ یہ نہیں چاہیں گے کہ مصباح کی شادی اس بندے سے ہو۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''یہ سب میں ماجد اینڈ کمپنی کو گھیرنے کے لیے کررہا ہوں۔ سمجھ لیں کہ یہ ایک اسٹیج ڈراما ہے جو ''خود اپنے دام میں صیاد آگیا'' کی صورتِ حال پر ختم ہوگا۔ ماجد جیسے کمینے شخص کو جکڑنے کے لیے یہ ڈرامار چانے کی اشد ضرورت ہے۔ آپ کل چار بجے عالیہ کو میرے دفتر بھیج دیں اور اس سے کہہ دیں کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی باتیں جب وہ میرے پاس آئے گی تو میں خود اسے سمجھادوں گا۔''

ڈاکٹر اکرم نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔ ''آپ بے فکر ہوجائیں اب بیگ صاحب۔''

''اور وہ جہاں آرا والا مشن کیسا چل رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس پر کام جاری ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''انشاء اللہ! بہت جلد میں آپ کو کوئی خوش خبری سناؤں گا۔''

''انشااللہ......!'' یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ موقوف کردیا۔

اگلی صبح میں عدالت جانے کے لیے گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ جہاں آرا کا فون آگیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ نے میرے کام کا کیا کیا؟''

وہ ''ہمارے کام'' کے بجائے ''میرے کام'' کے الفاظ استعمال کررہی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ماجد نے اس کیس کی ڈرائیونگ سیٹ پر اپنی بیوی کو بٹھادیا تھا۔

''میری عالیہ سے بات ہوگئی ہے۔'' میں نے اسے خوش فہمی میں مبتلا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہتی ہے وہ؟'' جہاں آرا نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''وہ اس رشتے کے لیے تیار تو ہے مگر اس نے ایک شرط عائد کردی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''کیسی شرط؟'' جہاں آرا نے پوچھا۔

''وہ کہتی ہے، پہلے اسے فلیٹ میں رہنے کی اجازت دی جائے پھر وہ مصباح کا رشتہ دینے کے لیے تیار ہوجائے گی۔'' میں نے بتایا۔

''یہی شرط تو ہماری طرف سے بھی ہے۔'' وہ بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''پہلے وہ رشتے کی بات پکی کرے، اس کے بعد ماجد اسے فلیٹ میں آنے کی اجازت دے گا۔''

''اگر آپ دونوں اپنی اپنی شرط پر یعنی اپنی اپنی ضد پر قائم رہے تو پھر یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی۔'' میں نے گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''پھر آپ کا کیا مشورہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، اگر دونوں جانب سے تھوڑی لچک کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ معاملہ بحسن وخوبی نمٹایا جاسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیسی لچک بیگ صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ لوگ آج ساڑھے چار بجے میرے دفتر آجائیں۔'' میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔ ''میں دونوں پارٹیوں کے بیچ تحریری معاہدہ کروا دیتا ہوں۔ ایک محدود مدت طے کرکے اس مسئلے کو حل کرلیتے ہیں۔ اس مدت کے اندر ماجد عالیہ کو واپس اسی فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کی اجازت دینے کا پابند ہوگا اور عالیہ بھی اسی مدت کے اندر مصباح کا رشتہ فیض کو دینے کی پابند ہوگی۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں فون پر آپ کو تفصیل نہیں بتاسکتا۔ میں وہ معاہدہ تیار کروالیتا ہوں۔ آپ ساڑھے چار بجے میرے دفتر آجائیں۔ باقی باتیں یہیں پر کریں گے۔''

''مطلب، آپ کو یقین ہے کہ معاہدے والا یہ فارمولا کامیاب رہے گا؟'' اس نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''ہنڈریڈ اینڈ ون پرسنٹ!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آپ نے وہ محاورہ تو سن ہی رکھا ہوگا کہ...... لکھتم میں دم ہے۔''

''جی سن رکھا ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔ ''یعنی جو چیز لکھ لی جائے وہ زیادہ مستند ہو جاتی ہے۔''

''بالکل درست!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اور یہ تحریر اسٹیمپ پیپر پر ہوگی اور اس پر نوٹری پبلک کی مہر بھی ثبت ہوگی یعنی لکھتم میں بہت زیادہ دم ہوگا۔''

''بہت خوب!'' وہ ستائشی لہجے میں بولی۔ ''آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا ہے۔ اب میں یہی سمجھوں گی کہ آپ عالیہ کے نہیں، میرے وکیل ہیں۔''

میں نے اس کی خوش فہمی کے غبارے میں ہوا بھرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔ ''جی بالکل۔ میں آپ ہی کا ہوں۔''

''آپ بہت اسمارٹ ہیں وکیل صاحب۔'' وہ قربان ہو جانے والے انداز میں بولی پھر پوچھا۔ ''کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟''

''میں ابھی تک اس نعمت سے محروم ہوں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں ذرا اس کھٹ راگ سے نمٹ جاؤں، پھر آپ کے لیے کچھ کرتی ہوں۔''

میں نے اس سے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ میرے لیے کیا کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اگر میں اس موضوع کو چھیڑ دیتا تو پتا نہیں، وہ کہاں سے کہاں نکل جاتی اور مجھے اس وقت صرف گھر سے نکل کر عدالت کی طرف جانا تھا لہٰذا اختتامی کلمات کے بعد میں نے جہاں آرا، کہاں آرا، یہاں آرا اینڈ وہاں آرا کو خدا حافظ کہہ دیا۔

ٹھیک چار بجے عالیہ میرے دفتر میں موجود تھی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اکرم نے یقیناً اسے بہت کچھ سمجھا کر بھیجا ہوگا لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس کا الجھنا لازمی سی بات تھی۔

''بیگ صاحب! یہ لوگ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے چال باز اور مکار لوگ ہیں۔'' عالیہ نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

''کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ آپ بالکل مطمئن ہو جائیں۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں ان سے زیادہ چال باز ہوں۔ آپ بس دیکھتی جائیں۔ ایسی قانون کی مار ماروں گا کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یہ بات طے ہے کہ میں مصباح کی شادی کسی بھی قیمت پر فیض سے نہیں کروں گی۔ اگر میں نے رشتے والی یہ بات ماننا ہوتی تو پھر مجھے یوں دربدر ہونے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ہم ہرگز یہ شادی نہیں کرانے جا رہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''یہ ایک سوچا سمجھا ڈراما ہے۔ فریبی کو فریب ہی سے مارا جا سکتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا...... لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے۔''

''جی سنا ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن میں بہت کمزور عورت ہوں۔ آپ ہی لوہا بن کر ان کے لوہے کو کاٹیے گا۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''میں آپ کا وکیل ہوں۔ ہر محاذ پر آپ کی جنگ لڑوں گا اور فتح بھی ہماری ہی ہوگی...... انشاء اللہ!''

''انشاء اللہ......!'' وہ تہ دل سے بولی۔

میں عالیہ کو مختلف زاویوں سے ہدایات دے ہی رہا تھا کہ جہاں آرا اور ماجد بھی میرے دفتر پہنچ گئے۔ میں نے دونوں پارٹیوں کو اپنے چیمبر میں آمنے سامنے بٹھا لیا پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''آپ دونوں کا بہت شکریہ کہ معقولیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے راضی ہو گئے ہیں، ورنہ عدالتوں سے انصاف حاصل کرنے کے لیے بڑے دھکے کھانا پڑتے ہیں اور نوٹوں کی بوریاں بھی خالی ہو جاتی ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بیگ صاحب۔'' ماجد نے کہا۔ ''ویسے بھی رشتوں کی بات خوشگوار ماحول میں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں اب تک جو حالات پیش آئے ہیں۔ وہ افسوس ناک ہیں۔''

''صرف افسوس ناک ہی نہیں بلکہ اس میں ہماری بہت ذلت ہوئی ہے۔'' عالیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ رشتے کی بات کو آگے بڑھانے کے لیے تلخی کو ختم کر دینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ذلت کسی ایک فریق کی نہیں ہوئی بلکہ یہ پورے خاندان کی رسوائی ہوئی ہے۔ اگر خاندان کے افراد میں اتفاق اور اتحاد ہو تو اس سے انسان کی عزت اور طاقت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اب دونوں جانب سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئے گی جس سے دوسرے کی دل آزاری ہو۔''

''میں تو آپ پر اعتماد کر کے یہاں چلی آئی ہوں۔''
عالیہ نے فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ جو کہیں گے، میں وہی کروں گی۔''

عالیہ میری ہدایات پر ایسا رویہ اپنائے ہوئے تھی جس سے ان چالباز میاں بیوی کو یہ تاثر ملے کہ وہ اندر سے ٹوٹ چکی ہے گویا عالیہ نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے ان کے سامنے ہتھیار پھینک دیے ہیں۔

''ہم بھی بیگ صاحب پر مکمل اعتماد کر کے ہی یہاں آئے ہیں۔'' جہاں آرا نے عالیہ کی بات کے جواب میں کہا۔ ''یہ بہت قابل وکیل ہیں۔ ہم سب کو ان کی تجاویز پر عمل کرنا چاہیے۔''

''میری تجویز تو یہی ہے کہ ماجد صاحب عالیہ کی سابق پوزیشن بحال کر دیں یعنی وہ عالیہ کو فلیٹ نمبر تین سو دو میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ اس کے بدلے میں عالیہ فیض کے لیے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے تیار ہے۔''

''جی، میں آپ کی تجویز ماننے کے لیے تیار ہوں۔'' ماجد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ عالیہ بعد میں اپنی بات سے پھر نہیں جائے گی۔''

جہاں آرا نے اپنے شوہر کی بات کو تقویت پہنچانے کی غرض سے کہا۔ ''میرا خیال ہے، پہلے رشتے کی بات پکی ہو جائے، اس کے بعد عالیہ کو فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔''

''اگر آپ لوگ اسی طرح ایک دوسرے پر اپنی عدم اعتمادی کا مظاہرہ کرتے رہے تو پھر اس مسئلے کا کوئی حل سامنے نہیں آسکے گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لہٰذا میں نے آپ لوگوں کے معاملے کو نمٹانے کے لیے ایک ایگری منٹ تیار کیا ہے۔''

''کیسا ایگری منٹ؟'' عالیہ نے استفسار کیا۔

عالیہ کا یہ استفسار بھی میری ہدایت کا نتیجہ تھا تاکہ ماجد اینڈ کمپنی کو یہ تاثر ملے کہ میں صرف انہی کا وکیل ہوں، جبھی میں نے ایگری منٹ والی بات عالیہ کو نہیں بتائی تھی۔ عالیہ کے سوال کے جواب میں، میں نے اپنی میز کی دراز میں سے ایک ٹائپ شدہ اسٹیمپ پیپر نکال لیا پھر اس اسٹیمپ پیپر کی تحریر پڑھ کر انہیں سنانے لگا۔ مذکورہ تحریر کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

''یہ معاہدہ دو افراد کے بیچ ہے یعنی ماجد ابن توصیف اور عالیہ بیوہ رضوان کے درمیان۔ فریق نمبر دو یعنی عالیہ اپنی بیٹی مصباح کو اس شرط پر ماجد کی سالی شبانہ کے بیٹے فیض احمد ابن ریاض احمد مرحوم کے عقد میں دینے کا وعدہ کرتی ہے کہ فریق نمبر ایک یعنی ماجد ابن توصیف اسے اور اس کی بیٹی مصباح کو حسبِ سابق اپنے فلیٹ نمبر تین سو دو واقع النور اپارٹمنٹس میں رہنے دے گا۔ اس معاہدے کی رو سے مصباح اور فیض کا نکاح اسلامی شرعی طریقے کے عین مطابق عرصہ چار ہفتے کے اندر پڑھایا جائے گا۔ رخصتی کی تاریخ فریقین کی باہمی رضامندی سے طے کی جائے گی۔ وعدہ خلافی کی صورت میں فریق نمبر دو یعنی عالیہ بیوہ رضوان کو فلیٹ نمبر تین سو دو خالی کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں وہ کسی قسم کے ہرجہ یا خرچہ کی حق دار نہیں ہوگی۔''

میں نے اس معاہدے کی تحریر اس طرح بنائی تھی کہ ماجد اور جہاں آرا کو یہی محسوس ہو کہ یہ تحریر ان کے حق میں جاتی ہے اور یہ کہ میں مکمل طور پر انہی کا طرف دار ہوں لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں نے اس تحریر میں ایسے خلا چھوڑے تھے جن پر میں بعد ازاں کھل کر کھیل سکتا تھا۔

ان دونوں پارٹیوں نے اس ایگری منٹ سے اتفاق کرتے ہوئے اسٹیمپ پیپر پر دستخط کر دیے۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ کو بھیج کر نوٹری پبلک سے تصدیقی مہر لگوالی۔ پھر اس معاہدے کی ایک ایک نقل عالیہ اور ماجد کو تھماتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ لوگ اپنے پاس رکھیں اور مجھے امید ہے، آپ لوگ اس کی پابندی بھی کریں گے۔''

''اور اصلی ایگری منٹ کا کیا ہوگا؟'' جہاں آرا نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ میرے پاس رہے گا۔'' میں نے ایگری منٹ کی اصل ان کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''جب تک آپ لوگوں کا معاملہ اس معاہدے کے مطابق نمٹ نہیں جاتا، آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا ہوگا۔''

''آپ پر اعتماد ہے تو ہم یہاں آئے ہیں بیگ صاحب!'' ماجد نے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں کہ اس کیس کا کیا ہوگا جو ادھر عدالت میں چل رہا ہے؟ میں یہ بات اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں نے کورٹ سے اسٹے آرڈر لے رکھا ہے۔ اگر کیس بھی چلتا رہا اور میں نے اس دوران میں عالیہ کو فلیٹ میں رہنے کی اجازت دے دی تو الٹا میں ہی پھنس جاؤں گا۔''

''فکر نہ کریں ماجد صاحب! میں آپ کو پھنسنے نہیں دوں گا۔'' میں نے اس کی پیٹھ کچھ اس انداز میں ٹھونکی جیسے قربانی سے پہلے بکرے کو تھپکی دی جاتی ہے۔ ''کیس کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ آپ لوگوں کے بیچ جو معاہدہ ہو چکا ہے اس

کی بنیاد پر میں پہلی ہی پیشی پر اس کیس کو ختم کروادوں گا۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔''

وہ مطمئن ہوگیا اور محتاط انداز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ پہلے عدالت سے یہ کیس خارج کروائیں۔ اس کے بعد ہی میں عالیہ کو فلیٹ میں قدم رکھنے کی اجازت دوں گا۔''

''بالکل، یہ تو اصولی بات ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اگلی پیشی پر یہ کیس عدالت سے خارج ہوجائے گا۔ جب دونوں فریقین میں کسی معاملے پر راضی نامہ ہوجائے تو پھر عدالت اس کیس میں خود ہی کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔''

''گڈ......!'' ماجد نے ایک آسودہ سانس خارج کی۔

میں نے کہا۔ ''ماجد صاحب! کیس خارج ہونے سے پہلے آپ کو بھی ایک ضروری کام کرنا ہوگا۔''

اس نے سوال بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ''کون سا کام؟''

''فلیٹ نمبر تین سو دو کو خالی کرانے کا کام۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب کیس عدالت سے خارج ہوجائے گا تو اس معاہدے کی رو سے آپ عالیہ کو اس فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کی اجازت دینے کے پابند ہوں گے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکے گا اگر اس سے پہلے مذکورہ فلیٹ کو خالی کروالیا جائے۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے بیگ صاحب۔'' جہاں آرا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں سردست باجی شبانہ کو اپنے فلیٹ میں شفٹ کرلوں گی۔ بعد میں انہیں کہیں اور منتقل کردیا جائے گا۔ بہرحال، آپ جب چاہیں گے، فلیٹ آپ کو خالی ملے گا۔''

ہمارے بیچ مزید دس پندرہ منٹ تک اسی موضوع پر بات ہوتی رہی پھر وہ تینوں میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگئے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں فی الحال کیس کو خارج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یہ معاہدہ میں نے کیس پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے تیار کروایا تھا۔ عدالتی کارروائی کے دوران آپ کو خود اندازہ ہوجائے گا کہ اس معاہدے کو میں کس انداز میں استعمال کروں گا۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر سب سے پہلے ماجد کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ وہ اس کیس کا مدعی بھی تھا۔ اسی کی جانب سے پہلے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا۔ اس کا بیان وہی تھا جو وہ اس سے پہلے تھانے میں لکھوا چکا تھا اور اسی درخواست پر عدالت نے اسٹے آرڈر جاری کیا تھا۔ اگر وہ اب اپنا بیان بدل دیتا تو خود ہی مصیبت میں پھنس سکتا تھا لہٰذا اس نے اپنے الفاظ کو دہرادیا۔ میں اس کے بیان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ماجد کے بیان کے مطابق اس کا چھوٹا بھائی مرحوم رضوان رہائش کے حوالے سے سخت پریشان تھا لہٰذا اس نے ایک ڈیڑھیا فلیٹ اپنے فلیٹ کے سامنے خرید کر رضوان کو اس میں بسادیا۔ وہ رضوان سے اس فلیٹ کا کوئی کرایہ بھاڑا نہیں لیتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اسے شک ہوا کہ اس کی بھاوج مسماۃ عالیہ اس فلیٹ پر مستقل قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہی ہے لہٰذا اس نے عالیہ کو مذکورہ فلیٹ سے نکال باہر کیا......!

جب اس کا بیان ختم ہوا تو میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ماجد صاحب! کیا یہ درست ہے کہ آپ نے فلیٹ نمبر تین سو دو، واقع النورا پارٹمنٹس انیس سو ستتر میں خریدا تھا؟''

''جی، یہ بات بالکل درست ہے کہ میں نے یہ فلیٹ آج سے نو سال پہلے یعنی انیس سو ستتر میں خریدا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور آپ اس بات سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ انیس سو ستتر سے لے کر انیس سو چھیاسی تک یعنی تاحال آپ کی بھاوج اس فلیٹ میں مقیم تھیں؟''

''اتفاق نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے دراصل یہ فلیٹ رضوان سے ہمدردی کے جذبے کے تحت خریدا تھا۔ وہ بے چارہ کرائے کے گھروں میں دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی لہٰذا میں نے کڑوا گھونٹ بھر کر یہ فلیٹ خرید لیا اور رضوان اس فلیٹ میں شفٹ ہوگیا۔ جب رضوان اس فلیٹ میں شفٹ ہوا تو ظاہر ہے، اس کی بیوی اور بیٹی بھی ساتھ ہی یہاں آگئی تھیں لہٰذا اس اعتبار سے آپ کی یہ بات درست ہے کہ عالیہ پچھلے نو سال سے مذکورہ فلیٹ میں رہائش پذیر تھی۔''

''اور ان نو سالوں میں آپ کے بیچ کوئی لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوا؟'' میں نے آہستہ آہستہ اسے گھیرنے کی کوشش شروع کردی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ دو سال پہلے آپ کی بیوی مسماۃ

صفیہ کا انتقال ہوگیا تھا۔'' میں نے سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''صفیہ مرحومہ کے ساتھ آپ نے ازدواجی رفاقت کے پندرہ سال گزارے تھے۔ وہ آپ کی ایک اچھی دوست بھی تھیں۔''

''جی بالکل، آپ کو بالکل صحیح پتا چلا ہے۔'' وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''میں صفیہ کو اب بھی یاد کرتا ہوں۔ وہ مجھے سمجھتی تھی۔''

''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ مرحومہ صفیہ کے ساتھ عالیہ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔'' میں نے کہا۔ ''ان کی گاڑھی چھنتی تھی اور اسی پیار و محبت میں عالیہ بصد شوق، آپ کے گھر کا سارا کام بھی کر دیا کرتی تھی۔''

''صفیہ تھی ہی اتنی اچھی کہ ہر کوئی اس پر جاں نثار کرنے کے لیے تیار ہوجاتا تھا۔'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''یہ سچ ہے کہ عالیہ نے صفیہ کی بہت خدمت کی تھی۔''

میں ماجد کے جذبات سے کھیل کر اسے رفتہ رفتہ اپنی گرفت میں لارہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بھی سچ ہے کہ صفیہ کے انتقال کے بعد بھی عالیہ نے اپنی خو کو تبدیل نہیں کیا۔ یہ اور اس کی بیٹی آپ کی خدمت میں بھی لگی رہی تھیں۔ آپ کے کھانے پینے، آرام کا بہت خیال رکھا تھا انہوں نے۔ آپ کو کبھی کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یہ دونوں ماں بیٹی پوری جاں فشانی سے آپ کی خدمت میں جتی رہتی تھیں۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔

''پھر کیا وجہ ہے......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کہ اچانک آپ لوگوں کے بیچ اختلافات اس نہج کو پہنچ گئے کہ آپ نے اس سے اپنا فلیٹ خالی کروالیا؟''

''میری طرف سے تو کوئی اختلاف نہیں تھا۔'' وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''عالیہ ہی کا دماغ خراب ہوگیا تھا۔''

''کسی بھی شخص کا دماغ خوامخواہ خراب نہیں ہوجاتا ماجد صاحب!'' میں نے کہا۔ ''خرابیِ دماغ کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اور آپ کو پتا ہے، اس سلسلے میں انسانی نفسیات کی ریسرچ کیا کہتی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ آپ بتائیں۔'' وہ پلکیں جھپکتے ہوئے بولا۔

میں نے بتایا۔ ''ماہرینِ نفسیات کا یہ کہنا ہے کہ اگر کسی شخص کا دماغ خراب ہوجائے تو اس کا علاج شروع کرنے سے پہلے اس شخص کے ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ زیادہ تر کیسز میں یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس شخص کو نہیں بلکہ اس کے اردگرد بسنے والے لوگوں کو علاج کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ناروا سلوک کے سبب اس شخص کا دماغ خراب ہوجاتا ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''کیا عالیہ کے ماحول میں کوئی ایسی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہوئی تھی جس نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہو؟''

''نہیں جناب! ایسا تو کچھ بھی نہیں تھا۔'' وہ اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس قسم کی جرح کر رہا ہوں اور میری یہی کوشش تھی کہ جب تک میں اپنا کام نہ کرلوں، اس کی سمجھ میں کچھ آئے بھی نہیں۔

''ماجد صاحب! حال ہی میں آپ نے دوسری شادی کی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی لگ بھگ دو ڈھائی ماہ پہلے۔''

''جی...... میں نے دوسری شادی کی ہے۔'' لئق نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''کیا دوسری شادی کرنا کوئی جرم ہے؟''

''نہیں جناب! ہرگز کوئی جرم نہیں۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ نے تو اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے دو سال بعد دوسری شادی کی ہے۔ اگر آپ صفیہ کی زندگی میں بھی دوسری شادی رچالیتے تو قانوناً و شرعاً اس کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے لیکن......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''لیکن کیا وکیل صاحب؟''

میں نے محسوس کیا کہ اس دوران میں جج بڑی دلچسپی سے عدالتی کارروائی کو سماعت کر رہا تھا اور میرا اندازِ جرح اسے پسند آرہا تھا۔

''لیکن یہ کہ......'' میں نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''امن و سکون کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ماحول عدم توازن کا شکار نہ ہو اور آپ نے اس توازن کا خیال نہیں رکھا تھا۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' اس کی اُلجھن میں اضافہ ہوگیا۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میں نے سنا ہے کہ آپ کی دوسری بیوی جہاں آرا بہت مغرور اور مزاج کی تیز عورت ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور ان کی عالیہ سے بالکل نہیں

بنتی۔ اول روز ہی سے ان کے بیچ لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ عالیہ اور جہاں آرا میں محاذ آرائی شروع ہو چکی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں زیادہ قصور عالیہ ہی کا تھا۔''

''مثلاً عالیہ کا کیا قصور تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''عالیہ ایک تنگ نظر اور حاسد عورت ہے۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ ''جہاں آرا کی خوشی اس سے دیکھی نہیں گئی اور بات بے بات اس نے فتنے کھڑے کرنا شروع کر دیے۔''

''عالیہ تنگ نظر اور حاسد عورت ہے.....'' میں نے اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کو شک ہوا تھا کہ عالیہ آپ کے فلیٹ پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے لہٰذا آپ نے بہ زورِ بازو اس سے فلیٹ خالی کروا لیا؟''

''جی بالکل، مجھے اس کی نیت پر شبہ ہو گیا تھا۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ میں ان دونوں کے جھگڑوں سے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ مجھے اس کے سوا کوئی چارہ دکھائی نہ دیا کہ عالیہ سے فلیٹ خالی کروا لوں۔''

''آپ نے کبھی عالیہ اور جہاں آرا کے جھگڑے کو نمٹانے کی کوشش نہیں کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''ایک آپ کی بیوی تھی اور دوسری بھاوج۔ میرا خیال ہے، آپ اس گھریلو مسئلے کو گھر کے اندر ہی حل کر سکتے تھے.....''

''میں نے اپنی بساط بھر کوشش کر کے دیکھ لی تھی اور ناکام ہو گیا تھا۔'' وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوا تھا۔''

''آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں ماجد صاحب!'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ نے پہلے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عالیہ کے سامان کو فلیٹ سے باہر پھنکوایا تھا۔ اس کے بعد عدالت کا رخ کیا تھا چنانچہ از روئے قانون آپ ایک سنگین جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں لیکن میں اس وقت آپ سے کچھ اور جاننا چاہتا ہوں۔''

میں نے دیکھا، جب میں نے اس کے قانون کو ہاتھ میں لینے اور سنگین جرم کا ارتکاب کرنے کی بات کی تھی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں مگر میرے آخری جملے پر اس نے سکون کی سانس لی تھی۔

''آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' اس نے تھوک نگل کر حلق کو تر کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس یہی کہ.....'' میں نے اپنے لہجے میں ڈرامائی رنگ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا عالیہ اور جہاں آرا میں عورتوں والی عمومی چپقلش ہی تھی یا کوئی لین دین کا معاملہ بھی تھا؟''

''کیسا لین دین؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''مثلاً یہ کہ..... جہاں آرا نے عالیہ سے کچھ مانگا ہو اور عالیہ نے صاف انکار کر دیا ہو۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس پر جہاں آرا کو غصہ آ گیا ہو اور اس نے آپ کے کان بھرے ہوں اور نتیجتاً آپ نے عالیہ کو اس فلیٹ سے بے دخل کر دیا ہو۔''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔ میں نے اے ایس آئی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تفتیشی افسر صاحب! آپ کی رپورٹ اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟''

اے ایس آئی نے کٹہرے میں آ کر میرے سوال کا جواب دیا۔ ''میں نے موقع پر جا کر جو تفتیش کی تھی، اس سے پتا چلتا ہے کہ عالیہ اور جہاں آرا کے بیچ کسی رشتے کے لین دین کا تنازع تھا۔''

ماجد میری جرح سے پہلے ہی کافی نروس ہو چکا تھا۔ تفتیشی افسر کی گواہی نے اسے اور بھی پریشان کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ جب انسان کی سمجھ کام کرنا چھوڑ دے تو پھر اسے سامنے کی بات بھی نظر نہیں آتی۔ اس موقع پر ماجد سچ بول کر اپنی پوزیشن کو واضح کر سکتا تھا لیکن افراتفری میں اس کے منہ سے نکل گیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں آفیسر..... کسی نے آپ کو غلط بتایا ہے۔''

میں ایسے ہی کسی موقع کا منتظر تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ماجد صاحب! حقیقت یہ ہے کہ آپ کی بیوی جہاں آرا نے اپنے ایک ایب نارمل بھانجے کے لیے عالیہ کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا لیکن جب عالیہ نے یہ رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو آپ عالیہ کے دشمن ہو گئے اور ایک رات ان کی عدم موجودگی میں آپ نے ان کا سامان باہر پھنکوا کر فلیٹ پر قبضہ کر لیا.....'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں ہوا میں تیر نہیں چلا رہا اور نہ ہی تفتیشی افسر کی رپورٹ پر انحصار کر رہا ہوں۔ میرے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے مصدقہ ٹھوس ثبوت موجود ہے۔''

''کیسا ثبوت وکیل صاحب؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اپنی فائل میں سے اس ایگری منٹ کی ایک نقل نکال کر جج کی جانب بڑھا دی جو چند روز قبل میرے دفتر میں عالیہ اور ماجد کے مابین تیار کیا گیا تھا۔ جج نے بغور اس معاہدے کو پڑھا تو صورتِ حال اس پر واضح ہوگئی۔ اس نے ماجد سے استفسار کیا۔

''آپ اس معاہدے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''مم...... میں...... آپ کے سوال کا...... جواب نہیں دوں گا......'' وہ برہمی اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ بولا۔

''مسٹر ماجد!'' جج نے غصیلی نظر سے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عدالت کے وقار کا خیال رکھیں ورنہ توہینِ عدالت میں آپ کو جیل بھی ہوسکتی ہے۔''

جیل کا نام سنتے ہی اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ جج کو کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے میری جانب دیکھا اور نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

''آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ آپ مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں بہت خطرناک انسان ہوں۔ بہت جلد آپ کو اس دھوکے بازی کا انجام پتا چل جائے گا۔''

''پوائنٹ از ٹوبی نوٹیڈ یور آنر۔'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''اس کیس کا مدعی مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دے رہا ہے اور وہ بھی بھری عدالت کے سامنے۔ اگر کل مجھے کسی قسم کا بھی حادثہ پیش آگیا تو اس کا ذمے دار مدعی ہی ہوگا اور جہاں تک اس معاہدے کا تعلق ہے تو......'' میں نے ذرا رک کر حاضرینِ عدالت پر طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ معاہدہ دو فریقین کے مابین ہے اور اس پر دونوں کے دستخط موجود ہیں۔ میں نے نہ تو یہ ایگری منٹ اپنی مرضی سے تیار کیا ہے اور نہ ہی گن پوائنٹ پر ان سے دستخط کرائے ہیں۔ دونوں پارٹیاں اس معاہدے کے لیے راضی تھیں تو یہ تحریر وجود میں آئی ہے۔ جناب عالی! مدعی نے اپنی بھاوج پر دباؤ ڈالنے کے لیے اسے گھر سے بے گھر کیا ہے۔ فیض احمد نامی ایک نوجوان مدعی کی بیوی کا بھانجا ہے۔ فیض ایک ایب نارمل شخص ہے اور مدعی کی بیوی اپنے بھانجے کا رشتہ عالیہ کی تعلیم یافتہ خوب صورت بیٹی سے کرنا چاہتی ہے۔ فیض کسی بھی طور پر عالیہ کی بیٹی مصباح کے قابل نہیں۔ اس معاہدے میں مدعی نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اگر عالیہ اپنی بیٹی کی شادی، جہاں آرا کے پاگل بھانجے سے کرنے کے لیے تیار ہوجائے تو وہ اسے یعنی عالیہ کو حسبِ سابق، فلیٹ نمبر تین سو دو واقع النور اپارٹمنٹس میں رہنے کی اجازت دے دے گا۔ اس معاہدے میں لفظ ''حسبِ سابق'' قابلِ توجہ ہے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ عالیہ کو محض اس رشتے سے انکار کی پاداش میں اس فلیٹ سے بے دخل کیا گیا ہے۔ دیٹس آل یور آنر!''

''مسٹر ماجد! اب آپ کیا کہتے ہیں؟'' جج نے ایک بار پھر مدعی سے سوال کیا۔

''سر......!'' وہ بے حد گھبراہٹ کے عالم میں بولا۔ ''اس وکیل نے دھوکے سے اس معاہدے پر دستخط کرائے ہیں۔ یہ عالیہ سے ملا ہوا ہے اور یہ معاہدہ ان لوگوں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ اس وکیل نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ عالیہ اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے تیار ہوگئی ہے۔ اس وکیل نے میری بیوی کو اپنی باتوں کے شیشے میں اتار لیا تھا۔ میں تو اس معاہدے پر دستخط کرنے کے حق میں نہیں تھا مگر میں اپنی بیوی کے سامنے مجبور ہوگیا تھا۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کے مجبور کرنے پر دستخط کیے تھے۔'' جج نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن عدالت یہ جاننے میں دلچسپی رکھتی ہے کہ آیا آپ اس معاہدے کے مضمون سے اتفاق کرتے ہیں یعنی...... اگر عالیہ اپنی بیٹی مصباح کا رشتہ آپ کی بیوی جہاں آرا کے بھانجے فیض احمد سے کرنے پر راضی ہوجائے تو آپ عالیہ اور اس کی بیٹی مصباح کو فلیٹ نمبر تین سو دو واقع النور اپارٹمنٹس میں رکھنے پر تیار ہوجائیں گے؟''

''جج...... جی......'' وہ بے حد نروس انداز میں بولا۔ ''پھر تو مجبوری ہوگی......''

''گویا یہ بات ثابت ہوگئی کہ اصل جھگڑا اسی رشتے کا ہے۔'' جج نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''باقی تمام باتیں فروعی ہیں۔''

''میں یہاں پر تھوڑا اختلاف کروں گا جناب عالی!'' میں نے نہایت ہی ادب سے کہا۔ ''باقی کی فروعی باتوں میں ایک اہم نکتہ بھی چھپا ہوا ہے۔''

''کون سا نکتہ وکیل صاحب؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''متنازع فلیٹ کی ملکیت کا نکتہ!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق اس فلیٹ کی خریداری میں عالیہ کے مرحوم شوہر رضوان کی بھی کچھ رقم لگی ہوئی ہے۔ اگر عدالت کی اجازت ہو تو میں اس سلسلے میں مدعی ماجد سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے اجازت دے دی اور میں ماجد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کے ساتھ جو ہاتھ کیا تھا، اس کے نتیجے میں وہ ابھی تک مجھے معاندانہ انداز میں دیکھ رہا تھا لیکن میں نے اس کے رویے کی پروا نہیں کی اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''ماجد صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں کہ متنازع فلیٹ آپ نے آج سے لگ بھگ نو سال پہلے یعنی انیس سو ستتر میں خریدا تھا۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی، میں نے یہی بیان دیا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''کیا آپ کو اس فلیٹ کا رقبہ معلوم ہے؟''

''لگ بھگ ستائیس گز......'' اس نے جواب دیا۔

''کسی ڈیڑھ ہیا فلیٹ کا رقبہ اس سے زیادہ کیا ہو گا۔''

''جن گھروں کا رقبہ کم ہوتا ہے، ان کی قیمت بھی یقیناً کم ہی ہوتی ہے۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ نے انیس سو ستتر میں مذکورہ فلیٹ کتنے کا خریدا تھا؟''

''ایک لاکھ تیس ہزار میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے حساب سے آپ نے مذکورہ فلیٹ کافی مہنگا خریدا تھا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''اس کی مارکیٹ ویلیو انیس سو ستتر میں ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھی۔''

''ہر جگہ آپ کا حساب تھوڑی چلتا ہے وکیل صاحب۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس وقت آپ ہی کی وکالت میں یہ فلیٹ خریدتا......!''

''اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا اور وہ مذکورہ فلیٹ دو لاکھ میں بھی خرید لیتا تو مجھے کوئی حیرت یا افسوس نہ ہوتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ سے ایسی توقع نہیں تھی۔''

''مجھ سے ایسی توقع کیوں نہیں تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''کیونکہ ان دنوں آپ پراپرٹی کا بزنس کر رہے تھے۔'' میں نے گہری چوٹ کی۔ ''کسی بھی زمین و جائداد کی مارکیٹ ویلیو ایک پراپرٹی ایجنٹ سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''مجھے اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے اپنے موکل کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست غیر متعلقہ باتوں میں گواہ کو الجھا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

جج نے مجھ سے کہا۔ ''وکیل صاحب! کیا متنازع فلیٹ کی مارکیٹ ویلیو کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق بنتا ہے؟''

''بلاواسطہ تعلق بنتا ہے جناب عالی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن وکیل استغاثہ کو چونکہ اس ذکر کے سبب کسی قسم کی الرجی کا سامنا ہے تو میں ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس موضوع کو موقوف کرتا ہوں......'' ایک لمحے کو رک کر میں نے گہری سانس لی پھر دوبارہ مدعی ماجد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ مذکورہ فلیٹ کی خریداری میں آپ کے مرحوم بھائی رضوان نے بھی کچھ رقم لگائی تھی؟''

''اس بات میں کوئی حقیقت نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب افسانہ ہے۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ رضوان نے تیس ہزار آپ کو دیے تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ایک لاکھ آپ نے ملائے تھے؟''

''کسی نے آپ کو مس گائڈ کیا ہے وکیل صاحب۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''رضوان نے مجھے ایک روپیہ بھی نہیں دیا تھا۔ ساری رقم میں نے اپنے اکاؤنٹ سے ادا کی تھی۔''

''بائی چیک یا ڈیمانڈ ڈرافٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''بائی ڈیمانڈ ڈرافٹ اور نہ بائی چیک۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے ''پے آرڈر'' سے وہ رقم ادا کی تھی۔''

''گڈ......!'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق ان دنوں دو بینکوں میں آپ کا اکاؤنٹ تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے ایک لاکھ تیس ہزار کا پے آرڈر کس اکاؤنٹ سے بنوایا تھا؟''

''مم...... میں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھے اس سوال کا جواب

دینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔''

''مسٹر ماجد! عدالت کے احترام کا خیال رکھیں۔''

جج نے اسے تنبیہہ کی۔''یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے کہ کس سوال کا جواب دینا ضروری ہے اور کس کا غیر ضروری۔ آپ اس سوال کا اگر جواب نہیں دینا چاہتے تو اس احتراز یا انکار کا سبب بتانا پڑے گا۔''

''سر! یہ ضروری تو نہیں کہ انسان کا سارا پیسا بینک ہی میں رکھا ہو۔'' وہ بات بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''انسان کچھ رقم گھر میں بھی تو رکھ سکتا ہے۔ وہ قرض بھی لے سکتا ہے اور گھر کا زیور بھی فروخت کر سکتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔'' جج نے بڑی رسان سے کہا۔''آپ شاید وکیل صاحب کا سوال سمجھ نہیں سکے۔ انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ کے پاس ایک لاکھ تیس ہزار کہاں سے آئے۔ ان کا سوال یہ ہے کہ آپ نے وہ پے آرڈر کس بینک سے بنوایا تھا۔ پیسا کہیں سے بھی آیا ہو، پے آرڈر تو بینک ہی سے بنے گا نا؟''

''جناب! تیس ہزار میرے گھر پر رکھے تھے اور ایک لاکھ میں نے اپنے اکاؤنٹ سے نکلوائے تھے۔'' ماجد نے جواب دیا۔

''کس اکاؤنٹ سے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ ایک دم گھبرا گیا پھر لکنت زدہ لہجے میں بولا۔''مم..... مجھے یاد آیا..... میں نے فلیٹ کی پے منٹ کیش کی تھی.....''

''مگر تھوڑی دیر پہلے تو آپ نے بتایا ہے کہ فلیٹ کی پے منٹ بائی پے آرڈر کی تھی؟'' جج نے تیکھی نظر سے اسے گھورا۔

''وہ..... میں..... بھول گیا تھا.....'' وہ شکستہ لہجے میں بولا۔''دراصل اس کیس نے میرے ذہن کو اتنا الجھا دیا ہے کہ یادداشت بھی متاثر ہوئی ہے.....''

جج کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ کیس کا مدعی صریحاً دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا جبھی وہ مسلسل مجھے ناپسندیدہ نظر سے گھور رہا تھا۔ میں نے پریشان حال مدعی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ماجد صاحب! قبل اس کے کہ آپ اپنی یادداشت چلے جانے کا کوئی فلمی ڈراما رچائیں اور ہمیں آپ کے سر پر ڈنڈے برسا کر یادداشت کو واپس لانا پڑے، میرے چند اہم سوالات کے جواب دے دیں۔ اس کے بعد اگر آپ کا دل چاہے تو کوما میں بھی جا سکتے ہیں۔''

اب وہ پوری طرح میری گرفت میں آ چکا تھا۔ وہ پریشان نظروں سے دائیں بائیں نگاہ دوڑا رہا تھا۔ میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ نے ایک لاکھ تیس ہزار کی رقم کیش پے منٹ کی تھی۔ آپ نے جس شخص سے یہ فلیٹ خریدا اس نے آپ کو رقم کی وصولی کی کوئی رسید وغیرہ تو یقیناً دی ہوگی؟''

''نن..... نہیں..... میرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''اس بندے نے مجھے رسید دی تو تھی مگر میں نے سنبھال کر نہیں رکھی۔''

''اور کتنے جھوٹ بولنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''مم..... میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ کمزور لہجے میں بولا۔

''تم نے پے در پے جھوٹ بول کر عدالت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔''جس وقت تم نے تین سو دو نمبر ڈیڑھ سیا فلیٹ خریدا، تمہارے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پانچ ہزار کی رقم موجود تھی۔ پھر تم نے تیس ہزار مزید اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائے اس طرح تمہارے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پینتیس ہزار کا بیلنس ہو گیا جس میں سے تم نے ایک لاکھ تیس ہزار کا پے آرڈر بنوا کر فلیٹ کے مالک کو پے منٹ کی تھی۔ میں یہ بات خالی خولی نہیں کر رہا۔ میرے پاس اپنے اس دعوے کا پکا ثبوت بھی ہے۔''

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ چہرہ ایک دم مرجھا گیا۔ اس کے ہونٹوں سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ''پپ..... پانی.....''

جج نے اس کی پکار پر توجہ دیے بغیر مجھ سے استفسار کیا۔''وکیل صاحب! آپ کے پاس کس قسم کا پکا ثبوت ہے۔ کیا آپ نے نو سال پرانا بینک کا ریکارڈ نکلوایا ہے؟''

''بینک ریکارڈ نہیں یور آنر!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''میں اس بندے کو ٹریس کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جس سے مدعی نے یہ فلیٹ خریدا تھا۔ اس شخص کا نام بہادر علی ہے اور آج کل وہ عائشہ منزل کے علاقے میں رہتا ہے۔ اگر عدالت میری بات کی صداقت کو چیک کرنا ضروری سمجھے گی تو میں بہادر علی کو عدالت میں بطور گواہ پیش بھی کر دوں گا۔''

بہادر علی کا نام مجھے ڈاکٹر اکرم سے معلوم ہوا تھا۔ باقی ساری اسٹوری میں نے خود بنائی تھی۔ میں نہ تو بہادر علی سے

کبھی ملا تھا اور نہ ہی یہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔

بعض اوقات ماجد جیسے بھوتوں سے نمٹنے کے لیے لاتوں کا بے دریغ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ میری یہ فکشن اسٹوری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ڈاکٹر اکرم چونکہ گزشتہ پچیس سال سے وہاں رہ رہا تھا اور النور اپارٹمنٹس کی بلڈنگ اس کی آنکھوں کے سامنے بنی تھی لہٰذا وہ وہاں کے فلیٹ مالکان سے اچھی طرح واقف تھا۔

میرے انکشاف نے ماجد کی رہی سہی ہمت کا بھی سوا ستیاناس مار دیا۔ اپنے قدموں پر کھڑا رہنا اس کے بس میں نہ رہا۔ وہ کٹہرے کے فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور ''پانی پانی'' کی گردان کرنے لگا۔

جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو اسے پانی پلانے کی ہدایت کی پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''وکیل صاحب! آپ کی جرح مکمل ہوگئی یا کوئی اور سوال بھی کرنا چاہیں گے؟''

''جناب عالی! مدعی نے لگاتار دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔'' میں نے اپنے کیس کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔ ''اس کی عیاری اور مکاری معزز عدالت پر عیاں ہو چکی ہے۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مذکورہ متنازع فلیٹ کی خریداری کے وقت عالیہ کے مرحوم شوہر نے تیس ہزار اپنے پاس سے دیے تھے لیکن مدعی اپنے چھوٹے بھائی کی اس رقم کو ہڑپ کرنے کی نیت رکھتا ہے لہٰذا یہ عدالت کو چکر دینے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا گیا۔ تو جناب! مدعی کا جھوٹ عدالت کے سامنے کھل چکا ہے۔ اس کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو میں اس سے صرف ایک سوال کرنا چاہوں گا۔ بس، اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

دس منٹ کے بعد ماجد دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا تاہم اس کی حالت نارمل نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے سوال کیا۔

''ماجد! تمہاری بیوی اپنے جس بھانجے کی شادی عالیہ کی بیٹی مصباح سے کرنا چاہتی تھی، اس کے باپ کا نام کیا ہے؟''

''ریاض احمد۔'' اس نے جواب دیا۔

''میری معلومات کے مطابق فلیٹ نمبر تین سو دو میں صرف فیض احمد اور اس کی والدہ یعنی تمہاری سالی شبانہ ہی شفٹ ہوئے ہیں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ریاض احمد ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتا؟ کیا وہ کراچی سے باہر کہیں گیا ہوا ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ریاض احمد کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''اوہ...... بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔'' میں نے مصنوعی غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ آئندہ پیشی پر وہ مدعی ماجد کو اس امر کا پابند کرے کہ یہ جہاں آرا کے بھانجے مسمی فیض احمد کو گواہی کے لیے عدالت

میں پیش کرے۔ مجھے یقین ہے کہ عدالت اس نمونے کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوگی۔''

''کیا آپ فیض سے بھی کسی قسم کی جرح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''ضرور جناب عالی!'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔''یہ بندہ میری موکلہ کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند ہے اور فیض کی اسی خواہش نے سارا فساد کھڑا کیا ہے۔ ایسے ''نابغۂ بے روزگار'' سے سوال کرکے مجھے بہت خوشی ہوگی۔ ویسے مجھے امید تو نہیں کہ مدعی فیض کو عدالت کے سامنے لائے گا لیکن اگر اس نے یہ غلطی کی تو پھر فیض کی عدالت میں موجودگی گویا مدعی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔''

جج نے تین روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

اگلی پیشی سے پہلے میں نے ڈاکٹر اکرم کو اپنے پاس بلایا اور اس کی کارکردگی کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے اسے جہاں آرا کی ہسٹری کھوجنے کا کام سونپ رکھا تھا۔ اس کی رپورٹ نے مجھے مطمئن کردیا۔ ڈاکٹر نے کافی مفید معلومات جمع کرلی تھیں۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا تاہم کٹہرے میں فیض احمد کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق گزشتہ پیشی سے گھر جاتے ہی ماجد اینڈ کمپنی نے فیض اور اس کی ماں شبانہ کو کہیں اور منتقل کردیا تھا۔ فیض کی جو ذہنی حالت تھی، اس کے پیش نظر ماجد کبھی بھی اسے عدالت میں لانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا لہٰذا ان ماں بیٹے کو منظر ہی سے غائب کردیا گیا تھا تاہم میں جانتا تھا کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔

جج نے ماجد سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔''مسٹر ماجد! آپ اپنی اہلیہ کے بھانجے کو عدالت میں لائے ہیں؟''

''نہیں سر!'' وہ اٹھ کر کھڑ[illegible] بولا۔

''وہ لوگ حیدرآباد گئے ہوئے ہیں۔ کسی عزیز کا انتقال ہوگیا ہے وہاں اس لیے ایمرجنسی میں جانا پڑ گیا۔ انشاء اللہ اگلی پیشی پر حاضر کردوں گا۔''

''اوکے.....'' جج نے اثبات میں گردن ہلائی پھر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا اور پوچھا''آج آپ کس گواہ کو پیش کررہے ہیں؟''

''مدعی کی بیوی جہاں آرا کو جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔''وہ باہر برآمدے میں موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے، گواہ کو پیش کیا جائے۔'' جج نے سرسری لہجے میں کہا۔

ماجد نے فیض کے حوالے سے صریحاً جھوٹ بولا تھا۔ اس کی بات سن کر میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا اور یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اس پیشی پر میں اس کیس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔

جہاں آرا کٹہرے میں آکر کھڑی ہوئی۔ اس کے نقوش میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی جو مردوں کا دل دھڑکانے کے لیے بڑی مؤثر ثابت ہوتی تھی لہٰذا جیسے ہی وہ عدالت کے کمرے میں داخل ہوئی، حاضرین عدالت نے گردن اٹھا کر دلچسپ نگاہوں سے اس کا استقبال کیا تھا۔

جہاں آرا نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ جہاں آرا کے بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے ماجد کی طرح عالیہ کو ایک ضدی، سرکش، احسان فراموش اور جھگڑالو عورت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان تمام احسانات کی تفصیل بھی بیان کی تھی جو عرصہ دراز سے ماجد نے اپنی بھاوج پر کررکھے تھے اور مسلسل کیے جارہا تھا۔

وکیل استغاثہ نے دوچار سوالات کے بعد اسے فارغ کردیا تو جج کی اجازت سے میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ مجھے اپنے قریب پاکر لمحے بھر کے لیے ڈسٹرب ہوئی پھر اس کا اعتماد لوٹ آیا اور وہ جم کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''جہاں آرا صاحبہ! آج فیض احمد کو عدالت میں پیش ہونا تھا لیکن وہ یہاں نظر نہیں آرہا۔ اس کا کوئی خاص سبب؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ فوراً اس کی مدد کو لپکا۔''جناب عالی! مدعی، فیض احمد کی عدالت میں عدم موجودگی کا سبب بتا چکا ہے لیکن میرے فاضل دوست نے کارروائی کے آغاز ہی سے وقت برباد کرنے کے ہتھکنڈے آزمانا شروع کردیے ہیں۔ اٹ از ناٹ فیئر۔''

''فیئر اور ان فیئر کا فیصلہ عدالت کو کرنا ہے، آپ کو یا مجھے نہیں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔''لہٰذا اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنی جرح کو آگے بڑھاؤں۔''

وکیل استغاثہ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ جج نے مجھ سے پوچھا۔

''وکیل صاحب! کیا آپ کے اس استفسار سے کچھ نیا ہونے والا ہے؟''

''ڈیفینیٹلی یور آنر!'' میں نے بہ آواز بلند کہا۔

''گزشتہ پیشی پر معزز عدالت نے اس کیس کے مدعی کی بیان

بازیوں کی قلابازیاں دیکھی تھیں۔ آج محترمہ جہاں آرا کی باری ہے۔ دیکھیں یہ کون کون سا سمر سالٹ لگاتی ہیں۔''

ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد میں نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''کاش! جہاں آرا کا بھانجا شریف آج عدالت میں حاضر ہو جاتا پھر آج کی عدالتی کارروائی ایک یادگار کی حیثیت سے تاریخ کا حصہ بن جاتی۔''

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

''فیض کہاں ہیں؟'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہمارے ایک عزیز کی اُدھر حیدرآباد میں ڈیتھ ہو گئی تھی۔'' اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ''فیض اور باجی حیدرآباد گئے ہیں۔''

''کیا آپ اپنے اس عزیز کا نام بتا سکتی ہیں جو فوت ہوئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اکبر علی!''

''فیض اور شبانہ کی واپسی کب تک ممکن ہے؟''

''چند روز بعد وہ واپس آجائیں گے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا جس گھر میں میت ہوئی ہے وہاں کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا؟'' میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ گھور کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''مطلب آپ سمجھ چکی ہیں جہاں آرا۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی!'' وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض کر دیا۔ ''وکیل صفائی استغاثہ کی معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس عمل سے روکا جائے۔''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کڑوی آواز میں کہا۔ ''میں بے چارہ آپ کی گواہ کو کیا ہراساں کروں گا۔ یہ تو بڑے بڑوں کو ہراساں کر دیتی ہیں۔ آپ نے گزشتہ پیشی پر اس کیس کے مدعی کا حال نہیں دیکھا تھا۔ ابھی تو ماجد کو ان کے ساتھ رہتے ہوئے دو ڈھائی ماہ ہی ہوئے ہیں اگر دو ڈھائی سال گزر گئے تو پتا نہیں اس کا کیا حال ہوگا۔''

''بیگ صاحب! آپ نے میت والے گھر کے حوالے سے سامان کا ذکر کیا ہے۔'' جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ کیا ماجرا ہے؟''

وجہ

بیوی۔ ''اعداد و شمار نے ثابت کر دیا ہے کہ پاگل خانوں میں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔''

خاوند۔ ''اس سے اندازہ لگا لو کہ کون کس کو پاگل کر رہا ہے۔''

''جنابِ عالی! سیدھی سی بات ہے۔ اگر کوئی شخص کراچی سے حیدرآباد کسی میت میں شرکت کے لیے جاتا ہے تو اسے اپنے ساتھ کوئی سامان وغیرہ لے جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ ہوا تو ایک چھوٹا بیگ رکھ لیا...... ایم آئی رائٹ؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' جج نے تائید کی۔

''لیکن شبانہ اور اس کا انوکھا لاڈلا تو ٹرک بھر سامان کے ساتھ فلیٹ نمبر تین سو دو واقع النور اپارٹمنٹس سے روانہ ہوئے تھے۔'' میں نے مزے مزے لے کر بتایا۔

''کیا مطلب...... ٹرک بھر سامان؟''

''جناب! میری بات کی تصدیق کے لیے آپ اپنے عدالتی عملے کو اسی وقت مذکورہ فلیٹ پر بھیج کر چیک کروا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کو وہ فلیٹ ایک دم خالی ملے گا۔ فیض اور اس کی مما تمام تر سامان کے ساتھ وہاں سے کہیں اور شفٹ ہو چکے ہیں۔''

''وہ...... لوگ...... حیدرآباد ہی گئے ہیں۔'' جہاں آرا کمزور سی آواز میں منمنائی۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہارے شوہر نے گزشتہ پیشی پر عدالت میں دروغ گوئی کا جو ڈراما شروع کیا تھا، اس کی دوسری قسط چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بیگ صاحب! اگر وہ لوگ کسی میت میں حیدرآباد نہیں گئے تو پھر کہاں ہیں؟'' جج نے بے ساختہ مجھ سے استفسار کیا۔

''کھڈی سائڑھے تین۔ مکان نمبر سیون سکس سیون۔ سی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ وہاں کرائے کے مکان میں شفٹ ہوئے ہیں اور یہ ہنگامی شفٹنگ محض اس لیے کی گئی ہے کہ فیض کو عدالت میں پیش نہ کرنا پڑے کیونکہ اگر فیض عدالت میں آجاتا تو پھر ان لوگوں کی سازش کی قلعی کھل جاتی۔ وہ ایب نارمل فیض تو اس قابل بھی

نہیں کہ کسی بھوتنی سے اس کی شادی ہوگئی بلکہ یہ کہ ایک تعلیم یافتہ اور خوب صورت کم عمر لڑکی کو اس کے پلے باندھ دیا جاتا۔ یہ سراسر زیادتی بلکہ ظلم کی انتہا ہوتی اس لیے عالیہ نے اس بے جوڑ رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا جس کے بعد ہی محترمہ جہاں آرا عالیہ کی دشمن ہوگئی۔ اس نے ماجد کی ایسی برین واشنگ کی کہ وہ بھی اپنی بھاوج اور بھتیجی کے خلاف ہوگیا۔ اس دشمنی اور مخالفت نے جو گل کھلایا، وہ عدالت کے سامنے ہے۔''

''بتاؤ بی بی...... '' جج نے براہ راست جہاں آرا سے پوچھا۔ ''کیا وکیل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں؟''

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

جج نے سخت لہجے میں اسے ڈانٹا۔ ''جو بھی ہے، سچ سچ بتا دو ورنہ میں تمہیں ابھی جیل بھجوا دوں گا۔''

وہ سہم کر مجھے تکنے لگی۔ میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''شاباش! شروع ہو جاؤ۔ سچ کو آنچ نہیں...... ابھی مجھے تم سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔''

''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی صورتِ حال میں گھرنے کے بعد جہاں آرا بڑی بے بس اور لاچار نظر آ رہی تھی لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا کیونکہ بہ صورتِ دیگر جج نے اسے جیل بھجوانے کی دھمکی دے دی تھی۔

اس نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اس کا بھانجا نارمل نہیں ہے لیکن وہ اس کا گھر بسانا چاہتی تھی اسی لیے اس کی شادی کی کوشش کر رہی تھی مگر فیض کی قسمت خراب کہ اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکی لہٰذا عدالتی خوف کے باعث اس نے اپنی بہن اور بھانجے کو کورنگی کے ایک مکان میں شفٹ کر دیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری وہ باجی اور بھانجا سلامت النور اپارٹمنٹس میں آنے سے پہلے کہاں رہتے تھے؟''

''ادھر کراچی ہی میں رہتے تھے......'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''کراچی کے کس علاقے میں؟'' میں نے کرید کا عمل جاری رکھا اور کہا۔ ''دیکھو، غلط بیانی کرنے کی کوشش نہیں کرنا۔ تم جانتی ہو...... میں کتنا باخبر ہوں......''

''کورنگی ہی میں......'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

''کورنگی ساڑھے تین کے مکان نمبر سیون سکس سیون سی میں نا؟''

''جی......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''جنابِ عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کورنگی ساڑھے تین کے جس مکان کا ذکر کیا ہے وہ کرائے کا گھر نہیں ہے بلکہ وہ جہاں آرا کی باجی شبانہ کی ملکیت ہے۔ یہ لوگ ایک خاص مشن کے تحت النور اپارٹمنٹس میں شفٹ ہوئے تھے جسے میں ''مشن شادی'' کا نام دوں گا لیکن جہاں آرا کو اس مشن میں کامیابی نہیں ہوسکی اور جب یہ خوف پیدا ہوا کہ فیض کو عدالت میں پیش کرنا پڑے گا تو شبانہ اور فیض اپنے سامان کے ساتھ واپس کورنگی والے مکان میں شفٹ ہوگئے اور حیدر آباد میں کسی کی میت کا بہانہ کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ ماجد بھی اس حقیقت سے واقف نہیں کہ کورنگی والا وہ مکان شبانہ کی ملکیت ہے۔ جہاں آرا نے اپنے شوہر کو مکمل اندھیرے میں رکھا ہوا ہے اور وہ کاٹھ کا الو اپنی بیوی کے اشاروں پر ناچتا ہے......''

میں نے لمحاتی توقف کر کے عدالت کے کمرے میں موجود ماجد کی طرف دیکھا۔ وہ ان حقائق کی رونمائی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا اور یک ٹک غصے بھری نگاہ سے وٹنس باکس میں کھڑی جہاں آرا کو گھورتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میری ریسرچ کے مطابق جہاں آرا اینڈ کمپنی جرائم پیشہ افراد کا ٹولا ہے جس کے تین ارکان ہی سے ابھی تک میں آگاہ ہو سکا ہوں یعنی جہاں آرا، فیض اور شبانہ۔ ان کے ساتھ اور کتنے لوگ شامل ہیں، اس کا پتا چلوانا عدالت کا کام ہے۔ پہلے جہاں آرا نے بوڑھے ماجد سے شادی رچائی، پھر وہ اپنے بھانجے کی شادی، عالیہ کی بیٹی مصباح سے کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ ماجد کی تمام پراپرٹی کو ہضم کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے۔ میں اس کے علاوہ بھی جہاں آرا کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں جہاں آرا پر اپنی جرح کو آگے بڑھانا چاہوں گا۔''

''اجازت ہے......!'' جج نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔

''جہاں آرا صاحبہ! کیا یہ سچ ہے کہ ماجد سے آپ کی دوسری شادی تھی؟''

''جی، یہ سچ ہے اور میں نے ماجد کو اس بارے میں بتا دیا تھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''آپ چاہیں تو اس سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''میرا تو اس وقت سب کچھ آپ ہی سے پوچھنے کو دل چاہ رہا ہے لہٰذا آپ ماجد کو بیچ میں نہ لائیں تو یہ آپ کے لیے بہتر ہوگا۔'' میں نے روکھے پھیکے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تمہارے شوہر کا نام کیا تھا؟''

''لیاقت حسین۔'' اس نے بتایا۔

وہ کھلا جھوٹ بول رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا لیاقت حسین سے آپ کی طلاق ہوئی تھی یا......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولی۔

''نہیں جی...... لیاقت کا انتقال ہوگیا تھا۔''

''یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟''

''پانچ سال سے زیادہ ہوگئے ہیں۔''

''اپنے بیان میں کوئی تبدیلی کرنا ہو تو میں تمہیں ایک منٹ دے سکتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''نن...... نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''سب ٹھیک ہے۔''

''او کے......'' میں نے اپنی فائل میں سے ایک تصویر نکالی پھر اسے جہاں آرا کو دکھانے کے بعد پوچھا۔ ''کیا یہی لیاقت حسین ہے، تمہارا مرحوم شوہر؟''

یہ تصویر ڈاکٹر اکرم نے بڑی محنت اور کوشش سے حاصل کی تھی۔ جہاں آرا نے اس تصویر کا بغور جائزہ لیا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''یہ تصویر لیاقت ہی کی ہے۔ آپ کو کہاں سے ملی؟''

''قبرستان میں سے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ایک پانچ سالہ قبر کی کھدائی کر کے میں نے یہ تصویر نکالی ہے۔''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے جج کی جانب بڑھ گیا پھر مذکورہ تصویر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔

''جناب عالی! جیسا کہ معزز عدالت کے ریکارڈ پر یہ آچکا ہے کہ جہاں آرا نے اس تصویر میں دکھائی دینے والے شخص کو اپنے شوہر کی حیثیت سے شناخت کرلیا ہے اور اس کا نام لیاقت حسین بتایا ہے جس کا پانچ سال پہلے انتقال ہوگیا تھا لیکن......'' میں نے ذرا سا توقف کر کے جہاں آرا کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے میں نے اس عورت سے کہا بھی تھا کہ میں بہت باخبر انسان ہوں لہٰذا یہ میرے ساتھ کسی قسم کی چکر بازی کے بارے میں سوچے بھی نہیں لیکن یہ پھر بھی باز نہیں آئی......''

''اب اس نے کون سی غلط بیانی کی ہے؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''جناب عالی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت آپ کے ہاتھ میں جس شخص کی تصویر ہے، اس کا نام لیاقت حسین نہیں بلکہ ریاض احمد ہے...... فیض احمد کا باپ۔''

''مگر جہاں آرا نے فیض احمد کے باپ کو اپنے شوہر کی حیثیت سے شناخت کیوں کیا؟'' جج نے بے ساختہ پوچھا۔

''اس لیے جناب عالی کہ ریاض احمد ہی جہاں آرا کا شوہر ہے'' میں نے کہا۔ ''اس عورت نے تھوڑی دیر پہلے اپنے شوہر کا نام اس لیے غلط بتایا تھا کہ اس نے ماجد کو بھی اپنے سابق شوہر کا نام لیاقت حسین ہی بتا رکھا ہے اور اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ......'' میں نے پھر لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو ان الفاظ سے مکمل کر دیا۔

''ریاض احمد کا انتقال نہیں ہوا۔ یہ شخص ابھی زندہ ہے اور جیل میں اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔''

''اوہ......'' جج نے غصیلی نظر سے جہاں آرا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم نے یہ کیا چکر چلا رکھا ہے بی بی؟''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے......'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔''

''بی بی! تم ہوش میں تو ہو۔'' جج نے غضب ناک انداز میں کہا۔ ''اب یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں رہا کیونکہ اس میں اور بھی بہت سے افراد کی ذات شامل ہو چکی ہے۔ تم سے جو پوچھا جا رہا ہے اس کا سیدھا اور سچا جواب دو ورنہ میں توہین عدالت کے جرم میں تمہیں طویل عرصے کے لیے جیل بھجوا دوں گا۔''

وہ دھواں دھار انداز میں آنسو بہانے لگی۔ ایسے ہی آنسوؤں کے لیے ''مگر مچھ'' کے آنسوؤں والا محاورہ بنایا گیا تھا۔ اس کے ان آنسوؤں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ میں نہ صرف اس کی اصلیت جان چکا تھا بلکہ اس تلخ حقیقت کو عدالت کے ریکارڈ پر لانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

''جناب عالی! میری معلومات کے مطابق جہاں آرا بہ دستور اپنے پہلے شوہر ریاض احمد کی بیوی ہے۔ دونوں کے بیچ نہ تو علیحدگی ہوئی ہے اور نہ ہی طلاق اور نہ ہی ریاض کا انتقال ہوا ہے بلکہ اس نے طیش میں آکر جہاں آرا کے ایک آشنا شاہد علی کا قتل کر دیا تھا جس کی سزا کے طور پر وہ پچھلے تین سال سے جیل میں بند ہے۔ اس واقعے کی اخبارات میں اچھی خاصی کوریج بھی ہوئی تھی۔ انہی چٹ پٹی خبروں کے چند نمونے میں نے حاصل کر لیے ہیں......'' پھر میں نے اپنی فائل میں سے تین سال پرانے اخبارات کے چند تراشے نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی ملاحظہ فرمائیں جناب عالی۔''

جج نے ان خبروں کو پڑھا تو اس کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔ اس نے جہاں آرا کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بی بی! تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم کتنے بڑے گناہ کی مرتکب ہوئی ہو۔ ایک شوہر کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص سے شادی رچانا سنگین ترین جرم ہے جس کی سزا کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔''

''عدالت تو اس ڈائن کو جب سزا دے گی تو دے گی۔'' ماجد نے دیوانگی کے عالم میں کہا۔ ''میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں اس بدکار عورت پر مقدمہ چلنے کا انتظار کروں۔ میں ابھی اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دبا کر کام تمام کردیتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے جہاں آرا کی جانب دوڑ لگادی۔ وہ ان لمحات میں پاگل ہوا جارہا تھا۔ اس کی یہ دماغی کیفیت عین فطری تھی۔ ریاض احمد نے تو جہاں آرا کے آشنا کی زندگی کا چراغ گل کرکے جیل پائی تھی لیکن ماجد گناہ کی اس پوٹ کو اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرکے سینہ ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

اس سے پہلے کہ وہ وٹنس باکس میں کھڑی جہاں آرا تک رسائی حاصل کر پاتا، متعلقہ عدالتی عملے نے اسے بیچ ہی میں دبوچ لیا اور قابو کرکے ایک طرف بٹھادیا۔

جج نے جہاں آرا کی گرفتاری کا حکم دیتے ہوئے تفتیشی افسر سے کہا کہ وہ جلد از جلد چالان عدالت میں پیش کردے۔ اس کے بعد اس نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

☆☆☆

ہمارا معاملہ صاف ہوگیا تھا۔ جج نے اس سارے فساد کی جڑ کو پولیس کے حوالے کرکے ہمارے لیے آسانیاں پیدا کردی تھیں۔ پولیس نے کئی ایک دفعات کے زیر اثر چالان بنا کر عدالت میں پیش کردیا۔ یہ کیس زیادہ عرصہ نہ چل سکا کیونکہ اس کیس کا ہر پہلو روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ جہاں آرا کو اپنے کیے کی سزا ملنا تھی۔ اس کا جرم بلکہ جرائم اتنے ہلکے پھلکے نہیں تھے کہ تادیبی کارروائی سے کام چل جاتا۔ یہاں تعزیری کارروائی بہت ضروری تھی اور عدالت نے بالآخر جہاں آرا کو ایک لمبے عرصے کے لیے جیل بھیج دیا۔

چند روز کے بعد عالیہ اپنی بیٹی مصباح کے ہمراہ میرے آفس میں آئی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ ماجد بہت بدل گئے ہیں۔

''اچھا۔'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس بندے میں کیا بدلاؤ آیا ہے؟''

''انہیں احساس ہوگیا ہے کہ اپنا کون ہے اور کون پرایا۔'' عالیہ نے بتایا۔ ''ہم انہی کے کہنے پر آپ سے ملنے آئے ہیں۔ وہ شرمندگی کے باعث آپ سے ملنے نہیں آئے۔ ویسے وہ آپ کے بے حد شکرگزار ہیں کہ آپ کی جرح کی وجہ سے جہاں آرا کی اصلیت کھل پائی اور وہ کیفرِکردار کو پہنچی۔''

''صرف وہی نہیں بلکہ مجھے پتا چلا ہے کہ پولیس نے اس کی باجی کو بھی شامل تفتیش کرلیا تھا اور وہ بھی آج کل جیل کی ہوا کھا رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور فیض کو پاگل خانے میں جمع کرادیا گیا ہے۔''

''ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے بیگ صاحب۔'' وہ نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ ''انہوں نے ہماری جمی جمائی زندگی کا بیڑا غرق کردیا تھا۔''

''ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''آپ آج کل کہاں رہ رہی ہیں؟''

''تین سو دو میں۔'' اس نے بتایا۔ ''اس واقعے نے ماجد کی آنکھیں کھول دی ہیں بیگ صاحب۔ وہ اسی روز ہمیں اپنے ساتھ النور اپارٹمنٹس میں لے گئے تھے۔ اب ہم خوش اور مطمئن ہیں۔''

''اللہ آپ کو ہمیشہ خوش اور مطمئن ہی رکھے۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔

''آپ نے کمال ہی کر دکھایا تھا بیگ صاحب۔'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔ ''واقعی آپ خطرناک مجرموں کو نکیل ڈالنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

''بس، میں اتنا جانتا ہوں کہ کون سا بھوت باتوں کا ہے اور کون سا بھوت لاتوں کا۔'' میں نے کہا۔ ''میں ان کی نیچر کے مطابق ہی سلوک کرتا ہوں کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اور باتوں کے بھوتوں پر لاتیں نہیں برسانا چاہئیں۔''

وہ تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھی رہیں پھر میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگئیں۔

میں نے مصباح کے پُرسکون مستقبل کے لیے دعا کی اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اللہ نے مصباح کو اگر فیض سے بچایا تھا تو وہ آئندہ بھی ضرور اس کی حفاظت کرتا، اس بات کا مجھے یقین تھا......!

(تحریر: حسام بٹ)

بے خبری

ثمر عباس

کبھی کبھی باخبری انسان کو اذیت میں مبتلا کردیتی ہے جبکہ بے خبری میں انسان انتہائی سکون سے مصائب بھرے جنگل سے بھی نکل جاتا ہے لیکن... زندگی کے ہر معاملے میں یہ فارمولا فٹ نہیں ہوسکتا۔ بعض معاملات میں انسان کو آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہاں معاملہ الٹا ہوگیا جب اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو... حقیقت کو صرفِ نظر کرنے پر مجبور کردیا گیا۔

ایک فلاحی ادارے میں امداد کے نام پر نقب زنی کا دلچسپ ماجرا

نک اب تک خود کو خوش قسمت تصور کرتا چلا آرہا تھا۔ وہ اس وقت تک بھی خود کو خوش قسمت تصور کررہا تھا جب تک اس کی برانڈ نیو مزدا کار کو پیچھے سے میئر کی بیوی کی کار نے ٹکر نہیں ماری تھی جو اس وقت اپنے سیل فون پر باتوں میں مگن تھی۔ اور وہ اس وقت تک بھی خود کو خوش قسمت تصور کررہا تھا جب تک پولیس نے اس کی کار کی ڈگی سے ایک مکمل انسانی ڈھانچا دریافت نہیں کرلیا تھا۔

نک کا پندرہ سالہ ڈرائیونگ کا ریکارڈ بالکل بے داغ

تھا۔ حتیٰ کہ اسے کبھی پارکنگ ٹکٹ بھی ایشو نہیں کیا گیا تھا لیکن بلاشبہ تمام تر غلطی اسی کی تھی۔ پولیس افسر اسے یہی بتانے کی کوشش کررہا تھا کیونکہ میئر کی بیوی قطعی طور پر معصوم اور بے گناہ تھی۔

اس کی توجہ کہیں مرکوز نہیں تھی کیونکہ اس کی کلائیاں پشت پر بندھی ہوئی تھیں اور ہتھکڑی ایک کرسی کے آہنی دستے سے گزار کر اس کے ہاتھوں میں پہنائی گئی تھی۔ نک کو تو بس یہ معلوم تھا جیسے پولیس افسر ٹیلی ویژن سیریز ''اسٹار ٹریک'' کے کرداروں کی زبان ''کلنگن'' میں بات کررہا ہو۔

ذرا ٹھہر جاؤ، اب وہ پولیس افسر کیا کہہ رہا ہے؟ اوہ! بات ایکسیڈنٹ سے آگے کی ہورہی ہے۔ اب وہ ڈھانچے کی بات کررہا ہے۔

''تو کم بخت یہ بتاؤ۔'' پولیس افسر آئرز کہہ رہا تھا .....

نک سوچنے لگا کہ یہ اچھا پولیس افسر ہے یا بُرا پولیس افسر؟ نک نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ان دونوں میں سے کس پولیس افسر نے اسے اس کے حقوق پڑھ کر سنائے تھے؟ اچھے پولیس افسر نے یا بُرے پولیس افسر نے؟ اور سنائے بھی تھے یا نہیں؟

افسر آئرز نک کو آڑے ہاتھوں لے رہا تھا۔ اوکے، وہ یقیناً ایک بُرا پولیس افسر تھا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں قطعی کوئی آئیڈیا نہیں ہے کہ ایک گلے سڑے ڈھانچے نے تمہاری کار کی ڈکی میں پہنچنے کا کیا راستہ تلاش کیا؟ یقیناً تمہیں کسی چیز کی بو تو محسوس ہوئی ہوگی یا اسے ادھر سے ادھر لڑھکتے ہوئے تو سنا ہوگا؟''

''اوغ...... گلا سڑا ڈھانچا؟''

ویل، اسے کار میں سوار ہونے کے بعد عجیب سی بدبو تو سُنگھائی دی تھی لیکن وہ یہی سمجھا کہ یہ اس کے پڑوسی کے روٹ ویلر پالتو کتے کی پوٹی ہوگی جسے وہ کبھی زنجیر سے نہیں باندھتے تھے اور یہ نادانی میں اس کے جوتوں سے لگ گئی ہوگی۔

نک نے اپنے طور پر یہی گمان کیا کہ وہ پُراعتماد لہجے میں جواب دے رہا ہے۔ البتہ جب الفاظ اس کی زبان سے ادا ہوئے تو ایسا لگا جیسے بلوغت کی درمیانی عمر کا کوئی ٹین ایجر بول رہا ہو۔ ''کیا مجھے کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے کی سہولت نہیں ہے؟''

ان دونوں میں سے اچھا پولیس افسر ابھی تک کونے میں خاموش کھڑا ہوا تھا لیکن بالآخر اس نے ثبوت پیش کردیا کہ وہ حقیقت میں بول بھی سکتا ہے۔

''ہم اسے اپنے دوسرے مہمان کے ساتھ حراست میں رکھنے والی کوٹھری میں رکھیں گے تاکہ اس کے ہوش وحواس بحال ہوجائیں لیکن پہلے اسے اپنے وکیل کو فون کرنے دینا۔''

بُرا پولیس افسر صرف غرا کر رہ گیا۔ البتہ اس نے بے دلی سے نک کو اپنے کزن وکیل ایڈورڈ سے فون پر بات کرنے کی اجازت دے دی۔

ایڈورڈ زیادہ تر طلاق کے کیسز ہینڈل کرتا تھا لیکن وہ واحد وکیل تھا جس سے نک واقف تھا۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات تھی کہ کبھی آپ نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا کہ آپ کے شناساؤں کے حلقے میں کتنے لوگ وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ان کے بارے میں خیال اس وقت آتا ہے جب آپ کسی الزام میں خود کو ایک پولیس اسٹیشن میں پاتے ہیں...... ویل، اس وقت اس پر کیا الزام عائد تھا، اسے اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔

مُردے کی بار برداری؟ یا سونگھنے کی حس کے غدود میں نقص؟

انہوں نے اسے ایک کوٹھری میں بند کردیا جہاں پہلے سے ایک شخص موجود تھا۔ وہ دیکھنے میں نامور ریسلر ہک ہوگن کے مانند لگ رہا تھا۔ البتہ اس سے زیادہ عظیم الجثہ تھا اور یقینی طور پر اس کا بدن بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہوگن کے ہوبہو فرد نے اپنا تعارف رابرٹ عرف بوبی کے نام سے کرایا جو کہ مضحکہ خیز لگا کیونکہ وہ یقینی طور پر کسی دودھ پیتے بچھڑے کے مانند نہیں لگ رہا تھا۔

البتہ نک کے ہوش وحواس اب بھی اس حد تک بجا تھے کہ اس نے اپنے اس خیال کو زبان سے ادا کرنے کی حماقت نہیں کی۔

بوبی کا رویہ نہایت دوستانہ تھا۔ ''تمہیں کس لیے اندر کیا گیا ہے؟'' بوبی نے پوچھا۔

''میئر کی بیوی کو ٹکر مارنے اور اپنی کار میں ڈھانچے کی موجودگی کے الزام میں۔'' نک نے بتایا۔

بوبی نے یہ سن کر اپنی الو جیسی آنکھیں آہستہ آہستہ جھپکانا شروع کردیں۔ نک، بوبی کی جانب سے کسی ایسے اشارے کا منتظر تھا جیسے اسے نک کی بات پر یقین نہ آیا ہو...... کوئی قہقہہ یا بازو پر ایک پنچ یا تمسخرانہ غراہٹ!

لیکن بوبی صرف یہ کہہ کر رہ گیا۔ ''صاف ستھرا۔''

''اور تم پر کیا الزام ہے؟'' نک نے شائستگی سے پوچھا۔ یہ ہمیشہ عقل مندی کا تقاضا ہوتا ہے کہ اپنی کوٹھری کے ساتھی سے اچھے تعلقات برقرار رکھے جائیں یا یہ نک کی اپنی سوچ تھی کیونکہ یہ اس کا حراست میں لیے جانے کا پہلا اتفاق تھا۔

بوبی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ پھر دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے جکڑ لیا اور ایک ایک کر کے اپنی انگلیاں چٹخانا شروع کر دیں۔ نک ہمیشہ ایسے افراد کو پسند کرتا تھا جو یہ کر سکتے تھے۔

''اس مرتبہ؟'' بوبی نے جواب دیا۔ ''کسی بندے کے چہرے کا بھرکس نکالنے کے الزام میں! وہ جس انداز میں بریٹ فیورے کا نام مسلسل لیے جا رہا تھا، وہ مجھے پسند نہیں آیا۔ جبکہ نام فاوورتھا۔ میرا مطلب ہے یہ درست ہے کہ یہ نام فرانسیسی ہے۔ لہٰذا اس کا تلفظ فاوروہ ہوتا ہے۔''

بوبی کا کہنا تھا کہ اس نام کو ادا کرتے وقت ''آر'' کو قدرے نظرانداز کر دینا ہوتا ہے۔

اس نے غور کیا کہ بوبی کا فرانسیسی لہجہ نہایت عمدہ تھا۔

''اور آخری بار کس الزام میں؟'' نک نے پوچھا۔

بوبی ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ ''اس سے پہلے دکانوں سے عورتوں کے زیر جامے چوری کرنے کے الزام میں اور جہاں تک انتہائی قریب ترین معاملے کی بات ہے تو یہ یقیناً نجی مال کی چوری کا ہے۔''

''واؤ! تب تو مجھے بھی بوبی کے وکیل کا نام معلوم کر لینا چاہیے۔'' نک نے سوچا۔ اس لیے کہ بظاہر یہی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ وکیل مشکل ترین صورت حال میں بھی بوبی کو رہائی دلوانے میں کامیاب رہا تھا لیکن نک اس وقت خاصی بوریت محسوس کر رہا تھا...... بلکہ بوریت سے زیادہ اسے خوف آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ بوبی کو مزید کریدنا چاہیے۔ اس نے بوبی سے پوچھا۔ ''نجی مال کی چوری؟''

بوبی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اسی ٹائپ کی۔''

''وہ کیا؟''

''مُردوں کی چوری!''

ایں! نک کو اس جواب کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ابھی تین گھنٹے قبل وہ تازہ کافی، پین کیک اور ساسیج کا عمدہ ناشتا کر رہا تھا اور ساتھ ہی ٹیلی ویژن کے مارننگ شو کی نہایت پُرکشش اینکر کے چٹکلوں

کٹرنیل

☆ جس شخص نے وقت ضائع کیا، اس نے سب کچھ ضائع کیا۔

☆ خوش اخلاقی سب سے بڑی دولت ہے۔

☆ کسی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار نہ کرو۔ ممکن ہے، اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اور تمھیں اس مصیبت میں مبتلا کر دے۔

☆ جو اپنے وعدے کا پابند نہیں، اس کا کوئی دین نہیں۔

☆ عقل کی حد ہو سکتی ہے لیکن بے عقلی کی نہیں۔

☆ اپنے آپ کو دانا نہ سمجھو بلکہ اس بات کا اندازہ لگاؤ کہ تم کیا کیا نادانیاں کرتے ہو۔

☆ ظالم صرف وہی نہیں جو ظلم کرے بلکہ وہ بھی ظالم ہے جو باوجود قدرت رکھنے کے ظالم کو ظلم کرنے سے نہیں روکتا۔

☆ عظیم ہے وہ دل جس میں دوسروں کے درد کا احساس ہو۔

☆ مرنے والوں سے عبرت حاصل کرو۔

☆ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے امید نہ رکھو۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

خطرناک غلطیاں

☆ اس خیال میں مست رہنا کہ ہمیشہ خوب صورت اور تندرست رہوں گا۔

☆ اس نیت سے عیب کرنا کہ صرف دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔

☆ اپنا راز کسی دوسرے کو بتا کر اس کو پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔

☆ ہر ایک انسان کے متعلق ظاہری صورت دیکھ کر رائے قائم کرنا۔

☆ جو کام اپنے آپ سے نہ ہو سکے، اس کو سب کے لیے ناممکن خیال کرنا۔

☆ لوگوں کی تکلیف میں حصہ نہ لینا اور ان سے ہمدردی کی امید رکھنا۔

☆ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقل منداور لائق تصور کرنا۔

☆ آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمانا۔

انتخاب۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر رشک آرہا تھا۔

اس کی ملازمت بھی بہت اچھی تھی۔ ایک مشہور مینوفیکچرنگ کمپنی میں وہ منیجر کے عہدے پر پہنچنے والا تھا۔ اس کی تنخواہ بھی عمدہ تھی۔ اس کی گرل فرینڈ بھی پیاری تھی جو اس کے ہمراہ ہاکی کے گیمز دیکھنے کے لیے جانے میں کوئی نخرے نہیں دکھاتی تھی اور کبھی کبھار اس کے لیے... آملیٹ بھی پکا دیتی تھی۔

اس کا نوآبادیاتی طرز کا اینٹوں کا مکان بھی بے حد عمدہ تھا اور اس نے اسے جس قیمت پر خریدا تھا، اب اس کی مالیت اس سے دگنی ہوچکی تھی۔

اور اب یہ سب کچھ اسے تاش کے پتوں کے بنے ہوئے گھر کے مانند محسوس ہورہا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے بکھر رہا تھا۔

بوبی نے گردن اس کی جانب گھماتے ہوئے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں اور پوچھا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ تمہارا چہرہ قدرے پژمردہ دکھائی دے رہا ہے۔ ابھی تو تم نے جیل کے پراسرار گوشت کا ذائقہ بھی نہیں چکھا۔''

گوشت کا نام سنتے ہی نک کا دھیان اچانک اس گلے سڑے مردے کی طرف چلا گیا جسے پولیس نے اس کی کار کی ڈکی میں دریافت کیا تھا۔

وہ اپنا پیٹ پکڑے کوٹھری کے اس گوشے کی جانب لپکا جہاں سنک نما ایک شے لگی ہوئی تھی۔ وہ ابکائیاں لیتا رہا حتیٰ کہ قے آنا بند ہوگئی۔ صبح کا پین کیک اور کافی کا ناشتا سب کچھ باہر نکل آیا تھا۔

بوبی اٹھ کر اس کے پاس پہنچا اور اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم چاہتے ہو تو میں وارڈن کو بلا دوں؟''

نک نے سنک کے زنگ جیسے ذائقے والے پانی سے کلی کرتے ہوئے اپنا منہ صاف کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ میری طبیعت سنبھل رہی ہے۔''

وہ واپس بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ بوبی لپک کر اس کے نزدیک آگیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''پہلی مرتبہ ہے نا؟''

نک نے کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا اور توقع کرنے لگا کہ بوبی اس کے ساتھ ایک اچھے پڑوسی کا سا برتاؤ کررہا ہے۔

بوبی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے بھی اپنی پہلی بار کا واقعہ یاد ہے۔ مجھے مقامی گن اسٹور کی کھڑکیوں کے شیشوں پر پتھراؤ کرتے ہوئے پکڑلیا گیا تھا۔'' بوبی نے نک کا شانہ دبایا تو نک کو اس کے انداز میں پدرانہ شفقت محسوس ہوئی کیونکہ ان دونوں کی عمروں میں خاصا فرق تھا۔ نک یہ تصور نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ایک حقیقی جیل میں اس کے لیے کیا متوقع ہوگا جہاں سارے قاتل اور ان کے کنبے کے لوگ موجود ہوں گے۔

خوش قسمتی سے وہ بوبی کی مزید پدرانہ محبت سے بچ گیا جب سلاخوں کی دوسری جانب اس کا وکیل کزن ایڈورڈ آن موجود ہوا۔

''اچھی خبر ہے، نک!'' وہ غرایا۔ وہ ہمیشہ ہی غرانے کے انداز میں بولتا تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ خوش ہوتا تھا تب بھی اور جب اپنی بیوی سے 'آئی لو یو' کہتا تھا، تب بھی! اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس کے خیال میں اس طرح لوگ اس کی بات کو سنجیدگی سے لیتے تھے لیکن اس کی زیادہ وجہ گلے کے کینسر کی وہ سرجری تھی جو برسوں پہلے ہوئی تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ گاہے بگاہے ٹیارلو برانڈ کے سگار پینے سے باز نہیں آتا تھا۔

''اچھی خبر؟'' نک نے دہرایا۔

''ہاں۔ تم آزاد ہو اور جاسکتے ہو۔ بے شک ابھی ایکسیڈنٹ کا معاملہ باقی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ انشورنس کمپنیاں اس معاملے کو آپس میں سلجھالیں گی۔''

نک کو احساس نہیں ہوا کہ اس کا سانس رکا ہوا ہے کیونکہ آزادی کی خبر سن کر وہ خوشی کے مارے سانس لینا تک بھول گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے خود کو سلاخوں کی دوسری جانب اپنے کزن وکیل ایڈورڈ کے پاس آزاد فضا میں پایا تو وہ تیزی سے سانس لینے لگا۔ تیزی سے سانس لینے سے اس پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

بوبی نے ایڈ روڈ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ نہایت حساس جسمانی کیفیت کا مالک ہے۔ ہے نا؟ تمہیں اس کا مکمل چیک اپ کرانا چاہیے؟''

ایڈورڈ ناپسندیدگی کی نظروں سے نک کو دیکھنے لگا پھر اسے ایک چھوٹی سی بھیڑ کے مانند لابی کی جانب ہنکالے گیا۔ نک نے پلٹ کر ایک آخری نگاہ بوبی پر ڈالی تو اس نے آنکھ مارتے ہوئے ہاتھ لہرادیا۔ وہ یقینی طور پر ایک دوستانہ انداز تھا۔

باہر کی دنیا کی اچانک چمک دمک اور آزادی کی فضا

میں پہنچتے ہی نک تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا۔ وہ اپنے کزن وکیل سے بولا۔ ''میں تمہارا احسان فراموش تو نہیں ہوں لیکن تمہیں اتنی دیر کیوں لگی؟ میں یہی سمجھا جیسے کہ میں سنگ سنگ جیل میں ہوں۔''

''سنگ سنگ جیل نیویارک میں ہے، نک!''

''جہاں کہیں بھی ہو، تم مجھے بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ اور تم نے کیا کیا ہے...... کیا کوئی جادو کی چھڑی گھمائی ہے؟''

''نہیں۔ میں نے پہلے کار ڈیلر کو فون کیا تھا اور اس سے مسئلہ حل ہوگیا۔'' ایڈورڈ نے جواب دیا۔

''کیا؟'' نک اب مکمل طور پر کنفیوژ ہو چکا تھا۔ ''ایمان داری سے بتاؤ۔ میرا چیک تو باؤنس نہیں ہوگیا؟''

ایڈورڈ اپنے دیدے گھماتے ہوئے بولا۔ ''جیل کی کوٹھری میں دو گھنٹے گزارنے پر تمہارا آئی کیو پچاس پوائنٹ گھٹ گیا ہے۔''

نک بدستور پریشان نظروں سے اپنے کزن کو دیکھتا رہا۔

''تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کچھ بھی نہیں...... رتی بھر بھی نہیں۔ یہ غلطی سراسر کار ڈیلر کی تھی۔ انہوں نے تمہیں غلط کار ڈیلیور کی تھی۔''

''غلط کار؟''

''ہاں!''

''تمہارا مطلب ہے کہ میرے پاس کسی انڈر ٹیکر کی کار آگئی تھی؟ کسی ایسے فرد کی جو تکفین اور تدفین کا کام کرتا ہے؟ یا اس میڈیکل ایگزامنر کے مانند جو ٹیلی ویژن پر آتا ہے۔ اس کا نام کیا ہے...... کوئنسی؟''

''نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے اور اس دوسرے فرد نے ایک ہی وقت میں بالکل ایک جیسی کاریں خریدی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ دوسرا فرد ایک عادی مجرم تھا جس کے الزامات کی فہرست نہایت طویل ہے۔ میرے خیال سے کاروں کی کمپنیاں آج کل اتنی مایوسانہ صورتِ حال سے دوچار ہیں کہ وہ کسی فرد کے سماجی پس منظر کا جائزہ لینے کی زحمت گوارا نہیں کرتیں۔''

ایڈورڈ نے قدرے توقف کیا، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال اس دوسرے فرد نے اپنی ٹیسٹ ڈرائیونگ کے دوران وہ ڈھانچا کار کی ڈکی میں کھسکا دیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ وہی کار خریدنے جارہا ہے۔ بظاہر اس کا خیال تھا کہ وہ ڈھانچا رات بھر کے لیے محفوظ رہے گا کیونکہ کار ڈیلر اس پر کسٹم کروم پلیٹڈ پہیے چڑھانے کے لیے اسے رات بھر اپنے پاس رکھنے کو کہہ رہا ہے۔''

نک منہ پھاڑے اپنے کزن کی بات سن رہا تھا۔

''لیکن ایک گڑبڑ ہوگئی۔ انہوں نے غلطی سے اس فرد کی کار تمہیں دے دی اور تمہاری کار اس فرد کے حوالے کردی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ دونوں کی کار کا میک، ماڈل، کلر سب کچھ ایک ہی جیسے تھے۔'' ایڈورڈ نے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔

گو نک کے ذہن پر چھائی دھند چھٹ چکی تھی اور اس کے ذہن کا ٹیپ فاسٹ فارورڈ ہو کر کار ڈیلر اور کروم وہیل پارٹس سے ہوتا ہوا ایک ہی لفظ پر جا کر رک گیا تھا اور یہی لفظ چھن چھن کر اس کی زبان پر آنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

''عادی مجرم؟''

''ہاں۔ ثابت یہ ہوا کہ اس سے قبل بھی وہ مُردے چوری کرنے کے الزام میں پکڑا جا چکا ہے۔ وہ انسانی جسم کے اعضا میڈیکل اسکولوں کو فروخت کرتا ہے۔''

نک نے بہ مشکل تمام تھوک حلق سے نگلا اور بولا۔ ''اس کا نام رابرٹ اور عرفیت بوبی تو نہیں ہے نا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے یہی نام ہو۔ اگر تم چاہتے ہو تو میں چیک کرلوں گا۔''

نک نے تیزی سے نفی میں گردن ہلادی۔ ''نہیں، میرے خیال سے میں یہ جاننا نہیں چاہتا۔''

وہ گھر پہنچا تو بری طرح تھک چکا تھا۔ وہ سونے کی خاطر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بوبی کا چہرہ بار بار ابھر رہا تھا۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا پھر بالآخر اسے نیند آ ہی گئی۔

لیکن اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنی برانڈ نیو مزدا کار میں بیٹھا جا رہا ہے اور ایک انسانی ڈھانچا اس کی کار ڈرائیو کر رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر صبح تک جاگتا رہا۔

دن نکلتے ہی اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی نئی مزدا کار کو فروخت کرنے کا اشتہار ای بے (e-Bay) پر ڈال دے گا تاکہ بوبی یا اس کا چرایا ہوا مُردہ پھر کبھی اس کے خوابوں میں نہ آئے۔

محفلِ شعر و سخن

❄ عماد وسیم......ٹنڈو الہیار
اس کے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرح ہوں
اتنا ہی بہت ہے کہ وہ بکھرنے نہیں دیتا

❄ عنبرین احمد......بہاولپور
رنج کتنا بھی کریں ان کو زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کر آنے والے
کتنی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

❄ ظفر عباس زیدی......بھوآنہ، چنیوٹ
بیٹھا ہے کس خیال میں اے قلب نامراد
اس گھر میں کون آئے گا جس میں دیا نہ ہو

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
غمِ حیات بنے جب عذاب رستے میں
ترا خیال کھلائے گلاب رستے میں
ہماری یاد کے جگنو سنبھال کے رکھیے
کہیں تو رات پڑے گی جناب رستے میں

❄ مدحت......کراچی
اس شہر میں کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد رہا

❄ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
پاتے ہیں کچھ گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے پتھروں سے بھی خوشبو کبھی کبھی

❄ آصف مطیب......رحیم یار خان
صبح کے تخت نشین شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

❄ جاوید اختر رانا......پاک پتن شریف
بھوک چہروں پہ لیے چاند سے پیارے بچے
بیچتے پھرتے ہیں گلیوں میں غبارے بچے
ان فضاؤں سے تو بارود کی بو آتی ہے
ان فضاؤں میں تو مرجائیں گے سارے بچے

❄ سید عبادت کاظمی......ڈیرہ اسماعیل خان
اس کا ذکر پھر چھیڑو کہ آنسو ٹوٹ کر نکلیں
مجھے دل کے سبھی پردے نمی سے پاک کرنے ہیں

❄ غلام یٰسین نوناری......مظفر گڑھ
شورِ وحشت بھی نہیں، تنگیِ داماں بھی نہیں
مجھ پہ اتری ہے محبت، بڑی تہذیب کے ساتھ

❄ محمد الیاس......لسبیلہ، بلوچستان
کبھی کتابوں میں پھول رکھنا کبھی درختوں پہ نام لکھنا
ہمیں ابھی تک ہے یاد سب کچھ نظر سے حرفِ سلام لکھنا
میرے نگر کی حسیں فضاؤ کہیں جو ان کا نشان پاؤ
تو پوچھنا کہ کہاں بسے وہ کہاں ملے ان کا قیام لکھنا

❄ زرین آفریدی......حیدرآباد
کون کہتا ہے کہ نفرتوں میں درد ہے محسن
کچھ محبتیں بھی بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں

❄ نجمی رحمان......نامعلوم مقام
کھلتے پھولوں کی یہ کہانی دل کو نہ کیوں تڑپائے بہت
شاخوں پہ کم کم کھلنے پائے ہاتھوں میں مرجھائے بہت

❄ عبدالجبار رومی انصاری......چوہنگ سٹی، لاہور
نالہ حدود کوئے رسا سے گزر گیا
اب درد دل علاج و دوا سے گزر گیا
ان کا خیال بن گئیں سینے کی دھڑکنیں
نغمہ مقامِ صورت و صدا سے گزر گیا

❄ زاہد احمد......شادمان ٹاؤن کراچی
جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تیری عاقبت سنوار چلے
مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......ڈاہرانوالہ
آپ کا کیا جائے گا کہ خواب میں آؤ گے تم
نیند آنکھوں سے ہماری رات بھر اڑ جائے گی

❄ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
حد سے توقعات زیادہ کیے ہوئے
بیٹھے ہیں دل میں ایک ارادہ کیے ہوئے
اس دشتِ بے وفائی میں جائیں کہاں کہ ہم
ہیں اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیے ہوئے

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر یہ معاویہ......خانیوال
در و دیوار ہیں، مکان نہیں
واقعہ ہے، یہ داستان نہیں
وقت کرتا ہے ہر سوال کو حل
زیست مکتب ہے امتحان نہیں

❄ احمد حسن عرشی خان......قبولہ شریف
راہ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے رشک غزالاں سب جانے پہچانے ہیں

❄ محمد شہباز اکرم نوئی......ڈھپئی، پاک پتن شریف
دوسری بار بھی ہوئی تو تم ہی سے ہوتی دلنشیں
میں بالفرض محبت جو دوبارہ کرتا

❄ عمر فاروق بھٹی......نور شاہ، ساہیوال
بجھتے ہوئے دیے کو بچا تو لیا مگر
دیکھی گئی نہ ہم سے ہوا کی شکست بھی

❄ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صبح کا بھولا مگر نہیں آیا
کسی چراغ نے پوچھی نہیں خبر میری
کوئی بھی پھول مرے نام پر نہیں آیا

❄ وردا، آریز ملک......گلستان جوہر، کراچی
ہم تو اسیرِ خواب تھے تعبیر جو بھی تھی
دیوار پر لکھی ہوئی تحریر جو بھی تھی
ہر فرد لاجواب تھا، ہر نقش بے مثال
مل جل کے اپنی قوم کی تصویر جو بھی تھی!

❄ اعجاز احمد......اسلام آباد
منظر کے اردگرد بھی اور آرپار دھند
آئی کہاں سے آنکھ میں یہ بے شمار دھند!
کیسے نہ اس کا سارا سفر رائیگاں رہے
جس کاروانِ شوق کی ہے راہ گزار دھند!

❄ ظفر اقبال ظفر......کامرہ شرقی
کچھ اس طرح لٹا ہے گلستان آرزو
اب تو دل کانپتا ہے بہاروں کے نام سے

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
مر گئی ہے محبت یہ لوگ کہتے ہیں
آؤ ہم تم مل کے اسے زندہ کردیں

❄ امتیاز احمد......منڈی بہاؤالدین
سکون گروی ہے اس کے پاس
محبت قرض لی تھی جس سے

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
آنکھوں کا رنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا!
کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے پہ نقش
پھر یوں ہوا کہ خود مرا چہرا بدل گیا

❄ اکرم علی......سکھر
تم ترکِ تعلق کا کہیں ذکر نہ کرنا
میں لوگوں سے کہہ دوں گا کہ فرصت نہیں ملتی

❄ عظیم افتخار......سرگودھا
کبھی کبھی کے تصور سے جی نہیں بھرتا
میرے خیال میں آؤ تو بار بار آؤ

❄ اشفاق شاہین.... لاہور

پائے جنوں کو وسعتِ صحرائے دل بہت
پھرتے رہے ندامتِ فرزانگی لیے

❄ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ

وہ جس قدر بھی منافق ہے پر یہ کہتا ہے
بچھڑنا ہم سے مگر پھر بھی سلسلے رکھنا

❄ داؤد اشفاق......اوکاڑہ

میں سمندر ہوں، جو کرتا نہیں توہینِ وفا!
چاند کے ساتھ ہی، ساحل سے اتر جاتا ہوں

❄ ملائکہ حریم......اوکاڑہ

شاید ادھر سے قافلہ رنگ و بو گیا
خوشبو کی سسکیاں ہیں ابھی تک ہواؤں میں

❄ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی

طاقت فریاد بھی مجھ میں نہ باقی رہ گئی
ظلم کرنا آپ کو مجھ پر اب آسان ہوگیا

❄ وزیر محمد خان......بٹل ہزارہ

منزل نہ دے چراغ نہ دے حوصلہ تو دے
تنکے کا ہی سہی تو مگر آسرا تو دے

❄ محمد شہباز ناز......گجر کالونی، سرگودھا

ہم دعا لکھتے رہے وہ دغا پڑھتے رہے
ایک نقطے نے محرم سے مجرم بنا دیا

❄ شبیر نازش......کراچی

میں ہوں آزار محبت میں وہاں پر کہ جہاں
آہ بھی زخم کی تشہیر نظر آتی ہے

❄ اسما ممتاز......کراچی

اگر میں آؤں گا صدیوں کی عمر لاؤں گا
کہ تیرے پاس مجھے مختصر نہیں رہنا

❄ مہتاب احمد......حیدر آباد

جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
دنیا، ارے یہ دنیا تو برباد ہووے گی

❄ انعم کمال......حیدر آباد

اسے دیکھوں تو بس اس کو دیکھتا جاؤں
وہ حسنِ خاص بڑے کروفر میں رہتا ہے

❄ ناہید یوسف......اسلام آباد

حبس ایسا ہے کہ دل ڈوب رہا ہو جیسے
چھوڑ آئیں کسی جنگل میں "ہوائیں" خود کو

❄ اویس احمد......ملتان

کتنی صدیوں میں ہوا یہ احساس
کوئی مجھ سے نہیں بہتر میرا

❄ سہیل احمد......سکھر

غبار راہ گزر ٹھہرا ہوں میں اس کی محبت میں
بتا اس سے زیادہ کیا مری تشکیل ممکن ہے

❄ نازش علی......ٹنڈو الہیار

کبھی کبھی تو یقیں سے بھی کوئی بات کرو
ہر اک مقام پہ کرتے نہیں ہیں اندازہ

❄ ممنون خان......چیچہ وطنی

اس سے آسان نہ تھی رسم تعارف بھی مگر
بات کو آگے بڑھانے میں بہت دیر لگی

❄ مرینہ احمد...... بہاولپور

اپنے ہی گھر میں رہتے ہوئے بے ہنر تھی میں
آنگن میں جیسے اک شجر بے ثمر تھی میں

❄ نعمان علی خان......جھنگ سٹی

موسم کے تغیر نے تقدیر سے پوچھا ہے
ان خانہ بدوشوں نے کیوں کوچ کی ٹھانی ہے

❄ پرویز خان......نواب شاہ

ہے ابر کیوں تنا ہوا کہ بستیاں تو بہہ چکیں
کہ گر چکی ہیں بجلیاں، یہ ہجر رتوں کا دور ہے

❄ مبشر زیدی......لاہور

اس شہر کے قاضی کا عجب حال ہے لوگو!
خود جرم پہ اکساتا ہے، دیتا ہے سزا بھی

حیرت کدہ

نصرت شاہنواز

یہ دنیا حیرت کدہ سے کم نہیں ہے اور زندگی کا کوئی بھی روپ اورانداز ہو... کوئی نہ کوئی پہلو حیرت میں ڈال دیتا ہے جیسا کہ اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ ذہن میں بے شمار سوالات کا طوفان اٹھا گیا... کہیں جانور انسان سے برتر ہے اور کہیں انسان، انسان کے ساتھ جانوروں والا سلوک کرتا دکھائی دیتا ہے... آخر کیوں...!

قدم قدم پر مایوسی اور امید کے درمیان ہونے والی جنگ کا احوال

آج دو مہینے ہونے کو آئے تھے اور ابھی تک کوئی کیس ہاتھ نہ آیا تھا۔ پرائیویٹ جاسوس فولادی کی سیکریٹری بھی اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ آخر کوئی کب تک تنخواہ ملنے کی صرف امید پہ کام کرتا رہتا۔ فولادی ابھی دفتر بند کر کے جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ہلکی سی دستک کے بعد دروازہ کھل گیا۔ آنے والا شخص کوئی پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا، خاصا صحت مند اور خوش حال بھی دکھائی دیتا تھا۔ سر سے پاؤں تک اجنبی کا جائزہ لینے کے بعد فولادی کو ایک

خوشگوار سا احساس ہوا، گویا کوئی تگڑی اسامی آئی ہے۔ آنے والے نے خود ہی آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔

''میرا نام کریم مشین والا ہے۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟''

فولادی نے مصافحہ کر کے تیزی سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہیں ضرور، ضرور۔'' لیکن دوسرے لمحے ہی فولادی کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی کیونکہ جلد ہی کریم مشین والا کے قیمتی کالے سوٹ پر کرسی کی دھول کی چھاپ بہت واضح تھی۔

''میں نے آپ کا ایڈریس ٹیلی فون ڈائریکٹری سے دیکھا تھا۔ مجھے کسی غیر معروف جاسوس کی ضرورت ہے اور میرا خیال ہے آپ کو یہاں کوئی نہیں جانتا۔'' کریم نے دھیرے لہجے میں اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

فولادی کو یہ سن کر اگرچہ اپنی توہین کا احساس ہوا لیکن اگر غیر معروف ہونے سے بھی کام مل سکتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ''کہیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' فولادی نے جیسے غیر معروف ہونے کی بات سنی ہی نہیں۔

''بات یہ ہے کہ میری بیٹی کا کتا مر گیا ہے، بلکہ مار دیا گیا ہے یعنی اس کا قتل ہوا ہے۔'' سیٹھ کریم نے وضاحت کی۔

فولادی کو سخت مایوسی ہوئی گویا اب وہ کتوں کا جاسوس ہے۔ ''مگر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟'' فولادی نے قدرے بیزاری سے کہا۔

''مجھے قاتل کا پتا لگانا ہے۔'' سیٹھ کریم نے گویا اپنے آنے کا مقصد واضح کر دیا۔

''بھلا، اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ کتا تھا مر گیا، دوسرا لے آئیں۔'' تفصیل جان کر فولادی کو کیس میں کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔

''نہیں...... وہ کتا شیکی بہت خاص تھا۔ میری بیٹی اسے امریکا سے لائی تھی۔ وہ اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھی اور اب بھی بڑی مشکل سے کھلانا پڑتا ہے۔'' سیٹھ کچھ غمگین ہو گیا۔ معلوم نہیں کتے کے غم میں یا پھر بیٹی کے کھانا نہ کھانے سے۔ فولادی کا دل چاہا کہہ دے، تو پھر کھانا اسے بھیج دیا کریں مگر افسوس ایسا ممکن نہ تھا۔

''آپ نے پولیس کو اطلاع نہیں کی؟'' فولادی نے اس بار تفتیشی انداز سے پوچھا۔

''کی تھی مگر پولیس کو انسانوں کے قاتلوں سے فرصت نہیں، کتے کے قاتل کو ڈھونڈنے کا ان کے پاس وقت کہاں ہے اور پھر لوگ کیا کہیں گے۔'' سیٹھ کریم نے فولادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پاگل!'' فولادی نے دل ہی دل میں جواب دیا۔

''اچھا اب بتاؤ کام کب شروع کر رہے ہو؟'' سیٹھ نے اچانک کاروباری رویّہ اپنا لیا۔ گویا اسے معلوم تھا کہ فولادی انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور پھر یہ تو خود اس کی اور دفتر کی حالت بتا رہی تھی۔ پھر سیٹھ کریم نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ کافی سمجھدار بزنس مین نظر آتا تھا، اس لیے فولادی کو بہانہ بنانا بے کار لگا۔ فولادی نے کچھ سوچنے کی اداکاری کی جس کے جواب میں سیٹھ کریم نے دس ہزار نکال کر میز پر ڈال دیے۔

''یہ فیس نہیں، اخراجات کے لیے ہیں۔ فیس کام ہونے پر ملے گی۔'' سیٹھ کریم کھڑا ہو گیا۔ ''کل کوٹھی پر آ جانا۔ اس کارڈ پر میرا ایڈریس اور فون نمبر ہے۔'' سیٹھ کریم نے میز پر ایک کارڈ رکھ دیا اور پھر فولادی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔ ''آج اپنا اور دفتر کا حلیہ ٹھیک کر لو۔ شاید میری بیٹی بھی تمہارے دفتر آئے تو اسے یہ سب......''

سیٹھ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''اور ہاں، فون کا بل بھی آج ہی ادا کر دو تاکہ یہ کل سے کام شروع کر دے۔'' یہ کہہ کر سیٹھ کریم نے باہر کا رخ کیا۔

فولادی کو یہ توہین آمیز رویّہ ذرا پسند نہ آیا مگر مجبوری میں انسان کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے اور یوں بھی سیٹھ کریم نے غلط تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

سیٹھ کے جانے کے بعد فولادی نے سب سے پہلے چکن روسٹ اور مٹن بریانی سے پیٹ کی آگ بجھائی پھر دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

فولادی درمیانے قد کا جوان آدمی تھا مگر جاسوسی کو پیشہ بنانے کے چکر میں وہ کافی خوار ہو چکا تھا۔ جب اللہ دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے بس اسی امید پر وہ دفتر چلا رہا تھا۔ کبھی کبھار چھوٹے موٹے کیس مل جاتے یا پھر باپ کے چھوڑے ہوئے دو مکان تھے جن کے کرائے سے زندگی کی گاڑی گھسٹ رہی تھی اور اب یہ کتا کیس فولادی کے حلق سے نہیں اتر رہا تھا مگر کیس لانے والا کافی دولت مند نظر آتا تھا بس اسی بات نے فولادی کو بھی یہ کیس لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

فولادی کا خیال تھا کہ کتے نے کوئی زہریلی چیز کھا لی ہوگی جو پوسٹ مارٹم سے معلوم ہو جائے گا مگر فولادی کو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی بلکہ کتے کو

باقاعدہ زہر کا انجکشن دیا گیا تھا۔

دوسرے دن فولادی نئی جینز اور جیکٹ میں ملبوس کوٹھی پہنچ گیا۔ کوٹھی واقعی اپنے مکینوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

فولادی کا تعارف سب نوکروں سے کروایا گیا اور کتے کی خادمہ سوزن سے بطور خاص کروایا گیا جو مستقل روئے جارہی تھی اور بار بار آنکھیں پونچھے جاتی اور کہے جاتی۔ "ہم کو کچھ نہیں معلوم صاحب، ہم کچھ نہیں جانتا۔"

تنگ آکر فولادی نے زور سے کہا۔ "نہیں معلوم تو خاموش رہو۔" یہ سنتے ہی وہ اچانک خاموش ہوگئی اور بالکل نارمل نظر آنے لگی۔

"مگر جناب! آپ کی بیٹی سے بھی تو ملاقات بہت ضروری ہے۔" فولادی نے سیٹھ کریم کی توجہ کیس کے سب سے اہم رکن کی طرف مبذول کروائی۔

"میں یہاں ہوں" کی آواز پر فولادی نے مڑ کر دیکھا تو بیس بائیس سال کی دبلی سی ایک لڑکی کالے لباس میں کھڑی تھی۔ سوجی ہوئی آنکھیں اور بغیر میک اپ کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ ابھی کتے کا سوگ جاری ہے۔

"میرا نام ماریہ ہے اور میرے ہی شیکی کا قتل ہوا ہے۔" وہ یہ کہتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اور مجھے قاتل جلدی چاہیے۔" ماریہ نے آنکھوں میں تیرتی نمی کو ٹشو پیپر سے صاف کیا۔ "پوچھیں کیا پوچھنا ہے؟" ماریہ نے سوالیہ نظروں سے فولادی کی طرف دیکھا۔

یہاں روز ہی ہزاروں انسان، دوسرے انسانوں کے ظلم کا شکار ہو کر مرجاتے ہیں اور ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ فولادی کو سادگی اور معصومیت کے باوجود، ماریہ کا کتے کے لیے رونا اچھا نہ لگا۔ کتا آخر کتا ہے مگر فولادی نے فوراً ہی ان خیالات کو جھٹک دیا۔ مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔

☆☆☆

فولادی اپنے نسبتاً صاف ستھرے دفتر میں بیٹھا نوکروں کی لسٹ اور کتا قتل کے دن کے تمام واقعات پر غور کررہا تھا۔ باورچی اور اس کا معاون تو شکل ہی سے... بےوقوف نظر آتے تھے۔ ان سے کسی منظم سازش کی امید کرنا بےکار تھا۔ سوزن اور ماریہ بھی کوئی قابل ذکر بات نہ بتا سکی تھیں سوائے اس کے کہ شیکی تمام دن یا تو ماریہ کے ساتھ تھا یا پھر سوزن کے ساتھ۔ سوزن کی تو نوکری ہی شیکی کے دم سے تھی۔ جبکہ بیگم صاحبہ سارے معاملے سے الگ تھلگ ہی نظر

آتی تھیں۔ انہیں اپنا سوشل سرکل ہی دنیا کا سب سے اہم نظر آتا تھا۔ ڈرائیور عبداللہ کی پہنچ گیراج، کار اور اپنے کوارٹر تک تھی، اسے کوٹھی کے کسی دوسرے حصے میں جانے کی اجازت نہ تھی، یوں بھی شیکی صرف گھر والوں اور سوزن سے مانوس تھا۔ دوسرے ملازموں کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ فولادی کو کہیں بھی کوئی کمزور نکتہ نظر نہ آیا۔

ایک بار پھر فولادی کوٹھی کے لان اور کمروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ نوکروں سے اس نے ایک بار پھر سوالات کیے۔ اس دن باہر سے آنے والوں کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی۔ سب نے ایک ہی بیان دیا کہ بیگم صاحبہ کے کچھ ملنے والے آئے تھے جو ڈرائنگ روم ہی سے چلے گئے تھے اور سب ان کی جان پہچان والے لوگ تھے۔ کوئی نیا فرد نہ تھا اور یوں بھی شیکی کو مہمانوں سے نہیں ملایا جاتا تھا کیونکہ وہ اجنبیوں کی صحبت پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ بات ماریہ نے فولادی کو بتائی۔

''جب میں اپنی دوست شہناز کے پاس جاتی تو بھی شیکی سوزن کے ساتھ گاڑی ہی میں رہتا تھا۔ اصل میں وہ بہت شرمیلا تھا۔'' ماریہ نے بڑے پیار سے کہا مگر فوراً ہی شیکی کی یاد میں ماریہ کے چہرے پر دکھ کے تاثرات ابھر آئے۔

''ہوسکتا ہے آپ کا کوئی دشمن ہو۔ ایسا دشمن جو صرف آپ کو ذہنی اذیت دینا چاہتا ہو۔'' فولادی نے سیٹھ کریم اور ماریہ کو مشورہ دیا کہ وہ ان خطوط پر بھی سوچیں مگر دونوں ہی انکار میں گردن ہلا کر رہ گئے۔

کئی دن گزرنے کے بعد بھی فولادی کے ہاتھ کوئی سراغ نہ لگا، اب تو فولادی مایوس ہونے لگا تھا۔ شام کے وقت فولادی سیٹھ کریم سے کوٹھی کے لان میں بیٹھا کیس کے بارے میں ہی گفتگو کر رہا تھا کہ اندر سے ایک ملازم بھاگتا ہوا آیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''صاحب! بیگم صاحبہ کی حالت خراب ہے۔ لگتا ہے شوگر لیول بہت گر گیا ہے۔''

''جلدی سے انجکشن لاؤ۔'' سیٹھ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''صاحب! گھر پر کوئی سرنج نہیں ہے۔'' ملازم نے تقریباً سہمتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بے پروائی ہے۔ عبداللہ سے کہو کہ فوراً سرنج لے کر آئے۔'' اور سیٹھ جلدی جلدی چلتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔

فولادی کی سمجھ میں نہ آیا کہ واپس چلا جائے یا پھر اندر جائے یا یوں ہی لان میں بیٹھا رہے۔ بہرحال وہ لان ہی میں بیٹھ گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد سیٹھ کریم باہر آیا۔ ''شکر ہے جان بچ گئی۔ اگر عبداللہ پھرتی نہ دکھاتا تو آج بیگم تو گئی تھیں جان سے۔'' سیٹھ کریم نے سکھ کا لمبا سانس لیا۔ فولادی نے بھی خدا کا شکر ادا کیا اور رخصت لے کر اپنے فلیٹ کی جانب چل دیا۔

آج فولادی کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔ کیا قسمت اس پر کبھی مہربان نہ ہوگی یا وہ ہے ہی نالائق لیکن دوسری بات ماننے کو اس کا دل نہ چاہا۔

فولادی نے ایک بار پھر گھر کے ملازموں کی فہرست پر نظر ڈالی۔ جانے کیوں عبداللہ پڑھتے ہی وہ رک گیا۔ کوئی بات تھی جو اسے پریشان کر رہی تھی پھر اچانک ہی اسے یاد آیا جب سیٹھ کے گھر سرنج کی ضرورت پڑی تھی جو عبداللہ ہی نے دی تھی لیکن فولادی کو اچھی طرح یاد تھا کہ تینوں گاڑیاں سامنے پورچ میں ہی کھڑی تھیں اور عبداللہ بازار نہیں گیا تھا...... تو کیا عبداللہ کے پاس گھر ہی میں سرنج تھی؟ فولادی فوراً تیار ہو کر سیٹھ کریم کے گھر پہنچ گیا۔

بڑی احتیاط سے تلاشی لینے پر بھی عبداللہ کے کمرے سے کوئی قابلِ ذکر چیز برآمد نہ ہوئی، صرف چند کاغذ کے ٹکڑے تھے جن پر غالباً کچھ ٹیلی فون نمبرز لکھے تھے۔ فولادی نے نمبروں کی چھان بین کی تو ایک نمبر ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کے لیب اسسٹنٹ کا تھا۔ ایک نمبر پاس کی ایک کوٹھی کا تھا۔ ان کوٹھی والوں کا سیٹھ کریم کے گھرانے سے کوئی میل جول نہ تھا، شاید ان کے کسی ملازم سے عبداللہ کی دوستی ہو۔ فولادی نے پہلے کوٹھی والوں کی چھان بین کی ٹھانی۔ ایک دن میں فولادی نے پتا لگا لیا کہ کوٹھی والوں کی ایک خادمہ اپنے مکینوں کے دو اور ساتھ کی کوٹھی والوں کے تین کتے روزانہ شام کو ٹہلانے لے جاتی ہے اور زیادہ حیرت فولادی کو اس وقت ہوئی جب فولادی نے عبداللہ کو خادمہ سے ملتے اور نہایت دوستانہ انداز میں باتیں کرتے دیکھا۔

فولادی کو آج ایک اسسٹنٹ کی ضرورت بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ آخر سیٹھ کریم نے اسے اپنا ایک آدمی مہیا کر دیا جس کے ذمے فولادی نے عبداللہ کی جاسوسی لگا دی۔ اب اندھیرے میں تیر چلانے والی بات تھی۔ فولادی نے لیب اسسٹنٹ کو فون کیا اور کہا اسے معلوم ہوا ہے کہ وہ جان لیوا ادویات چوری کر کے فروخت کرتا ہے۔ اس کا تیر نشانے پر لگا لہٰذا فولادی نے زبان بند رکھنے کی بھی قیمت مانگی۔ لیب اسسٹنٹ کافی بزدل ثابت ہوا اور منت ساجت

کرنے لگا مگر فولادی نے اسے پولیس کی دھمکی دی تو وہ مان گیا۔ فولادی نے اسے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ توقع کے عین مطابق اس نے فوراً عبداللہ سے رابطہ کیا جس کی اطلاع سیٹھ کے آدمی نے فولادی کو دے دی۔ اب سب کچھ ظاہر ہو چکا تھا مگر عبداللہ نے یہ سب کیوں اور کب کیا؟

فولادی ایک بار پھر سیٹھ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا عبداللہ، ماریہ اور سوزن سے سوال جواب کر رہا تھا۔ حسبِ معمول سوزن نے رونا شروع کر دیا۔ ''ہم نے کچھ نہیں کیا صاحب...... ہم بے قصور ہے۔'' تو فولادی نے اسے پولیس کی دھمکی دے کر اسے ساری روداد پھر سے سنانے کے لیے کہا۔ جب سوزن نے بتایا کہ شام کو وہ، ماریہ اور شیکی، ماریہ کی دوست شہناز کے گھر گئے تھے تو فولادی چونک پڑا۔

''کیا گاڑی ماریہ چلا رہی تھی؟''

''نہیں صاحب! عبداللہ لے کر گیا تھا۔ جب ماریہ بی بی اندر چلی گئیں تو میں شیکی کے ساتھ لان ہی میں بیٹھ گئی۔ عبداللہ فیکٹری چلا گیا تھا۔ ہم سارا وقت شیکی کے ساتھ تھا کہیں نہیں گیا۔'' سوزن کے سارا وقت پر زور دینے کو فولادی نے فوراً محسوس کر لیا۔

فولادی نے عبداللہ کے فیکٹری جانے اور واپس آنے کے ٹائم کا حساب کیا تو ایک گھنٹا کہیں بھی نہیں کھپتا تھا مگر عبداللہ صاف مکر گیا۔

''صاحب! آپ کو معلوم نہیں پانچ اور چھ کے بیچ کتنا ٹریفک ہوتا ہے ایک گھنٹا تو یونہی نکل جاتا ہے۔'' مگر عبداللہ کی بات، فولادی کو ہضم نہ ہوئی۔

فولادی نے سوزن سے دوبارہ تصدیق کی کہ شیکی، عبداللہ سے مانوس نہیں تھا اور اسے اپنے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔

فولادی نے سوزن کی طرف گھور کر دیکھا۔ ''کیا تم نے شیکی کو بالکل اکیلا نہیں چھوڑا تھا؟'' سوزن نے پھر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ''میں صرف پانی پینے اندر گئی تھی شیکی کو چھوڑ کر۔''

فولادی نے شہناز کے گھر کا رخ کیا۔ پولیس کی دھمکی اور چند سوالات کے بعد خانساماں ایاز نے جلد ہی قبول کر لیا کہ جب بھی ماریہ یہاں آتی تھی تو سوزن بھی ساتھ ہوتی، اس طرح ان کی دوستی ہو گئی اور اس دن بھی وہ کوارٹر میں ہی تھے جب عبداللہ واپس آیا۔ اسے معلوم ہو گیا اور وہ ہمیں بلیک میل کرنے لگا۔ اگر وہ ہماری شکایت کرتا تو دونوں کی نوکری چلی جاتی۔ اس لیے ہم اسے ہر مہینے ایک مخصوص رقم دینے پر راضی ہو گئے۔

مگر عبداللہ نے شیکی کو انجکشن کیسے دیا، اس سوال کا جواب سوزن سے مل گیا۔

''صاحب! میں روتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تو عبداللہ نے کہا کہ وہ اس کے لیے پانی لائے۔ جب شیکی اس کے پیچھے آنے لگا تو عبداللہ نے کہا کہ شیکی کو گاڑی ہی میں چھوڑ کر جاؤ۔ صاحب! میں نے شیکی کو گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ میری بات سمجھتا تھا پھر ماریہ بی بی بھی آ گئیں اور ہم گھر آ گئے۔ اسی رات شیکی مر گیا۔''

سیٹھ اتنی دیر میں پولیس کو فون کر چکا تھا۔ عبداللہ جواب تک بظاہر مطمئن کھڑا تھا، پولیس کو دیکھتے ہی پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

''تم بہت چالاک ہو فولادی مگر میں نے جو کیا میں اس کے لیے خوش ہوں۔ یہ لوگ کتوں کے لیے تو روتے ہیں مگر انسانوں پر ظلم کرتے ہوئے ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ کیا تم لوگوں نے بچوں کو کچرے میں گلے سڑے پھل چن کر کھاتے دیکھا ہے؟ کیا تم نے کسی بچے کو کتے سے روٹی چھین کر کھاتے دیکھا ہے؟ میں نے دیکھا نہیں، کھائی ہے۔ مجھے ان کتوں اور کتے رکھنے والوں دونوں سے نفرت ہے جو اپنے کتوں کو تو امپورٹڈ بسکٹ کھلاتے ہیں مگر اپنی کوٹھیوں کے آس پاس ان کو بھوک سے بلکتے بچے دکھائی نہیں دیتے۔ کتے تو ایئر کنڈیشن میں سوتے ہیں اور انسانوں کو چھت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ گٹروں کے آس پاس رہتے بچوں اور انسانوں کو بیماریوں سے مرتے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں آتے۔ جایئے فولادی صاحب! کونے والی کوٹھی میں جایئے۔ وہاں بھی لوگ دو کتوں کا ماتم کر رہے ہوں گے۔'' عبداللہ چیختا رہا اور سب حیرت زدہ اسے دیکھتے رہے۔

پولیس آئی اور عبداللہ، سوزن اور ایاز کو پکڑ کر لے گئی۔ سوزن اور ایاز کو تو پولیس نے چھوڑ دیا۔ عبداللہ پر کیس چلا اور اسے آخر کار پاگل قرار دے کر دماغی اسپتال بھیج دیا گیا۔ لیب اسسٹنٹ کو دو سال کی قید ہوئی مگر فولادی سوچ رہا تھا کہ دماغی علاج کی کس کو ضرورت ہے؟ ان کو جو کتوں کو انسانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور انسانوں سے کتوں جیسا سلوک کرتے ہیں یا پھر ان انسانوں کو جو کتے جیسے سلوک کو برداشت کرتے کرتے دماغی مریض بن جاتے ہیں؟

آخری قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت واحترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن وعشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین وسنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ وآہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی صداقتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا تیمر و اور چاچی متی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برباد کرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف تجلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مر مٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ، جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹمی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ مراد نے مرینہ کو قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ مرینہ اور مراد میں پھر ان بن ہوگئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرالیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوادیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کرلیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوالیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِاقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہوجاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک

حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارضِ اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی منگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہوگیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ عابی دو اغوا کاروں کے ساتھ دنیا دیکھنے خود چلا گیا۔ عابی رومانیہ آگیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ماروی اچانک انتقال کر گئی۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی جس کا نام ماروی رکھا گیا۔ وہ بچی حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی۔ مراد نے ماسٹر کو بوبو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کرلیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرالیے۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمے داری عابی کے سپرد کردی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھا لیا۔ عابی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ مگر وہ انجان دشمن عابی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان تون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابی کی غیر معمولی طاقت کے زیرِ اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ تاریک دنیا کی ایک لڑکی نیلماں دینِ اسلام کی طرف مائل ہو کر عابی کی مددگار بن گئی۔ وہ جب چاہتی تھی ٹرانسپیرنٹ ہو کے غائب ہو جاتی تھی۔ نیلماں نے عابی کی مدد کر کے ان تون کو پکڑوا دیا تاہم نیلماں کا باپ باروو اسے عابی کے شکنجے سے نکال کر لے گیا۔ شیطان کو ماننے والی اور اس کی پرستش کرنے والی لارا نامی عورت نے پھانس کر مراد سے نکاح کرلیا تاہم نیلماں کی بدولت مراد پر اس کی اصلیت کھل گئی۔ لارا مراد کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مراد اپنے ہونے والے بچے کو شیطان کے سائے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ نیلماں کو لارا کے متعلق آگہی ملی۔ اس نے مراد کو لارا کے پاس پہنچا دیا۔ لارا نے اپنے بچاؤ کے لیے مراد پر گولی چلائی مگر نیلماں سامنے آگئی۔ وہ جان سے گئی۔ مراد کی گولی سے لارا زخمی ہوئی مگر اس کے ہاتھ نہ آسکی۔ لارا نے ایک لڑکے کو جنم دیا اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مراد کو کوئی دوسرا بچہ حوالے کر دیا۔ عابی کو ایک لڑکی پسند آگئی اور اس نے اس سے شادی کرلی۔ ادھر لارا کی خدمات پر مامور جادوگر نے لارا کو شکنجے میں لے لیا۔ اس نے عابی اور ماروی سے مدد مانگی۔ عابی نے جادوگر کو ہلاک کردیا۔ اس نے حیرت انگیز قوتوں کی مالک چار عورتوں سے شادیاں کرلیں۔ عابی کو زہر دے کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ادھر شیطان نے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ناکارہ کر دیا تھا اور اس نے لارا کو افریقا پہنچا دیا تھا، دانش اور ماروی اس تک پہنچ نہیں پا رہے تھے کیونکہ اس کی شخصیت بدل دی گئی تھی۔ شیطان کے چیلے نے مراد پر حملہ کیا اور مراد شدید زخمی ہوگیا۔ مراد بے ہوش تھا۔ ماروی کو آگاہی ملی کہ مراد کا علاج ایک غار میں ہوگا۔ ماروی، مراد کو تبت لے گئی۔ دشمن بھی اس کے پیچھے وہیں پہنچ گئے۔ وہ مراد کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ دشمن ارضِ اسلام پر حملہ کرنے کے در پے تھے۔ یہ کڑی آزمائش کا وقت تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے...... کبھی یہ آزمائش ان لوگوں پر بھی آجاتی ہے جنہیں اللہ سنبھلنے کا موقع دینا چاہتا ہو...... اور غریب کی آزمائش اس کی غربت میں اور امیر کی اس کی امارت میں آتی ہے...... تاکہ وہ اس قادر مطلق کو یاد کریں۔

ارضِ اسلام کے نیک باسیوں پر یہ آزمائش ان کا ایمان پاک کرنے کے لیے آئی تھی...... اور وہ اس پر بھی شاکر تھے۔ اور دعاگو بھی تھے کہ اللہ انہیں، ابلیسی قوتوں کے آگے فتح مبین نصیب فرمائے......

ادھر دشمن ارضِ اسلام پر مشترکہ دھاوا بولنے کی عملی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ صیہونی تنظیمیں .... اور کریگ ہوسٹن کی سیکنڈ اینڈ کمانڈ میں جدید ہتھیاروں اور فل آٹومیٹک آرمڈ آرٹلری اور انفنٹری افواج کے علاوہ سپرسانک میزائل بردار جیٹ طیاروں سمیت ارضِ اسلام پر جنگ کا بگل بجا دیا گیا۔

روشن دنیا کے باسیوں کو اس کی خبر تو پہلے ہی سے ہوگئی تھی اور انہوں نے اقوام متحدہ کے عالمی امن فورم میں اس جارحیت کے خلاف احتجاج کے ساتھ مدد کی بھی درخواست کی تھی جس سے بڑی مجرمانہ قسم کی چشم پوشی کی گئی۔ کیونکہ یہاں بھی ایک بڑے دشمن سپر پاور کا ہی اثر و رسوخ چلتا تھا۔

ادھر وار زون کے بیس کیمپ میں ہمزاد اور زیب النساء اپنی آرمی کے ساتھ موجود تھے! ان کے ہمراہ اتحادی بھی تھے، جن میں گھاگھرا پلٹن کے سوا ماسٹر کو بوبو، ریڈ آرمی کی افواج بھی شامل تھیں۔

کریگ ہوسٹن اور یہودی حکمرانوں نے جنگ کا بگل تو بجا دیا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ یہ لوگ ابھی تک اندر سے ایک انجانے خوف کا بھی شکار تھے۔

بہرکیف ...... بگل بج چکا تھا، دشمن طیارے سرحدوں

سے پرواز کر چکے تھے۔ایک قریبی اتحادی (دشمن) ملک میں جنگی بیس کیمپ قائم کیا جاچکا تھا، جدھر آرٹلری اور انفنٹری افواج کو روانہ کیا جاچکا تھا۔

گھمسان کا رن پڑا۔ بلاشبہ ارض اسلام کی عسکری و افرادی قوت دشمن کے مقابلے میں کئی گنا کم تھی مگر ان کی ایمانی قوت اور کوہ شکن حوصلے ہی ان کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ ان کا اپنے اللہ پر یقین کامل تھا کہ وہ اسلام دشمنوں اور امِ مسلمہ پر وحشیانہ جارحیت کرنے والوں کو منہ توڑ جواب دیں گے۔

جنگ ابھی وارزون تک محدود تھی۔ ارضِ اسلام کے سپاہی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ ہمزاد ان کی کمانڈ کر رہا تھا۔ زیب النساء جائے نماز پر بیٹھی اللہ سے فتح مبین کے لیے دعاؤں میں مشغول تھی۔

خبریں آرہی تھیں کہ دشمن اور ان کے اتحادی بہت جلد ''وارزون'' کو سویپ کرتے ہوئے ارضِ اسلام کی سرحدوں میں داخل ہونے والے ہیں۔ چند طیارے ارض اسلام کی سرحدوں کو پار کر آئے تھے اور گولہ باری کی تھی جس کے نتیجے میں آبادی میں خاصی تباہی اور بے گناہ انسانی جانوں کا زیاں ہوا تھا۔ سماعت شکن دھماکوں سے ارضِ اسلام کی سرحدیں اور زمین لرز اٹھی۔ روشن دنیا کی افواج اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمن افواج سے بڑی بے جگری سے لڑ رہی تھی مگر نظر یہی آرہا تھا کہ دشمن غالب آتے جارہے تھے۔

ہمزاد پریشان ہونے لگا تھا۔ وارزون سے ان کا قبضہ ختم ہونے لگا تھا۔ وہ پیچھے کی طرف دھکیلے جارہے تھے جبکہ دشمن طیارے پہلے ہی ارض اسلام کی سرحدوں کو پار کر چکے تھے۔

مصلے پر بیٹھی فتح کی دعائیں مانگتی ہوئی زیب النساء کے کانوں تک بھی دھماکے سنائی دے رہے تھے، وہ متوحش اور تشویش زدہ ہوگئی تھی۔ دشمن بزدل مگر چالاک اور مکار ثابت ہوا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب ارضِ اسلام اپنے دو بڑے سپوتوں سے محروم ہو چکا تھا، دشمنوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ عابی کی رحلت اور مراد کی قریب المرگ ہیئت کذائی کسی بھی طرح ارض اسلام کے مفاد میں نہ تھی اور یہی کمزوری، شاید دشمن کی طاقت بننے لگی تھی۔

شکست قریب نظر آرہی تھی، کسی بھی وقت وسیع تر تباہی اور بے گناہ ہلاکتوں سے بچنے کے لیے سرینڈر کیا جانے والا تھا...... ہمزاد دکھ بھرے چہرے اور آنسوؤں کے ساتھ زیب النساء کے پاس پہنچا۔ وہ اس سے آخری یہی مشورہ لینے آیا تھا کہ اب ہتھیار ڈالنے اور اپنے ملک کو دشمن کے حوالے کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

''آہ...... اس منحوس خبر کو سننے سے پہلے میں زندہ ہی کیوں رہی......'' وہ درد بھرے لہجے میں بولی۔ ''اپنے نوجوانوں سے کہو جا کر ہتھیار ڈال دیں، یوں بے موت نہ مریں...... شاید آگے کوئی بہتری کی صورت نکل آئے......

امید پر دنیا قائم ہے...... مایوسی گناہ ہے۔ اب بھی ہمارے پاس ایک آخری ہتھیار تو ہے ناکہ ہمارے یہ شیطان دشمن ہمارے قریب آنے، ارض اسلام کے اندر داخل ہونے کی سکت نہیں رکھتے، سوائے لارا کے......''

ہمزاد نے رنجور سی نظروں سے مصلے پر بیٹھی زیب النساء کو دیکھا اور اسی لہجے میں بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن دشمن ہمارے اس آخری ہتھیار سے بھی واقف ہیں اور وہ ہماری ریاست کا محاصرہ کرلیں گے...... پھر ہم کہاں جائیں گے؟''

''میں نے کہا نا...... بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی...... ابھی جاؤ اور اپنے ساتھیوں اور نوجوانوں کو بے موت مرنے سے بچاؤ......'' زیب النساء نے سسکتے ہوئے کہا تو ہمزاد الٹے پیروں پلٹ گیا......

☆☆☆

کریگ ہوسٹن، بن زیان اور یہودی حکمران اپنے اتحادیوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ ارض اسلام والوں نے جنگ بندی کردی تھی اور انہوں خود کو...... ریاست کی چہار دیواری میں محصور کرلیا تھا...... دشمن سرحد پار کر چکا تھا......

''تین بڑے'' دشمن سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے اور فتح پانے کے باوجود متفکر نظر آتے تھے۔

''اگر اس محاصرے سے بھی کوئی حل نہ نکلا تو...... کیا ہوگا؟'' ایک یہودی اکابر نے کریگ ہوسٹن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا لہجہ فطری خوف کا شکار محسوس ہوتا تھا۔

''یہ لوگ کب تک محاصرے میں رہیں گے......؟ سانپ تو نہیں ہیں جو مٹی کھا کر گزارہ کرلیں گے...... اناج کھانے اور پانی پینے والے جیتے جاگتے انسان ہیں وہ۔ انہیں ہمارے آگے جھکنا ہی پڑے گا۔ جس طرح ابھی جھکے ہیں۔''

''انہوں نے ایک آخری امید کے سہارے یہ سب کیا ہے......'' سپر پاور کے ایک حکمران نے کہا۔

"آخری امید؟" کسی نے سوالیہ کہا۔

"ان کی آخری امید...... پردۂ غیب سے آنے والی اچانک مدد کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔" شیطانی ادارے کے ایک ہم منصب نے خیال ظاہر کیا۔

"کریکٹ!" کریگ ہوسٹن مکاری سے بولا۔

"ارض اسلام والے جس آخری امید کے سہارے بھوکے پیاسے بیٹھے رہنے کو ترجیح دیے ہوئے ہیں، وہ مرادعلی منگی اور ماروی دوم کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے......"

"اوہو......"

وہاں موجود سب کے ہونٹوں سے تحیر آمیز آواز خارج ہوئی تھی۔ اس میں اندیشناک وسوسوں کے علاوہ انجانے خوف کا بھی عنصر غالب تھا۔

"ایسا ہے تو پھر ہمیں جلد ہی ریاست ارض اسلام پر اپنے مکمل قبضے کا کوئی راستہ نکالنا ہوگا...... اگر مراد بھلا چنگا ہوکر آ گیا اور ماروی بھی اس کے ہمراہ ہوئی تو پھر ہماری خیر نہیں......"

ایک یہودی اکابر اپنے فطری خوف تلے بولا۔ اسی کے ساتھی نے اس کی تائید میں لقمہ دیا۔

"اب تو مراد کو اپنے دوسرے بیٹے دانش کی بھی حقیقت کا پتا چل چکا ہے۔ کیا خبر وہ دونوں آفت کے پرکالے بہن بھائی...... ہم سب کے لیے ایک اور ایک گیارہ ثابت ہوں اور ہمیں تگنی کا ناچ نچادیں۔ اب تو ہماری دشمنی بھی کھل کر سامنے آ گئی ہے، ہم چھپے دشمن نہیں رہے...... مراد سیدھا ہم پر وار کرے گا۔"

"ان آخری امیدوں کے زمانے لد چکے ہیں ارضِ اسلام والوں کے لیے......"

اس بار بن زیان نے کہا۔ مقصد اپنے دیرینہ اتحادیوں کے دلوں سے خوف نکالنا تھا، جبکہ حقیقت یہی تھی کہ وہ خود بھی اندر سے ڈرا ہوا تھا۔ ماروی کے ذکر سے تو اس کی جان نکلتی تھی۔ کیونکہ اس نے لارا کے کہنے پر اسے صرف اس شرط پر بخش رکھا تھا کہ وہ آئندہ ارض اسلام کے خلاف کسی سازش میں شامل نہ ہوگا اور بس اپنے جزیرے والے حصار میں ہی مقید رہے گا...... وہ آگے بولا۔

"مراد نے بھلا چنگا ہونا ہوتا تو وہ اب تک سامنے آ چکا ہوتا...... وہ لہاسا کے جس غار میں...... موت کی جو گھڑیاں گن رہا ہے، وہ پوری ہونے والی ہیں...... اور ماروی اس آس پر اس کے ہمراہ ہے کہ کب اس کا باپ صحت یاب ہوتا ہے۔"

"لاما کیشوراکا کا انجام تم کیوں بھلا رہے ہو؟ اس نے کتنی کوشش کی تھی مراد کو حالتِ بیماری میں ختم کرنے کی، ہم سب نے دیکھا پھر اس کا کیا انجام ہوا؟"

شیطانی ادارے کے ایک مندوب نے یاد دلایا اور یہودی اکابرین اس کی بات پر اپنا سر دھننے لگے۔ انہیں اس کی بات سے پورا اتفاق تھا اور وہ اب کریگ ہوسٹن اور بن زیان کی طرف ذرا تیکھی اور جواب طلب نظروں سے گھور رہے تھے۔ اس کا جواب کریگ ہوسٹن کے پاس تھا۔

وہ اپنے چہرے پر پورا اطمینان سموتے ہوئے بولا۔

"لاما کیشوراکا...... مراد یا ماروی وغیرہ کے ہاتھوں نہیں بلکہ...... اپنی جلد بازی اور پرغرور طبیعت کی وجہ سے اپنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔"

"واٹ؟"

"ہاں! درمیان میں ایک غلط فہمی پیدا کردی تھی اس نے...... ہم نے لاما کیشوراکا پر حملہ کروادیا تھا کہ اس نے ہمارے ان دونوں آدمیوں موسی گا اور رونڈا کو ہلاک کروا دیا ہے جو لہاسا کے اس گالان نامی غار میں گھس کر مراد اور ماروی کا خاتمہ کرنے گئے تھے۔"

"تو اس میں بھی اسی آفت کی پرکالہ ماروی کا ہی ہاتھ ہوسکتا ہے......"

"میرا خیال ہے ہم وقت ضائع کررہے ہیں......" سپرپاور کے ایک سینئر عہدے دار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں اس مسئلے کا حل نکالنے کے لیے سر جوڑے بیٹھے ہیں اور مت بھولو کہ ابھی تک حالت جنگ میں ہیں۔ جب تک کہ ارض اسلام پر ہمارا مکمل قبضہ نہیں ہوجاتا، ہمیں جلد از جلد ایسا کوئی حتمی لائحہ عمل طے کرلینا چاہیے جس سے یہ آخری ٹیڑھ بھی باقی نہ رہے اور مراد اور ماروی کا قصہ بھی ہمیشہ کے لیے تمام ہو......"

اس کی بات پر سب نے اپنے سروں کو کورس میں اثباتی جنبش دے کر صاد کیا تھا۔ میٹنگ جاری رہی اور اپنے اصل ایجنڈے کی طرف آ گئی۔

بالآخر وقت کے ان یزیدوں نے یہی طے کیا کہ محاصرہ جاری رکھا جائے اور ارض اسلام کو اور وہاں سے بیرونی دنیا میں جانے والے راستوں کو بند کردیا جائے...... ان کا دانہ پانی سب بند کردیا جائے...... وغیرہ وغیرہ۔

میٹنگ کے برخاست ہونے کے بعد کریگ ہوسٹن...... وار روم میں جا کر فون پر راجر ہارڈی سے رابطہ کرنے لگا۔

☆☆☆

راجر ہارڈی اپنی محل نما رہائش گاہ آئرلینڈ کے ''وائٹ پیلس'' میں مقیم تھا۔ اسے ایک ایک بات کی رپورٹ مل رہی تھی، یہ بھی کہ ارضِ اسلام میں اس کے اتحادیوں کا قبضہ ہونے لگا تھا۔

کریگ ہوسٹن نے فون پر اس سے کہا۔

''راجر! یہی موقع ہے فوراً لارا کو استعمال کرو......''

''بے فکر رہو...... میں اس کی ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں سے خوب واقف ہوں اور اس حقیقت سے بھی کہ ہم میں سے یہی مراد اور ارضِ اسلام والوں کی وہ واحد دشمن ہے جسے ارض اسلام کی ریاست کے دائرۂ حصار میں گھسنے کی طاقت حاصل ہے۔ اس لیے تم بے فکر رہو...... میں تر پ کا پتا پھینکنے والا ہوں۔''

اس نے شیطانی قہقہہ لگا کر کہا اور فون بند کر دیا۔

راجر ہارڈی ریاست ارضِ اسلام کی شکست پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے اس ''خوشی'' کو مزید کشید کرنے کے لیے اپنی بیوی لارا کو شامل کیا۔ اس کے ساتھ پینے پلانے اور جشن کا دور چلانے کے بعد وہ اس سے بولا۔

''لارا! مائی سوئٹ ہارٹ! اب تم نے ایک کام کرنا ہے۔ اپنے بیٹے دانش کے پاس جاؤ اور اسے ورغلانے کی کوشش کرو کہ...... ان کے باپ کی حکومت اب ختم ہو چکی ہے اور خود اس کی زندگی کا بھی اب کوئی بھروسا نہیں رہا...... وہ لپا سا کے اس سرد غار میں کب تک زندگی اور شفایابی کی آس میں پڑا رہے گا...... بہتر یہی ہے کہ وہ اسے اسی وقت اپنے ساتھ ارضِ اسلام کی سرزمین پر لے جائے...... کیونکہ لارا ڈیئر! تم ہی وہ واحد ہستی ہو جو ارض اسلام میں داخل ہو سکتی ہو...... وہاں جا کر تم مراد علی منگی کے ہمزاد اور زیب النساء کو سمجھانے کی کوشش کرو گی کہ تمہارے دشمن...... عابد علی منگی کی موت اور مراد علی منگی کی پراسرار بیماری کے بعد بے پناہ طاقت کے حامل ہو چکے ہیں اور...... وہ تب تک ارضِ اسلام کا محاصرہ کرتے رہیں گے جب تک کہ تم انہیں اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دو گے...... اگر ان سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو تو...... صرف راجر ہارڈی کو ہی اندر داخل ہونے کی اجازت دے دو...... میں ایک معاہدے کے تحت اس مشکل وقت میں ان کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔''

کریگ ہوسٹن نے ایک عمل کے ذریعے لارا کو راجر ہارڈی کا تابع بنا رکھا تھا...... لارا نے فوراً اس کی ہامی بھر لی اور روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

خبلیس اپنے شیطانی معبد خانے میں موجود خوشی سے تالیاں پیٹ رہا تھا...... وہ طاغوتی قوتوں کے ساتھ ساتھ دماغی کھیل بھی کھیل رہا تھا اور اسے اپنی طاغوتی قوتوں سے زیادہ شرپسندیوں پر ناز تھا، کیونکہ یہ کامیابی سے ہمکنار ہوتی تھیں اور پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ یہ شیطان کی حرکت ہوتی ہے۔ اس میں انسانوں...... کے درمیان غلط فہمیاں پنپتی تھیں اور بہ آسانی جنگیں کرنے کا بھی زیادہ احتمال ہوتا ہے۔

اس لیے خبلیس کو اپنی یہی صفت سب سے زیادہ پسند تھی۔ وہ ارض اسلام پر اپنے چیلوں کی چڑھائی اور ان کی کامیابی کا سارا منظر تیسری آنکھ سے دیکھ رہا تھا...... نظر اسے بھی آ رہا تھا کہ یہ کامیابی ایک طرح سے ادھوری سہی...... لیکن یہ کیا کم تھا کہ سارے دشمن اکٹھے ہو کر روشن دنیا والوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ وہ اب ڈرے ہوئے بھی نہیں تھے...... کامیابی تو حاصل کر لی تھی...... مگر ادھوری اور خبلیس اس بات پر خوش تھا کہ یہی بات روشن دنیا والوں کے لیے مزید اذیت کا سبب بنے گی۔ جب ان کا راشن پانی بند کر دیا جائے گا اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دیں گے۔

شیطان کی شیطانیت کا کوئی انت نہیں ہوتا، وہ زیادہ سے زیادہ انتشار، اکھاڑ پچھاڑ سے لطف اندوز ہوتا ہے، جیسا کہ اس وقت خبلیس ہو رہا تھا۔ وہ اب ایک نیا تماشا دیکھنے کا منتظر تھا۔

وہ اپنی شیطانی آنکھ سے ایک اور منظر بھی دیکھ کر خوش ہو رہا تھا...... اور وہ تھا راجر ہارڈی کا...... جو اپنے ہی ساتھیوں اور اتحادیوں کو دھوکے میں رکھتے ہوئے روشن دنیا والوں کی اس مقدس ریاست پر تن تنہا قبضے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ طاقت اور حکمرانی کا لالچ ایسا ہی اندھا ہوتا ہے...... کہ انسان اپنے محسنوں کو بھی دھوکا دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ اس نے ایک نئے فتنے کا سوچا۔

اس کا ارادہ تھا کہ راجر ہارڈی کے اس فتور نیت کا پتا کریگ ہوسٹن کے سامنے ظاہر کر دے لیکن ابھی وہ منتظر تھا کہ پہلے راجر ہارڈی روشن دنیا والوں کی اس ریاست پر پوری طرح قابض ہو جائے۔ اس کام کے لیے اس نے طاغوتا کا انتخاب کیا تھا۔

☆☆☆

خبلیس کا مقرب خاص کارپرداز چیلا...... عذر باد، لارا کے پیچھے پڑا ہوا تھا...... لارا جو اس وقت خود کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ آخر کس کی تابع ہے؟

راجر ہارڈی کی یا پھر عذرا بادی......؟

جس وقت وہ ہارڈی کے حکم پر دانش کے دماغ میں جانے کی تیاری میں تھی تو اسے ایک پیغام ملا۔ ”لارا! دانش کے پاس پہنچ کر تم نے وہی کچھ کرنا ہے جو میں کہوں گا...... سمجھ گئیں۔“

”دسمجھ گئی۔“ لارا نے تنویمی عمل کے زیر اثر کہا۔

”فوراً دانش کے پاس جسمانی طور پر پہنچو اور اسے ورغلاؤ کہ تم اس کی ماں...... اب اپنے لختِ جگر کے بغیر نہیں رہ پا رہیں، تم اسے یہ بھی باور کراؤ گی کہ اس کی شخصیت ایک ماں کے بغیر ادھوری ہے......“

لارا...... دانش کو تلاشتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی۔ وہ اس وقت لہاسا کے برف زار میں واقع گالان کے غار کے سامنے موجود تھا۔

ایسے میں لارا اس کے دماغ میں جانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی کیونکہ اس کی بہن ماروی اس کے سامنے تھی اور دونوں بہن بھائی کسی اہم گفتگو میں مصروف تھے۔

لارا دانش کو تنہائی میں ہی رام کرنا چاہتی تھی، اس لیے وہ لہاسا کے گیسٹ ہاؤس میں آ گئی اور دانش کے لوٹنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

ماروی کو دشمن اور اس کے اتحادیوں کی اس تنگی جارحیت کا علم ہو چکا تھا اور وہ اپنے ہم وطنوں کی مدد کے لیے جانا چاہتی تھی مگر گالان کی اس برفاب گپھا میں اپنے بیمار باپ کو تنہا بھی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ فکر و تشویش کے مارے ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے؟

مراد علی منگی کی صحت یابی آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور ان آخری اور خصوصی لمحات میں اسے حکم ملا تھا کہ وہ ادھر ہی رہے گی۔ ساتھ ہی اسے یہ نوید سنا دی گئی تھی کہ کسی بھی وقت مراد کو ایک طویل بے ہوشی سے نجات ملنے والی تھی اور وہ پھر سے مکمل طور پر صحت یاب ہونے والا تھا مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ ماروی یہاں سے ہلے گی بھی نہیں۔

یہاں غار کے اندر ماروی کی مخفی طاقتیں بھی کام نہیں کر رہی تھیں۔ بس! ایک حد تک ان سے کام لیا جا سکتا تھا کہ اس نے کسی طرح اپنے بھائی دانش سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اسے جھٹکا لگا۔

دانش کا دماغ اسے لاکڈ ملا تھا۔ اسے حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی کہ یہ کیا معاملہ تھا؟ کیا کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمن نے...ان کی کسی کمزوری سے فائدہ تو اٹھانے کی

سنہری باتیں

☆ اپنی آواز کے بجائے اپنے دلائل بلند کیجیے۔ پھول بادل کے گرجنے سے نہیں، برسنے سے اگتے ہیں۔

☆ کبھی اتنے بلند و بانگ دعوے نہ کیجیے جو آپ سچ نہ ثابت کر سکیں۔ ورنہ لوگ یہی کہیں گے کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔

☆ دوسروں کے گرنے پر آج خوشیاں نہ مناؤ۔ کل تمہارے ساتھ بھی یہی ہو سکتا ہے۔

☆ کمینے کی صحبت کوئلے کی طرح نقصان پہنچاتی ہے کہ جب یہ گرم ہوتا ہے تو بدن کو جلا دیتا ہے اور جب سرد ہوتا ہے تو کپڑوں کو سیاہ کرتا ہے۔

☆ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

☆ وہ خوش رہتا ہے جو کسی سے کچھ نہیں چاہتا۔

☆ پہاڑوں کی چوٹیاں بنو۔ جو ہر وقت ایک دوسرے کو دیکھتی رہتی ہیں، گڑھے نہ بنو۔ جو ایک دوسرے کو دیکھ ہی نہ سکیں۔

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

راز کی باتیں

☆ اچھی نیت والوں کو سکون ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔ ان کے دل کسی نکھری صبح کی طرح اجلے اور پُرسکون ہوتے ہیں۔

☆ جس دل میں برداشت کی ہمت ہو وہ کبھی شکست نہیں کھاتا۔

☆ زندگی کسی کے نام کر دینا آسان اور گزارنا بہت مشکل ہے۔

☆ ایسی دوستی کو قبول نہ کرو جو تمہیں اپنوں سے دور کر دے۔

☆ سچائی ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔

☆ دعا ایسا عمل ہے جو تقدیر کو مات دے سکتا ہے۔

☆ توبہ ایسا دروازہ ہے جو موت کی ہچکی تک کھلا رہے گا۔

☆ لوہا نرم ہو کر ہتھیار، سونا نرم ہو کر زیور، مٹی نرم ہو کر کھیت اور آٹا نرم ہو کر روٹی بنتا ہے اس طرح انسان کا دل نرم ہو جائے تو ولی بن جاتا ہے۔

انتخاب۔ جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

کوشش نہیں کی ہے؟ تشویش اس بات کی تھی کہ کہیں دانش کے خلاف کوئی سازش نہ کی جارہی ہو...... وہ غار سے باہر آگئی اور ایک بار پھر اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بھائی کے دماغ میں دستک دی تو اسے پتا چلا کہ تاریک دنیا کی منحوس گہرائیوں میں پروان چڑھنے والے ایک شیطانی چیلے حبلیس کی داسی ہامبی تارا نے ایسا کیا ہے...... اس نے نہ جانے کس موقعے سے فائدہ اٹھا کر دانش کا دماغ اس کی طرف سے (ماروی کی طرف سے) لاکڈ کردیا تھا...... وہ سمجھ گئی کہ ایسا کوئی بیرونی حربہ استعمال کرکے ہی کیا گیا ہے، ورنہ دانش ان کے قابو میں آنے والا کہاں تھا۔

جب اسے غار سے باہر کافی دیر بیتنے لگی تو اسے روحانی اشارے ملنے لگے کہ وہ مراد کو اکیلا نہ چھوڑے۔ وہ مجبور تھی اور بے بس بھی۔ تاہم اس نے فوراً ہی اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دانش پر کیا گیا ہامبی تارا کا یہ عمل توڑ ڈالا اور بھائی کو آواز دی۔ وہ آگیا۔

''بھائی! تم ادھر آجاؤ...... بابا کے پاس، مجھے جلد ارض اسلام کی طرف لوٹنا ہے۔''

''لیکن آپی! میں کیسے آؤں؟ گالان کے اندر جانے کی مجھے ممانعت ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اندر صرف تم ہی جاسکتی ہو؟'' دانش نے پریشانی سے کہا۔

ماروی سوچ میں پڑ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ دانش کو بابا کے پاس چھوڑ کر وہ اپنے دیس کا رخ کرے گی۔ یا کم از کم غار سے باہر آکر وہ خیال خوانی کے ذریعے ہی اپنے وطن کے باسیوں کی مدد کرسکے لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس طرح وقت کا زیاں نہ ہوجائے۔

ایک حد تک خیال خوانی کے ذریعے اس نے اپنے بھائی دانش سے رابطہ تو کرلیا تھا، تاہم اس نے کہا۔

''بھائی! تمہاری بات بھی ٹھیک ہے، لیکن تم شاید میرا مطلب نہیں سمجھے...... میں چاہ رہی تھی کہ تم......''

''آپی! میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ چکا تھا......'' دانش نے اس کی بات کاٹ کر بڑی ملائمت آمیز رسانیت سے کہا۔

''تم یہ چاہتی تھیں نا کہ مجھے وہاں غار کے باہر ہی پہرے پر بٹھا کے سہی، تم ذرا دیر کے لیے باہر آجاتیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی بابا جانی کے لیے صحیح نہیں ہوتا...... جو شرط ان کی شفایابی سے نتھی ہے، اس کی صحت کو برقرار ہی رکھنا ہوگا نہیں...... میری اچھی آپی! تمہیں بابا جانی کے پاس سے بھی نہیں ہٹنا ہے...... جبکہ اب تو بابا جانی کی کسی وقت صحت یابی کی غیب سے نوید بھی سنائی جاچکی ہے۔''

دانش نام کا ہی نہیں ذہن کا بھی دانش مند تھا۔ ماروی کو خوشی ہوئی کہ اس کا بھائی بھی عقل و فراست میں کم نہیں...... وہ چند ثانیے کچھ سوچتی رہی اس کے بعد بولی۔

''بھائی! پھر تم ہی کچھ کرسکتے ہو...... ہم پر برا وقت ضرور آیا ہوا ہے لیکن ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ہم اسے کبھی بھی برا وقت نہیں کہیں گے...... یہ تو آزمائش کا وقت ہے جو آگے ہمیں سرخ روئی عطا کرنے والا ہے۔ بس! دعا یہ کرو کہ ہم لوگ اللہ رب العزت کی طرف سے دی ہوئی اس آزمائش پر پورا اتریں اور یہ زیادہ طویل ثابت نہ ہو، ہمیں اسے برداشت کی توفیق حاصل ہو۔''

''آمین!'' دانش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ماروی آگے بولی۔

''تم اسی وقت لوٹ جاؤ اور میری یا بابا جانی کی فکر مت کرو...... وہاں دیکھو، کیا ہورہا ہے؟ کیسے ہمارے دشمنوں نے ہماری عظیم ریاست پر قبضہ جمانے کا دانستہ نکالا ہے مگر اپنا بھی خیال رکھنا، ہمارے دشمن ضرور بڑی طاقت میں ہوں گے۔ ایسے ہی نہیں انہوں نے خود کو ظاہر کرکے ہم پر ہلا بولا ہے...... ہماری کوئی کمزوری ان کے ہاتھ لگی ہے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا آپی! تم فکر نہ کرو......'' دانش نے باعزم ہوکر جواب دیا۔

''اور بھائی! اس دشمن سے بھی محتاط رہنا جو تمہاری مام کا بھیس بھر کے آتی ہے کیونکہ دشمن تمہاری اس کمزوری سے اچھی طرح واقف ہیں اور کسی طرح بھی کسی حالت میں بھی ایسی ''مام'' کے جھانسے میں مت آنا۔''

''آپ فکر نہ کریں آپی! میں محتاط رہوں گا......'' دانش نے کہا۔ ''اور اسی طرح محتاط رہتے ہوئے پتا چلاؤں گا اور اپنی ریاست کو بھی دشمنوں کے ناپاک قدموں سے بچانے کی کوشش کروں گا۔''

''شاباش میرے بھائی! جاؤ...... اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔'' ماروی نے دعائیں دے کر بھائی کو رخصت کردیا۔

اس کے بعد ماروی نے اپنی آنکھیں موند لیں اور من ہی من میں وہ بابا صلاح الدین اجمیری کا تصور لانے کی کوشش کرنے لگی۔

اسی وقت ایک آواز پر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں

اور یہ دیکھ کر اس کے رگ وپے میں خوشی ومسرت کی لہریں دوڑ گئیں جب اس نے اپنے بابا جانی کو آنکھیں کھولتے اور یہ کہتے سنا......

''بیٹی! تت......تم یہاں، یہ کون سی جگہ ہے، یہ سب کیا ہے......اف، میرے سر کا درد......آہ......یہ کون ہے؟''

مراد نے ہوش میں آتے ہی باتوں کے دوران کراہنا بھی شروع کردیا...... باپ کو باتیں کرتے دیکھ کر ماروی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے، ان میں اشکِ غم بھی تھا اور آبِ مسرت بھی۔

اس نے فوراً ہی باپ کی دل جوئی شروع کردی اور ہولے ہولے اس کا سر دابنے لگی......پھر دھیرے سے بولی۔

''بابا......بابا......بابا جانی! میں آپ کی بیٹی ماروی، آپ کے ساتھ ہوں......آپ کیسے ہیں اب؟''

''آہ......یہ میرے سر میں کیا ہورہا ہے؟ مم......مجھے یہ کیسی آوازیں سنائی دے رہی ہیں؟ آہیں...... سسکیاں، مجھے کون پکار رہا ہے؟''

اس کے بعد مراد دوبارہ بے ہوش سا ہوگیا۔

''بابا......بابا جانی! آنکھیں کھولیے...... آپ دماغ پر زور مت دیجیے، میں آپ کو سب بتادوں گی......''

ماروی پھر باپ کو پکارنے لگی مگر مراد علی منگی نے پھر دوبارہ اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔ گالان کی اس سرد اور تنگ وتاریک گپھا میں ماروی کی سسکیاں گونجنے لگیں......

☆☆☆

جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے......جنوبی افریقا کی یہ بستی جادوگروں اور ساحروں پر مشتمل تھی اور کمبلی گا ئنا کا بھائی زومبی گا ئنا جنوبی افریقا کی جادونگری کے ایک علاقے پر حکومت کرتا تھا۔

بے شک وہ جادوگروں کا قبیلہ تھا لیکن زومبی گا ئنا کی موت کے بعد وہاں کوئی خطرناک چیلنج کرنے والا جادوگر نہیں رہا تھا۔ کمبلی گا ئنا بھی ڈھول کا پول تھی۔ اوپر سے بج رہی تھی۔ خوب بول رہی تھی۔ اندر سے کھوکھلی تھی۔

تاہم اس نے ایک ناپاک عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے بھائی زومبی گا ئنا کا انتقام مراد سے ضرور لے گی۔

''عابی کے بعد دانش ہی مراد کا اپنا لہو ہے۔'' کمبلی گا ئنا کہہ رہی تھی۔ ''مراد کے ایک بیٹے پرنس عابی نے میرے بھائی کی جان لی۔ ہم نے عابی پر جادو کیا اور اسے مروا ڈالا۔ میں مراد کے دوسرے بیٹے دانش کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔ وہ اپنی گم شدہ ماں کی تلاش میں بھٹک رہا

سرداریاں

سردار نے پہلی دفعہ موبائل خریدا پھر بھی پریشان بیٹھا تھا۔

دوسرا سردار۔ ''دوست کیا ہوا؟''

سردار۔ ''نیا موبائل لایا ہوں، پتا نہیں کیا ہورہا ہے، اس پر کوئی میسج آتا ہے اور یہ بند ہوجاتا ہے۔''

دوست۔ ''کیا میسج آتا ہے؟''

سردار۔ ''بیٹری لو......''

☆☆☆

ایک سردار کافی دور کھڑی لڑکی کو گھور رہا تھا۔ تنگ آکر لڑکی نے ہاتھ سے لعنت کا اشارہ کیا۔

سردار نے دوست کو کہنی مار کے کہا۔ ''لے اج فیر پنج (5) وجے دا ٹائم فکس ہوا اے۔''

☆☆☆

سردار ایک گھر چوری کرنے گیا۔ تجوری پر لکھا تھا۔

''تجوری کو توڑنے کی ضرورت نہیں۔ 440# لگاؤ اور سامنے والے لال بٹن کو دباؤ، تجوری کھل جائے گی۔''

جیسے ہی بٹن دبایا الارم بج اٹھا اور پولیس آگئی۔ جاتے وقت سردار مالک مکان سے بولا۔

''خدا کی قسم! آج انسانیت سے ہمارا اعتبار اٹھ گیا۔''

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں
ضلع ڈی آئی خان

کہاں تک سنو گے...

تین افراد آپس میں بیٹھے ہوئے اپنی اپنی دکھوں کی داستان بیان کررہے تھے۔ پہلا بولا۔

''میں تین سال سے افریقا کے خطرناک جنگلات میں رہ رہا ہوں۔''

دوسرے نے کہا۔ ''میں پانچ سال سے عرب کے صحرا میں زندگی گزار رہا ہوں۔''

تیسرے نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ''میں بیس سال سے اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

ہے۔ میں اسے بھی ٹریپ کرنے والی ہوں۔ اس کے بعد مراد اپنے بیٹوں سے محروم ہو جائے گا۔ بس وہی بیٹی ماروی رہ جائے گی۔ میں اپنے منتروں کی شکتی سے اسے بھی جلا کر بھسم کردوں گی۔''

یہی اس کے عزائم تھے اور وہ اپنے ان ناپاک عزائم پر قائم تھی۔

کمبلی گائنا نے اب اس جادوگری کی حکومت کی باگ خود سنبھال لی تھی......وہ خود بھی بڑی ساحرہ تھی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا تھا کہ اس نے ماروی سمیت اس کے بھائی دانش تک کو بھٹکا رکھا تھا، یعنی وہ دونوں بہن بھائی اب تک یہاں کا راستہ ہی نہیں پا سکے تھے۔

گائنا فیملی......درحقیقت قدیمی افریقا کے ''وچ ڈاکٹرز'' کی نسل و شجرے سے تعلق رکھتی تھی..... اس کے پاس جادوگروں کی پوری فوج تھی، ان میں خیال خوانی کے ماہر بھی تھے اور ستارہ شناس بھی.....سوئیاں چبھونے والی گڑیوں کی جادوگرنیاں بھی تھیں اور مردہ انسانی ہڈیوں پر سحر پھونک کر تباہی و بربادی پھیلانے والے ساحر بھی......

وہ اس وقت اپنے علاقے کی ایک بستی کے دور افتادہ گوشۂ تنہائی میں ایک ایسے مسکن میں موجود تھی جسے ''ڈارک ہاؤس'' کا نام دیا گیا تھا۔

یہ ''ڈارک ہاؤس'' جڑواں تنوں والے ایک ٹھگنے اور چھتنار پیڑ کی جڑ کے نیچے بنا ہوا تھا۔ اس پیڑ کی شاخوں پر الوؤں اور مردار خور گدھوں کا ٹھکانا بھی تھا۔ یہ درحقیقت اس کے ساتھی تھے۔

ڈارک ہاؤس کے اندر جانے کا راستہ اسی موٹے تنے کے اوپر سے ہو کر نیچے جاتا تھا۔ جہاں کمبلی گائنا اپنی ایک ماتحت وچ ڈاکٹرنی......میڈم سبارو کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ خاص خاص ایام میں ہی ادھر کا رخ کرتی تھی۔

چند دن پہلے ہی کمبلی گائنا نے اسے ایک گڈا...اور ایک گڑیا... تیار کرنے کا حکم دے رکھا تھا، بلیک میجک کے ذریعے ایک کو ماروی اور دوسرے کو دانش کا نام دینے کے لیے کہا تھا اور میڈم سبارو یہی دونوں گڑیا بنا کر اس کے پاس لائی تھی۔

میڈم سبارو نے گڈے گڈی کا وہ جوڑا اپنے خنزیر کی کھال والے تھیلے سے نکال کر اس کے سامنے فرش پر رکھ دیا اندر مشعلیں روشن تھیں......اس کی روشنی میں کمبلی گائنا نے ان دونوں ڈولز کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا اور اس کے مکروہ چہرے پر منحوس سی مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں خود کلامیہ بڑبڑائی۔

''اب میں مراد کو ان دونوں سے محروم کردوں گی جس طرح اس نے مجھے میرے بھائی زومبی گائنا سے محروم کردیا تھا۔'' پھر وہ میڈم سبارو سے تحکمانہ لہجے میں بولی۔

''میں انہیں تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی ہوں تاکہ مراد اچھی طرح اپنی اولادوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہے..... اس لیے ابھی ان دونوں کے ایک بازو اور ایک ہاتھ میں سوئیاں چبھو ڈالو......''

میڈم سبارو نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ایک تکونی شیپ کی ڈبیا نکالی، اسے کھولا تو اس کے اندر بے شمار چھوٹی چھوٹی سوئیاں ایک ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے چار سوئیوں کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد فرش پر ستارے کا نشان بنایا، جس کے ہر کونے پر اس نے مختلف اشکال کی خوفناک صورت کھوپڑیاں بنائیں......اور پھر دونوں ڈولز اس کے درمیان میں رکھ دیں۔ اس کے بعد اپنی آنکھیں موندے منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے لگی۔ یہ کوئی اجنبی زبان تھی......جس کے الفاظ ٹیڑھے میڑھے منہ بنا کر ہی ادا کیے جا رہے تھے۔

یہ جنتر منتر پڑھنے کے بعد اس نے سب سے پہلے دانش کی شکل والی گڑیا اٹھائی، اسے بائیں ہاتھ میں پکڑا اور دائیں ہاتھ سے سوئی اٹھا کر اس کے دائیں بازو میں کھبو دی۔ اس کے بعد دوسری سوئی لے کر اس کی دائیں ٹانگ میں پیوست کردی۔

اس کے بعد گڑیا دوبارہ اسٹار کے بیچ میں رکھی اور اسی طرح جب اس نے... یہی عمل ماروی کی شکل والی گڑیا سے بھی کرنا چاہا تو گڑیا میں آگ لگ گئی۔ دونوں بھونچکی رہ گئیں۔

''یہ کیا ہوا، ماروی کی گڑیا کو؟'' کمبلی گائنا نے حیرت سے پوچھا۔

''میں خود حیران ہوں مادام!'' میڈم سبارو الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ ''ابھی پتا چلاتی ہوں.....'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں موندلیں اور تھوڑی دیر بعد کھولیں تو ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولی۔

''مادام! ماروی پر اس وقت یہ عمل نہیں ہوسکتا، وہ ضرور کسی ایسے مقدس حصار کے اندر موجود ہے...... جہاں یہ شیطانی عمل اپنی رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہے۔''

''ماروی ہی تو ہمارا اصل شکار اور ٹارگٹ ہے......''

کمبلی گائنا نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''اس پر یہ عمل کرنا

ضروری ہے۔''

''آپ اس کی فکر نہ کریں مادام!'' میڈم سبارو نے ازراہِ تشفی اس سے کہا۔

اس کے بعد اس نے تھیلے سے ایک اور گڑیا نکالی۔ پہلے اس پر پڑھ کر کچھ پھونکا اور پھر دو سوئیاں اٹھا کر ایک گڑیا کے بائیں بازو میں اور دوسری دائیں ٹانگ میں پیوست کر دی۔ ماروی کی گڑیا کو کچھ نہیں ہوا... وہ اب پہلے والی گڑیا کی طرح جل کر بھسم نہیں ہوئی تھی۔

''اب کیا کیا تم نے؟ کیا اب ماروی تکلیف میں ہے؟'' کمبلی گائنا نے سوالیہ اور مستفسرانہ نظروں سے میڈم سبارو کی طرف دیکھا۔

''میں نے ایک خاص عمل کے تحت اس کا توڑ نکال لیا ہے مادام!'' میڈم سبارو نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں غرور آمیز تفاخر تھا۔ آگے بولی۔

''ماروی ابھی اس تکلیف میں مبتلا نہیں ہوئی ہے لیکن جیسے ہی وہ اپنے حصار سے نکلے گی، اس تکلیف کی ابتدا ہو جائے گی۔''

''مگر اس طرح تو وہ پھر اپنے گرد وہی حفاظتی حصار قائم کر کے اس تکلیف سے آزاد ہو جائے گی......؟''

''میں نے اپنے علم سے پتا چلایا ہے کہ وہ جس حفاظتی حصار میں ہے، وہ عارضی ہے۔ وہ مستقل اس میں نہیں رہ سکتی، بہت جلد وہاں سے نکلنے والی ہے......''

اس کی بات پر کمبلی گائنا کو کچھ تسلی ہوئی تھی...... اپنا کام نمٹانے کے بعد وہ مؤدبانہ انداز میں اپنا سر جھکا کر اس سے بولی۔

''میں نے اپنا کام نمٹا دیا ہے......''

کمبلی گائنا اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بغور گڑیا میں پیوست سوئیوں کو تک رہی تھی پھر بولی۔

''مجھے ابھی ان دونوں بھائی بہن کو اذیت میں رکھنا ہے...... یہ مر تو نہیں جائیں گے اس کی تکلیف سے......؟''

''نہیں مادام! یہ مریں گے نہیں مگر اذیت کے مارے سسکتے ضرور رہیں گے......''

''شاباش! اب تم ایک کام کرو......''

''حکم کریں مادام!''

''تم اسی وقت ایک مشہور ڈاکٹر کے روپ میں وہاں جاؤ گی، یہ اب تم پر منحصر ہوگا کہ تم کس طرح اپنی دوستی کو ماروی اور دانش کے درمیان بڑھانے کی کوشش کرتی ہو۔'' کمبلی گائنا نے کہا۔

لطائف

ماہر نفسیات۔ ''مبارک ہو آپ کا علاج مکمل ہو گیا۔ اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔''

دماغی مریض۔ ''کیا فائدہ، آپ کے علاج سے پہلے میں فرانس کا بادشاہ تھا۔ اب ایک عام آدمی ہوں۔''

☆☆☆

دو بے وقوفوں پر عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ جج نے ایک بے وقوف سے پوچھا۔ ''کہاں رہتے ہو؟''

بے وقوف نے ہاتھ ہلاتے ہوئے۔ ''کہیں بھی نہیں۔''

جج نے یہی سوال دوسرے بے وقوف سے کیا۔ وہ پہلے بے وقوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے پڑوس میں۔''

☆☆☆

فقیر بچے سے۔ ''بابا! دس روپے کا سوال ہے۔''

بچہ۔ ''بابا، سوال اس طرح حل نہیں ہوتا۔ پہلے کاپی میں لکھ کر لا۔''

☆☆☆

مریض۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپریشن کے بعد مجھے پیاس بہت لگنے لگی ہے۔''

ڈاکٹر۔ ''یار یاد آیا، میں روئی کا گولا تو تمہارے پیٹ میں بھول گیا ہوں۔''

☆☆☆

مالک نوکر سے۔ ''بلی تو میری مری ہے تو کیوں رو رہا ہے؟''

ملازم۔ (بے خیالی میں) ''جناب! اب میں دودھ پی کر کس پر الزام لگاؤں گا۔''

مرسلہ۔ زاہد احمد...... کراچی

☆☆☆

میاں بیوی میں اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ ایک دن صاحب بڑا سا تربوز لے آئے اور بیوی کو پیش کیا۔ بیوی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ شام ہوئی تو بیوی نے شکریہ ادا کیا۔ ''آج میں بہت خوش ہوں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ سارے کا سارا تربوز آپ نے مجھے دے دیا اور خود چکھا تک نہیں۔''

شوہر نے کہا۔ ''دراصل آج کل ہیضے کا موسم ہے۔ کل کے اخبار میں میں نے پڑھا تھا کہ تربوز کھانے سے دو عورتیں انتقال کر گئی ہیں۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

''وہ تم پر ایک سچے اور مخلص دوست کا بھروسا کرنے لگیں اور پھر اسی طرح تم .... مزید سوئیاں چبھو کر انہیں اس قدر بیمار اور لاغر کردو کہ مراد تمہاری یہ بات ماننے پر مجبور ہوجائے کہ تم اسے علاج کے لیے افریقا کے کیمپ اسپتال لے جاؤ گی، اس طرح تم بہانے سے ان دونوں بہن بھائی کو یہاں لے آنا اور میں انہیں ایک خاص عمل کرنے کے بعد اس ڈارک ہاؤس کو ان کا قید خانہ بنادوں گی پھر مراد سے بات کروں گی......''

''یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا مادام! بس آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔'' میڈم سبارو بولی اور اس کے بعد کمبلی گا کنا نے فقط اپنے سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا اور پھر اسے ایک خاص انداز میں سلام کرکے چلتی بنی۔

☆☆☆

ہامبی تارا......اب اپنے ہی ساتھی کے مقابلے پر آچکی تھی......وہ اس کا کوئی حکم ماننے پر تیار نہ تھی۔ اس نے خبلیس کی آشیر باد لے لی تھی......اور اس نے اسے اپنا کام اپنی صوابدید پر کرنے کی اجازت دے ڈالی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ خیال خوانی کے ذریعے پھر دانش کے دماغ میں پہنچی۔

دانش اس وقت اپنی بہن ماروی کے ایما پر پہلے لہاسا شہر پہنچا اور اس گیسٹ ہاؤس میں آیا جو تبتی حکومت نے انہیں دے رکھا تھا۔

وہاں اس نے ٹی وی پر خبریں سنیں تو تقریباً تمام ہی چینلز پر ریاست ارضِ اسلام پر دھاوا بولنے کی خبریں چیخ رہی تھیں...... حملے کا جواز سپر پاورز یہ بتارہی تھیں کہ یہاں مذہبی انتہا پسندوں کے دہشت گردی کے تربیتی کیمپ تھے اور دہشت گردوں کو مذکورہ ریاست کی زمین کھلے بندوں استعمال کرنے کی اجازت دی جارہی تھی وغیرہ......

انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں کی طرف سے اسے ایک چھوٹے سے امن پسند ملک پر سپر پاورز کی ننگی جارحیت سے تشبیہ دی جارہی تھی اور واشگاف انداز میں ان کی طرف سے کہا جارہا تھا کہ سپر پاورز نے درحقیقت خود مذہبی انتہا پسندی دکھاتے ہوئے یہ دھاوا بولا ہے۔ مقصد ارضِ اسلام کے بعض ایسے قدرتی وسائل پر قبضہ جمانا مقصود تھا جن پر سپر پاورز کی ایک عرصے سے نظر تھی۔

جواب میں کریگ ہوسٹن اور اس کے ہم نوا بھی مختلف ٹی وی چینلز پر اپنا راگ الاپنے اور اپنے اس اقدام کو دنیائے امن و آشتی کے قیام کی کوشش اور دہشت گردی کے خاتمے سے تعبیر کرنے میں مصروف تھے......مگر عالمی میڈیا پر بہ بدستور ارضِ اسلام کی اب تک کی امن پسندی، بھائی چارے کی لاتعداد مثالیں دکھائی جارہی تھیں......اور وہ کہیں بھی ان کی دہشت گردی یا مذہبی انتہا پسندی کے کوئی ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہے تھے، بلکہ انہوں نے تو چیلنج کررکھا تھا کہ کوئی ایک ثبوت دے دیا جائے......

عالمی میڈیا ہی کی ایک معروف خبر رساں ایجنسی سے تعلق رکھنے والے دو لبنانی بہن بھائی وقار الحسن اور زہرہ رپورٹنگ کرنے کے لیے ارض اسلام کی طرف عازم سفر ہوئے تاکہ خود جاکر اپنی آنکھوں سے حقائق دیکھ کر انہیں دنیا کے سامنے لاسکیں......

یہ دونوں بہن بھائی جوان اور اسمارٹ تھے اور اپنے کام میں ماہر تھے اور پُرعزم بھی۔ عالمی میڈیا میں تبصرہ نگاری اور تجزیہ کاری میں ان کا دنیائے ابلاغ میں بڑا نام تھا۔

دنوں بہن بھائی ڈائریکٹ فلائٹ سے ارض اسلام کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ ایک قریبی پڑوسی ملک کے ائرپورٹ پر اتر کر انہوں نے سرحدی علاقے کے اس طرف روانگی کا پروگرام بنایا تھا۔ ایک طاقت ور ہارس پاور کی انجن والی جیپ میں وہ ارض اسلام کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

کریگ ہوسٹن کے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے نے، جو ایسی کسی بیرونی مہم جوئی پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا، اس نے فوراً کریگ ہوسٹن کو ان دونوں بہن بھائی کی آمد کی خبر کردی......کریگ ہوسٹن پریشان ہوگیا۔

وہ ابھی وار زون کے اپنے بیس کیمپ میں ہی موجود تھا۔ اس نے چار تربیت یافتہ فائٹرز کے ذریعے دونوں رپورٹر بہن بھائی کو راستے ہی میں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا۔

''خیال رہے، یہ کارروائی ایک حادثے کے سوا کچھ نہ ہو......کوئی گولی اور کاری زخم نہیں لگنا چاہیے......نہ ہی دوبدو مقابلے کا گمان ہو......بس! ان کی گاڑی کو کسی حادثے سے دوچار کردو کہ ان کی لاشیں جل کر سڑ جائیں۔''

چاروں فائٹرز ایک کار اور ایک بڑے سے ٹرک میں روانہ ہوگئے۔ دو کار میں موجود تھے اور دو ٹرک میں۔

جلد ہی وہ کریگ ہوسٹن کے بتائے ہوئے اس بنجر سرحدی علاقے میں داخل ہوگئے جدھر سے ان دونوں بہن بھائی کی جیپ دوڑی چلی آرہی تھی......

ان کے پاس دو بیگ تھے، ایک میں تو ان کے کپڑے اور روزمرہ کے استعمال کا ضروری سامان تھا

جبکہ دوسرے بیگ میں ان کا رپورٹنگ اسٹف تھا، جس میں لیپ ٹاپ، کیمرے اور دیگر رپورٹنگ سے متعلق سامان رکھا ہوا تھا۔

شام ہونے لگی تھی اور وہ ارضِ اسلام کی سرحد کے قریب تھے۔ جیپ وقار ہی ڈرائیو کر رہا تھا اور زہرہ اس کے عقب میں سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں لیپ ٹاپ تھا اور وہ اس میں مصروف تھی۔ اچانک وہ بھائی کی آواز پر چونکی۔

''ہمشیرہ! ذرا دیکھنا...... ہمارے تعاقب میں شاید کوئی گاڑی آرہی ہے......''

زہرہ نے چونک کر لیپ ٹاپ سے سر اٹھایا اور عقب میں گردن موڑ کر جیپ کی بیک اسکرین سے دیکھا تو اسے پیچھے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں...... ابھی وہ اس پر غور کر ہی رہی تھی کہ وقار کی دوبارہ چونکتی ہوئی آواز ابھری۔

''ارے......! یہ تو سامنے سے بھی کوئی گاڑی آرہی ہے۔ کوئی ٹرک لگتا ہے شاید......''

راستہ ناہموار تھا اور بے قاعدہ ہونے کے سبب کوئی خاص ٹریک نہیں بنا ہوا تھا...... آگے پیچھے سے تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی آتیں یہ گاڑیاں کریگ ہوسٹن کے فائٹرز کی تھیں۔

''ہوشیار...... مجھے یہ کوئی سازش لگتی ہے...... بھائی جان!'' پیچھے سے زہرہ نے کہا۔

ان کی چھٹی حس نے پہلے ہی سے گویا خطرے کا الارم بجا دیا تھا۔ اپنی حفاظت اور دفاع کے لیے ان کے پاس صرف ایک ہی پستول تھا۔ وہ وقار نے گلوز کمپارٹمنٹ سے نکال کر اپنی بہن کو تھما دیا۔ زہرہ بھائی کے مقابلے میں زیادہ زیرک دماغ تھی۔ اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے اسٹف بیگ سے کیمرا نکالا اور کلپس کے ذریعے اسے جیپ کے اندر کھڑکی کے ساتھ اس طرح اٹیچ کر دیا کہ وہ اس سارے ڈرامے کی ویڈیو لیتا رہے......

آگے پیچھے سے آنے والی دونوں گاڑیاں اب طوفانی رفتار سے ان کی جیپ کے قریب آتی جارہی تھیں۔ اجنبی دیس اور جنگ زدہ ملک میں ایسی کسی صورتِ حال کا سامنا اچھے اچھوں کا حوصلہ خطا کر سکتا تھا۔

وہ دونوں بھی کچھ نروس ہوگئے تھے، تاہم جلد ہی انہوں نے اپنی اس فطری کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ وقار کی نظریں جیپ کی ونڈ اسکرین پر مرکوز تھیں اور وہ سامنے سے تیزی کے ساتھ آتے ہوئے ٹرک کو دیکھ رہا تھا، جواب کافی واضح ہو گیا تھا۔ ابھی رات اتنی نہیں اتری تھی، تاہم ہیڈ لائٹس کی ضرورت بھی تھی...... جبکہ پیچھے آنے والی کار بھی ان کے کافی نزدیک آچکی تھی۔

ٹرک سامنے آیا تو وقار نے محسوس کیا کہ ٹرک ڈرائیور کے ''عزائم'' کیا ہو سکتے تھے، کیونکہ ایک تو اس کی رفتار بے حد تیز تھی، دوسرے یہ کہ وہ انہی کے راستے پر چلا آرہا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ وہ اپنا بھاری بھرکم ٹرک ان کی جیپ سے ٹکرانے کا پورا پورا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔

پھر جیسے ہی ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا ان کے بالکل قریب آیا، وقار نے اس کی تباہ کن ٹکر سے اپنی جیپ بچانے کی غرض سے اسٹیئرنگ دائیں جانب کاٹنے کی کوشش کی کہ اچانک ان کے پیچھے سے آنے والی کار، بالکل جیپ کی سائڈ سے آن لگی...... گویا اس نے ان کی جیپ کے موڑ کاٹنے کا راستہ ہی بند کر دیا تھا...... ٹکر لازمی تھی۔ یہ حملہ مشترکہ پلان کا نتیجہ لگتا تھا وقار کو...... مگر اس نے بھی دانت بھینچ کر وہی کیا جو وہ کر رہا تھا، یعنی اس نے اپنی جیپ کی ایک زوردار سائڈ کار کو ماری مگر کار اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی...... تھوڑا جھٹکا ضرور لگا۔

ادھر ٹرک دھڑدھڑاتا ہوا ان کی جیپ کے عین سامنے آچکا تھا، بائیں جانب اسٹیئرنگ موڑنے کا کوئی آپشن نہ تھا...... کیونکہ اس طرف کھائی تھی اور متعدد درختوں اور جھاڑیوں کا تاریک سلسلہ تھا، وہاں گھس جانے کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا......

سامنے سے آنے والی ٹرک کی سیلابی لائٹس دونوں بہن بھائی کے چہروں پر پڑی تھی۔ ان کے چہرے فق نظر آرہے تھے۔ اسی وقت شدید قسم کا دھماکا ہوا اور زہرہ کے حلق سے تیز چیخ خارج ہوئی۔

☆☆☆

ارضِ اسلام پر مشکل وقت پڑا ہوا تھا۔ دشمنوں نے مکمل قبضہ حاصل کرنے کے لیے ریاست کا بدستور محاصرہ کر رکھا تھا۔ محاصرے کا تیسرا روز تھا اور ریاست میں مقدور بھر ہی راشن پانی بچا تھا۔ گویا جو کچھ بھی تھا، وہ کسی زادِ راہ ہی کی طرح تھا خوراک کی قلت پڑنے لگی تھی اور ریاست کے عوام بھوک اور پیاس سے بے حال ہونے کے قریب تھے۔

ہمزاد اور زیب النسا اپنی عوام کی حالت زار پر پریشان اور فکرمند تھے...... اور یہ سوچنے پر مجبور تھے...... کہ ہتھیار ڈال دیے جائیں اور اس حصار کو توڑ دیا جائے کہ اچانک ہمزاد کو کسی کی آمد کا احساس ہوا۔ تب ہی معلوم ہوا کہ یہ دانش تھا، خوشی سے ہمزاد کی حالت دیدنی ہوگئی۔ دراصل ہمزاد ومراد کو لہاسا چھوڑ کر واپس اپنی ریاست میں آگیا تھا۔

"بیٹا! تم کہاں تھے؟ ماروی کیسی ہے؟ بابا (مراد) کیسے ہیں...... اور تم؟ دیکھو...... مراد کیا بیمار ہوا ہے کہ ہم پر کیسا مشکل وقت آن پڑا۔"

"آپ لوگ فکر نہ کریں...... بابا جانی کو ہوش آنے والا ہے...... آپی انہی کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں اور بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ بابا جانی کو غار میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتیں لیکن آپی نے مجھے بتایا ہے کہ انہیں بابا جانی کی جلد شفایابی سے متعلق نوید ضرور ملی ہے......" دانش بولا۔

"خدا کرے وہ جلد شفا پائیں......" ہمزاد نے دعائیہ کہا اور بولا۔ "بیٹا! مراد کی بیماری کی وجہ سے ہماری روحانی صلاحیتیں بھی ماند سی پڑتی محسوس ہو رہی ہیں...... تم ہی کچھ کرو کسی طرح ان ظالموں کو یہاں سے دور کر دو...... ہمارا کھانا پانی سب ان مردودوں نے بند کر رکھا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں...... میں آ گیا ہوں، انہیں اچھی طرح سبق سکھاتا ہوں۔" دانش بولا تو ہمزاد نے اس سے کہا۔

"بیٹا! اپنا بھی خیال رکھنا، دشمن تب ہی خود کو ظاہر کرتا ہے جب وہ غیر معمولی طاقت میں آتا ہے۔"

"میں خیال رکھوں گا اور آپ بھی حوصلہ رکھیں۔" دانش نے ازراہ تشفی کہا۔ "آپی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جیسے ہی بابا جانی کو ہوش آ گیا، وہ بھی دشمنوں کو سبق دینے کے لیے ان کے دماغ میں جا گھسیں گی۔"

دانش وہاں سے لوٹا اور اس نے محاصرے اور قابض دشمنوں کی طاقت کا اچھی طرح جائزہ لیا...... اسے ہمزاد کی بات درست لگی۔

دشمن واقعی اس بار بڑی شیطانی قوتوں کے ساتھ ان پر قہر بن کر ٹوٹا تھا۔ شیطانی ادارے کے ٹیلی پیتھی جاننے والے بھی تھے اور ساتھ ہی اسے شیطان کے خاص چیلے "خبلیس" کی بھی غیر جسمانی موجودگی کا احساس ہوا...... ہوتے ہوتے اس نے خبلیس سمیت اس کے چیلوں آبنوس، کاہن اور طاغوتا کا بھی پتا چلا لیا یہاں تک کہ ہامی تارا کا بھی اسے علم ہو گیا کہ وہ بھی گل کھلانے کے لیے پر تولے ہوئے تھی......

خبلیس خود کو ظاہر کیے بغیر دشمنوں کی پس پردہ سپورٹ میں تھا اور اس کی نوید "ڈی۔ کیچر" کے راجر ہارڈی نے کریگ ہوسٹن کو پہلے سے دے رکھی تھی۔

اسے یہ بھی پتا چلا کہ ماروی کے طویل عرصے تک غیاب کے بعد بن زیان جو ماروی کے خوف سے اپنے جزیرہ نما محل میں ایک حصار کی حفاظت میں تھا وہ بھی کھل کر باہر آ چکا تھا اور یہاں موجود تھا۔

دانش نے سب سے پہلے دشمنوں کو "لیڈ" کرنے والے بڑے دشمن کریگ ہوسٹن کے دماغ میں جانے کا سوچا۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی خیال آیا کہ اگر وہ اس کے دماغ میں جانے میں ناکام رہا تو اس کی خبر کریگ ہوسٹن کو بھی ہو جائے گی اور کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ ریاست کے خلاف اپنا محاصرہ مزید تنگ کر دیتا اور کوئی فوری جارحانہ پالیسی اپنانے کی کوشش کرتا، لہٰذا دانش نے ذہنی فراست سے کام لیتے ہوئے فیصلہ کیا کہ پہلے بن زیان پر طبع آزمائی کی جائے......

اس سے پہلے دانش نے بیرونی دشمنوں کو جانچنے کے لیے اپنے خیالات کی لہروں کو منتشر کیا...... تو اسے واضح انداز میں تو نہیں البتہ کچھ ایسے مخفی اشارے ضرور ملے جس سے اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ براعظم کی سرحدوں سے پار اس کے دشمنوں کا ٹولا بھی ان کے خلاف سرگرم ہو چکا ہے...... جس کا تعلق زومبی گاگنا کے خاندان سے جڑتا تھا۔ ان میں بلیک میجک جاننے والے بھی تھے اور شیطانی پیروکار بھی...... پھر اس نے اپنی ماں لارا کو تلاشنے کی سعی چاہی مگر وہ اس تک ابھی رسائی حاصل نہ کر سکا......

وہ خاصا متفکر ہو گیا تھا اور پُر جوش بھی...... اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ عابد بھائی کی رحلت اور مراد علی کی طویل المرگ بیماری نے دشمنوں کے حوصلے سوا کر ڈالے تھے۔

"ماروی آپی! ارض اسلام ہر طرف سے اور ہر قسم کے خطرناک دشمنوں میں گھر چکا ہے...... خدارا...... آپ بھی جلد نکلنے کی کوشش کریں......"

خیالی پیغام رسانی کے بعد دانش نے اسی وقت بن زیان کے دماغ میں داخل ہونے کی کوشش کی...... اسے لاکڈ پا کر اس نے آنکھیں موند لیں اور باطنی نظر میں اس نے وہاں کے ماحول کا جائزہ لیا جہاں وہ اس وقت موجود تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے کیمپ کے ایک ایسے گوشۂ عافیت میں آرام کر رہا تھا، جہاں شراب بھی موجود تھی۔

دانش کے ذہن رسا میں ایک جھماکا ہوا۔ اس نے کچھ سوچ کر بن زیان کے دماغ کو جھٹکے دینا شروع کر دیے۔ وہ اپنے دماغ کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔

"دی...... ی...... یہ کیا ہو رہا ہے میرے دماغ کو......" وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور تب ہی اس کی نگاہ قریب دھری شراب کی بوتل پر پڑی۔ بلا کچھ سوچے سمجھے اس نے شراب کی بوتل ایسے ہی اپنے منہ سے لگا لی اور کریگ ہوسٹن

کی اس ہدایت کو بھی بھلا بیٹھا جو اس نے اسے یہاں آتے وقت دی تھی کہ دماغ لاکڈ ہونے کے بعد بھی اسے اگر کسی قسم کا جھٹکا محسوس ہو تو وہ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا...... اور جھٹکے لگنے کی صورت میں فوراً اسے خبر کرے گا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

وہ خرابی دماغ سمجھ کے شراب کے کئی گھونٹ چڑھا گیا تھا اور اس پر نشہ ساطاری ہونے لگا تھا، تب ہی دانش نے دوبارہ اس کے دماغ میں گھسنے کی کوشش کی اور اس بار وہ کامیاب ہو گیا......

ماروی نے اسے دشمن کی بعض کمزوریوں کے بارے میں آگاہ کر رکھا تھا جن کے ذریعے وہ بڑے اور طاقت ور دشمنوں کی سونڈ کی چیونٹی بن سکتا تھا۔ یہی تو وہ ''ویک پوائنٹس'' ہوتے ہیں جنہیں بڑی ذہنی فراست اور زیرک دماغی سے تلاش کیا جاتا ہے، جس طرح دشمن مراد وغیرہ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے رہے تھے۔ اب بن زیان کا دماغ اور وہ خود مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں آچکے تھے۔

اس کے دماغ میں کامیابی سے قابض ہونے کے بعد دانش نے پہلے اس کے اور دشمنوں کے مذموم عزائم پڑھنے کی کوشش کی، اس کے بعد اسے معلوم ہوا کہ دشمن افواج اور اتحادی افواج کے کمانڈر کون کون تھے۔ نیز محاصرے کے کمانڈنگ انچارج کہاں کہاں متعین کیے گئے تھے۔

دانش نے بن زیان کے ذریعے سے ہی ان کے دماغوں تک بھی رسائی حاصل کر لی۔ انہیں کوئی حکم دینے سے پہلے وہ ان سب کے دماغوں کو پڑھ لینا چاہتا تھا تاکہ بعد میں کوئی سقم باقی نہ رہے۔

یہی وہ وقت تھا جب دانش اپنا حکم انہیں صادر کرنے والا تھا کہ میڈم سبارو کی سوئی چبھوئی ہوئی گڑیا نے اسے تکلیف پہنچائی۔ دانش کو اپنے...... بازو میں شدید تکلیف کا احساس ہوا اور بے اختیار اس نے کراہ کر اپنا دایاں بازو پکڑ لیا۔ ابھی وہ اس تکلیف سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے اپنی بائیں ٹانگ میں اسی طرح کی تکلیف کا احساس ہوا اور وہ مارے اذیت کے بے حال ہو کر زمین پر گر پڑا۔

اس نے اپنی تکالیف کی جگہ پر کوئی زخم تلاشنے کی کوشش کی مگر اسے وہاں کسی زخم یا ضرب کا نشان تک نظر نہیں آیا...... اسے حیرت ہوئی، ساتھ ہی پریشان بھی ہوا کہ یہ کیسی تکلیف تھی جو اسے دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ درد تو یوں بھی کب نظر آتا ہے، مگر جہاں ہوتا ہے وہ جگہ متورم تو ضرور ہوتی ہے۔ اس نے درد کا احساس کیا اور اس کی نوعیت جاننے کی کوشش کی تو اسے یوں لگا جیسے اس کے بازو اور ٹانگ میں سوئی گھونپ دی گئی ہو...اس کا وہ عمل بھی ٹوٹنے لگا جو اس نے بن زیان پر کر رکھا تھا۔

اس نے اپنی ان دیکھی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے، خیال خوانی کی اور بن زیان کو چھوڑ کر اس نے چوٹ پہنچانے والے کو تلاشنا چاہا مگر ناکام رہا۔ اس نے فوراً دوبارہ بن زیان کے دماغ میں رسائی حاصل کی کہ کہیں یہ کم بخت ہاتھ سے نہ نکل جائے، چوٹ تو پھر بھی برداشت کی جاسکتی تھی مگر بن زیان جیسا موذی ہاتھ سے نکل جاتا تو برا ہوتا۔ اس نے اسی وقت بن زیان کے ذریعے ان سارے کمانڈروں کو محاصرہ ہٹانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی انہیں آپس میں لڑوا دیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دشمنوں کا یہ بیس کیمپ خود ایک میدانِ جنگ کا ساں پیدا کرنے لگا...... دانش نے بن زیان کے احکامات کو جاری رکھتے ہوئے اس کے دماغ کو ایک آخری جھٹکا دیا تاکہ کریگ ہوسٹن اس کے دماغ میں آکر اس کا حکم نہ ٹلوا سکے...... نہ ہی اسے اس کے بارے میں (دانش کے بارے میں) کچھ اندازہ ہو سکے......

دانش کے ٹیلی پیتھی عمل میں یہ سب سے اہم صلاحیت تھی کہ اس کا کیا گیا تنویمی عمل ٹوٹتا نہیں تھا۔ ادھر بن زیان کے لیے یہ دماغی جھٹکا تباہ کن ثابت ہوا، وہ کر یہہ انگیز چیخ مار کر گرا اور تڑپ تڑپ کر تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈا پڑ گیا۔

دانش نے خیال خوانی کی پرواز کی اور ہمزاد کو بتا دیا کہ وہ اپنی بچی کھچی فوج کو دوبارہ دشمنوں کے مقابلے پر لے آئے کیونکہ اس نے ان کے درمیان خیال خوانی کی ''پھوٹ'' ڈلوا دی ہے۔

ہمزاد نے زیب النساء سے مشورہ کیا، وہ کچھ خوشی اور کچھ تفکر سے بولی۔

''میرا خیال ہے ہم ابھی دوبارہ لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں...... ابھی ہم صرف اپنی دفاعی پوزیشن میں رہیں تو سردست یہی بہتر رہے گا۔ محاصرہ ٹوٹ جائے اور دشمن کے اندر خرابی پیدا ہو جائے۔ دانش بیٹے سے کہو کہ وہ اسی طرح ان کے سر کا درد بنا رہے تاکہ دشمن خود ہی بیزار اور گھبرا کر اپنے پیروں بھاگ کھڑا ہو۔''

ہمزاد کو زیب النساء کی یہ تجویز اچھی لگی۔ اس نے وہی دانش کو بتادی، دانش نے ابھی انہیں اپنی ''پراسرار تکلیف'' کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ کہیں یہ لوگ دوبارہ نہ پریشان ہو جائیں...... وہ اپنی اس تکلیف کا خود ہی...

سدباب کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ایسا ہی کیا اور بڑے دھیان سے اپنے اعصاب کو پُرسکون کرتے ہوئے، تکلیف سہتے ہوئے گہرائی تک خیال خوانی کی اور اس پراسرار تکلیف کا محرک تلاشنے کی کوشش کی تو اسے پھر بھی کچھ سمجھ نہیں آیا۔

اس نے سوچا ماروی آپی سے اس سلسلے میں کچھ مشورہ اور مدد لی جائے مگر عبث رہا وہ ابھی گالان کی گپھا کے اندر ہی تھی اور وہاں تک اس کی خیال خوانی کی لہریں پہنچنے سے قاصر تھیں۔ یوں بھی ماروی نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی باباجانی کو ہوش آجائے گا، وہ خود ہی گپھا سے باہر آکر اس سے رابطہ کرلے گی بلکہ سب سے کرے گی۔

دانش اپنی اس پراسرار تکلیف کے لیے صرف ماروی سے ہی مشورہ کرنا چاہتا تھا اور اسی سے اس کا ذکر بھی کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔

اس نے بن زیان سے خاطر خواہ کام لے لیا تھا اور بعد میں اسے شدید دماغی جھٹکے پہنچا کر بالآخر ہلاک کردیا تھا۔

ادھر جب کریگ ہوسٹن کو ان کمانڈرز کی آپس کی لڑائی کا علم ہوا تو اسے شدید حیرت ہوئی۔ اس کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہ حرکت کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے نے کی ہوگی۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ کمانڈرز میں شاید آپس میں... کوئی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہوگی، کیونکہ ایک ہی جگہ مستقل قیام کرنے کے باعث ایسا بھی کبھار ہوجاتا ہے۔ یقیناً یہ کسی آپس کی ''مس انڈراسٹینڈنگ'' کا ہی نتیجہ ہوسکتا ہے۔

کیونکہ اسے روشن دنیا والوں کی طرف سے تسلی تھی کہ وہ خود محصور تھے۔ ان کا (روشن دنیا والوں کا) شہ زور...... عابد علی منگی عرف عابی مرچکا تھا۔ ریاست کا فرماں روا، مردِ آہن، مراد علی منگی ایک دور دراز برفیلے مقام پر موت کی گھڑیاں گن رہا تھا، آفت کی پرکالہ ماروی کو باپ کے ساتھ ہی گالان کی اس گپھا میں محدود کردیا گیا تھا۔ رہا دانش تو وہ اپنے باپ اور بہن کی بیرونی رکھوالی کے لیے وہیں ان کے اریب قریب رہنے پر مجبور تھا۔

تاہم کریگ ہوسٹن بھی کم گھاگ نہ تھا۔ اس نے ان سب باتوں کے باوصف اپنے ذہن میں یہ خدشہ ضرور رکھا تھا کہ یہ ''کارستانی'' کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے کی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ان کی اپنے اتحادیوں سے اچھی خاصی انڈراسٹینڈنگ تھی اور انہیں پورا یقین دلایا گیا تھا کہ ریاست ارض اسلام میں پوری طرح قابض ہوجانے کے بعد ان کے بعض اہم وسائل پر ان کی پوری پوری حصے داری ہوگی اور انہیں ان کا معاوضہ بھی طے شدہ معاہدے کے مطابق مختلف اشکال میں ادا کیا جائے گا۔

لہٰذا اس نے سب سے پہلے تو اس لڑائی کے محرکات تلاش کرنے کی کوشش کی کیونکہ یوں اسے فوراً اس بات کا اندازہ ہوسکتا تھا کہ آیا معاملہ ٹیلی پیتھی کا تھا یا واقعی پھوٹ ڈالنے کا تھا...... اگر ٹیلی پیتھی کا شاخسانہ نہ ہوتا تو لڑائی کی کوئی وجہ سرے سے ہی نہ ہوتی، بجز اس کے کہ...... بس یہ لوگ اچانک سے ہی ایک دوسرے کو اپنا جانی دشمن سمجھنے لگے تھے اور اگر واقعی پھوٹ ڈالنے کا معاملہ ہوتا تو ان کے بیچ مفتوح مملکت کی حصے داری کا کوئی شوشہ چھوڑا گیا ہوتا۔

دانش بھی صرف نام کا ہی دانش نہ تھا...... وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے ٹیلی پیتھی کا یہ وار بہت سنبھل کر کیا تھا...... وہ جانتا تھا کہ ایسے موقعے پر ٹیلی پیتھی کا گیم کھیلا گیا تو اس کی کامیابی عارضی بھی ثابت ہوسکتی ہے اور دشمن فوراً اس کا توڑ نکال لیں گے...... جبکہ وہ اسی بھول میں تھے کہ اس وقت ارض سلام کے جو دو بڑے ٹیلی پیتھی اور روحانی قوتوں کے ماہر تھے وہ مراد علی منگی کو بچانے کے لیے مصروف کار تھے اور اس پوزیشن میں ہرگز نہ تھے کہ وہ اس طرح کا کوئی کھیل کھیل سکتے۔

اسی لیے دانش نے ان کمانڈر کے دماغوں میں صرف ایک دوسرے سے بلاجواز پل پڑنے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا بلکہ بڑی چالاکی اور مہارت سے پہلے ایک کے دماغ میں یہ بات راسخ کردی تھی کہ ان کے ساتھ دوست بن کر دھوکا کیا جانے والا ہے۔ مقصد کی برآوری کے بعد انہیں یا تو غیر اہم وسائل کے جھانسے میں رکھا جائے گا یا پھر ٹالا جاتا رہے گا، نیز کسی کو کم اہمیت دی جائے گی اور کسی کو زیادہ فائدہ پہنچایا جائے گا، وغیرہ......

لہٰذا جب کریگ ہوسٹن نے ان کے دماغ میں جھانکا تو اسے یہی کچھ معلوم ہوسکا...... وہ پریشان ہوگیا۔ اس نے ان کے دماغوں میں گھس کر انہیں حکم دیا کہ وہ یہ سب محض ایک غلط فہمی کی بنا پر کررہے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں......

معاملہ کچھ سنبھلا جس کی دانش کو خبر ہوئی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد دو تین کمانڈروں کے دماغ کو لاک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کے اذہان میں یہ بات بٹھادی کہ ان کے ساتھ اسی طرح کا دھوکا کیا جانے والا ہے کیونکہ کریگ ہوسٹن اور اس کی افواج بہت جلد ارض اسلام پر اپنا مکمل تسلط جمانے والی ہے۔

ادھوری فتح اور ادھوری حکومت، ایک مکمل شکست

سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ کریگ ہوسٹن اور مراد علی منگی کے دشمن اسی صورتِ حال سے دوچار ہو چکے تھے۔

کریگ ہوسٹن سے یہ موجودہ صورتِ حال ایک حد تک ہی سنبھلی تھی لیکن پھر وہی حالات پیدا ہونے لگے تو اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کی یہ ادھوری فتح اب سانپ کے گلے میں پھنسے ہوئے اس چھچھوندر کی مثل ہوگئی تھی جو نہ نگلنے کا تھا اور نہ اگلنے کا......

☆☆☆

ہامبی تارا...... عذرباد کو خاطر میں لائے بغیر اپنے مشن میں مصروف تھی۔ وہ ایک بار بڑی کامیابی سے دانش کو ماں کا جھانسا دے چکی تھی...... اس بار اس نے خیال خوانی کی تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ جب اس کے دماغ میں پہنچی تو اسے لاکڈ پایا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی اور دماغی جھٹکوں سے بھی کام لیا لیکن عبث...... کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا...... اسے حیرت آمیز پریشانی نے جکڑ لیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا تھا؟ وہ دانش کو کیوں نہیں ''کیچ'' کر پارہی تھی؟ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ سوچتی رہی اپنے دماغ پہ زور دیتی رہی...... پھر دفعتاً ہی اس کے دماغ میں ایک خیال آیا......

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس کے کسی طاقت ور ٹیلی پیتھی جاننے والے بہی خواہ نے اس کا دماغ لاکڈ کر رکھا ہو؟ مگر...... کیوں؟

عذرباد کا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا کہ کہیں یہ اس کی شرارت نہ ہو۔ وہ پہلے ہی اس کی کامیابی سے جلتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے پہلے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر خبلیس معظم کے سامنے سرخرو ہو۔

بہرکیف...... اس کا پتا چلانے کے لیے ہامبی تارا نے طاغوتا کو اپنا بنایا۔ وہ اس کا ایک خاموش عاشق تھا، جب پہلی بار...... خبلیس نے ان کا برین واش آؤٹ کیا تھا اور ان کی تمام صلاحیتیں دوبارہ بحال کر ڈالی تھیں تو اس نے ہامبی تارا کو شیطانی معبد میں ہی دیکھا تھا اور اسی دن سے اس پر عاشق ہو گیا تھا...... مگر پھر یہ دیکھ کر کہ ہامبی تارا تو پہلے ہی خبلیس کی محبوبہ کہلاتی تھی، اس نے اپنے اس چور خیال کو بھی اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

ہامبی تارا کو پتا تھا کہ طاغوتا اس کا ایک خاموش چاہنے والا ہے۔ اس وقت اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی کیونکہ اسے اپنے حسن کی تجلیوں کا علم تھا...... اور وہ خبلیس کی خاص کنڈل داسی اور عذرباد کی محبوبہ ہونے کی دعوے دار تھی مگر اب چونکہ حالات کچھ اور تھے، اسی لیے اس نے طاغوتا کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

اسے ایک بات کی تو تسلی تھی ہی کہ خبلیس نے اسے اپنی صوابدید پر چھوڑ رکھا ہے اور وہ اس کی شیطانیت پھیلانے کے لیے اپنی مرضی سے کچھ بھی کر سکتی ہے، سو وہ کر رہی تھی اور اسے اب عذرباد کی بھی کوئی پروا نہ رہی تھی، کیونکہ اسے خبلیس کی طرف سے ''شہ'' مل چکی تھی۔ یوں بھی عذرباد کے سلوک اور اس کے تھپڑ نے اس کے دل و دماغ سے کافی ساری ہوا نکال دی تھی۔

''طاغوتا! کیسے ہو؟ یہ میں مخاطب ہوں تم سے...... ہامبی تارا۔''

اس کے دماغ میں پہنچ کر اسے مخاطب کرتے ہوئے ذرا نرم لہجے میں اس نے کہا تو طاغوتا کو تو پہلے یقین ہی نہیں آیا کہ ہامبی تارا جیسی حسینہ اس سے مخاطب تھی، اس پر تو جیسے شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ تاہم وہ ڈرا بھی کہ کہیں یہ کوئی اور معاملہ تو نہیں؟ پھر اس کے میٹھے لہجے کا اثر تھا کہ اس نے فوراً فریفتہ ہونے کے انداز میں تابعداری سے کہا۔

''زہے نصیب...... مادام! میں آپ کا غلام...... اس ناچیز کو کیسے یاد کیا؟''

''مجھے اپنے مشن کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔'' ہامبی تارا نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ ''کیا تم کسی مشن میں پہلے سے مصروف تو نہیں ہو؟''

اس کی بات سن کر طاغوتا گویا ریشہ خطمی ہوتے ہوئے بولا۔

''مصروف تو خبلیس معظم نے سب کو ہی کسی نہ کسی مشن میں رکھا ہوا ہے...... لیکن آپ کے کام آنا بھی میرے لیے اپنے مشن کا ایک حصہ ہی ہوگا...... کیونکہ معظم خبلیس کا یہی حکم ہے کہ ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام بھی آتے رہو...... حکم کریں...... یہ غلام آپ کے کس کام آسکتا ہے؟''

اس کی بات سن کر ہامبی تارا اندر سے کھل اٹھی۔ اسے تسلی ہوئی تھی کہ طاغوتا جو کہہ رہا تھا، وہ غلط نہ تھا۔ دوبارہ اس سے میٹھے لہجے میں بولی۔

''تم دشمنوں کے پرانے جاننے والے ہو اور ان کی بعض کمزوریوں سے واقف بھی...... کسی طرح سے پتا لگاؤ کہ دانش کے دماغ کو کس نے لاکڈ کر رکھا ہے؟ حالانکہ میں پہلے ایک بار اس کی ماں کے بھیس میں اس کے دماغ میں جا چکی ہوں...... اور یاد رہے، اس نے اپنی ماں لارا کے

سلسلے میں اپنے دماغ کو بھی لاکڈ نہیں کیا۔"

"ابھی پتا لگا کر آپ کو بتاتا ہوں...... مادام!" طاغوتا نے کہا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ہامبی تارا کے دماغ میں آکر ایک سنسنی خیز انکشاف کر ڈالا...... مجرم گھر کا بھیدی ہی نکلا تھا جس کے بارے میں بتاتے ہوئے طاغوتا کو حیرت بھی ہو رہی تھی اور وہ کچھ خوف زدہ بھی تھا...... تاہم محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"مادام! ممکن ہے ایسا کسی وسیع مفاد میں ہو...... لیکن آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے عجیب ہی لگ رہا ہے کہ آپ کے داخلے کو روکنے کے لیے دانش کا دماغ عذرباد نے لاکڈ کیا ہے......"

اس اطلاع پر ہامبی تارا کے تن بدن میں آگ لگ گئی...... اسے عذرباد سے نفرت ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ جبلیس سے اس سلسلے میں بات کرے...... مگر پھر اس کی ہدایت اسے یاد آگئی کہ اس نے کہا تھا، وہ دونوں جو چاہے کریں، دونوں آزاد ہیں...... تو اس نے خود ہی کچھ کرنے کا فیصلہ کیا اور طاغوتا سے کہا۔

"تمہارا شکریہ طاغوتا! تم میرے کام آئے...... کیا میں آئندہ بھی تم سے امید رکھوں؟"

"میں ہر وقت، ہر پل آپ کے کام آنے کے لیے حاضر رہوں گا مادام...... اور کوئی حکم؟" طاغوتا فرماں برداری سے بولا۔

"میں نے دانش کو اس کی ماں کے روپ میں بے وقوف بنا رکھا تھا۔" بالآخر اس نے کہا۔ وہ طاغوتا اور اس کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد کرنے لگی تھی۔ جانتی تھی کہ یہ تاریک دنیا کا سب سے پرانا اور گھاگ فرد تھا۔

"میں دانش کو اس کی ماں لارا کے روپ کے جھانسے میں رکھے ہوئے تھی اور کامیاب جا رہی تھی کہ عذرباد نے اپنے نمبر بڑھانے اور مجھے اپنی تابعداری میں رکھنے کے چکروں میں میرا یہ مشن ڈراپ کر دیا۔ مشکل یہ ہے کہ میں اس کی شکایت جبلیس سے بھی نہیں کر سکتی...... خود کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

ہامبی تارا نے اپنی پریشانی اس کے گوش گزار کر دی۔ طاغوتا کو سنجیدہ ہونا پڑا...... اسے معاملے کی گمبھیرتا کا اندازہ ہوا تو وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

"مادام! آپ فکر نہ کریں...... مجھے ایک بار پھر تھوڑا وقت دیں......"

"تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھلاؤں گی طاغوتا! مجھے کسی طرح دانش کے دماغ میں پہنچا دو اور اس کے بعد تم اور میں......"

یہ کہتے ہوئے ہامبی تارا نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو طاغوتا مسرور سا ہو کر چلا گیا۔

وہ تھوڑی دیر بعد آیا اور بولا۔ "مادام! آپ آزاد ہیں...... شیطان معظم نے ہمیں جو طاغوتی قوتیں عطا کر رکھی ہیں، ان میں سے ایک کو میں نے اس طرح آزمایا ہے کہ عذرباد کو ہم پر ذرا بھی شک نہ ہوگا...... اب میری شکایت آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہم اور تم ایک عظیم ہم راز بن چکے ہیں طاغوتا!" ہامبی تارا پورے جوش مسرت سے بولی۔ "تم دیکھنا ہمارا یارانہ کس قدر کامیاب رہے گا...... اب میری بھی ایک بات سن لو، یہ عذرباد ہی تھا جس نے شیطان معظم سے مصلحت کے نام پر اور دشمنوں پر حاوی ہونے کے لیے اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ تم تینوں کو طویل عرصے کے لیے برین واش کر کے معبد کے کونے میں پھینک دیا جائے۔ یہ میں ہی تھی کہ جبلیس سے کہلوا کر تم تینوں کو اپنی اصل صلاحیتوں کے ساتھ دوبارہ فعال کروایا...... درحقیقت عذرباد کی چال یہی ہے کہ پاتال کی منحوس گہرائیوں میں جبلیس کے عظیم ماتحت کے طور پر صرف اسی کا نام گونجتا رہے۔ اپنے اس ذاتی مقصد کے لیے وہ اپنوں کے خلاف بھی کارروائی کرنے سے نہیں چوکتا...... اب ہم دونوں نے اپنا مشن کامیاب اور اس کا ناکام کر کے جبلیس کے سامنے یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ عذرباد کی پالیسیاں غلط اور ہماری درست تھیں۔"

"میں سمجھ گیا مادام! اگر یہ بات ہے تو پھر میں آپ کے ساتھ ہوں۔" طاغوتا بولا اور پھر اجازت لے کر چلا گیا۔

اس دن کے بعد سے ہامبی تارا اور عذرباد کے درمیان اچھی خاصی ٹھن گئی تھی۔ اس نے یہ معاملہ بعد کے لیے اٹھا رکھا اور پھر اسی وقت دانش کے دماغ میں دستک دی۔

دانش اس وقت اپنی ٹانگ اور بازو کی اس نامعلوم اور پراسرار تکلیف پر پڑا اینٹھ رہا تھا کہ اسے اپنی ماں کی آمد کی خبر ہوئی۔ اس نے فوراً اسے آنے کی اجازت دی اور باطنی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے ایک جھٹکا لگا۔

اسے اپنی آپی (ماروی) کی بات یاد آگئی...... یہ کوئی اور خاتون تھی جو اس کی ماں کا روپ بھر کے آئی تھی۔ اس نے چالاکی سے کام لیا اور اسے آنے کی اجازت دی...... یہی وہ وقت تھا جب ہامبی تارا کو اندر سے کھٹک ہوئی۔

"اوہو...... لختِ جگر! تم زخمی ہو......؟ کس نے

تمہارا یہ حال کیا؟ مجھے بتاؤ...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''مام! آپ کہاں تھیں؟ میں آپ کو یاد کرتا رہا...... آپ کس قدر کٹھور ہیں، میرا پلٹ کر حال بھی نہیں پوچھا...... دیکھیں، نہ جانے کس نے مجھے اتنا زخمی کر ڈالا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رو پڑا۔

ہامبی تارا کو ایک موقع ملا۔ اپنے لہجے اور آواز میں دنیا جہاں کی ممتا اور محبت کا جوش سموتے ہوئے وہ اس سے بولی۔

''بیٹا! تم بالکل پریشان مت ہونا، میرا انتظار کرو...... میں تمہیں کبھی اس حال میں نہیں دیکھ سکتی...... ابھی پتا چلاتی ہوں کہ یہ کس کی حرکت ہے۔''

''تھینک یو مام! بٹ ڈوانٹ ہری...... میں بہت اذیت میں ہوں......''

ہامبی تارا چلی گئی۔ دانش دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ وہ اس کا پتا چلا چکا تھا۔ یہ جبلیس کی چیلی ہامبی تارا تھی۔

اس نے بھی اب لوہے کو لوہے سے کاٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شیطان کی یہ چیلی اس کے مرض کا ضرور پتا چلالے گی...... اور وہی ہوا...... ہامبی تارا نے سوچ کی لہروں کو وسیع کیا... تو وہ جنوبی افریقا کی جادوگرنی، زومبی گاگانا کی بہن کمبلی گاگانا تک جا پہنچی اور تب اسے معلوم ہوا کہ روشن دنیا کا ایک اور نیا دشمن پیدا ہو چکا تھا، بلکہ یہ ایک پرانے دشمن ہی کی باقیات تھی۔ یعنی زومبی گاگانا کی عابی مرحوم کے ہاتھوں ہلاکت کے بعد اس کی بہن کمبلی گاگانا نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے مراد کے ان دونوں بیٹی بیٹے (دانش اور ماروی) کو اذیتیں دے کر ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا...... اور اس مقصد کے لیے کمبلی گاگانا نے اپنی ایک ساتھی جادوگرنی میڈم سبارو کو یہ ٹاسک دے کر بھیجا تھا کہ وہ ان دونوں بہن بھائی کو اذیتیں دے کر ہلاک کرے گی۔

جن گڑیا میں اس نے سوئیاں چبھوئی تھیں، وہ اسی کے پاس موجود تھیں، نیز اب وہ یعنی میڈم سبارو کہاں تھی، یہ اسے ابھی نہیں پتا چل سکا تھا۔

بہرطور...... اس نے دانش کے اریب قریب رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ شاید اسے میڈم سبارو کا کھوج مل جائے...... پھر بھی اس نے دانش کے پاس آکر کہا۔

''میرے بچے! جنوبی افریقا کے ایک وچ خاندان سے تعلق رکھنے والی جادوگرنی کمبلی گاگانا کی ایک ساتھی میڈم سبارو نے دو گڑیوں کے ساتھ یہ سوئیوں والا سارا کھیل کھیلا ہے، ایک تمہارے لیے اور دوسرا تمہاری بہن ماروی کے لیے......''

اس کی بات پر دانش پریشان سا ہوگیا۔ اسے اپنی پریشانی سے زیادہ آپی ماروی کی فکر تھی کیونکہ وہ پہلے ہی ایک اہم کام میں مصروف تھی اور وہیں کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر اسے یہ تکلیف پہنچتی تو پھر بابا جانی کو کون دیکھتا...... اس نے فوراً پُرتشویش لہجے میں ہامبی تارا سے کہا۔

''آپ کسی طرح میڈم سبارو کو تلاش کیجیے مام! اس کا ہلاک ہونا ضروری ہے...... لیکن، آپ کب یہ چاہیں گی کہ روشن دنیا کے کسی فرد کی مدد کریں؟''

دانش نے شکوہ بھی کردیا تو ہامبی تارا نے بھی لاڈ بھرے انداز میں صاف گوئی سے کہا۔

''ہاں میرے بچے! تم نے صحیح کہا ہے، میں تمہاری مدد تو ضرور کروں گی مگر تمہاری بہن ماروی کے سلسلے میں مدد کرنے سے قاصر ہی رہوں گی، کیونکہ میں بھی مجبور ہوں اگر میں ایسا کروں گی تو شیطان کی طرف سے زیرِعتاب

عقلمندی

سیلز مین نے ایک لڑکی کو براؤن شوز کے دام دو سو روپے بتائے مگر اس کے پاس صرف سو روپے تھے لہٰذا اس نے وہی رقم بطور امانت رکھ کر جوتے اس کو دے دیے کہ باقی رقم وہ کل آکر دے دی گی۔

''تم بالکل بے وقوف ہو۔'' دکان کے مالک نے چلا کر کہا۔ ''اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔''

''اس کے اچھے بھی آئیں گے جناب!'' سیلز مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے دونوں جوتے بائیں پیر کے دیے ہیں۔''

جواب

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ''گھر میں لڑکی جوان ہوگئی ہے اور آپ کو کچھ پروا ہی نہیں۔''

''تو کیا کروں؟'' شوہر نے بے بسی سے پوچھا۔ ''تلاش تو کر رہا ہوں مگر کیا کروں؟ جو بھی لڑکا ملتا ہے، احمق، کام چور اور معمولی شکل و صورت کا ہی ملتا ہے۔''

''لو اور سنو...... اگر میرے والد بھی یہی سوچتے تو میں اب تک کنواری ہی بیٹھی رہتی۔'' بیگم نے تنک کر جواب دیا۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

آجاؤں گی......"

"ٹھیک ہے مام! لیکن آپ اسے تلاش تو کرسکتی ہیں نا......؟ وہ ہے کہاں اور کیا چاہتی ہے؟" دانش نے کہا تو وہ بولی۔

"میں کوشش کررہی ہوں، تم فکر نہ کرو...... ہاں! تمہاری ریاست پر دشمنوں نے حملہ کررکھا ہے، کیا تم مجھے وہاں لے جاسکتے ہو؟ ہوسکتا ہے میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں؟"

اس نے آخر میں بڑی مکاری سے اپنے مطلب کی بات بھی کردی تو دانش بھی چالاکی سے بولا۔

"جس طرح آپ کی مجبوری ہے اسی طرح میری بھی مجبوری ہے مام! لیکن میں انکار نہیں کررہا...... آپ کو مناسب وقت پر وہاں اپنے ساتھ لے چلوں گا...... آہ...... میری تکلیف......"

وہ آخر میں کراہ اٹھا...... ہامبی تارا نے دکھاوے کی پریشانی ظاہر کی اور ممتا بھرے لہجے میں بولی۔

"کیا ہوا میرے لعل؟"

"مام! اس موذی کو جلدی تلاش کیجیے، ورنہ میری جان نکل جائے گی......"

"جان تو تمہاری اور تمہاری بہن ماروی کی میں بھی نکالنا چاہتی ہوں مگر وقت آنے پر......"

اس کی بات پر ہامبی تارا نے دانت پیس کر دل ہی دل میں کہا، یہ دل کی آواز دانش نے بھی سن لی۔

ہامبی تارا اسے تسلی دے کر بے نیل و مرام چلی گئی...... وہ میڈم سبارو کو تلاش کرنا چاہتی تھی، وہ اس کے ساتھ سودے بازی پر تیار تھی۔

اس نے خیالات کی لہروں کو دوڑایا۔ وہ جنوبی افریقا کی اس بستی میں پرانے برگد کی جڑ میں موجود، کمبلی گائنا کے ٹھکانے میں جاپہنچی...... کمبلی گائنا اس وقت اپنے بھائی زومبی گائنا کی لاش پر کوئی جنتر منتر اور الاپ شلاپ میں مصروف تھی۔

"کون ہے؟"

برگد کی جڑ کے محبوس ٹھکانے میں کمبلی گائنا کی بارعب آواز گونجی۔ ہامبی تارا کو اس کی جادوگری پر قائل ہونا پڑا، ورنہ تو وہ یہی سمجھی تھی کہ اس کی وہاں غیر جسمانی موجودگی کا اسے علم نہ ہوگا، ایک امتحان تھا سو لے لیا گیا تھا۔

"میں تمہاری دوست اور دشمن کی دشمن...... ہامبی تارا ہوں۔"

"کہاں سے آئی ہو؟ اور مقصد بیان کرو...... ٹیلی پیتھی جاننے والے میرے آگے پانی بھرتے ہیں۔ خبردار...... ایسی کوئی حرکت مت کرنا۔"

"میں جانتی ہوں اسی لیے دوستی کا ہاتھ بڑھانے آئی ہوں۔" ہامبی تارا بولی۔

"دوستی کے پیچھے غرض ہونا ضروری ہے میرے لیے...... تم میرے کس کام آسکتی ہو؟" کمبلی گائنا بولی۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارے دشمن مشترکہ ہیں۔"

"یہ کوئی خاص اہمیت والی بات نہیں جس سے ہماری دوستی کی بنیاد پڑے۔" کمبلی گائنا یکدم اکھڑے لہجے میں بولی۔ "میں اپنے دشمنوں کو خود ہی ٹھکانے لگانے کی سکت رکھتی ہوں۔"

ہامبی تارا جان گئی کہ یہ بیل آسانی سے منڈھے چڑھنے والی نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ خود اس کی دوستی، بالفاظِ دیگر مدد کی خواہشمند ہے، اس لیے اس کی پُرغرور صفت کو سہتے ہوئے بولی۔

"دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی تمہارے بھائی نے بھی کی تھی اور ساری دنیا نے اس کا صحرا میں حشر دیکھا، اب تم بھی وہی غلطی کررہی ہو......"

ہامبی تارا کا یہ طعنہ کمبلی گائنا کو سیدھا پیشانی پر لگا۔ وہ بلبلا کر بولی۔

"دفع ہوجاؤ یہاں سے...... چلی جاؤ ورنہ جلا کر بھسم کردوں گی......" اس نے جلدی جلدی کچھ بدبدانا شروع کردیا۔

ہامبی تارا کے گرد آگ روشن ہوگئی، کمبلی گائنا کو کیا معلوم تھا کہ ہامبی تارا خود شیطان ہے اور آگ کی پیداوار بھی، اس پر آگ کیا اثر کرے گی۔ اس نے کمبلی گائنا کے غرور کو خاک میں ملانے کے لیے اس کے دماغ کو جھٹکے دیے۔

وہ چلانے لگی۔ ابلیس نے ہامبی تارا کو جتنی بھی طاغوتی قوتوں سے آشنا کررکھا تھا، وہ ساری اس نے کمبلی گائنا پر آزما ڈالیں...... جس کے نتیجے میں بہت جلد ہی کمبلی گائنا زیروزبر ہوکر تڑپنے لگی...... اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہیں آتا، خود کو بلند اور اونچا ہی سمجھتا ہے......

کمبلی گائنا نے دیکھا کہ اس سے بھی بڑھ کر طاغوتی قوتوں والے پڑے ہیں، جنہوں نے اس کے ٹھکانے میں آکر اسے بے بس کردیا ہے تو بہتری اسی میں ہے کہ اس گمنام کو دوست بنالیا جائے...... وہ چلا کر بولی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... مجھے تسلیم ہے تمہاری

دوستی......تم میری دوستی کی کسوٹی پر پوری اتری ہو۔
ہامبی تارا نے ایک شیطانی قہقہہ بلند کیا اور اسی لہجے میں بولی۔
”مگر تم میری کسوٹی پر پوری نہیں اتری ہو......اب میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گی......تم اب صرف میرا کہنا مانو گی......بولو منظور ہے؟“
یہ سن کر کمبلی گا ئنا کے تن بدن میں آگ لگ گئی......بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔”کیا بکواس کر رہی ہو۔تم مجھے جانتی نہیں ہو۔میں افریقا کے جادوگروں کے ایک پورے قبیلے کی سردارنی ہوں۔ابھی انہیں حکم دوں گی تو وہ سب تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جلا کر بھسم کر ڈالیں گے......تم نے اگر دھوکے سے مجھ پر قابو پالیا ہے تو کسی بھول یا خوش فہمی میں مت رہنا......میں اس کا توڑ بھی جانتی ہوں......اور تمہارا بھی برا حشر کر سکتی ہوں......“
ہامبی تارا بھی کھاگ تھی اور سمجھتی تھی کہ کمبلی گا ئنا غلط نہیں کہہ رہی تھی۔گیدڑوں کا غول بھوکا ہو تو شیر پر بھی حملہ کر دیتا ہے۔وہ ایک قہقہہ لگا کر مکارانہ فروتنی سے بولی۔
”یہی بات تو میں تجھے سمجھانا چاہ رہی تھی کمبلی بہنا کہ برابری کی سطح پر ہی دوستی زیادہ پائیدار ثابت ہوتی ہے،خود کو دوسرے سے برتر سمجھ کر دوستی کرنا عداوتوں کو جنم دیتا ہے۔لو......اب تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں......تھام لو یا ٹھکرا دو......“
یہ کہتے ہی ہامبی تارا اس کے سامنے اپنے پورے وجود کے ساتھ آ گئی۔وہ ایک حسین و جمیل عورت کے روپ میں تھی۔کمبلی گا ئنا نے تیز طرار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسی لہجے میں بولی۔
”بہن بھی کہہ دیا اور دوستی کا بھی ہاتھ بڑھا لیا تو اب یہ رشتہ قائم رہے گا......ویسے تم اب بھی اپنے اصل روپ میں نہیں ہو......شیطانی صفت کے لوگ اس قدر حسین نہیں ہوتے......“
”ہاہاہا......بہت تجربے کار ہو۔“ہامبی تارا نے قہقہہ لگایا۔
”صحیح کہا تم نے......اب کام کی بات ہو جائے؟“
”ہاں بولو!“
”تمہاری ساتھی میڈم سبارو نے میرا ایک ہوتا ہوا کام بگاڑ دیا ہے۔ایسا ظاہر ہے نادانستگی میں ہوا ہے۔اگر تم اسے کہہ دو کہ وہ صرف ماروی کے پیچھے رہے اور دانش کا پیچھا چھوڑ دے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ میں نے ابھی دانش سے بہت سے اہم کام لینے ہیں۔“

اس کی بات پر کمبلی گا ئنا حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔
”دانش تو ہمارے مشترکہ دشمنوں میں سے ایک ہے......لیکن......ٹھیک ہے،تمہیں اگر اس سے ایسا کوئی کام لینا ہے جو مراد علی منگی اور اس کے ساتھیوں کی تباہی و بربادی کا باعث ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“
”تمہارا شکریہ کمبلی بہنا!“ ہامبی تارا بولی۔”مراد اور اس کے سارے ساتھی اپنی رعایا کے ساتھ اس وقت تباہی کے دہانے پر ہی کھڑے ہیں......ہم نے ریاست ارض اسلام کے فرماں روا مراد علی منگی کو بیمار و لاچار کر کے تبت کے دور دراز برف پوش غاروں میں پھنکوا دیا،جس کے نتیجے میں ان کے چھپے ہوئے لاتعداد دشمنوں کو کھل کر میدان میں آنا پڑا اور یوں وہاں ان کا قبضہ ممکن ہوا۔“
”سچ کی آڑ میں جھوٹ شامل مت کرو بہن ہامبی تارا......!“ کمبلی گا ئنا بولی۔”مجھے وہاں کے تمام حالات کا علم ہے۔مراد کے دشمنوں کو ابھی تک مکمل فتح حاصل نہیں ہوسکی ہے اور ادھوری فتح ان کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے۔رہا مراد تو وہ لہاسا میں گالان کے غار میں اپنی شفایابی کا منتظر ہے......اس کے بارے میں کیا کہو گی؟“
ہامبی تارا کا جھوٹ چل نہ سکا۔خجالت آمیز مسکراہٹ سے بولی۔
”یہ کیا کم فتح ہے کہ ہم نے ارض اسلام کے باسیوں کو محبوس رہنے پر مجبور کر دیا ہے......ایک دشمن کی وجہ سے معاملہ تھوڑا الجھ ضرور گیا ہے مگر ہم جلد ہی باہمی تعلق داری سے اس پر قابو پالیں گے......اسی لیے تو کہتی ہوں کہ کالی طاقتوں کا بھی آپس میں اتحاد ضروری ہے۔ماضی میں بھی ہماری باہمی چپقلش کا فائدہ انہی کو ہوتا رہا ہے۔میں نے ابھی ”دی کیچر“ کے شیطانی ادارے کے سربراہ راجر ہارڈی سے بھی جا کر ملنا ہے اور معظم جبلیس کا پیغام اسے پہنچانا ہے۔“
”ٹھیک ہے،میں تمہارے ساتھ ہوں......دانش کو میڈم سبارو آزاد کر دے گی۔“
”میرا اس سے رابطہ کروا دو......اور اسے کہو کہ وہ اس سلسلے میں میری ہدایات پر عمل کرے۔میں دانش کی بیماری دور کر کے اس پر اپنا احسان رکھنا چاہتی ہوں۔میں نے اس کی ماں لارا کا بہروپ بھر کر اسے دھوکے میں رکھا ہوا ہے۔“
کمبلی گا ئنا نے فوراً اس کی ہامی بھر لی اور ہامبی تارا

مطمئن ہوکر چلی گئی۔

☆☆☆

اصل لارا کو دانش کے پاس روانہ کرنے کے بعد راجہ ہارڈی نے فوراً اس کی اطلاع عذرباد کو کردی...... عذرباد کا اصل مشن شروع ہوا......

اب اسے کیا معلوم تھا کہ ہامبی تارا نے کیا گل کھلا رکھا ہے اور یہ بھی کہ عذرباد نے اسے تھپڑ مارنے کے بعد جس خدشے کی طرف اس کی توجہ دلائی تھی، وہ خدشہ بھی سچ ثابت ہوا تھا۔ یعنی...... دانش کو ہامبی تارا کی اصلیت کا علم ہو چکا تھا اور ہامبی تارا اسے اپنی فتح پر محمول کیے ہوئے تھی۔

عذرباد نے فوراً ہامبی تارا کو لارا کے پیچھے لگانے کی کوشش میں اس سے رابطہ کیا۔

''دانش کی اصل ماں لارا اس کے پاس روانہ کردی گئی ہے......فوراً ان دونوں ماں بیٹے کے پاس جا کر خبر لو اور مجھے آگاہ کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر مت لگانا کہ آیا لارا اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی یا نہیں؟''

ہامبی تارا منہ بنا کر بولی۔

''میرا جانا فضول ہوگا......لارا کے بجائے مجھے لارا بنا کر اس کے پاس بھیجنا چاہیے تھا......اور میں اب تک دانش کو بے وقوف بنانے میں کامیاب رہی ہوں......اب لارا وہ باتیں نہیں جانتی جو میں دانش سے کہہ چکی ہوں، نتیجے میں ہمارا پول کھل جائے گا۔''

عذرباد کو اس کی بات پر طیش آگیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

''تم نے میری اجازت کے بغیر خود سے کوئی کام نہیں کرنا ہے......تم میرا بنا بنایا کام بگاڑنے پر تلی بیٹھی ہو......جاؤ......وہی کرو، جو میں نے کہا ہے۔''

ہامبی تارا کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ عذرباد سے صاف صاف بات کرلے......ٹھنک کر بولی۔

''میں تمہاری داسی نہیں ہوں عذرباد! جیسے تم خبلیس معظم کے ماتحت ہو......وہی درجہ مجھے بھی حاصل ہے۔ ہماری راہیں الگ ہیں مگر مشن ایک......کون کامیاب ہوتا ہے، اس کی رپورٹ خبلیس معظم کو مل جائے گی......آئندہ مجھ پر حکم چلانے کی کوشش مت کرنا......بلکہ دانش کا پورا معاملہ میرے سپرد کردو۔ تم مراد سے نمٹنے کی کوشش کرو، جو بہت جلد شفا پانے والا ہے۔''

عذرباد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ خبلیس کی طرف سے اسے جو خصوصی شیطانی طاقتیں ملی ہوئی تھیں، وہ اس نے بروئے کار لاتے ہوئے اپنی ہی ساتھی کو اپنا تابع بنانے کی کوشش کی مگر پھر اسے خبلیس کی وہ کڑی ہدایت یاد آگئی کہ اپنے کسی ساتھی کو بہ وقتِ ضرورت تابع بنانے سے پہلے اسے بتانا ضروری ہوگا۔

اس نے خبلیس سے رابطہ کرکے اس سے ہامبی تارا کی شکایت کردی......اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ اس نافرمان کو اپنا تابع بنانے پر مجبور ہے۔

خبلیس جو کہ پہلے ہی اپنے علم میں اپنے ان دونوں خاص چیلوں کی کارگزاریاں رکھے ہوئے تھا......مکروہ لہجے میں اپنے شیطانی فلسفے کے مطابق بولا۔

''شیطانی قوتیں دو الگ راستوں پر عمل پیرا رہتی ہیں تو زیادہ بدی پھیلتی ہے۔ تم ہامبی تارا کو اپنے ساتھ ملا کر ایک راستے کا انتخاب کیوں کرتے ہو؟ اسے اپنا کام کرنے دو اور تم اپنے الگ راستے پر کام کرو......مگر دو الگ راستوں پر رہتے ہوئے تم دونوں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند ہو......ایک ساتھ ایک راستے پر نہیں۔''

عذرباد سمجھ گیا کہ ہامبی تارا کا ایسے ہی نہیں دماغ خراب ہوا......وہ خبلیس کی جبلت کو اس سے زیادہ جان گئی تھی۔ عذرباد خاموشی سے لوٹ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے اب جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس نے مراد کو دھوکے سے پچھاڑا تھا لیکن اب وہ پہلے ہامبی تارا کا بندوبست کرنا چاہتا تھا جس کا وہ ایک اٹل فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں تو نہیں آسکتا تھا مگر اسے راستے سے ہٹانے کی اس میں طاقت تھی۔ اس کے بعد ہی وہ ارضِ اسلام کے خلاف اپنی ساری قوتیں آزمانے کا ناپاک ارادہ کیے ہوئے تھا۔

وہ ہر قیمت پر ارضِ اسلام کی مقدس سرزمین میں گھسنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں تو اتحادی، بات ایک ہی تھی۔ اس نے فوراً لارا پر طبع آزمائی کی اور اس کے دماغ میں جا گھسا......

ہارڈی نے دیکھا اب لارا عذرباد کے تابع ہو چکی ہے، وہ اس کے دماغ سے نکل گیا، البتہ اس نے عذرباد کو اپنا ''ٹاسک'' سمجھا دیا تھا۔ لارا کو دانش سے مل کر کیا کہنا تھا، وہ اس نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا۔ لارا اسی وقت دانش کے دماغ میں جا پہنچی۔

☆☆☆

برفانی گپھا میں ہو کا عالم تھا......رات اپنے ابتدائی پہر میں تھی۔ باہر سرد برفانی ہواؤں کا اسرار جاری تھا۔ دور کہیں برفانی بھیڑیوں کے غرانے کی آوازیں اور لومڑیوں

کے چیخنے چلّانے کا شور سنائی دے رہا تھا۔

مراد کا وجود کسی بے جان لاشے کی طرح سامنے رکھا ہوا تھا اور ماروی باپ کے بے سدھ جسم کے قریب اداس اور سر جھکائے بیٹھی تھی۔

ایک امید ہوئی تھی جب مراد نے کراہ کر آنکھیں کھول دی تھیں اور کچھ ٹوٹے پھوٹے جملے ادا کیے تھے، وہ بھی اس طرح کہ جان کنی کا عالم ہو۔

ماروی کو باپ کی صحت یابی سے متعلق جو اشارے ملے تھے، وہ ان پر دوبارہ غور کرنے لگی۔ یہ اشارے مبہم اور غیر مبہم سے تھے۔ بتایا جا رہا تھا کہ اللہ کی طرف سے بہتری کی توقع رکھو...... کہ جو مصیبت اس وقت ارضِ اسلام والوں پر آئی ہوئی ہے، وہ جلد ٹل جائے گی اور ماروی اس مصیبت کو باپ کی ''بیماری'' سے تعبیر کر رہی تھی۔

اس کا اپنا اندر خونم خون ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بار وہ اس پابندی سے ہٹ جائے اور سیدھا جا کر سب سے پہلے اپنے باپ کا انتقام لے اور عذر باد کا براحشر کر کے رکھ دے۔ اس نے اپنے باپ کے بے جان سے وجود کی طرف دیکھا اور اسے ہولے سے چھو کر باپ کو پکارنے لگی۔

''بابا...... بابا...... میرے اچھے بابا...... آنکھیں کھول دیں نا......''

وہ رو پڑی...... اس برف پوش غار میں اس کی سسکیاں گونجنے لگیں، باہر برفیلی ہوائیں بھی جیسے اس کے ساتھ بین کرتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ٹھیک اسی وقت ماروی چونکی۔ اس کی سماعتوں سے کوئی باریک سی آواز ٹکرائی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اطراف میں دیکھا...... پھر وہی باریک اور مبہم سی غیر واضح آواز......

''یہ کیسی آواز ہے......؟'' ماروی خود کلامیہ انداز میں بڑبڑائی۔ تب ہی اس نے غور کیا اور بری طرح ٹھٹکی۔ آواز اس کے بابا جانی کے قریب سے آ رہی تھی، جو بھنچی بھنچی سی تھی۔

ماروی پر جیسے وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ گھٹنوں کے بل پر تو وہ ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی، اب وہ بیٹھے بیٹھے مراد پر جھک گئی اور اپنا ایک کان اس کے منہ کے قریب لے گئی۔

''نن...... نہیں، ابھی نہیں...... یا مرشد! عالی مقام! بس ایک موقع اور......''

مراد کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ماروی نے سیدھے ہو کر باپ کا چہرہ دیکھا۔ اس نے آواز دینے کے لیے، اسے پکارنے کے لیے اپنا منہ کھولا ضرور تھا، مگر عبث کہ آواز ہی ماروی کے حلق سے نہ نکل پائی۔ اس نے پھر ایسی کوئی کوشش نہیں کی، سمجھ گئی تھی کہ یہ سب مشیتِ ایزدی ہے، اسے دخل نہیں دینا چاہیے، بابا جانی کس سے مخاطب تھے؟ یہ سوالیہ نشان تھا، ماروی کے لیے مگر وہ فوراً جان بھی گئی کہ عالی مقام مرشد کون ہو سکتا تھا؟ اور بابا جانی اس وقت اپنے باطنی وجدان کی کیفیات سے دوچار تھے۔

وہ اور غور سے سننے لگی اور اپنا کان ان کے لرزیدہ ہونٹوں کے قریب...... بالکل قریب لے جا کر گویا ہونٹوں پہ رکھ دیا کیونکہ آواز باریک ہوتی جا رہی تھی جو معدوم ہونے کے قریب بھی تھی۔

''آہ...... ایسا ہے کیا؟ تت...... تو پھر ٹھ ٹھ...... ٹھیک ہے یا مرشد! اس کا بھی مجھ پر حق ہے اور...... اور...... آشتی کے لیے بھی...... سب کے لیے بھی...... لل...... لیکن ان سب کو صص...... صبر بھی عطا کرنا...... بس ایک موقع اور......''

آواز آنی بند ہو گئی...... مراد کے منہ سے ایک آہ سے مشابہ ہمکاری خارج ہوئی۔ ماروی کی سر دست کچھ سمجھ نہ آ سکا...... وہ دہل رہی تھی، ہول رہی تھی۔ اپنے اندازے قائم کر رہی تھی۔ ان ٹوٹے لفظوں کو جوڑ کر سوچ رہی تھی۔

''نن...... نہیں ابھی نہیں......'' اس کا کیا مطلب تھا؟

''آہ...... ایسا ہے کیا؟ تو پھر ٹھیک ہے مرشد! اس کا بھی مجھ پر حق ہے اور...... آشتی کے لیے بھی۔''

بابا جانی نے یہ جملہ کس کے لیے کہا تھا کہ اس کا بھی مجھ پر حق ہے؟ اور صبر کی بات...... پھر آشتی...... سب ٹھیک ہو جائے گا...... کی طرف اشارہ...... کیا ہونے والا تھا بابا جانی کے ساتھ؟ ہمارے ساتھ؟ اشارہ تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ سب ٹھیک ہونے والا تھا...... یا پھر...... اس سے آگے سوچ کر اسے ہول سا آنے لگا تھا۔ کچھ واضح بھی تھا اور کچھ نہیں بھی۔ ایک ادھورے وسوسے کی سولی تھی جس پر ماروی جھول کر رہ گئی تھی۔

ماروی کی کچھ تسلی ہوئی اور کچھ نہیں...... تاہم اس نے یہی سوچا کہ امید اچھی رکھنی چاہیے۔ سو وہ رکھے ہوئے تھی۔

اسے دانش کا خیال آیا کہ اس کی خیر خیریت لے لی جائے۔ خیال خوانی کے لیے اسے گپھا سے باہر جانا پڑتا تھا۔ وہ اٹھی اور باہر گپھا کے دہانے تک آئی اس نے باہر جھانکا۔ سرد اور کاٹ دار برفیلی ہوائیں شرّاٹے بھر رہی تھیں۔

ابھی وہ گپھا سے باہر قدم رکھنے والی ہی تھی کہ اچانک زمین نے جیسے اس کے قدم پکڑ لیے...... وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکی۔ وہ مجبور اور بے بس سی ہو گئی۔

''خدارا......! میں کیا کروں؟ کیسے اپنے لوگوں کی

مدد کروں...... ؟ اس سے پہلے میں کبھی ایسی بے بسی اور لاچارگی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔"

وہ گھٹے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ سوچنے لگی۔
پھر اسے مشیتِ ایزدی اور مصلحت آمیز بھلائی پر محمول کر کے وہ پلٹ آئی اور دوسرے ہی لمحے چونک پڑی۔

"باباجانی......!" اس کے حلق سے بے اختیار یہ نکلا تھا۔

☆☆☆

دانش کی تکلیف کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ وہ پریشان ہوگیا تھا۔ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی اضافی تکلیف کا متحمل ہوتا۔ وہ اس وقت اپنے بیمار باپ کی سرزمین کو دشمنوں کے غاصبانہ قبضے سے چھڑانے کی تگ و دو میں تھا اور یہ کام وہ تنہا سرانجام دے رہا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے دیدہ و نادیدہ دشمنوں سے نبرد آزما تھا۔

وہ اس مہارت کے ساتھ خیال خوانی کے ذریعے دشمن کی اتحادی افواج کو آپس میں لڑا چکا تھا کہ اب تک کوئی یہ نہیں جان سکا تھا کہ یہ "حرکت" تھی کس کی؟ یا یہ کہ مذکورہ کیا اندرز ٹیلی پیتھی کے زیراثر تھے۔ اس کی دوسری کامیابی یہ تھی کہ اس نے ہامبی تارا کی اصلیت جان لی تھی۔

پہلے وہ اسے "ماں" بن کر بے وقوف بنا رہی تھی، اب وہ اسے "بیٹا" بن کر اپنی چال میں لانے کی کوشش میں تھا مگر اسی دوران وہ خود بھی اپنے ایک نادیدہ دشمن کی زد میں آچکا تھا اور اب اسے بے چینی سے ہامبی تارا کا انتظار تھا کہ وہ اس چھپے ہوئے دشمن کا کھوج لگا کے اسے بتائے کہ آخر وہ ہے کون؟

اندازہ تو اسے ہو چلا تھا کہ وہ دشمن ضرور ایسے علاقے اور قبیل سے تعلق رکھتا ہوگا جہاں تک اس کی یا روحانی قوتوں کی رسائی نہیں تھی۔ وہ اسے روشن دنیا کی کمزوری پر نہیں بلکہ مشیتِ ایزدی پر محمول کرتے تھے۔

دفعتاً اس کے دماغ میں کسی نے دستک دی...... وہ چونکا، پہلے تو یہی سمجھا کہ ہامبی تارالارا کے بھیس میں اس کے پاس اس نادیدہ دشمن کی کوئی اطلاع لے کر آئی ہے مگر یہ اسے کوئی اور لگا۔

"کون ہو تم؟" ایک اجنبی اور نسوانی آواز پر وہ چونکا۔

"میں دوست ہوں...... بلکہ یوں سمجھ لو...... ایک ڈاکٹر ہوں، تمہارا علاج کرنا چاہتی ہوں۔"

"یہ کیسی دوست ہو تم؟ جو اپنا تعارف کروائے بغیر......"

"مجھے موقع تو دو بولنے اور اندر آنے کا......" اجنبی خاتون نے بات کاٹی۔

دانش نے پہلو بچا کر اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

"میرا نام ڈاکٹر میڈورا ہے...... میں ٹیلی پیتھی کی ماہر ہوں...... لوگ انٹرنیٹ پر اپنی اشتہاری مہم چلاتے ہیں، میں اس طرح اپنی پبلسٹی کی مہم چلاتی ہوں...... جو لوگ انجانی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں، میں انھیں کچھ کر کے اپنا کلائنٹ بناتی ہوں اور دام لے کر ان کا علاج کرتی ہوں۔"

یہ میڈم سبارو تھی۔ دانش اس کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ فطری ردعمل کے طور پر بہت سے شکوک وشبہات اس کے ذہن طباع میں جاگے اور جو سب سے پہلا شبہ ابھرا اس کے تحت اس نے قدرے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"اپنی پبلسٹی کی اشتہاری مہم چلاتی ہو یا خود ہی بیمار کر کے اس کے علاج کے بہانے دام کھرے کرتی ہو؟"

"ہاہاہا......" میڈم سبارو نے قہقہہ اگلا اور اسی انداز میں بولی۔ "میرے بارے میں پہلا شبہ یہی لوگوں کے ذہنوں میں ابھرتا ہے۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں بھی کسی ایسی ہی بیماری کا شکار ہوں ڈاکٹر میڈورا......؟"

"یہ میرے لیے عام سی بات ہے، اپنے مریض تلاش کرنا میرے لیے کیا مشکل ہے۔" وہ جواباً بولی۔ "لیکن افسوس، مجھ سے متاثر ہونے کے بجائے لوگ میری اس خوبی کو شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں...... جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو......"

"چلو......! میں تم پر شبہ نہیں کرتا مگر یہ تو بتا دو کہ تم میرا علاج کر سکتی ہو؟ میں تمہیں فیس دوں گا۔"

دانش نے دانستہ اس کے چکر میں آتے ہوئے بالآخر کہا۔

"ضرور کر سکتی ہوں، کیوں نہیں کر سکتی...... تم ہامی تو بھرو......"

"بھر لی ہامی......"

"اپنی تکلیف تفصیل سے بتاؤ۔"

دانش نے بتا دی۔

"ہُم...... بیماری کی نوعیت خاصی گمبھیر لگتی ہے...... اس طرح کی بیماری کا علاج عموماً ایک مخصوص ماحول میں ہوتا ہے۔ پہلے وہ ماحول ہمیں بنانا ہوگا اس کے بعد علاج کی تیاری کرنا ہوگی لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اس میں فیس زیادہ ہوگی۔"

''کتنی فیس ہوگی؟'' دانش نے پوچھا۔ سبارو نے اسے خاصی مہنگی فیس بتائی۔ وہ بھی چالاک تھی، سمجھتی تھی کہ مفت کہوں گی تو دانش کو اس پر دشمن کا شک ہوجائے گا۔ فیس بتائے گی تو وہ پروفیشنل کہلائے گی مگر نہیں جانتی تھی کہ دانش بھی کم کائیاں نہیں تھا۔ وہ چند ثانیے بعد ہامی بھرتے ہوئے بولا۔

''مجھے منظور ہے...... کیا مجھے اب تمہارے کلینک پر آنا پڑے گا؟''

''نہیں، میں نے کہا نا کہ اس طرح کی نوعیت کی بیماری میں مخصوص ماحول کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''تو مجھے تم سے ملنا پڑے گا؟''

''ہاں!''

''کہاں؟''

''میں پتا بتاتی ہوں، ذہن نشین کرلو......'' میڈم سبارو نے کہا اور اسے جو پتا بتایا وہ دانش نے ذہن نشین کرلیا۔ اس نے وقت بھی لے لیا۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ دانش اس پر سوچتا رہا۔ اسی وقت ہامیی تارا آگئی...... وہ بھی اس وقت کمبلی گاتنا سے اپنے خفیہ ''معاملات'' طے کرکے ہی آئی تھی۔

اس سے لارا کے لب و لہجے میں بولی۔

''میرے لختِ جگر! تیری ماں تیری اس پراسرار اور عجیب تکلیف سے بہت پریشان اور بے چین تھی مگر دیکھ! میں تیری یہ تکلیف دور کرآئی ہوں......''

''پیاری مام! پھر دیر کس بات کی ہے، جلدی سے مجھے اس اذیت ناک تکلیف سے نجات دلائیں...... بہت درد ہورہا ہے۔''

''تھوڑی دیر اور یہ تکلیف برداشت کرلو میرے بچے! بس تھوڑی دیر اور......''

''ٹھیک ہے مام!'' دانش نے کہا پھر اس سے بولا۔

''مام! آپ کو بابا جانی کی بیماری کے بارے میں پتا ہے؟ وہ کس قدر بیمار ہیں؟''

''ہاں بیٹا! پتا ہے مجھے۔''

''تو پھر مام! آپ شیطان کی پوجا چھوڑ دیں اور ہماری روشن دنیا میں آجائیں نا...... بابا جانی آپ کو معاف کردیں گے۔''

ہامیی تارا نے دل میں کہا۔ ''وہ تو اب مرنے کے قریب ہے، مجھے اسے خوش کرکے کیا ملے گا؟ ہاں البتہ جلد مرجائے تو اور بات ہے۔''

وہ اوپری دل سے بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ سب میرے لیے کس قدر مشکل ہے۔ میں اپنی شیطانی دنیا کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں! تم مجھے وہاں تو لے جاسکتے ہو نا! کیا خبر تمہارے ساتھ کچھ دن رہتے ہوئے میرا دل شیطان سے اچاٹ ہوجائے اور میں تمہارے دین میں شامل ہوجاؤں۔''

وہ آخر میں مکاری سے بولی۔ اسے یہ بات پتا تھی کہ ارض اسلام میں شیطانی ٹولوں میں صرف لارا ہی کو جانے کی اجازت تھی اور وہ بھی صرف اپنے بیٹے کی مرضی اور اس کے ساتھ ہی جاسکتی تھی۔

یوں وہ ایک بار اندر داخل ہونا چاہتی تھی، اس کے بعد اسے اپنا گل کھلانا آسان ہوجاتا۔ وہ ابلیس کا ایک بڑا مشن چٹکی بجاتے ہی پورا کردیتی۔ ارض اسلام کے دشمن مکمل فتح حاصل کرلیتے اور پھر ابلیس، اس پاک ریاست پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد اسے شیطانی دنیا میں بدل دیتا۔

ہامیی تارا عذرباد سے بڑا کارنامہ انجام دینا چاہتی تھی تاکہ ابلیس کی نظروں میں اس کی قدر و قیمت عذرباد سے کہیں گنا بڑھ جائے۔

ادھر دانش بھی کائیاں تھا اور چالاکی سے زہر کو زہر سے ختم کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ لہجے میں خوشی سموتے ہوئے اور بچوں کے سے بھول پن سے بولا۔

''سچ مام! آپ ایسا سوچنے لگی ہیں تو مجھے بھی پورا یقین ہے کہ ارض اسلام کی روحانی دنیا میں رہتے ہوئے آپ کی سوچ بدل جائے گی اور آپ ایک روز شیطان کے اثر سے آزادی بھی حاصل کرلیں گی۔''

''بس تو پھر میرے بچے! مجھے اپنے ساتھ ریاست میں لے چلو...... میرا دل ہر وقت تمہاری خاطر دھڑکتا رہتا ہے۔''

''مام! میں پہلے اس تکلیف سے آزاد ہونا چاہتا ہوں! ورنہ وہ پہلے ہی پریشان ہیں، مجھے اس حالت میں دیکھ کر مزید پریشان ہوجائیں گے۔'' دانش نے بھی چالاکی سے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''اس کم بخت کمبلی گاتنا نے ابھی تک میرا کام نہیں کیا، نہ جانے اس خبیث جادوگرنی کی نیت میں کیا ہے۔''

دانش اس کے چور خیالات پڑھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہی وقت ہے ترپ کا آخری پتا پھینکنے کا۔

اس نے اسے ڈاکٹر میڈورا (میڈم سبارو) کے بارے میں بتادیا۔ اس کے چور خیالات بہ آسانی پڑھنے کے بعد دانش کو پوری طرح معلوم ہوگیا تھا کہ معاملہ کیا تھا اور درحقیقت ڈاکٹر میڈورا کون تھی، وغیرہ۔

اس نے ہامیی تارا کو بتادیا کہ ڈاکٹر میڈورا نام کی

ایک خاتون اس کے پاس آئی تھی۔ ہامبی تارا سمجھ گئی کہ وہ کون ہوسکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ کمبلی گائنا کی دوستی یا دشمنی جائے بھاڑ میں، میں خود اس کا ابھی قلع قمع کروائے دیتی ہوں، جبکہ میری فتح بھی قریب ہے۔ دانش صحت یاب ہوتے ہی مجھے ایک بار اپنی ماں سمجھ کر اپنے ساتھ ارض اسلام لے جائے اور پھر میں اندر سے ان کی جڑیں کھوکھلی کر دوں۔ اس سے پہلے کہ عذر باد کامیاب ہوتا وہ اتنی بڑی کامیابی اپنے سر لینا چاہتی تھی۔

اس نے دانش کے بتائے ہوئے پتے پر کوچ کیا اور میڈم سیارو کے پاس موت بن کر جا پہنچی...... دونوں کالی قوتوں کی پروردہ تھیں۔ ایک جادوگرنی ایک شیطان....۔ دونوں کا ٹکراؤ ہوا...... شیطان کو برتری حاصل ہوئی اور اس نے میڈم سیارو کو ختم کر ڈالا...... اس کے مرنے کی دیر تھی کہ دانش کی پراسرار تکلیف ختم ہوگئی۔ وہ پھر سے بھلا چنگا ہوگیا۔

اس نے اسی وقت منصوبے کے مطابق خیال خوانی کی اور چاہا کہ اس کی خبر جلد کمبلی گائنا تک پہنچا دے، تاکہ وہ ہامبی تارا کے مقابلے پر آجائے۔

کالی طاقتوں کے یہ دونوں دشمن ایک دوسرے میں الجھے رہیں گے اور وہ خود دشمن اتحادی افواج میں خلفشار پھیلا کر انہیں کمزور کردے گا۔ اس کے بعد ارض اسلام کی بچی کھچی مگر بہادر افواج کی کمان سنبھال کر ان پر ٹوٹ پڑے گا۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی دعا مانگ رہا تھا کہ اس کی بہن ماروی بھی آجائے تاکہ دشمنوں کے دلوں میں اچھی طرح ان کی دہشت بیٹھ جائے۔

مگر دانش ہمیشہ کی طرح کمبلی گائنا تک پہنچنے میں ناکام رہا...... اس کا جادوئی سحر اس وقت سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مشیت ایزدی نے اگر انہیں زومبی گائنا جیسے دشمن پر بڑی فتح دی تھی تو کچھ مصلحت کا تقاضا بھی رکھتی تھی۔ وہ صبر کر گیا اور منتظر تھا کہ اب آگے کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆

دشمنوں کی سازشوں سے آگاہ رہنے کے لیے، دانش نے جب ایک موقعے پر کریگ ہوسٹن کے دماغ میں جھانکا تو اسے اس خوش کن حقیقت کا پتا چلا کہ ایک عالمی خبر رساں ادارے سے تعلق رکھنے والے دو مسلم بہن بھائی ریاست ارض اسلام پر سپر پاورز اور ان کے اتحادیوں کی جارحیت کی رپورٹنگ کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے، جو حقائق کو دنیا کے سامنے لانا چاہتے تھے مگر ساتھ ہی دانش کو اس کر یہ حقیقت کا بھی علم ہوا کہ ان دونوں بہن بھائی کو کریگ ہوسٹن نے ختم کرنے کے لیے اپنے چار لڑاکا ایجنٹ روانہ کردیے تھے جو ان دونوں کا اس طرح قتل کرتے کہ وہ حادثہ معلوم ہوتا......

دانش نے ان کا کھوج لگایا، سوئے اتفاق یہ وہی وقت تھا جب وقار اپنی جیپ کو کار اور ٹرک کی طوفانی ٹکر سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک دھماکا ہوا اور اس کی بہن زہرہ کے منہ سے غیر ارادی طور پر چیخ سی خارج ہوگئی۔ اس نے خوف سے آنکھیں بھی موند لی تھیں۔

زہرہ کو ایک جھٹکا لگا۔ ان کی جیپ رک گئی۔ وقار آنکھیں پھاڑے ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے حیرت کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ اس کی پھیگی ہوئی آنکھیں سامنے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہی تھیں۔

کار اور ٹرک کا ایک دوسرے کے ساتھ تصادم ہو چکا تھا۔ دونوں میں آگ بھڑکی ہوئی تھی۔

"ی ی...... یہ کیسے ہوگیا؟ ناممکن...... یہ دونوں گاڑیاں تو کسی بھی لمحے ہماری جیپ سے ٹکرانے ہی والی تھیں ہم...... مگر یہ دونوں آپس میں کس طرح ٹکرا گئیں؟"

بالآخر وقار کے منہ سے تحیر آمیز الفاظ برآمد ہوئے تو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی اس کی بہن زہرہ نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

"بھائی! مجھے خود بھی اس بات پر حیرت ہے۔ یہ ہو کیسے گیا؟ م...... مجھے تو اپنی موت کا یقین ہوگیا تھا کہ ہمیں اب اس خطرناک حادثے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

"یہ کوئی معجزہ ہی ہوا ہے۔"

"ایسا ہی ہے شاید...... بھائی! اب جلدی سے اپنی منزل کی طرف بڑھو۔"

وقار نے جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ زہرہ نے اس سارے حادثے کی رپورٹ بمع ویڈیو تیار کرلی تھی کہ انہیں کس طرح سچ سامنے نہ لانے کے لیے ایک گھناؤنی سازش کے تحت مروانے کی کوشش کی گئی تھی۔

تب انہوں نے جائے مقام پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ ادھر دانش نے ارض اسلام کے چند جری نوجوانوں اس کام پر مامور کردیا کہ ان دونوں بہن بھائی کی ہر ممکن مدد کی جائے اور ان سے تعاون کے ساتھ ساتھ انہیں سارے حقائق دکھائے جائیں، وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

لارا جیسے ہی دانش کے دماغ میں پہنچی تو اسے ایک جھٹکا لگا...... وہ اندر پہنچنے سے قاصر تھی۔ اس نے دانش کو جھٹکے دینے چاہے مگر اس کا دل نہیں مانا۔ کریگ ہوسٹن اور راجر ہارڈی نے اسے پورے حواسوں کے ساتھ اور پورا ٹاسک دے کر دانش کی طرف روانہ کیا تھا۔

اس نے بڑے پیار سے دانش کے دماغ میں دستک دی۔ دانش فوراً اپنی اصل ماں کو پہچان گیا اور خوش ہوا...... لارا خواہ جیسی بھی سہی، یا دانش لارا کے لیے روشن دنیا کا فرد سہی...... مگر بعض رشتے بھی بہت مضبوط اور عجیب ہوتے ہیں...... ان دونوں ماں بیٹے کا بھی ایک دوسرے کی مخالف راہیں ہونے کے باوجود ایسا ہی کچھ مضبوط رشتہ قائم تھا۔

دانش نے ماں کو آنے دیا اور سلام کیا۔ لارا ممتا بھرے لہجے میں بولی۔

''میرے لعل! کیسا ہے تو؟''

''میں ٹھیک ہوں مام! لیکن ذہنی طور پر پریشان ہوں۔ تمہارے ساتھیوں کی وجہ سے میرے بابا جانی بیمار پڑ چکے ہیں۔ ماروی بہن ان کے ہمراہ نتھی ہو چکی ہیں ادھر ارض اسلام کے دشمنوں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اتحادیوں کے ساتھ حملہ کر دیا اور اب ریاست کا محاصرہ کر لیا ہے۔''

''وہ میرے ساتھی کب ہیں لختِ جگر؟'' لارا بولی۔ ''میں تو خود ان کی تابع ہو کر رہ گئی ہوں...... کھلونا بن چکی ہوں۔''

دانش کو لارا کے لب و لہجے سے پہلی بار مایوسی ٹپکتی محسوس ہوئی اور وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اب شاید اس کی ماں بدل ہونے لگی ہے، فوراً بولا۔

''تو پھر مام! آپ ایسے لوگوں کا ساتھ کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟ اب دیکھ لو تمہارے شیطان نے بھی تمہیں کھلونا بنا کر رکھ دیا۔ وہ اپنے چیلوں اور ساتھیوں کے ساتھ بھی کبھی سچا نہیں رہتا، بلکہ کسی کے ساتھ بھی سچا نہیں۔ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اب بھی وقت ہے چھوڑ دو انہیں...... اور میرے ساتھ چل کر ارض اسلام اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاؤ...... تمہیں اللہ کی عبادت اور اس کی بندگی میں سکون ہی سکون ملے گا...... ضمیر کے سکون سے بڑھ کر کوئی سکون نہیں۔'' دانش نے ماں کو پھر سمجھانے کی کوشش کی تو لارا بولی۔

''شاید میں بھی اس طرح سوچنے لگی ہوں...... مجھے لگتا ہے بیٹے کہ تم مجھ سے جیت رہے ہو...... تم جیت گئے ہو......''

''نہیں مام! درحقیقت یہ جیت میری نہیں آپ کی جیت ہو گی...... حق کی جیت ہو گی، باطل کو ہمیشہ کی شکست لکھ دی گئی ہے۔''

''بس تو پھر مجھے ارض اسلام لے چلو...... میں وہاں رہنا چاہتی ہوں...... تمہارے ماحول میں رہتے ہوئے ممکن ہے میرے دل و دماغ پر اس کا مزید گہرا اثر پڑے......''

بالآخر لارا نے کہا اور دانش کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا...... حالانکہ کوئی اور حالات ہوتے تو ایسا نہ ہوتا مگر اب حالات ہی اور نہیں بلکہ ان کی چالیں بھی بدلنے لگی تھیں۔ وہ محتاط ہو گیا اور اسی لہجے میں ذرا ٹھہر کر بولا۔

''مام! آپ کو وہاں لے جانے کی تو میری دیرینہ خواہش ہے اور آپ جاتی بھی رہی ہیں لیکن اب اس کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔''

لارا چونکی اور اسی لہجے میں بولی۔ ''مگر...... کیوں؟''

''مام! آپ کو تو پتا ہی ہے کہ وہاں آج کل کیا حالات چل رہے ہیں...... بابا جانی ٹھیک ہو جائیں اور ماروی آپی بھی ان کی مستقل تیمارداری سے آزادی پالیں تو پھر...... میں آپ کو وہاں ضرور لے جاؤں گا۔''

''لیکن بیٹے! مجھے ابھی وہاں جانا ہے، میرے دل میں شاید ایک قدرتی تڑپ جاگی ہے، ڈرتی ہوں کہیں یہ ماند نہ پڑ جائے...... سچ پوچھو تو مجھے وہاں کے ماحول میں بڑا سکون ملتا تھا۔'' لارا نے چالاکی سے کہا تو دانش جذباتی طور پر مجبور سا ہونے لگا مگر اسے اپنی بہن ماروی کی ہدایات بھی یاد تھیں۔

ماروی جانتی تھی کہ ایسے مخدوش حالات میں جبکہ دشمنوں کی اس نئی جنگ نے ان سب کو ایک طرح سے اپنی اپنی جگہ محبوس کر کے رکھ دیا تھا تو یقینی طور پر دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والے مہروں کو آگے سرکانے کی کوشش کریں گے اور ان کا سب سے آسان ہدف لارا ہو گی کیونکہ ان میں فقط ایک لارا ہی تھی جو ریاست ارض اسلام میں داخل ہو سکتی تھی۔

اب چونکہ وہ سرزمین مراد سے خالی تھی، اس لیے سازش کے تار و پود بھی بہ آسانی وہاں بُننے کے لیے ہی لارا کو استعمال کیا جا سکتا تھا...... مگر لارا پر یہ قدغن ضرور لگا دی گئی تھی کہ وہ اپنے بیٹے دانش کی مرضی کے بغیر وہاں ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتی تھی اور یہی ہدایت اس نے دانش کو بھی گالان سے روانگی کے وقت اور اس سے پہلے بھی کر چکی تھی۔

لارا مکاری سے اسے سوچتا پا کر اس کا ذہن پڑھنے

لگی تو اسے اس کے تامل کی وجہ معلوم ہوگئی۔ وہ ممتا بھرے لہجے میں بولی۔

''بیٹا! میں مانتی ہوں کہ حالات خراب ہیں...... اور ان حالات میں شکوک وشبہات کا جنم لینا فطری بات ہے۔ تمہارے پیاروں نے تمہیں میرے متعلق جو نصیحتیں کر رکھی ہوں گی، وہ غلط بھی نہیں...... لیکن تم یہ بھی تو دیکھو میں تو تمہاری ماں ہوں...... کیا میں نہیں جانتی کہ اگر تمہیں میں اس طرح کا دھوکا دوں گی تو تمہاری نظروں میں ہمیشہ کے لیے گر جاؤں گی۔''

''مام! آپ وعدہ کریں کہ آپ مجھے دھوکا نہیں دیں گی...... ورنہ پھر ہمارا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔''

بیٹے کی بات سن کر لارا خوش ہوگئی۔ اس نے دل میں کہا۔

''بیٹا! بھلا کبھی ماں بیٹے کا رشتہ بھی ختم ہوا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

دانش اس کی بات مان گیا۔

☆☆☆

کریگ ہوسٹن کو ایک ساتھ دو خبریں ملی تھیں...... ایک اچھی اور ایک بری۔ بری خبر تو یہ تھی کہ بن زیان دانش کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اچھی خبر یہ تھی کہ لارا اس کے پہلے اہم منصوبے میں کامیاب ہو چکی تھی اور اب اس نے وہاں رہتے ہوئے منصوبے کے دوسرے اور آخری مرحلے پر کام کرنا تھا، اور منصوبے کا یہی آخری مرحلہ ان کی ادھوری فتح کا ''ٹرننگ پوائنٹ'' ثابت ہونے والا تھا۔ یعنی ان کی ادھوری فتح مکمل جیت سے ہمکنار ہو جاتی...... کیونکہ لارا ارض اسلام میں داخل ہوتے ہی...... ان کی ہدایت کے مطابق...... راجر ہارڈی اور کریگ ہوسٹن کے آنے کی جگہ بناتی...... مرادکی غیر موجودگی میں وہ یہ کام بہ آسانی کر سکتی تھی۔

اس نے فوراً یہ خوش خبری ہارڈی کو سنادی۔ وہ بھی بہت مسرور ہوا، دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اس دوسری فتح پر مبارک بادوں کا تبادلہ کیا۔

عذرباد ہر وقت ان کے خیالات کی ''ریکی'' کرتا رہتا تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا تو وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ کیونکہ اس کی ''لارا'' (ہامبی تارا) اس مشن میں مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی تھی بلکہ اس نے اپنی ضد اور غرور میں آ کر اپنا کام بھی خراب کر ڈالا تھا۔ اس نے فوراً اس سے رابطہ کیا اور غصے سے بھنا کر بولا۔

''کرلی تم نے اپنی من مانی...... دیکھ لیا تماشا؟ اب دوسرا گروپ ہم پر راج کرے گا۔''

''ہوا کیا ہے آخر؟'' ہامبی تارا نے سرد لہجے میں پوچھا تو عذرباد نے اسے ساری بات بتادی۔ ہامبی تارا یہ سن کر حیران بھی ہوئی اور مایوس بھی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے خوش ہو کر بولی۔

''تم نادان ہو، ہمیں فتح ملے یا ہمارے دوستوں کو، بات تو ایک ہی ہے...... مقصد جبلیس معظم کو خوش کرنا ہے......''

''بے وقوف عورت! جبلیس معظم ارض اسلام میں اپنی حکومت چاہتے ہیں، اگر یہ لوگ وہاں پہلے سے قابض ہو جاتے ہیں تو سمجھو ہم ایک اور فضول سی جنگ میں الجھا دیے جائیں گے...... کیا ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ جنگ ہی کرتے رہیں؟ ہم بھی سکون چاہتے ہیں، ٹھہراؤ، پڑاؤ اور جشن ناچ، آرام کرنا ہمارا بھی حق ہے۔ انہی معاملات کی وجہ سے تو میں خود تم سے بلکہ خود سے بھی بیزار ہو گیا تھا۔ تمہاری جلد بازی نے نہ صرف میرا بلکہ تمہارا اپنا بھی بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ میرا تو یہ خواب تھا کہ میں اور تم مل کر اس ریاست کی باگِ عنان سنبھالتے اور پھر میں تمہیں اپنی ملکہ بنالیتا......''

ہامبی تارا اپنے اس عاشق بامراد کی باتیں سن کر گنگ سی ہوگئی...... اسے اب جا کر یہ احساس ہونے لگا کہ اس نے ...... جنونِ عداوت میں شاید کوئی بڑی غلطی کر دی تھی، جس کا نقصان اسے عذرباد کی ناراضگی کی صورت میں اٹھانا پڑا تھا۔

جیت تو پھر بھی جبلیس معظم کی ہوئی تھی اور وہ ان سے ناخوش نہیں ہو سکتا تھا، یہ الگ بات تھی کہ اب ارض اسلام میں ان کے قبضے اور حکومت کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''عذرباد! اگر یہ بات ہے تو ہمیں ابھی جا کر جبلیس کے روبرو پیش ہو کر بتا دینا چاہیے کہ ہم دونوں کیا چاہتے ہیں؟''

''اب کیا فائدہ بتانے کا؟'' عذرباد ناراضگی سے بولا۔

''جبلیس معظم کے لیے ایک ہی بات ہے۔ ہم یا وہ...... (کریگ ہوسٹن وغیرہ) اس کے لیے اس میں کوئی فرق نہیں۔''

''لیکن ہم جبلیس معظم سے یہ تو کہہ سکتے ہیں ناکہ ارض اسلام میں اگر اس کے خاص چیلوں کی حکومت ہوگی تو کیا یہ اور زیادہ اچھا نہ ہوگا؟''

''وہ یہی کہے گا کہ جاؤ، پھر انہیں پچھاڑ دو...... اور پھر ہم ایک نئی اور نہ ختم ہونے والی جنگ میں جت کر رہ

جائیں گے۔" عذرباد نے کہا تو ہامبی تارا تڑپ کر بولی۔

"عذرباد! میرے محبوب! مجھے معاف کردو، مجھ سے واقعی بہت بڑی غلطی ہوگئی...... لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میرا دل اسی دن تم سے خراب ہوگیا تھا جب تم نے میری کارکردگی پر مجھ سے خوش ہونے کے بجائے ناراض ہوکر میرے منہ پر تھپڑ جڑ دیا تھا۔"

"مرد ذات میں غصہ ہوتا ہی ہے، اتنی ہی وہ اپنے چاہنے والے سے محبت بھی تو کرتا ہے۔" عذرباد بولا۔ "لیکن تم نے اپنی ناراضگی کو منتقم مزاجی اور نفرت میں ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ دشمنی میں بھی بدل دیا۔ حالانکہ میں جس پلاننگ پر چل رہا تھا وہ بہت جلد مجھے فتح سے ہمکنار کرنے والی تھی...... مگر تم نے میرے ساتھ فضول کی عداوت اور بغض رکھ کر میرا راستہ کاٹ ڈالا...... اب تم واپس وہیں جاؤ جہاں سے بلائی گئی تھیں، ورنہ تم پھر میرا راستہ کھوٹا کرتی رہوگی۔ تمہیں اب دور خلاؤں کی بھیانک ویرانیوں میں جانا ہوگا ہمیشہ کے لیے......"

اس کی بات سن کر ہامبی تارا جیسے سرتاپا لرز گئی۔ اسے دنیا کی زندگی میں جو لذت ملی تھی، وہ خلاؤں کی سپاٹ ویرانیوں میں کہاں تھی۔ اسے آج اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ جبلیس نے عذرباد کو کیسی کیسی خطرناک اور کالی طاقتوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ اس کے قدموں میں گر گئی۔

"نہیں...... نہیں، اپنے جبلیس معظم کی خاطر ایسا مت کرو۔ مجھے واپس مت بھیجو۔"

دفعتاً ہی اسے ہر طرف اتھاہ خاموشی کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر اپنا سر اٹھایا اور ایک ہولناک چیخ اس کے حلق سے خارج ہوگئی۔

☆☆☆

ہامبی تارا سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑانے کے بعد عذرباد نے کمبلی گاٹا سے رابطہ کیا۔ وہ اس وقت سخت غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے کالے علم کے ذریعے سے یہ پتا چلالیا تھا کہ اس کی خاص منظورِ نظر میڈم سبارو کو جبلیس کی ایک چیلی...... ہامبی تارا نے دھوکے سے مار ڈالا تھا۔

اس نے ہامبی تارا سے انتقام لینے کے لیے اپنے جادوئی گولے میں ہامبی تارا کو تلاشنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر وہ اسے نہیں مل سکی تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے جادوئی گولے نے کسی شے سے محرومی ظاہر کی ہو...... لیکن اس کا جادوئی گولا...... کچھ ایسے اشارے دے رہا تھا کہ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی دشمن اور میڈم سبارو کی قاتلہ ہامبی تارا موت سے تو ہمکنار نہیں ہوئی ہے مگر اس دنیا میں بھی نہیں رہی ہے۔

اس اشارے پر اسے عجیب طرح کی حیرت ہوئی تھی۔ وہ وقت تھا جب عذرباد نے اس سے رابطہ کیا۔ کمبلی گاٹا کو اس سے ہامبی تارا کے تعلق کی بو آئی اور اس نے غرا کر کہا۔

"چلے جاؤ یہاں سے...... تم سے مجھے دشمنی کی بو آرہی ہے۔"

"تم نے صحیح کہا مادام!" عذرباد مکاری سے بولا۔ "مگر جو دشمن تمہارا تھا، وہ میرا بھی تھا اس لیے میں نے اسے ہمیشہ کے لیے دوسری دنیا میں پہنچادیا ہے، کیونکہ وہ میری ساتھی بن کر میرا ہی راستہ کھوٹا کررہی تھی لیکن میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں۔ تسلی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ادھر ہی سے واپس چلا جاتا ہوں۔"

کمبلی گاٹا کو اب تک دوستی اور دشمنی کا خوب اندازہ ہوچکا تھا۔ ہامبی تارا نے بھی اسی طرح اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا مگر اس دوستی کا رنگ دشمنی میں بدل گیا تھا جس کے نتیجے میں اسے اپنی ایک اہم ساتھی میڈم سبارو سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

اب وہ ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ جانتی تھی کہ یہ سب مفادات کے کھیل ہوتے ہیں اور کوئی کسی کا سچا دوست نہیں ہوتا۔ زیادہ بہتر اکیلے رہ کر اپنے دشمن سے نمٹتے رہنا ہوتا ہے۔ اسے اپنے بھائی زومبی گاٹا کا حشر بھی یاد تھا۔

اس کے اگر دشمن تھے تو دوست بھی تھے مگر وقت پر کوئی بھی کام نہ آسکا تھا۔ یوں بھی جادوگری سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو کم ہی دوستیاں راس آتی تھیں، اس سلسلے میں اکثر اسے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔ لہٰذا اس نے صاف گوئی اور روکھے لہجے میں کہا۔

"مجھے کسی کی دوستی یا مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا راستہ بنانا اور دشمنوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتی ہوں...... تم جاسکتے ہو......"

عذرباد اس کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ سمجھ گیا کہ ہامبی تارا کے بگاڑے ہوئے کام کا خمیازہ اور بھی نہ جانے کہاں تک اسے بھگتنا پڑے گا۔ ورنہ تاریک دنیا والوں کا اصول یہی ہوتا تھا کہ اس طرح دوستیاں کرو کہ دشمنی میں بدلتے وقت دوست کو پتا بھی نہ چلے۔

وہ ناکام پلٹ گیا۔

اس نے لارا کی خبر لینا چاہی مگر نہیں لے سکا، اس نے ہارڈی سے رابطہ کیا۔ اس نے اسے یہ خوش خبری سناڈالی کہ

وہ دانش کے ذریعے ریاست ارض اسلام پہنچادی گئی ہے۔اس کے لیے یہ بڑی خبر تھی۔اس نے کریگ ہوسٹن کے دماغ کو پڑھا، وہاں بھی یہ مسرور کن خبر موجود تھی۔ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہارڈی عنقریب ارض اسلام میں لارا کے اثر سے داخل ہونے والا تھا۔

دشمنوں کے دشمن کی فتح قریب تھی اور یہ درحقیقت شیطان اور کالی طاقتوں والوں ہی کی فتح تھی مگر عذرباد کے لیے یہ معاملہ کچھ اور بن چکا تھا۔وہ اسے اپنی ذاتی فتح میں بدلنا چاہتا تھا، جسے یہ چٹکی بجانے کا خیال سمجھے ہوئے تھا۔

لہٰذا اس نے فوراً کریگ ہوسٹن کے دماغ میں اجارہ داری قائم کرنا چاہی تو کریگ کو پتا چل گیا اس نے فوراً اپنی سانس روک لی۔جس دم میں وہ غیر معمولی مہارت رکھتا تھا۔اسے سانس روکتا پا کر عذرباد نے شیطانی چال چلی۔

''دوستوں کو خوش آمدید نہیں کہو گے؟'' عذرباد نے مکاری سے کہا۔

''دوست اس طرح چھپ کر وار نہیں کرتے......''

''میں تو تم سے مخاطب ہونا چاہتا تھا۔''

''میں اس وقت کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔تم جاسکتے ہو۔'' کریگ ہوسٹن نے کہا اور عذرباد کو بھگا دیا۔

عذرباد کو اس طرح دھتکارے جانے پر طیش آگیا، وہ سمجھ گیا کہ کریگ ہوسٹن کا فتح کے نشے میں دماغ خراب ہوگیا ہے۔اس نے زقند بھری اور ہارڈی کے پاس جا پہنچا۔ اس نے اس کے ساتھ معاملہ داری طے کرنی چاہی اور کسی طرح اسے قائل کرلیا کہ کریگ ہوسٹن خوش فہمیوں میں مبتلا ہے اور وہ ہاتھ آئی جیت کھودے گا۔بہتر یہی ہے میں اور تم (ہارڈی اور عذرباد) آپس میں معاملہ داری کر کے ارض اسلام پر قابض ہوجاتے ہیں اور پھر مل کر اس ریاست پر حکومت کرتے ہیں۔

ہارڈی کو بھی یہ ادھوری فتح الجھن میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔وہ خود بھی کریگ ہوسٹن کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کیے ہوئے تھا پھر بھی اس نے عذرباد سے کہا۔

''لارا کو ہم ارض اسلام بھیجنے میں کامیاب ہوچکے ہیں۔اب بھلا ہماری مکمل فتح میں کیا شک باقی رہ گیا ہے؟''

''لارا......وہاں ابھی اس پوزیشن میں نہیں آئی ہے کہ وہ تمہارے داخلے کے لیے بھی کوئی جگہ بنا سکے۔اس کے لیے اسے ابھی بہت وقت لگے گا۔جب تک ارض اسلام والوں کو اپنی شکست فتح میں بدلنے کے لیے بہت سارا وقت

فرمایا بزرگوں نے

لمحۂ فکریہ۔دنیا تعلیم یافتہ لوگوں سے بھر گئی ہے مگر انسانیت سے خالی ہوگئی ہے۔پہلے دو لوگ لڑتے تھے تو تیسرا صلح کرواتا تھا مگر اب تیسرا ویڈیو بناتا ہے۔

تقویٰ۔بصیرت اور تقویٰ اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب انسان ایسی بات پر اللہ کا شکر ادا کرے جس پر صبر کرنا مشکل ہو۔

معراج۔اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بخشش کے لیے آنسو بہایئے اور اپنی مسکراہٹ کو اس کی مخلوق میں بانٹ دیجیے کہ یہی انسانیت کی معراج اور بندگی کا تقاضا ہے۔

زندگی۔زندگی آسان نہیں ہوتی، اسے آسان بنانا پڑتا ہے...... کچھ نظرانداز کر کے اور کچھ برداشت کر کے۔

صبر۔صبر ایک ایسی سواری ہے جو اپنے سوار کو کبھی گرنے نہیں دیتی۔نہ کسی کے قدموں میں اور نہ کسی کی نظروں میں۔

مرسلہ۔جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

مل جائے گا۔''

اس کی بات ہارڈی کے دل کو لگی۔اس نے......اس کے ساتھ معاملہ داری کرلی اور پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟

عذرباد بولا۔''ذرا انتظار کرو...... میں تم سے جلد رابطہ کروں گا۔''

عذرباد نے دوبارہ کمبلی گاتنا کو ایک پیغام پہنچادیا کہ جس کمرے میں اس نے اپنے بھائی زومبی گاتنا کی لاش رکھی ہوئی ہے اور جہاں اس نے لارا کو اس کی ٹیلی پیتھی کی قوتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے قید رکھا ہوا تھا، کریگ ہوسٹن اور اس کے دستِ راست ہارڈی نے ہی اسے وہاں سے نکلوا کر اپنا تابع بنا کر ریاست ارض اسلام پہنچادیا ہے۔ یہ تمہارے دشمن نمبر ایک کی سرزمین ہے، اور اس وقت ہر کسی کے لیے تر نوالہ بنی ہوئی ہے۔تمہارے پاس موقع ہے کہ تم بھی وہاں اپنا جادو جگاؤ۔اپنا اقتدار دشمن کے ملک میں جماؤ اور ان کے سینوں پر مونگ دلو۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' ہوسِ اقتدار نے کمبلی گاتنا کو بھی لالچ میں اندھا کردیا۔اس نے جوابی پیغام دیا۔

''لارا تمہاری بھی تابع رہ چکی ہے، وہ اس وقت

ارضِ اسلام میں موجود ہے۔اس کے ذریعے وہاں قبضہ جماؤ......'' عذرباد نے اسے راہ دکھائی۔

''لیکن اس سے پہلے اپنے ان دو دشمنوں سے بھڑنا مت بھولنا، جنہوں نے لارا کو تم سے چالاکی سے چھینا ہے۔ایک کا نام کریگ ہوسٹن اور دوسرے کا راجر ہارڈی ہے۔''

عذرباد یہ شیطانیت پھیلانے کے بعد تماشا دیکھنے کے لیے اور موقع کا منتظر ہو کے بیٹھ رہا۔

☆☆☆

محاصرے کی صورتِ حال میں ہر کوئی پریشان تھا اور پریشانی میں ہی انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔لارا کو اس چلتر بازی کا اندازہ تھا، اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ہمزاد اور زیب النساء کو یہ باور کروا لیا تھا کہ وہ شیطان کی کارگزاریوں سے اب عاجز آچکی ہے، جہاں اسے سکون نام کی کوئی چیز ذرا بھی نہیں ملی تھی، مگر یہاں وہ جب آئی تھی اسے ایک طرح کا روحانی سکون ملتا تھا، تو کیوں نہ وہ اس راحت کو ہمیشہ کے لیے اپنا لے پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ یہاں تاعمر اپنے بیٹے دانش کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔

ہمزاد نے اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کی۔مراد کے نہ ہونے کے باعث جانے کیا بات تھی کہ ان کا ذہن اس انداز میں کام کرنا چھوڑ چکا تھا، جس انداز میں وہ اسے کام میں لایا کرتے تھے۔

ریاست، روحانی طور پر بھی کمزور پڑنے لگی تھی۔ مشیت ایزدی ابھی جانے اور کتنے امتحان لینے پر تلی ہوئی تھی کہ ہمزاد کو بھی لارا کی سچائی پر یقین سا آنے لگا تھا۔انہوں نے اسے وہاں آزاد چھوڑ دیا۔

لارا نے خیال خوانی کے ذریعے ہارڈی کو گرین سگنل دینا چاہا تھا کہ اسی وقت اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا دماغ قابو میں کرنے کی کوشش کررہا ہے۔اس نے خطرہ محسوس کرتے ہی اپنی سانس روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی، اسی وقت اسے ایک جھٹکا لگا اور اس کے دماغ میں کمبلی گائنا آگئی۔

لارا نے بیٹے کو دھوکا دیا تھا اور اب وہ خود دھوکے میں آچکی تھی۔گویا بُرے کا انجام بُرا۔

☆☆☆

ماروی کی چیخ اپنے بابا جانی کے بے سدھ پڑے وجود کو دیکھ کر نکلی تھی......اس کے سینے کا زیر و بم جو اس کی زندگی کی ضمانت تھا، شاید اسے لگا کہ تھم چکا ہے۔

''بابا جانی......!'' ماروی صدمے اور انجانے خوف سے چلائی۔جانے اس نے کیا سمجھا کہ گھبرا کر وہ اس طرف بڑھی......مگر اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ گر پڑی۔ہوش کھونے تک اس نے عالمِ غنودگی میں محسوس کیا کہ کسی کے مہربان ہاتھوں نے اسے گرنے سے سنبھالا تھا۔

جب دوبارہ اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو لہاسا سٹی کے اسی گیسٹ ہاؤس میں پایا۔وہ پریشان سی ہوگئی اور اپنی آنکھیں موند کر باطنی آنکھ سے روحانی قوتوں کا تصور ذہن میں لانے لگی تو اسے اشارہ ملا کہ فوراً ریاست ارضِ اسلام پہنچے۔جہاں نہ صرف اس کی ضرورت ہے بلکہ ایک اور بڑی خوش خبری بھی اس کی منتظر ہے۔

اس نے اسی وقت ریاست کا رخ کیا۔

☆☆☆

وقت جیسے اسی لمحے کا منتظر تھا۔دشمنوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔کمبلی گائنا کے ارضِ اسلام میں داخلے کی خبر سب سے پہلے کریگ ہوسٹن کو ہوئی تھی اور اس کے بعد ہارڈی کو۔

کریگ ہوسٹن کو ہارڈی پر غداری کا شبہ ہوا اور اس نے غصے میں آکر ہارڈی کے دماغ کو اس قدر جھٹکے دیے کہ وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد اس نے ارضِ اسلام پر افواج کو چڑھائی کا حکم دے دیا۔کمبلی گائنا نے ہمزاد اور زیب النساء پر قابو پا لیا تھا مگر دانش اس کے مقابلے پر آگیا۔اسے دکھ ہوا تھا کہ اس کی ماں نے اسے دھوکے میں رکھا تھا۔

دانش نے کمبلی گائنا کے دماغ کو اس قدر شدید جھٹکے دیے کہ وہ مرتے مرتے بچی اور بالآخر اس نے اپنی بچی کھچی افواج کے ساتھ بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی۔

کالی آندھی ارضِ اسلام پر ہلا بول چکی تھی۔کمبلی گائنا نے اپنے کالے چیلوں کی فوج کو بھی وہاں بلوا لیا تھا، ادھر سپر پاور سمیت یہودی افواج ریڈ آرمی اور اتحادیوں سمیت حملہ آور ہوئی تھی۔

ریاست میں عجیب کھچڑی پکنے لگی تھی۔دشمن کے دشمنوں کی آپس میں ٹھن چکی تھی۔تین اطراف سے جنگ چھڑ گئی تھی۔ریاست والے بھی نئی طاقت کے ساتھ دوبارہ جنگ کے لیے کمربستہ ہو چکے تھے۔وجہ یہ تھی کہ انہیں مراد کی اچانک آمد کی خبر ملی تھی اور ہوا بھی یہی تھا، ریاست کا مالک اللہ کے حکم سے صحت یاب ہو کر آچکا تھا۔گویا مردہ جسم میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔

مراد کو انہوں نے اپنے بالکل قریب پایا تھا مگر وہ نہ

کسی سے بات کر رہا تھا نہ بول رہا تھا، بس جنگی حکمتِ عملی میں جتا ہوا تھا۔

ادھر کسی جاسوس نے کریگ ہوسٹن کو مطلع کیا کہ مراد کو انہوں نے وہاں دیکھا ہے، تو وہ سن ہو کر رہ گیا۔ کمبلی گانا کو دانش نے پچھاڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے لیے اسی طرح آسان شکار ثابت ہوئی تھی جس طرح اس کا بھائی زومبی گانا لمبی لمبی بڑھکیں مار کر اس کے بھائی عالی کے ہاتھوں شکار ہوا تھا۔ اپنے باپ کی آمد کی دانش کو بھی خبر ہوئی تھی جس سے اس کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ اور وہ اسے لڑائی کے دوران، اپنے ساتھیوں سے پوچھتا ہوا تلاشے جا رہا تھا۔ دانش کو باپ کے آنے کی خبر سن کر اب کسی بات کی فکر نہیں رہی تھی۔

کریگ ہوسٹن کو اس وقت مراد کی جھلک نظر آئی جب وہ اپنی افواج کے سپہ سالار کی حیثیت سے آگے بڑھ رہا تھا...... پھر نہ جانے کریگ ہوسٹن پر کیسا دورہ پڑا کہ اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

ریاست ارض اسلام کے فرماں روا کی جو کوئی بھی جھلک دیکھتا، اس پر لرزہ طاری ہونے لگتا...... اس مردِ آہن کو اس کے ساتھی بھی احترام و عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔

دشمن گھٹنے لگے تھے۔ مراد کے شفایاب ہو کر لوٹ آنے کی گردش کرتی خبروں نے ہی دشمنوں کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

ادھر وہ دونوں رپورٹر بھائی بہن...... ان سارے واقعات کی خبریں لائیو نشر کر رہے تھے اور سپر پاور سمیت ان کے اتحادیوں کے سیاہ مکروہ چہرے دنیا کے سامنے لا رہے تھے۔

عذرباد خوش تھا کہ اس نے سب کو لڑوا دیا تھا...... مگر مراد کی آمد کی خبر نے اسے بھی تشویش میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ کمبلی گانا ماری گئی تھی اور ریاست ارض اسلام کی افواج بے جگری اور بہادری سے دشمن افواج کے ساتھ برسرِ پیکار تھی اور انہیں پسپا کر رہی تھی۔ کریگ ہوسٹن اور ان کے اتحادیوں کی سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ یہ سب مراد کی اچانک اور غیر متوقع آمد اور اس کے روحانی کمال و قوت کے طفیل ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے ان کی افواج کے حوصلے بھی بلند ہو گئے تھے۔

دشمن، بالخصوص ٹیلی پیتھی جاننے والے یہ بات بھول چکے تھے کہ ارضِ اسلام میں داخل ہونے کی اگر انہوں نے تدبیر کر لی تھی تو اس صورت میں انہیں اس کی قیمت بھی چکانی پڑی تھی، یعنی ان کی یہ قوت بھی اس پاک سرزمین میں پوری طرح عمل پذیر ہونے سے قاصر تھی مگر وہ اپنی اس کمزوری کو مراد کی آمد پر محمول کیے ہوئے تھے کہ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔

کریگ ہوسٹن نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ دانش نے خیال خوانی کے ذریعے اپنی بہن ماروی سے رابطہ کیا اور پھر دونوں بہن بھائی نے اس پر بیک وقت حملہ کیا...... اس وقت مراد کی آمد نے ان سب کے اندر جیسے جنون بھر دیا تھا۔

کریگ ہوسٹن کی دماغی حالت عجیب ہو گئی اور وہ اپنے وار زون میں بنے بیس کیمپ میں جا پڑا...... جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کے سامنے مراد کھڑا، پُرطیش نظروں کے ساتھ اسے گھور رہا تھا۔

''تم کیا سمجھتے تھے کہ میں یہاں نہیں ہوں اور تم یہاں اس پاک دھرتی پر اپنا قبضہ جما لوگے؟ کیا نہیں جانتے تھے کہ مراد یہاں ہو نہ ہو...... اس پاک سرزمین کی اللہ حفاظت کرتا ہے۔''

''مم...... مجھے معاف کر دو...... مجھ سے غلطی ہو گئی۔'' کریگ ہوسٹن گھگیا کر بولا۔

''غلطی؟ تم نے یہاں کے معصوم لوگوں کا دانہ پانی بند کر دیا۔ انہیں اذیت میں مبتلا کیا اور انہیں غلام بنانے کے مذموم ارادوں سے یہاں حملہ کیا...... تم نے ناقابلِ معافی جرم کیا ہے۔ موت بھی تمہارے لیے کم سزا ہے اس لیے تمہیں ایسی سزا دینی چاہیے جو رہتی دنیا تک نمونۂ عبرت بنی رہے اور پھر کسی کو اس عظیم ریاست پر ننگی جارحیت کی جرأت نہ ہو......''

ماروی اور دانش اپنے بابا جانی کی پُرجلالی آواز پر فرطِ جذبات سے آب دیدہ... ہو گئے تھے۔ وہ اپنے بابا جانی کا اشارہ سمجھ چکے تھے۔ اسی وقت ان دونوں بہن بھائی نے کریگ ہوسٹن کے دماغ کو ایسے خطرناک جھٹکے دیے کہ وہ پاگل اور مجہول سا ہو کر رہ گیا۔

ارضِ اسلام کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ دنیا بھر میں اس کی افواج کی شجاعت اور روحانی قوتوں کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ سپر پاورز اور یہودی سازشی قوتیں شرمسار ہو کر رہ گئی تھیں۔

عذرباد سمیت طاغوتی قوتیں بھی ہمیشہ کی طرح زوال پذیر رہی ہیں مگر یہ ہمیشہ انسانوں کو امتحان میں ڈالتی رہیں گی...... تاقیامت یہ سلسلہ اللہ کے حکم سے جاری رکھا گیا ہے۔ عذرباد بھی ناکام ہو گیا تھا۔ جبلیس

نے اسے واپس بلا لیا تھا۔ تمام طاغوتی قوتوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس جنگ کے بعد ارض اسلام پر دوبارہ چڑھائی کس قدر مہنگی پڑ سکتی ہے...... وہ سب پاتال کی منحوس گہرائیوں میں جا دفن ہوئے تھے کہ وہی ان کا ٹھکانا اور مسکن تھا مگر وہ خاموش بیٹھے رہنے والے نہیں تھے۔ شیطان پینترے بدل بدل کر نیک انسانوں کے ایمان کو آزمائش میں ڈالتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ ایسے ہی کسی اور موقعے کے لیے شیطان اپنے چیلوں کو منتظر رہنے کا حکم دے چکا تھا۔

☆☆☆

ماروی وہاں پہنچ چکی تھی اور اس وقت مراد کی ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی مگر وہ تو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

وہ سب حیران تھے۔ وہ جس طرح طوفانی لہر کے ساتھ وارد ہوا تھا، ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ انہیں خوف ہوا کہ کہیں خدانخواستہ مراد دھوکے سے کسی دشمن کے وار تلے تو نہیں آ گیا۔ دشمنوں پر فتح اور عالمی دنیا میں سرخروئی کی مسرتیں اس خوف کے باعث ماند پڑنے لگی تھیں۔ وہ سب پریشان تھے مگر ماروی کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی...... اس کی سماعتوں میں آپوں آپ مراد کے وہ ٹوٹے پھوٹے جملے گونجنے لگے تھے، جو اسے لہاسا کے برف زار غار میں سنائی دیے تھے۔

''نن...... نہیں، ابھی نہیں...... یا مرشد! عالی مقام! بس ایک موقع اور......''

''آہ...... ایسا ہے کیا؟ تت...... تو پھر ٹھ ٹھ...... ٹھیک ہے یا مرشد! اس کا بھی مجھ پر حق ہے اور...... اور...... آشتی کے لیے بھی...... سب کے لیے بھی...... لل...... لیکن ان سب کو صص...... صبر بھی عطا کرنا...... بس ایک موقع...... اور......''

''آہ...... ایسا ہے کیا؟ تو پھر ٹھیک ہے مرشد! اس کا بھی مجھ پر حق ہے اور...... آشتی کے لیے بھی۔'' اس نے گہرائی سے سوچا بابا جانی نے یہ جملہ کس کے لیے کہا تھا کہ ''اس کا بھی مجھ پر حق ہے؟''

اور صبر کی بات...... پھر آشتی...... سب ٹھیک ہو جائے گا...... کی طرف اشارہ...... کیا ہونے والا تھا بابا جانی کے ساتھ؟ ہمارے ساتھ؟ اشارہ تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ سب ٹھیک ہونے والا تھا...... کچھ واضح بھی تھا اور کچھ نہیں بھی، ایک ادھورے وسوسے کی سولی تھی جس پر ماروی جھول کر رہ گئی تھی۔

مگر...... بہت تلاش کے بعد ماروی کو اشارہ ملا اور پھر مراد کو اپنے مخصوص کمرے میں موجود پایا جہاں وہ سجدۂ شکر بجالانے میں مصروف تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سب کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں اور خود کو بھی احساس ہوا کہ اس موقع پر صرف مراد کو ہی نہیں ہر ایک فرد کو اس رب العزت کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدے میں گر جانا چاہیے جس نے نہ صرف مراد پر اپنی کرم نوازی کرتے ہوئے موت سے زندگی کی جانب لوٹا دیا بلکہ شیطان دشمنوں پر بھی غلبہ اور فتح نصیب ہوئی۔ بے شک اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت کے گہرے غاروں میں دھکیل دے مگر...... جیت ہمیشہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے والوں کی ہوتی ہے، بے شک راہ میں جتنی چاہے مشکلات کھڑی ہو جائیں۔

☆☆☆

ماروی صبح جاگی تو اسے رات کا خواب یاد آیا جس میں اس نے اپنے بابا جانی کو یہ کہتے سنا تھا کہ میں مر جاؤں تو مجھے میری ماروی کے پہلو میں دفنا دینا۔ یہ تمہارے بابا کی آخری خواہش ہے۔

ماروی گھبرا کر پھر اپنے بابا جانی کے پاس جا پہنچی اور روتے ہوئے خواب بیان کیا تو مراد نے انتہائی شفقت سے ماروی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور سنجیدگی سے کہا۔

''بیٹا جو جان دنیا میں آتی ہے اسے ایک روز اپنے خالق کی جانب لوٹنا بھی ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں لیکن...... سچ پوچھو تو واقعی یہی میری آخری خواہش بھی ہے...... جسے دل و جان سے چاہا اسی کے پہلو میں دفن ہو جاؤں۔''

''اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر لمبے عرصے تک قائم رکھے بابا جانی...... آپ کو ماروی کے دو روپ ملے...... آغاز نے آپ کی زندگی کا منظر نامہ ہی بدل ڈالا...... ایک چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر آپ ایک ریاست کے حکمران بن گئے...... دوسرے روپ میں، میں یعنی آپ کی بیٹی...... جو آپ کے لیے اپنی جان بھی نچھاور کر سکتی ہے۔''

ماروی نے بڑے مان سے کہا تو اپنی پیاری بیٹی کو سینے سے لگا کر دو آنسو اس کے گالوں پر پھسل گئے...... اور پھر ماضی کے آئینے پر نگاہ پڑتے ہی مراد کی آنکھوں میں اپنی محبوبہ ماروی کی تصویر جیسے ثبت ہو کر رہ گئی۔

ختم شد

درد مند

منظر امام

کہتے ہیں کہ آنکھوں دیکھا منظر سچا ہوتا ہے مگر... ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ وہ جو بہت گھمنڈی فطرت کا مالک تھا جب اسے وہ سوا سیر ملا تو سارا گھمنڈ گویا ہوا ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھوں نے اسے ایک بار پھر دھوکا دے دیا... کیونکہ جو کچھ اس نے دیکھا، سنا اور سمجھا وہ سب بے بنیاد نکلا۔

ایک دردمند دل انسان کا اظہار ہمدردی کا اچھوتا انداز

کافی پینے کے دوران باتیں ہوتی رہی تھیں۔

فرید کا دوست نعمان اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ ''پھر جو میں نے ڈاکٹر کو گالیاں دی ہیں تو اس کے ہوش ٹھکانے آگئے۔''

''تمہارے بیٹے کو ہوا کیا تھا؟'' فرید نے پوچھا۔

''ارے کوئی خاص بات نہیں تھی۔'' نعمان نے بتایا۔

''تم تو اپنی بھابی کو جانتے ہو۔ وہ خرم سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ ویسے تو دنیا کی ہر ماں اپنے بیٹے سے پیار کرتی ہے

لیکن میری بیوی تو پاگل ہے۔ خرم کو ذرا سا کچھ ہو جائے تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔"

"ہاں جانتا ہوں۔" فرید ہنس پڑا۔ "میں خود ایک بار یہ تماشا دیکھ چکا ہوں۔"

"تم نے کب دیکھ لیا؟" نعمان نے پوچھا۔

"ایک بار جب میں تمہارے گھر گیا تھا تو بھابی نے رو رو کر اپنا حال خراب کر رکھا تھا۔ پتا چلا خرم کو کانٹا چبھ گیا ہے اور وہ فوری طور پر اسے اسپتال لے جا رہی ہیں۔ میں نے سمجھایا۔ بھابی خدا کے لیے اس کو مرد بننے دیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس کے لیے آپ ہاسپٹل چلی جائیں۔ یہ تو اور بچوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور وہ دوستوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے ہوئے خود ہی کانٹا نکال کر دوبارہ کھیل شروع کر دیتے ہیں۔"

نعمان نے ایک گہری سانس لی۔ "یہی تو پرابلم ہے یار..... نمیرہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پاگل ہو جاتی ہے اور ذرا ذرا سی بات پر شہر کے سب سے مہنگے ہاسپٹل پہنچ جاتی ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ میں اس قابل ہوں کہ ہاسپٹل کا خرچ برداشت کر سکوں۔ اگر نمیرہ جیسی بیوی کسی غریب کی ہوتی تو اس کا بیڑا ہی غرق ہو چکا ہوتا۔"

دونوں ہنس پڑے۔ وہ دونوں ہی بزنس مین اور بہت پرانے دوست تھے۔ نعمان کا دفتر فرید کے دفتر کی بلڈنگ سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ وہ اکثر کافی پینے اس کے پاس آ جایا کرتا یا کبھی کبھی خود فرید اس کے پاس چلا جاتا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔

کافی ختم ہو گئی تھی۔ اس دوران نعمان کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ "ہیلو!" اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ دس بار منع کیا ہے کہ جس وقت میں مسٹر فرید کے ساتھ ہوں اس وقت ڈسٹرب مت کیا کرو۔ ہاں کہو۔ کیا ہوا ہے؟ تو پھر؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟ نہیں۔ وہ پچھلے مہینے لے چکا ہے۔ میں نے ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہے۔ ..دس ہزار؟ منع کر دو اس کو۔"

فون بند کر کے اس نے فرید کی طرف دیکھا۔ "یار، ان لوگوں نے تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔"

"کیا بات ہو گئی؟" فرید نے کافی کی دوسری پیالی بنا دی تھی۔

"میرے دفتر میں ایک کلرک ہے۔ اس کا بیٹا بیمار رہتا ہے۔ بتا رہا تھا کہ اس کے پھیپھڑوں میں پانی آ گیا ہے۔"

"اوہ......"

"ہاں یار، کچھ ایسا ہی ہے لیکن میں بھی کیا کر سکتا ہوں۔ دس ہزار ایڈوانس مانگ رہا تھا۔ اب میں دینے کو تو دے سکتا ہوں لیکن ایسے لوگوں کے ساتھ پرابلم یہ ہوتی ہے کہ اگر ایک بار ان کی مدد کر دی جائے تو یہ اسے اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ بار بار چلے آتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔ مجھے خود بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔" فرید نے کہا۔

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"بس بھائی کچھ اسی قسم کی داستان تھی۔" فرید نے کہا۔

"اچھا! اب اجازت دو، میں چلتا ہوں۔" نعمان کرسی سے اٹھ گیا تھا۔

نعمان کے جانے کے بعد اس نے فون اٹھا لیا۔ اس کو اپنی بیوی کے ساتھ مارکیٹ جانا تھا۔ وہ کئی دنوں سے اس کے ساتھ چلنے کی ضد کر رہی تھی لیکن اسے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ آج اسے فرصت تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے نوید کو بھی ساتھ لے چلے گا۔ وہ بھی کئی دنوں سے ریموٹ کنٹرول والے ہیلی کاپٹر کی ضد کر رہا تھا۔

دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی لیکن فون ریسیو نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا پھر اس نے موبائل پر ٹرائی کیا۔ موبائل اٹھا لیا گیا۔ اس کی بیوی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "فرید! خدا کے لیے جلدی آ جائیں۔ میں کب سے آپ کو ٹرائی کر رہی ہوں۔"

"ہوا کیا ہے؟"

"نوید گر گیا ہے۔ میں اس وقت اسپتال میں ہوں۔"

فرید کی جان نکل گئی تھی۔ نوید کے اسپتال میں ہونے کا مطلب یہ تھا کہ بات کچھ سیریس ہے۔ اسے اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت تھی۔

"راحیلہ! پریشان مت ہونا، میں ابھی آ رہا ہوں۔ کس اسپتال میں ہو؟"

"ورونا میں۔" اس نے بتایا۔

ورونا شہر کے مہنگے اسپتالوں میں سے ایک تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نوید کو کس طرح اکیلی لے گئی ہو گی۔

فرید نے اسپتال پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ طویل کوریڈور میں اسے اپنی بیوی کا بھائی جواد دکھائی دے گیا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ نوید کو کون لایا ہو گا۔ جواد اس کو دیکھتے

ہی اس کے پاس آ گیا تھا۔
''فرید بھائی! میں آپ کو مسلسل فون کر رہا تھا مگر آپ کا نمبر نہیں مل رہا تھا۔'' اس نے کہا۔
''نوید کہاں ہے؟ کیا ہوا ہے اس کو؟''
''وہ سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔ کچھ کمپلیکیشن ہو گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔
''وہ ہے کہاں؟''
''آئیں میرے ساتھ۔''
نوید بے ہوش تھا۔ اس کو بتایا گیا کہ فی الحال اس کو تکلیف کے احساس سے بچانے کے لیے انجکشن دیا گیا ہے۔ اس کی بیوی نوید کے بستر کے پاس ہی تھی۔ اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر رکھا تھا۔
''آپ لوگ اسے جس قسم کا ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں، یہ تو کوئی علاج نہیں ہوا۔'' اس نے ڈاکٹر سے کہا۔
''ہاں، یہ کوئی علاج نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے کی سرجری ہوگی۔''
''تو دیر کس بات کی ہے؟ جو کرنا ہے جلدی کریں۔''
''اس قسم کی سرجری صرف ڈاکٹر زبیری کرتے ہیں۔ ہم نے ان کو پیغام بھیج دیا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔''
''حد ہوتی ہے بے پروائی کی۔ یاد رکھیں، میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں جس کو آپ لوگ اتنا ایزی لے رہے ہیں۔''
''دیکھیں، ہم کسی بھی پیشنٹ کو ایزی نہیں لیتے۔'' ڈاکٹر نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''سب ہماری نگاہوں میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پرابلم یہ ہے کہ اس کیس کو صرف ڈاکٹر زبیری ہی ہینڈل کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان کو انفارم کر دیا ہے۔ وہ آنے والے ہوں گے۔''
''ان سے کہیں کہ ان کو جتنی رقم بھی چاہیے، لے سکتے ہیں۔ دس لاکھ، بیس لاکھ۔''
''معاف کیجیے گا۔'' ڈاکٹر کا لہجہ خشک ہو گیا تھا۔ ''ہم جو کچھ اس اسپتال سے لیتے ہیں، وہی ہمارے لیے کافی ہے۔ آپ ہم سے بحث نہ کریں۔''
اسی وقت جواد نے اس کا بازو تھام لیا۔ ''آئیں فرید بھائی! اس طرف آ جائیں۔'' وہ اسے ایک طرف لے گیا۔
''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اس وقت جذباتی نہ ہوں۔ یہ کمبخت جلا کر کیس بگاڑ بھی سکتے ہیں۔ اس ڈاکٹر زبیری کو آ جانے دیں پھر دیکھتے ہیں۔''
''وہ آ کیوں نہیں رہا؟ بے پروائی کی ایک حد ہوتی ہے۔''

خبردار

شادی شدہ زندگی کے پچیس سال ساتھ گزارنے والے میاں بیوی ساحلِ سمندر پر بیٹھے تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا ہوا سرگوشیوں میں پیار بھری باتیں کر رہا تھا۔ بیوی نے کچھ دیر ان کی باتوں کی طرف کان لگائے پھر شوہر سے مخاطب ہو کر بولی۔
''میرا خیال ہے کہ لڑکا، لڑکی کے سامنے شادی کی تجویز رکھنا چاہتا ہے۔ تم تھوڑا سا کھنکھار کر انہیں آگاہ کر دو۔''
''میں کسی سے کیوں ہمدردی کروں؟'' شوہر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جس وقت میں نے تمہارے سامنے شادی کی تجویز رکھی تھی، مجھے کسی نے کھنکھار کر متنبہ کیا تھا؟''

حقیقی محبت

پھول سے کانٹے نے کہا۔ ''تو بہت خوب صورت ہے اسی لیے دنیا کے سب لوگ تجھ سے محبت کرتے ہیں اور مجھ سے نفرت۔''
پھول نے بڑی حلیمی سے جواب دیا۔
''دنیا کے نفرت کرنے سے کیا ہوتا ہے، میں تو تجھ سے محبت کرتا ہوں۔''

عقل

ایک بچے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے والد اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''یہ زخم کیسے آیا؟''
والد۔ ''یہ دیوار میں پیپرویٹ کی مدد سے کیل گاڑ رہا تھا، میں نے کہا کہ پیپرویٹ کے بجائے کسی اور چیز سے کیل گاڑو۔ کچھ تو عقل سے کام لو، دماغ استعمال کرو، کھوپڑی استعمال کرو اور پھر اس نے پیپرویٹ رکھ کر کھوپڑی استعمال کی۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

''فرید بھائی! اس قسم کے کیسز دیکھتے دیکھتے ان کے دل سخت ہوجاتے ہیں۔''

''اوکے.....'' فرید نے ایک گہری سانس لی۔ ''بس ایک بار نوید ٹھیک ہوجائے۔ پھر اس کی سختی کو نرمی سے بدل دوں گا۔''

اسی دوران ڈاکٹر زبیری بھی آپہنچا تھا۔ فرید اس کی طرف لپکا... لیکن جواد نے اسے پکڑ لیا۔ ''پلیز فرید بھائی! یہ موقع اس سے بحث کرنے کا نہیں ہے۔ اس کو اپنا کام کرنے دیں۔''

فرید خود پر جبر کر کے رہ گیا۔ نوید کو فوری طور پر آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ اس کی بیوی روتی ہوئی اس کے پاس آگئی تھی۔

''اب بتاؤ۔ وہ کیسے گرا؟'' فرید نے پوچھا۔

''بس بہت تیزی سے سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ پیر سلپ ہوگیا اور میرا بیٹا لڑھکتا ہوا نیچے آگیا۔'' اس کی بیوی نے بتایا۔ ''وہ اسی وقت بے ہوش ہوگیا تھا۔ میری تو جان نکل گئی تھی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی وقت جواد بھائی آگئے۔ ہم اسے فوراً... یہاں لے آئے۔ ڈاکٹر نے جب اس کو دیکھا تو اسے ہوش آچکا تھا لیکن درد کی شدت سے میرا بیٹا بری طرح تڑپ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا تھا اور کہا کہ ڈاکٹر زبیری کے آنے کے بعد ٹریٹمنٹ ہوگا۔''

''اور وہ نواب کا بچہ اتنی دیر میں آیا ہے۔'' فرید غصے سے بولا۔

''پلیز فرید بھائی! اپنے غصے کو کنٹرول میں رکھیے گا۔'' جواد نے کہا۔ ''کیونکہ نوید کو ابھی کچھ دنوں تک اسی اسپتال میں رہنا ہوگا۔''

فرید اپنے ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ بعض دفعہ حالات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انسان اپنی دولت اور طاقت کے باوجود بے بس ہوکر رہ جاتا ہے اور یہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا...... جب اس کا غصہ اور اس کا مزاج اس کے کام نہیں آرہا تھا۔

''فرید میرا بچہ ٹھیک تو ہوجائے گا نا؟'' اس کی بیوی نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں۔ کیوں ٹھیک نہیں ہوگا۔'' فرید نے کہا۔ ''یہ شہر کا سب سے مہنگا اسپتال ہے۔ ہم اسی لیے اپنے بیٹے کو یہاں لائے ہیں کہ اس کا ٹریٹمنٹ اچھا ہو۔ ورنہ لاکھوں خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

اسی دوران میں آپریشن تھیٹر سے ایک نرس باہر آئی۔

فرید نے اس کو گھیر لیا۔ ''کیا ہوا...... بتاؤ؟ کیسا ہے ہمارا بیٹا؟''

''دیکھیں، ڈاکٹر صاحب آپریٹ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتی۔'' وہ آگے چلی گئی۔

فرید گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہاں اس کی ایک نہیں چل رہی تھی۔ اس کا سارا کروفر نکل گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر زبیری بھی آپریشن تھیٹر سے باہر آگیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ وہ نرس سے کچھ کہتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا کہ فرید اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیسا ہے میرا بیٹا؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''کل تک اسے ہوش آجائے گا۔ باقی باتیں آپ دوسروں سے پوچھ لیں۔''

ڈاکٹر زبیری اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ فرید کو اس وقت اپنی توہین کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ اس کو بھی اس طرح نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ معاشرے میں اس کی ایسی پوزیشن تھی اور یہاں یہ حال تھا کہ ڈاکٹر کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ اس سے دو منٹ رک کر بات بھی کر سکے۔

اس نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''تمہارے ڈاکٹر زبیری صاحب اتنے بڑے لاٹ صاحب ہیں کہ ان کے پاس بات کرنے کا بھی وقت نہیں ہے؟''

''جناب! ڈاکٹر صاحب مجبور ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا مجبوری ہے ان کے ساتھ؟''

''کل رات ان کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ وہ بچ نہیں سکا۔ اس وقت اس کا جنازہ تیار رکھا ہوا ہے۔ وہ صرف آپ کے بیٹے کو بچانے کے لیے یہاں آگئے تھے۔''

وہ ڈاکٹر اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ فرید سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔

جواد نے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''فرید بھائی! ہوتا کچھ اور ہے اور ہم کچھ اور سمجھتے ہیں۔ چلیں، چل کر نوید کو دیکھ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر نے دیکھنے کی اجازت دے دی ہے۔''

اس وقت شاید زندگی میں پہلی بار فرید کے چہرے پر پشیمانی کے تاثرات تھے۔ اس نے برابر سے گزرتے ہوئے اسی ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''پلیز! کیا آپ مجھے ڈاکٹر زبیری کا ایڈریس بتا سکتے ہیں؟ مجھے ان کے بیٹے کے جنازے میں شریک ہونا ہے۔''

دہلی کے مشہور بزرگ شیخ بدرالدین کے والد کا نام علی اور دادا کا نام اسحاق تھا لیکن آپ کے دادا کا نام آپ کے نام کا ایک جز و بن گیا اور باپ کا نام بس تذکرہ اور سوانح میں محفوظ ہو کر رہ گیا۔

انہوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس زمانے میں حصولِ علم کے علاوہ فنِ سپاہ گری بھی شرفا میں عام تھا۔ بدرالدین نے اس فن میں بھی کمال حاصل کیا۔ دورانِ تعلیم چند ایسے مسائل بھی سامنے آئے کہ ان کا بخوبی اور اطمینان بخش علم حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ بدرالدین نے ان مسائل کو علمائے عصر کے سامنے رکھا اور ان کا جواب مانگا۔ ان علما نے تسلی بخش جواب دینے کے بجائے انہیں باتوں میں الجھانے اور پھسلانے کی کوشش کی لیکن آپ ان علما کے جوابات سے ذرا بھی مطمئن نہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے ہمدردوں سے مشورہ کیا۔ ”دوستو! کیا میں ان مسائل کے جوابات سے محروم رہوں گا؟“

شیخ بدرالدین اسحاق

ضیا تسنیم بلگرامی

بزرگانِ دین کے سلسلے کی ایک اور خوب صورت کڑی، جن کی تمام زندگی آزمائشوں میں گزری اور جنہیں اجودھن پاک پتن کی قدیم جامع مسجد میں دفن کیا گیا۔ کیونکہ آپ نے اسی مسجد میں اپنی زندگی کا بڑا وقت گزارا تھا۔ اللہ کے عشق اور خشیت میں سب سے زیادہ رونے والا اللہ کے گھر میں رہا اور اللہ سے راز و نیاز کی حالت میں ہی اپنی جان دے دی۔ جان بوجھ کر نماز قضا کرنے والوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ... جب کم وقت اور مصروفیات کا نام لے کر اپنی شرمندگی اور احساس جرم کو مٹانے کی سعی کی جاتی ہے۔

ایک ایسے ولی کا قصہ جن کا رواں رواں یادِ الٰہی میں مصروف و مشغول تھا

ایک مخلص اور سمجھ دار دوست نے جواب دیا۔ ''نہیں بھائی بدرالدین! تم اپنے مسائل کے جوابات دہلی میں نہیں، بخارا میں پاؤ گے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تم بخارا کوچ کر جاؤ۔''

بدرالدین کے دل پر دوست کے مشورے نے بڑا اثر کیا۔ آپ نے رختِ سفر باندھا اور بخارا کے لیے عازمِ سفر ہو گئے۔

دورانِ سفر آپ نے اجودھن میں قیام کیا۔ اجودھن میں بھی آپ کا ایک دوست رہتا تھا۔ آپ نے اسی دوست کے ہاں قیام کیا۔

جب یہ دونوں ایک ہی دسترخوان پر کھانے میں مشغول تھے تو دوست نے پوچھا۔ ''یار میرے! تم نے دہلی کیوں چھوڑ دیا؟ دہلی میں کیا کمی پائی تھی تم نے؟''

بدرالدین نے جواب دیا۔ ''دہلی میں کوئی کمی نہیں محسوس کی میں نے مگر میں کچھ عرصے سے چند مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ دہلی بھر میں ایک عالم بھی مجھے ایسا نہیں ملا کہ وہ مجھے مطمئن کر سکتا۔''

دوست نے پوچھا۔ ''تو کیا تم نے بخارا جانے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے برصغیر سے مایوس ہونے کے بعد بخارا جانے کا ارادہ کیا ہے۔''

دوست نے کہا۔ ''مگر دوست! اجودھن میں ایک بزرگ ہیں بابا فرید مسعود گنج شکر۔ تم بخارا جانے سے پہلے ایک بار ان سے ضرور مل لو۔''

بدرالدین نے کہا۔ ''لیکن میں ان سے کیوں ملوں۔ جب میں جانتا ہوں کہ برصغیر میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو میرے مسائل کے جواب دے سکے تو میں ان بزرگ سے مل کر اپنا وقت کیوں ضائع کروں؟''

دوست نے اصرار کیا۔ ''دوست! تم اپنا وقت نہیں ضائع کرو گے بلکہ تم ان سے مل کر بے حد خوش ہو گے۔ میرے کہنے سے تم ان سے ایک بار مل ضرور لو۔''

بدرالدین دوست کے اصرار پر مجبور ہو گئے، بولے۔ ''تم کہتے ہو تو میں مل لوں گا لیکن میں دل سے نہیں ملوں گا۔ طوعاً و کرہاً مل لوں گا۔''

بدرالدین اپنے دوست کے ساتھ بابا فرید کی خانقاہ میں پہنچے تو وہاں ایک ہجوم دیکھا۔ یہ لوگ بابا فرید کے شوقِ دیدار میں ان کی خانقاہ کے در پر پڑے ہوئے تھے، اس ہجوم کے لوگ اپنے لباس اور وضع قطع سے مختلف ملکوں کے معلوم ہوتے تھے۔ بدرالدین غیر ملکی مشتاقانِ دید کو دیکھ کر ذرا حیران ہوئے۔ ایک غیر ملکی سے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''بغداد سے۔''

بدرالدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''مگر کیوں؟ کیا بغداد میں بڑا درویش نہیں ملا؟''

بغدادی مہمان نے بدرالدین کو حیرت سے دیکھا۔ ''جناب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے تعلق رکھتے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میرا نام بدرالدین ہے اور میں دہلی کا رہنے والا ہوں۔''

بغدادی جوان نے کہا۔ ''تب پھر میں آپ کی لاعلمی پر افسوس کروں گا۔ برادر عزیز! جن بزرگ کی چوکھٹ پر اس وقت ہم بیٹھے ہیں، یہ یکتائے عصر ہیں۔ ان کا اس وقت کوئی ثانی نہیں۔''

بدرالدین نے اس بار خاموشی اختیار کی مگر انہوں نے اس بغدادی جوان سے جو کچھ سنا تھا، وہ حیرت انگیز تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے غیر ملکی بوڑھے سے پوچھا۔ ''جناب! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

غیر ملکی بوڑھے نے جواب دیا۔ ''مصر سے۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''کیوں؟ آخر ان بزرگ میں کیا خاص بات ہے جو آپ لوگ اتنی دور سے ان سے ملاقات کو تشریف لائے ہیں، حالانکہ میں خود دہلی کا رہنے والا ہوں لیکن اپنی مرضی سے نہیں، اپنے ایک دوست کے اصرار پر ان سے ملنے آ گیا ہوں۔''

مصری بوڑھے نے بدرالدین کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا۔ ''تب پھر تو میں یہ کہوں گا کہ تو بدقسمت ہے ورنہ بابا فرید جیسا درویش اس دور میں کہیں ملنے سے رہا۔''

یہ باتوں میں مشغول تھے کہ ایک شخص اندر سے نمودار ہوا اور آواز دی۔ ''بدرالدین اسحاق کس کا نام ہے؟''

بدرالدین اسحاق آگے بڑھے اور عرض کیا۔ ''بندے کو بدرالدین اسحاق کہتے ہیں۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میرے ساتھ اندر تشریف لے چلیں، آپ کو بابا یاد فرما رہے ہیں۔''

بدرالدین اسحاق کا دوست باہر ہی رہ گیا اور آپ اندر چلے گئے۔ اس وقت بابا فرید تنہا بیٹھے تھے اور ان کے آس پاس کتاب نام کا ایک کاغذ بھی نہیں تھا۔

بابا فرید نے بدرالدین کی طرف نظر بھر کے دیکھا تو وہ کانپ گئے۔ انہیں ایسا لگا گویا وہ کسی بادشاہ کے سامنے پیش کر دیے گئے ہیں۔

بابا فرید نے پوچھا۔ ’’تُو دہلی سے یہاں تک آیا اور مجھ سے ملے بغیر ہی بخارا چلے جانا چاہتا تھا، خوب۔ ہمیں بھی تو مہمان نوازی کا موقع دیا ہوتا...... اور رہ گیا یہ خیالِ خام کہ بعض مشکل مسائل کے جوابات بخارا کے عالم ہی دے سکتے ہیں، تو یہ تیرا وہم ہے۔‘‘

اس کے بعد آپ نے باری باری ان مشکل مسائل کا ذکر کیا اور ان کی وضاحت اور تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ بدرالدین کے ہوش وحواس ہی جاتے رہے، فرمایا۔ ’’بدرالدین! اب تو کہیں نہیں جائے گا، یہیں میرے ساتھ رہے گا۔‘‘

بدرالدین پسینے سے شرابور ہو چکے تھے، کہا۔ ’’بابا! میں اپنی نادانی اور کم علمی پر شرمندہ ہوں۔‘‘

بابا نے فرمایا۔ ’’شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، کم علمی اور نادانی میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔‘‘

اب بدرالدین اسحاق اجودھن میں مستقل رہنے لگے۔ انہیں اپنی کم مائیگی کا اتنی شدت سے احساس ہوا کہ وہ اکثر رویا کرتے تھے۔ روتے روتے ان کی آنکھیں سوج گئیں اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے، آنکھیں خراب ہونے لگیں۔

بابا فرید کی مرید خواتین میں ایک ایسی خاتون بھی تھیں جو آنکھوں کا علاج سرمے سے کیا کرتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے بدرالدین سے کہا۔ ’’بھائی بدرالدین! میں آنکھوں کا علاج بہت اچھا کرتی ہوں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری آنکھیں خراب ہوتی جارہی ہیں۔‘‘

بدرالدین نے جواب دیا۔ ’’وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ حضرت یعقوبؑ کی طرح گریۂ پیہم نے میری آنکھوں کو خراب کردیا ہے، نہ رونا میرے بس کی بات ہی نہیں۔‘‘

بڑی بی نے مشورہ دیا۔ ’’لیکن اگر تم چند گھنٹے کی خاموشی اختیار کرو تو میں تمہیں ٹھیک کرسکتی ہوں۔‘‘

بدرالدین نے جواب دیا۔ ’’اے کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا۔‘‘

آپ کی اس حالت میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ بابا فرید آپ کو اس حالت میں دیکھتے تو کچھ بھی نہ کہتے۔

ایک دن آپ نے یہ شعر پڑھنا شروع کردیا۔

پیشِ صلابتِ غمش روحِ نطق می زند
اے زہزار صعوہ کم پس تو نواچہ می زنی

(اس کے عشق کے غم میں روح تک خاموش ہے۔ اے انسان! تیری ہستی ایک ممولے کے ہزارویں حصے سے بھی کمتر ہے پھر تو نالہ کیوں کرتا ہے)

آپ نے اس شعر کا ورد صبح شروع کیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرا اور شعر بار بار زبان پر آتا رہا، آپ کی حالت بھی غیر ہوتی چلی گئی۔ عالم شوق اور تحیر میں آپ کو کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ پورا دن اسی حال میں گزر گیا۔ شام کو بابا فرید نے انہیں حکم دیا۔ ’’بدرالدین! اس وقت امامت تم کرو گے، میں تمہارے پیچھے نماز پڑھوں گا۔‘‘

بدرالدین مجبور ہوگئے اور امامت کے لیے کھڑے ہوگئے۔

تکبیرِ تحریمہ کے بعد آپ نے قرأت کے بجائے مذکورہ بالا شعر پڑھنا شروع کردیا اور کچھ دیر بعد بے ہوش ہوکر گر گئے۔

بابا فرید نے انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ دوسرے مقتدی دل برداشتہ تھے۔ انہوں نے سرگوشی میں کہنا شروع کیا۔ ’’یہ بدرالدین تو اس لائق ہی نہیں رہ گئے کہ انہیں امام بنایا جائے۔‘‘

دوسرے شخص نے کہا۔ ’’ذرا دیکھو تو قرآنی آیات کے بجائے فارسی کا شعر پڑھ رہے تھے نماز میں۔ یہ کیا بات ہوئی؟‘‘

بابا فرید نے ہوش میں لے آنے کے بعد بدرالدین سے پوچھا۔ ’’بدرالدین! یہ تجھ کو کیا ہوگیا ہے؟‘‘

بدرالدین رو رہے تھے، بولے۔ ’’بابا! پتا نہیں مجھ کو کیا ہوگیا ہے۔‘‘

بابا فرید نے حکم دیا۔ ’’پھر سے نماز پڑھا مگر خبردار اس بار جو تو نے کوئی شعر پڑھا۔‘‘

بدرالدین امامت کے لیے کھڑے ہوگئے اور بہ مشکل تمام نماز پڑھائی۔ اس بار نہ تو انہوں نے کوئی شعر پڑھا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کا سہو ہوا۔

اس واقعے نے بڑی شہرت اختیار کی اور لوگوں کا ہجوم آپ کی زیارت کے لیے جمع ہونے لگا۔

☆☆☆

بابا فرید گنج شکر کی مہربانیاں اور نوازشیں اپنے عروج پر تھیں۔ بدرالدین اسحاق نے اجودھن میں وہ مقام اور مرتبہ حاصل کرلیا تھا کہ حد اور بس...... ایک دن بابا فرید نے آپ سے فرمایا۔ ’’بدرالدین! میں آج سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ادا کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

بدرالدین اسحاق نے عرض کیا۔ ’’پیرو مرشد! آپ کی پوری زندگی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطابق ہے۔‘‘

بابا فرید نے فرمایا۔ ’’ہاں، مگر میں آج جس سنت پر عمل کرنے والا ہوں، اس کا تعلق میری بیٹی اور تم سے ہے۔ جس طرح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے سلسلے میں حضرت علیؓ سے خود بات کی تھی، اسی طرح آج میں اپنی بیٹی کے سلسلے میں تم

سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری بیٹی کا نام بھی بی بی فاطمہ ہے۔"

بدرالدین اسحاق پر کپکپی طاری ہوگئی، جواب دیا۔ "پیرومرشد! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، میں اس قابل کہاں!"

بابا فرید نے بدرالدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے سہلاتے ہوئے فرمایا۔ "تم اس قابل ہو، میں جانتا ہوں تم اس قابل ہو، اگر تم اس قابل نہ ہوتے تو میں یہ بات ہی نہ کرتا۔"

بدرالدین اسحاق نے اعتماد سے پُرآواز میں کہا۔ "آپ نے مجھ پر اعتماد فرمایا۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، میں چاہتا ہوں یہ رسم نہایت سادگی سے آج ہی انجام پا جائے۔"

بدرالدین اسحاق نے ایک عذر پیش کیا۔ "حضرت! میں ایک نادار پردیسی ہوں، شادی کہاں سے کروں گا کیونکہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ پھر شادی کے مصارف کس طرح اور کون اٹھائے گا؟"

بابا فرید نے تلخی سے کہا۔ "نادان! میں نے کہہ جو دیا کہ جو کچھ ہونا ہے آج ہی ہوگا۔"

بدرالدین نے دبی زبان میں عرض کیا۔ "جیسی پیرومرشد کی مرضی، یہ خاکسار کیا عرض کرے۔"

بابا فرید نے ایک سادہ سی تقریب میں اپنی بیٹی کا ہاتھ بدرالدین اسحاق کے ہاتھ میں دے دیا۔ شرفِ دامادی عطا فرمانے کے بعد انہیں اپنی خلافت بھی بخش دی۔ لوگوں کو بدرالدین اسحاق کی خوش نصیبی پر رشک ہو رہا تھا۔

بابا فرید نے اپنے بیٹے شیخ یعقوب اور نواسے شیخ علاؤالدین کو آپ کے حوالے کر دیا اور فرمایا۔ "ان دونوں کو کلام اللہ تم پڑھاؤ گے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بسروچشم۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "ہم نے تم کو دامادی اور خلافت سے سرفراز فرمایا......"

بدرالدین اسحاق نے جواب دیا۔ "لیکن میں خود کو آپ کا خادم سمجھتا ہوں اور انشاء اللہ زندگی بھر آپ کی خدمت کروں گا۔"

بابا فرید نے آپ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بڑی دعائیں دیں اور اس موقع پر آپ نے اپنے غلام اخی مبارک کو بدرالدین اسحاق کے حوالے کر دیا۔ اخی مبارک خانقاہ میں جہازی کے نام سے مشہور تھے۔

☆☆☆

بابا فرید کی خدمت میں بیعت کے لیے آنے والوں کا ہجوم رہتا۔ ان میں معمولی اور غیر معمولی دونوں ہی قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی بیٹھا نظر آیا جس کی بڑی مونچھ اور پُرشکوہ چہرے نے دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ بابا فرید نے پوچھا۔ "تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ میں دیپال پور کا مقطع دار ہوں اور میرا نام ملک شرف الدین کبرا ہے۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "کیا مجھ سے بیعت ہونا ضروری ہے؟"

ملک شرف الدین نے جواب دیا۔ "بابا! میرے آنے کا مقصد تو یہی ہے۔"

بابا فرید نے مولانا بدرالدین اسحاق کو آواز دی۔ "ذرا میرے پاس تو آنا۔"

بدرالدین اسحاق بابا فرید کے سامنے ادب سے کھڑے ہوگئے، فرمایا۔ "ارشاد پیرومرشد۔ خادم حاضر ہے۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "دیپال پور کا مقطع دار ملک شرف الدین کبرا حاضر ہے، اس کو بیعت کر لو۔"

ملک شرف الدین کو مولانا بدرالدین اسحاق نے تجسس اور شوق کی نظروں سے دیکھا اور انکساری سے عرض کیا۔ "حضرت! آپ کی موجودگی میں، میں انہیں بیعت کر لوں۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "ہاں، یہ میرا حکم ہے۔"

مولانا بدرالدین اسحاق نے ملک شرف الدین کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ "کیا تو بھی آمادہ ہے کہ میں تجھے مرید کر لوں؟"

ملک شرف الدین نے عرض کیا۔ "شیخ! جب بابا فرید نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں پیرومرشد مولانا بدرالدین اسحاق کا مرید ہو جاؤں تو اس سے مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔"

مولانا بدرالدین اسحاق نے ملک شرف الدین کو اپنا مرید کر لیا اور رخصت ہوتے وقت فرمایا۔ "ملک شرف الدین! ہر شخص کے پیچھے حاسدوں اور اہلِ شماتت کی قطار لگی ہوئی ہے۔ تیرے پیچھے بھی یہ لوگ موجود ہیں، ان سے ہوشیار رہنا۔"

ملک شرف الدین نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پیرومرشد! میں لوگوں سے ہوشیار رہتا ہوں۔ میں انسانی جبلت سے خوب اچھی طرح واقف ہوں، انشاء اللہ یہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

مولانا نے فرمایا۔ ''میں نے تجھ سے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔ بس انسان کو ذرا احتیاط ضرور کرنا چاہیے۔''

ملک شرف الدین دیپال پور واپس چلا گیا۔ وہ اس منصب پر کئی سال قائم رہا۔

ان دنوں بادشاہ اپنے ملک کا دورہ کر رہا تھا۔ شاہی سواری دیپال پور سے گزری۔ دیپال پور کے حاکم اور دوسرے منصب داروں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی اور دیپال پور کے نظم و نسق پر گفتگو چھڑ گئی۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو ملک شرف الدین سے حسد رکھتے تھے۔ بادشاہ نے ان سب کو باری باری شرفِ ملاقات بخشا اور شاہی منصب داروں کے بارے میں ان سے بات کرنے لگا۔

ایک منصب دار نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! اور تو سب ٹھیک ہے لیکن یہاں کا مقطع دار صحیح نہیں ہے۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''اس کا نام؟''

منصب دار نے جواب دیا۔ ''ملک شرف الدین کبرا۔''

بادشاہ نے ایک دوسرے منصب دار کو طلب کیا۔ اس نے بھی وہی جواب دیا۔ بادشاہ نے اس کو اسی وقت معزول کر دیا اور حکم دیا کہ اسے دیپال پور سے دور کسی جگہ قید کر دیا جائے۔

شاہی حکم کی دیر تھی کہ سپاہیوں نے ملک شرف الدین کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کہا۔ ''ملک شرف الدین! آپ کو بادشاہ نے معزول کیا اور دیپال پور سے باہر قید کرنے کا حکم دیا ہے......''

ملک شرف الدین نے پریشانی سے پوچھا۔ ''مگر میری خطا؟ میرا گناہ؟''

سپاہیوں نے جواب دیا۔ ''شاہی منصب داروں نے آپ کی بابت بادشاہ کو یہ بتایا ہے کہ آپ صحیح آدمی نہیں ہیں۔''

ملک شرف الدین نے اپنے آس پاس دیکھا، اس کے اپنے آدمی حیرت زدہ اور پریشان سے کھڑے اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ملک شرف الدین اپنے آدمیوں کی نظر میں خوار ہو رہا تھا، اس نے ایک آدمی کو آواز دی۔ ''فخر الدین!''

یہ آدمی آگے بڑھا، بولا۔ ''جی میرے آقا۔''

ملک شرف الدین نے پوچھا۔ ''آج کل کس چیز کی فصل ہے؟''

فخر الدین نے جواب دیا۔ ''خربوزوں کی۔''

ملک شرف الدین نے نرمی سے کہا۔ ''اب چونکہ میں خود معزول ہو چکا ہوں اس لیے تجھ کو کوئی حکم تو دے نہیں سکتا۔ ہاں، میری تجھ سے ایک درخواست ہے۔ تو بہت سارے خربوزے لے کر پیر و مرشد بدرالدین اسحاق کی خدمت میں چلا جا اور انہیں میرا پورا واقعہ بتا کے دعا کی درخواست کر......اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

فخر الدین نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے، میں آج ہی ان کی خدمت میں خربوزے لے کر چلا جاؤں گا۔''

دیپال پور سے مولانا بدرالدین اسحاق کا مسکن زیادہ دور نہیں تھا۔ فخر الدین نے بہت سارے خربوزے لیے اور آپ کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

جب فخر الدین آپ کی خدمت میں پہنچا تو وہاں آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ فخر الدین نے ملک شرف الدین کا سارا حال سنایا اور آپ کی خدمت میں خربوزے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''پیر و مرشد! مجھ سے تو اپنے آقا کی بے بسی دیکھی نہ گئی اور میں خربوزے لے کر فوراً ہی یہاں چلا آیا۔''

مولانا بدرالدین اسحاق کو بہت غصہ آیا، جوش میں فرمایا۔ ''بادشاہ نے کسی تحقیق اور تفتیش کے بغیر اتنا بڑا حکم دے دیا؟ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟''

حاضرینِ مجلس میں قاضی صدرالدین حاکم اجودھن بھی تشریف فرما تھے۔ وہ بادشاہ کے خوف سے آپ کی باتوں کی تائید نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کی باتیں سن کر چپ رہے۔

آپ نے پھر فرمایا۔ ''ملک شرف الدین کے ساتھ بڑی زیادتی ہو گئی ہے۔''

قاضی صدرالدین پھر خاموش رہے۔

آپ نے غصے میں فرمایا۔ ''قاضی! میں کیا کہہ رہا ہوں؟ تو میری تائید کر یا تردید، تو خاموش کیوں ہے؟''

قاضی نے جواب دیا۔ ''حضرت! آج پوری دنیا میں ظلم اور ناانصافی کا دور دورہ ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں پوری دنیا کی بات نہیں کر رہا۔ اپنے بادشاہ اور ملک شرف الدین کی بات کر رہا ہوں۔''

قاضی نے جواب دیا۔ ''اپنا بادشاہ تو بہت منصف مزاج اور نیک دل ہے، پھر معلوم نہیں کس طرح ملک اشرف الدین کے خلاف

معزولی اور قید کا حکم جاری کر دیا۔"

مولانا نے ذرا سی دیر کے لیے سکوت اختیار کیا، ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں اور افسوس ناک لہجے میں کہا۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی، ابھی ابھی میں نے ملک شرف الدین کو اس حال میں دیکھا کہ کئی سپاہیوں نے اس کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور وہ اس کو دیپال پور کے باہر کہیں لے جا رہے ہیں۔"

ملک شرف الدین کا خادم فخر الدین روہانسا ہو گیا، بولا۔ "میں نے اسی حال میں چھوڑا تھا اپنے آقا کو۔"

مولانا بدر الدین اسحاق نے خربوزوں کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "صدر الدین! ان خربوزوں کو حاضرینِ مجلس میں تقسیم کر دو۔"

صدر الدین نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور خربوزوں کو حاضرین میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔

جب یہ تقسیم کرتے کرتے مولانا کے پاس پہنچے اور مولانا کے حصے کے خربوزے ان کے سامنے رکھ دیے تو آپ نے فرمایا۔

"صدر الدین! شرف الدین کا حصہ بھی یہیں میرے حصے کے پاس رکھ دو۔"

صدر الدین نے ملک شرف الدین کا حصہ بھی ان کے پاس رکھ دیا۔ آپ نے ان خربوزوں کے پاس اپنے سر کی پگڑی بھی اتار کر رکھ دی اور فرمایا۔ "میں ملک شرف الدین کا انتظار کروں گا۔ آپ اپنے حصوں کے خربوزے یہاں کھائیں یا گھر لے جائیں لیکن میں ملک شرف الدین کے ساتھ کھاؤں گا اور اسی وقت اپنی پگڑی بھی اپنے سر پر رکھوں گا۔"

صدر الدین نے پوچھا۔ "حضرت! آپ اپنی دستار کو کب تک اپنے سر پر نہیں رکھیں گے، ملک شرف الدین کا کیا بھروسا۔ نماز کے اوقات میں آپ کیا کریں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ایک معاملہ ہو گیا ہے، میں نے اپنے رب سے کہہ دیا ہے کہ تو میری دستار کا بھرم رکھ لے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میرے رب کو میرا کتنا خیال ہے۔"

حاضرینِ مجلس حیران تھے کہ مولانا کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ ملک شرف الدین کی اتنی جلدی رہائی ممکن ہی نہیں۔ آپ نے ملک شرف الدین کے ذکر کو ترک کیا اور اللہ کے نیک بندوں کی باتیں شروع کر دیں۔

ملک شرف الدین کا خادم پریشان تھا کہ مولانا نے اس کے آقا کو بھلا دیا اور دوسری باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اس نے ذرا جرأت سے کام لیا، کہا۔ "حضرت! میرے آقا کا کیا ہو گا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں کیا جانوں کیا ہو گا۔ غیب کا علم خدا کو ہے، اس سے پوچھ کہ تیرے آقا کا کیا ہو گا۔"

پھر آپ نے صبر کے فضائل بیان کیے۔ "لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ صبر کیا ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "صبر نام ہے اللہ کی دی ہوئی مصیبتوں کو سکون کے ساتھ برداشت کرنا اور کوئی گلہ نہ کرنا۔"

آپ نے فرمایا۔ "نہیں، صرف اتنے ہی معنی کافی نہیں ہیں۔ یاد رکھو دین کے جتنے مقامات ہیں، ان کی تنظیم تین امور سے ہوتی ہے۔ معارف، احوال اور اعمال۔ معارف (علوم) درخت ہیں۔ احوال اس کی شاخیں اور اعمال اس کا پھل ہیں۔ صبر کی تنظیم بھی انہی تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ صبر سے پہلے بہت سی چیزوں کا علم و یقین بہت ضروری ہے۔ اس علم سے استقلال اور مضبوط حالت پیدا ہوتی ہے۔ اس حالت کا پھل صبر ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھو کہ ایک شخص پر ظلم کیا گیا۔ مظلوم میں اتنی قوت ہے کہ وہ بدلہ لے لے، اگر اور کسی طرح نہیں تو وہ بددعا تو کر سکتا ہے مگر اس نے اپنے معاملے کو خدا پر چھوڑ کر صبر اختیار کیا۔ ایک شخص سے سب کچھ چھن گیا اور وہ بالکل تہی دست اور مفلوک الحال ہو گیا۔ اس افلاس اور تہی دستی نے اس کے دل کو مضطرب اور بے چین کر دیا مگر زبان پر لفظ صبر اور شکر کا ورد جاری ہو گیا، کیا یہ صبر ہے؟ نہیں یہ نہ تو صبر ہے اور نہ شکر۔"

کسی نے پوچھا۔ "کیا صبر و شکر کا اطلاق جانوروں پر بھی ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں! فرشتوں اور جانوروں کو صبر کی تکلیف سے معاف رکھا گیا ہے لیکن انسان میں چونکہ ملکیت اور بہیمیت کو یکجا کر دیا گیا ہے اس لیے اسے بعض کاموں کا حکم دیا گیا ہے۔" پھر آپ نے اس کی یوں وضاحت فرمائی۔ "امام غزالی نے اپنی کتاب احیاالعلوم میں صبر کی یوں وضاحت فرمائی ہے۔ اگر پیٹ اور شرم گاہ کو حرام اور مکروہ سے بچانے میں صبر ہو تو اس کا نام عفت ہے اور صحت، قوت اور فارغ البالی کی حالت میں صبر کا نام ضبطِ نفس ہے۔ اگر صبر جنگ اور مقابلہ کی حالت میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے۔ اگر غیظ و غضب کی حالت میں صبر ہو یعنی غصہ پی لیا جائے تو اس کا نام حلم ہے۔ اگر آفاتِ ارضی و سماوی کی حالت میں صبر کیا جائے تو اس کا نام سعۃ الصدر (کشادہ دلی) ہے۔ اگر کسی کے راز کو مخفی رکھنے میں صبر ہو تو اس کا راز کتمان السّر (اخفائے راز) ہے۔ اگر مباحات اور غیر ضروری سامانِ عیش و عافیت سے صبر ہو تو اس کا نام زہد ہے۔ اگر کم سامانِ زندگی پر صبر ہو تو اس کا نام قناعت ہے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ سے ایمان کے

بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہوالصبر (ایمان صبر ہے)"
مجلس میں واہ واہ، سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

آپ نے فرمایا۔"رسول اللہ ﷺ کے مقام اور مرتبے سے کون واقف نہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حلم اور انکسار کا یہ حال تھا کہ ایک بار ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس لایا گیا۔ وہ آپؐ کے رعب سے لرزہ براندام ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس سے فرمایا۔"اے شخص! تو سکون سے بیٹھ جا۔ تو مجھ سے خوفزدہ کیوں ہے؟ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قبیلۂ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں۔ اس عورت کا بیٹا جو دھوپ میں سوکھا ہوا نمکین گوشت کھایا کرتی تھی۔"

حاضرینِ مجلس کی آنکھیں نم ہوگئیں اور بعض تو ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ مولانا بدرالدین اسحاق کی آواز بھی بھرا چکی تھی آپ نے اپنی تقریر جاری رکھی، فرمایا۔"ایک دوسرا واقعہ حضرت عمرؓ کا ہے۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ کو ایک دن اس حال میں دیکھا کہ مشک آپ کی گردن میں پھنسی ہوئی تھی اور آپ لوگوں کو پانی دیتے پھر رہے تھے۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا۔"امیرالمومنین! یہ کیا ہے؟" آپؓ نے جواب دیا۔"میرے نفس میں خود پسندی آگئی تھی اس لیے میں نے سوچا اسے ذلیل کیوں نہ کیا جائے۔"

فخرالدین آپ کی وعظ وتقریر میں گم ہوگیا۔ اس نے اپنے آقا ملک شرف الدین کو بھی بھلا دیا، آپ تقریباً ایک گھنٹے اسی طرح بولتے رہے کہ اچانک ایک طرف سے السلام علیکم یا حاضرین مجلس، کی صدا بلند ہوئی۔ لوگوں نے مڑ کر دیکھا تو مجلس میں ملک شرف الدین داخل ہو رہے تھے۔ شرف الدین کا خادم فخرالدین دوڑ کر اپنے آقا سے لپٹ گیا۔

مولانا بدرالدین اسحاق بھی ملک شرف الدین کو اپنی مجلس میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، فرمایا۔"شرف الدین! ادھر میرے پاس آؤ۔ میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

ملک شرف الدین آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

آپ نے پوچھا۔"وہ تیرے مقدمے اور قید کا کیا ہوا؟"

ملک شرف الدین نے جواب دیا۔"حضرت! مجھے زیادہ واقعات کا تو علم نہیں مگر لوگوں نے مجھے بتلایا کہ جب میں دیپال پور سے باہر کسی قید خانے کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو بادشاہ کو خلوت میں اس کے بعض بااثر مصاحبین نے یہ سمجھایا کہ شرف الدین کے حاسدوں نے جھوٹ بول کر اسے معزول کرایا ہے ورنہ شرف الدین بہت اچھا آدمی ہے۔ بادشاہ کے دل پر مصاحبین کی باتوں کا اثر ہوا اور اس نے ایک دوسرا فرمان جاری کر دیا... ملک شرف الدین کو اس کے عہدے پر بحال کیا جاتا ہے اور اس کی سزا معاف کی جاتی ہے۔"

کسی مصاحب نے ادب سے عرض کیا۔"حضورِ والا! جب ملک شرف الدین نے کوئی خطا کی ہی نہیں تو سزا کی معافی کیسی؟"

بادشاہ نے معافی کی جگہ لفظ موقوف لکھوا دیا۔

ملک شرف الدین نے کہا۔"بادشاہ کے گھڑسوار اس فرمان کے ساتھ میرے پاس پہنچے اور مجھے آزاد کرا دیا۔ میں آزاد ہوتے ہی اپنے گھر جانے کے بجائے سیدھا آپ کی خدمت میں چلا آیا۔"

آپ نے حاضرین سے فرمایا۔"کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں خربوزے ملک شرف الدین کے ساتھ کھاؤں گا اور اسی وقت اپنی اتری ہوئی دستار اپنے سر پر رکھوں گا۔"

آپ نے دستار دوبارہ اپنے سر پر رکھ لی اور ملک شرف الدین کے ساتھ خربوزے کھانے لگے۔

☆☆☆

اجودھن میں بابا فرید کی خانقاہ کے مطبخ کا بڑا خرچہ تھا۔ اس کو ایک باضابطہ نظام کے ماتحت چلایا جاتا تھا۔ اس میں لکڑی کا بڑا صرفہ تھا۔ مریدین ... باری باری اجودھن کے آس پاس کے جنگلات جاتے اور لکڑیاں لایا کرتے تھے۔ مولانا بدرالدین اسحاق بھی اپنی باری پر یہ خدمت انجام دیتے تھے چنانچہ ایک دن جو آپ کی باری آئی تو بابا فرید کے دو صاحبزادے بھی آپ کے ساتھ چلنے پر مصر ہوئے۔ آپ نے انہیں ساتھ چلنے سے منع فرمایا۔"اگر آپ دونوں ہمارے ساتھ چلیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی لیکن میں جنگل میں آپ دونوں کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

صاحبزادوں نے پوچھا۔"مگر کیوں؟ ہمارے ساتھ چلنے میں آپ کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟"

آپ نے فرمایا۔"جنگلوں میں درندے ہوتے ہیں اس لیے میں آپ دونوں کو اپنے ساتھ لے جا کر کوئی خطرہ نہیں مول لینا چاہتا۔"
لیکن دونوں صاحبزادگان کا ساتھ چلنے کا اصرار اپنی جگہ برقرار رہا، آپ مجبور ہوگئے اور دونوں کو اپنے ساتھ لے لیا۔

راستے میں ایک صاحبزادے نے مولانا سے کہا۔"حضرت! آپ تو بابا کے مرید اور خلیفہ ہیں، ایک دوسرے بزرگ سیدی احمد کے مریدوں میں یہ کرامت دیکھنے میں آئی کہ وہ شیر پر سوار ہو کر سانپ کو کوڑے کے طور پر استعمال کرتے تھے، کیا آپ میں ایسا کمال نہیں ہے؟"

مولانا بدرالدین اسحاق نے فرمایا۔ ''صاحبزادگان! آپ کو اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔''
ایک نے پوچھا۔ ''کیوں؟ ہمیں اس طرح کیوں نہیں سوچنا چاہیے؟''
مولانا نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ کرامت اور خوارق عادات واقعات قابلِ توجہ نہیں بلکہ اولیاء اللہ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہوتی ہے کہ اتباعِ سنت اور شریعت میں کتنا کامیاب رہا۔''
آپ کی یہ بات دونوں صاحبزادگان کی سمجھ میں نہیں آئی، ایک نے کہا۔ ''وہ کس طرح؟''
آپ نے فرمایا۔ ''آپ دونوں نے حضرت جنید بغدادی کا نام تو سنا ہی ہوگا؟''
دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ''ہاں، خوب سنا ہے، وہ سرخیل کاروانِ تصوف تھے۔''
مولانا نے جواب دیا۔ ''انہی حضرت جنید بغدادی کی خانقاہ میں ایک شخص اس غرض سے آکر مقیم ہوا کہ وہ آپ کی کوئی کرامت دیکھے۔ حضرت جنید بغدادی کے مرید اس شخص کی غرض وغایتِ آمد سے لاعلم تھے۔ یہ شخص اپنا پورا خرچ آپ کرتا تھا۔ خانقاہ سے کچھ بھی نہ لیتا تھا۔ مریدوں نے پوچھا...... کیا تم یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہو؟''
اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں تعلیم حاصل کر چکا ہوں۔''
مریدوں نے پوچھا۔ ''تب پھر کیا تم علم تصوف حاصل کرنا چاہتے ہو؟''
اس نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ شوق بھی نہیں۔''
کئی ماہ کے قیام کے بعد جب وہ شخص جانے لگا تو حضرت جنید بغدادی کو اس بات کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے اس شخص کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا۔ ''عزیز من! تم اس خانقاہ میں کئی ماہ مقیم رہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم نے خانقاہ کا کوئی احسان بھی نہیں لیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تم حصولِ تعلیم بھی نہیں چاہتے تھے اور اب اپنی آمد کا مقصد بتائے بغیر واپس جارہے ہو۔ کیا جانے سے پہلے تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم یہاں کیوں آئے تھے اور اب واپس کیوں جارہے ہو؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں نے آپ کی بابت یہ سنا تھا کہ آپ بہت بزرگ آدمی ہیں۔ میں آپ کے پاس کئی ماہ اس لیے رہا کہ آپ سے کوئی کرامت صادر ہو اور میں دیکھوں مگر افسوس کہ میں مایوس واپس جارہا ہوں۔''
جنید بغدادی نے پوچھا۔ ''اب میں تجھ سے کچھ پوچھوں گا، کیا تو سچ بولے گا؟''
اس نے جواب دیا۔ ''میں سچا اور صاف گو انسان ہوں، آپ پوچھیں انشاء اللہ میں سچ بولوں گا۔''
جنید بغدادی نے پوچھا۔ ''تم کئی ماہ میرے قریب رہے۔ تم نے مجھے کوئی ایسا کام کرتے دیکھا جو سنت کے خلاف ہو؟''
اس نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کو کوئی ایسا کام کرتے نہیں دیکھا جو سنت اور شریعت کے خلاف ہو۔''
جنید بغدادی نے فرمایا۔ ''بھائی! تم اس سے بڑی اور کیا کرامت دیکھتے۔''
اس شخص نے پوچھا۔ ''سنت اور شریعت کا تعلق تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہے، پھر آپ کا سب سے بڑا معجزہ کیا ہوا؟''
جنید بغدادی نے جواب دیا۔ ''قول وفعل میں مطابقت۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم زندگی بھر اس معجزانہ عمل پر کاربند رہے۔''
اس شخص نے آپ کا فرطِ عقیدت سے ہاتھ چوم لیا، کہا۔ ''بیشک آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل درست ہے۔''
یہ واقعہ سنانے کے بعد مولانا بدرالدین اسحاق نے دونوں صاحبزادگان سے پوچھا۔ ''اب آپ دونوں مجھے یہ بتائیں کہ بابا فرید کی پوری زندگی سنت کے اتباع میں گزر رہی ہے یا نہیں؟''
دونوں نے جواب دیا۔ ''بیشک، بابا پوری طرح متبعِ سنت و شریعت ہیں۔''
مولانا بدرالدین اسحاق نے فارسی کا شعر پڑھا۔

بیرونِ قبر لافِ کرامت چہ میزنی!
ایماں اگر بہ گور بری صد کرامت است

(قبر سے باہر کرامت کی ڈینگ کیا مارتا ہے؟ اگر تو قبر میں اپنے ساتھ ایمان لے جائے تو یہ سب سے بڑی کرامت ہے)
دونوں صاحبزادگان آپ کے اس جواب سے لاجواب ہوگئے۔
مولانا بدرالدین اسحاق نے مزید فرمایا۔ ''مخدوم زادوں کو اپنے والد محترم اور ان کے مریدوں کی عظمت اور بزرگی کا اندازہ نہیں ہے ابھی، ورنہ اپنی زبان سے ایسی باتیں نہ نکالتے۔''
اسی طرح باتیں کرتے ہوئے یہ تینوں جنگل میں داخل ہوگئے۔ مولانا بدرالدین اسحاق نے لکڑیاں توڑنا اور جمع کرنا شروع کردیں۔

ابھی انہیں جنگل میں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف سے خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ دونوں مخدوم زادے .... چوکنا ہو کر آہٹ کی طرف دیکھنے لگے، لیکن مولانا اپنے کام میں مشغول رہے۔ دونوں صاحبزادوں نے جھاڑیوں کے اندر سے ایک شیر کو نمودار ہوتے دیکھا۔ دونوں کی دہشت سے حالت ہی غیر ہوگئی۔ انہیں بچاؤ کا اور کوئی طریقہ تو سمجھ میں آیا نہیں، دونوں تیزی سے درخت پر چڑھ گئے اور اوپر سے چیخ کر مولانا کو مطلع کیا۔ ''قبلہ استادِ محترم! مولانا! شیر...... بھاگیے۔''

آپ نے اپنا کام چھوڑ کر شیر کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑا آپ کو گھور رہا تھا۔ آپ نے دونوں مخدوم زادوں کو آواز دی۔

''آپ دونوں نیچے آجائیے، یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

لیکن ان دونوں کا ڈر سے بہت برا حال ہو چکا تھا، جواب دیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم تو آپ کی طرف سے خوفزدہ اور فکر مند ہو رہے ہیں۔''

مولانا شیر کے قریب چلے اور اپنی آستین اس کے منہ پر مار کے بولے۔ ''یہ تجھے اس وقت کیا سوجھی جو میرے مخدوم زادوں کو خوفزدہ کر دیا۔ تو یہاں سے چپ چاپ چلا جا۔''

شیر کتے کی طرح دم ہلانے لگا۔ دونوں صاحبزادگان حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آپ نے ان دونوں کو ایک بار پھر نیچے آنے کی ہدایت کی لیکن وہ نیچے نہیں آئے اور یہی کہتے رہے۔ ''جب تک یہ شیر موجود ہے ہم نیچے نہیں اتریں گے۔''

آپ نے شیر کو غصے میں مخاطب کیا۔ ''او کتے! کیا تو نے نہیں سنا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جب تک تو یہاں موجود ہے دونوں مخدوم زادے نیچے نہیں اتریں گے اس لیے میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو یہاں سے دفعان ہو جا۔''

شیر پالتو کتے کی طرح کھڑا بدستور اپنی دم ہلا رہا تھا۔ جب آپ نے اس کو دفعان ہو جانے کا حکم دیا تو وہ جدھر سے آیا تھا، اسی طرف چلا گیا۔ اب آپ نے صاحبزادگان سے کہا۔ ''شیر چلا گیا، اب تو آپ دونوں نیچے آجائیں۔''

ان دونوں کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ بہ مشکل نیچے اترے اور آپ سے درخواست کی کہ اب جنگل میں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں، گھر واپس چلیے، ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔

مولانا نے فرمایا۔ ''بظاہر تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن آپ کی اگر یہی مرضی ہے تو ہم گھر واپس چلے چلیں گے۔''

دونوں مخدوم زادے درخت سے اترے اور آپ ان دونوں کو لے کر گھر واپس ہوئے۔ آپ کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا بھی رکھا ہوا تھا۔ دونوں مخدوم زادے اپنی بزدلی پر پشیمان تھے اور مولانا کی کرامت کے معترف ہو چکے تھے۔ راستے میں کہا۔ ''مولانا! ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اتنی بڑی کرامت کا ظہور آپ کی ذات سے بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال ہم آئندہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں کریں گے۔''

☆☆☆

مولانا بدر الدین اسحاق کی صحبت میں جو لوگ بیٹھا کرتے تھے ان میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ جب بھی اجودھن جاتے مولانا کے پاس زیادہ رہتے۔

ایک دن مولانا کی صحبت میں کافی عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ آپ اپنے حجرے میں بیٹھے کچھ لکھنے میں مشغول تھے۔ نمازِ مغرب کا وقت قریب آتا جا رہا تھا اور مولانا کے لکھنے پڑھنے کا انداز یہ بتاتا تھا کہ وہ جب تک اپنا خط پورا نہ لکھ لیں گے، نمازِ مغرب کے لیے نہیں اٹھیں گے۔ آپ کے ایک مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت پیر و مرشد! مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''

آپ نے ایک دوسرے مرید سے فرمایا۔ ''تو چھت پر چلا جا اور دیکھ کر بتا کہ آفتاب کیا کہتا ہے؟''

وہ مرید چھت پر چلا گیا اور واپس آکر بتایا۔ ''آفتاب غروب ہونے ہی والا ہے۔''

آپ نے بات سنی ان سنی کر دی اور خط لکھنے میں مشغول رہے۔

کچھ دیر بعد ایک دوسرا مرید اٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔ ''پیر و مرشد! نماز کا وقت تنگ ہے، یہ خط تو آپ بعد میں بھی لکھ سکتے ہیں مگر مغرب کی نماز قضا ہو گئی تو؟''

آپ نے خط لکھتے لکھتے ایک مرید کو حکم دیا۔ ''فرید! جا چھت پر چلا جا اور دیکھ کہ سورج کے غروب ہونے میں ابھی کتنی دیر ہے۔''

فرید نامی مرید چھت پر گیا اور واپس آکر جواب دیا۔ ''حضرت! آفتاب تو قریب الغروب ہے، اب وقت نہیں رہا۔''

آپ بدستور خط لکھتے رہے فرمایا۔ ''میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ میں پورا خط لکھ کر ہی یہاں سے اٹھوں گا۔ اس سے پہلے اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

شیخ نظام الدین اولیاء بھی بہت بے چین ہو رہے تھے، انہوں نے مولانا سے فرمایا۔ ''مولانا! اب وقت نہیں رہا، چلیے مغرب کی نماز

ادا کیجیے، اس کے بعد کوئی اور کام کیجیے۔''

مولانا نے اسی طمانیت سے جواب دیا۔ ''اچھا چھت پر جا کے آفتاب کی حالت تو دیکھ لو، وہ کیا کہتا ہے۔''

نظام الدین اولیا چھت پر گئے اور واپس آ کر جواب دیا۔ ''مولانا اب وقت نہیں رہا، چلیے فوراً مغرب کی نماز ادا کیجیے، اس کے بعد کوئی اور کام کیجیے۔''

مولانا نے جواب دیا۔ ''اگر سورج کو غروب ہونے کی اتنی ہی جلدی ہے تو وہ غروب ہو جائے لیکن میں نے اپنی بابت جو فیصلہ کیا ہے اس پر کاربند رہوں گا۔ میں جب تک اپنا خط پورا نہیں کرلوں گا نہیں اٹھوں گا۔''

حاضرین مجلس کا حال بہت برا ہو رہا تھا۔ آپ حسب معمول اپنے خط میں مشغول رہے۔ کچھ دیر بعد جب آپ اپنے کام سے فارغ ہوئے تو ایک مرید کو حکم دیا۔ ''جا چھت پر چلا جا اور آفتاب کی طرف دیکھ کر بتا کہ اب اس کے غروب ہونے میں کتنی دیر ہے؟''

حاضرین کے منہ لٹکے ہوئے تھے، ایک نے مایوسی سے جواب دیا۔ ''پیرومرشد! اپنا تو خیال یہ ہے کہ نماز گئی، آفتاب غروب ہو چکا ہوگا۔ آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ کتنا اندھیرا پھیل چکا ہے۔''

آپ نے حکم دیا۔ ''میں کیا کہہ رہا ہوں، جا چھت پر جا اور دیکھ کر بتا کہ ابھی آفتاب کے غروب ہونے میں اور کتنی دیر ہے؟''

مرید بے دلی سے چھت پر چلا گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آفتاب ابھی موجود تھا۔ وہ نیچے آیا اور اعلان کیا۔ ''پیرومرشد! آفتاب ابھی موجود ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نہ کہتا تھا کہ جب تک میں اپنا صفحہ پورا نہ کرلوں گا، آفتاب غروب نہیں ہوگا۔''

آپ نے امامت فرمائی اور بقیہ نے اقتدا کی اور سب نے نمازِ مغرب ادا کی۔

☆☆☆

آپ کاموں میں بہت زیادہ مشغول تھے۔ اسی مشغولیت کے عالم میں بابا فرید نے آپ کو آواز دی۔ ''مولانا بدرالدین!''

مولانا اپنے شیخ کی آواز سن نہیں سکے اور بدستور اپنے کام میں مشغول رہے۔ بابا فرید نے دوبارہ آواز دی۔ ''مولانا بدرالدین! ذرا میرے پاس تو آنا۔''

لیکن مولانا پھر نہ سن سکے۔ بابا فرید نے تیسری بار آواز دی۔ ''مولانا بدرالدین! یہ کیسی مصروفیت ہے کہ تم نے اپنے دل سے میرا خیال ہی نکال دیا۔''

اس بار مولانا نے آپ کی آواز سن لی۔ سارے کام چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچ گئے اور خوشامدانہ عرض کیا۔ ''پیرومرشد! میں شرمندہ ہوں کہ آپ کی آواز نہیں سن سکا۔''

بابا فرید بہت دل برداشتہ تھے، فرمایا۔ ''تمہیں ایسا نہیں کرنا تھا۔''

مولانا نے درخواست کی۔ ''غلام معافی کا خواستگار ہے۔''

بابا فرید نے انہیں کوئی کام نہیں بتایا اور منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔ مولانا ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے رہے۔ بابا فرید نے کچھ دیر بعد فرمایا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔''

لیکن یہ نہیں گئے۔ کچھ دیر بعد بابا نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پھر فرمایا۔ ''کیا تم نے سنا نہیں، اب تم جا سکتے ہو۔''

مولانا، بابا فرید کے سامنے سے ہٹ گئے اور ملول اور افسردہ ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔ آپ کئی دن تک اسی حال میں رہے۔

اسی دوران دہلی سے خواجہ نظام الدین اجودھن پہنچے اور مولانا کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے فرمایا۔ ''مولانا! یہ عجیب بات ہے کہ جب میں کسی مشکل میں پھنس جاتا ہوں تو پہلے میں بابا فرید کو، اس کے بعد آپ کو وسیلہ بنا کر خدا سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ آپ میرے حق میں دعا فرماتے۔''

مولانا روہانسے ہو گئے، جواب دیا۔ ''بابا نظام! ان دنوں میں خود بڑی مشکل میں ہوں، مجھے پتا نہیں کہ بابا فرید نے میری نعمت سلب کرلی یا میں اب بھی اسی مقام فیض پر فائز ہوں۔''

اس کے بعد آپ نے بابا فرید کے پکارنے اور اپنے کام میں مشغول ہونے کا پورا واقعہ سنا دیا، فرمایا۔ ''بابا نظام! یہ ایسا دکھ ملا ہے جو جیتے جی کانٹے کی طرح دل میں چبھا رہے گا۔''

بابا خواجہ نظام الدین نے فرمایا۔ ''واہ مولانا محترم! وہ کتنی بڑی نعمت آپ کے پاس تھی جو سلب ہونے کے بعد بھی آپ میں اتنی موجود ہے۔''

بابا فرید کی مجلس میں ہم عصر بزرگانِ دین کے تذکرے ہو رہے تھے۔ خواجہ نظام الدین نے دورانِ ذکر ایک ایسے بزرگ کا قصہ سنایا جو اس وقت حیات نہیں تھے، ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ بابا فرید کے پاس مولانا بدر الدین اسحاق بھی تشریف فرما تھے۔

بابا فرید نے پوچھا۔ ''جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی حالت کیا تھی؟''

حضرت محبوب الٰہی نے جواب دیا۔ ''پیرومرشد! کچھ نہ پوچھیے، ان کی وفات سے عبرت ہوئی۔''

بابا فرید نے پوچھا۔ ''وفات کے وقت ان کے نماز ادا کرنے کی کیا کیفیت تھی؟''

محبوب الٰہی نے جواب دیا۔ ''وفات سے پہلے ان کی تین دن کی نمازیں قضا ہو گئی تھیں۔''

بابا فرید خاموش ہو گئے لیکن مولانا بدر الدین اسحاق نے فرمایا۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا۔''

محبوب الٰہی کا خیال تھا کہ بابا فرید اس خبر پر کوئی تبصرہ کریں گے لیکن وہ خاموش رہے۔

اسی دوران بابا فرید بیمار پڑ گئے۔ ان کے پہلو اور جوڑوں میں شدید درد اٹھنے لگا تھا۔ مولانا بدر الدین ہر وقت آپ کے پاس موجود رہتے۔ پھر جب آپ پر غشی طاری ہونے لگی تو مریدوں اور ارادت مندوں میں کہرام مچ گیا۔ اسی تکلیف کے عالم میں بابا فرید نے نمازِ عشا ادا کی اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو حاضرین سے پوچھا۔ ''کیا میں نے عشا کی نماز پڑھ لی؟''

مولانا بدر الدین نے جواب دیا۔ ''جی پیرومرشد! آپ نے ابھی بے ہوش ہونے سے پہلے ہی نمازِ عشا ادا فرمائی ہے۔''

بابا فرید نے فرمایا۔ ''لیکن میں ایک بار پھر نمازِ عشا ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

اور آپ نے ایک بار پھر نمازِ عشا ادا فرمائی اور پھر بے ہوش ہو گئے۔

ہوش میں آنے کے بعد آپ نے حاضرینِ محبت سے پوچھا۔ ''کیا میں نے نمازِ عشا پڑھ لی؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''ایک بار نہیں، آپ نے دو بار عشا کی نماز ادا فرمائی ہے۔''

بابا فرید نے فرمایا۔ ''لیکن میں ایک بار پھر نمازِ عشا ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

اور آپ تیسری بار نمازِ عشا ادا فرمانے لگے۔ اسی عالم میں آپ کا وصال ہو گیا۔

بابا فرید کی جگہ ان کے صاحبزادے شیخ بدر الدین سلیمان نے سنبھالی اور مولانا بدر الدین اسحاق ان کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اب بابا فرید جیسی بات نہیں رہی تھی۔ شیخ بدر الدین سلیمان کے آس پاس جو لوگ رہنے لگے تھے، انہیں مولانا سے حسد تھا۔ وہ مخدوم زادے کو ہر وقت ورغلاتے رہتے تھے۔

ایک خوشامدی مرید نے شیخ سلیمان کو مشورہ دیا۔ ''پیرومرشد! بابا فرید تو اب ہم میں موجود نہیں، جن لوگوں نے ان کی خدمت کی ہے، اب انہیں آرام کرنا چاہیے کیونکہ وہ زمانہ کچھ اور تھا اور یہ زمانہ کچھ اور ہے۔''

مخدوم زادے شیخ سلیمان نے پوچھا۔ ''تمہارا یہ اشارہ کس طرف ہے؟''

مرید نے مولانا کی طرف اشارہ کیا۔ ''مثلاً یہ مولانا۔ ان کی عمر اور آپ کی عمر میں خاصا فرق ہے۔ یہ جب ہاتھ باندھ کر آپ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔''

شیخ سلیمان نے اس وقت تو سکوت اختیار کیا لیکن مرید کی بات دل میں بیٹھ گئی۔

اسی طرح ایک دوسرے مرید نے شیخ سلیمان سے کہا۔ ''پیرومرشد! مولانا سے فرما دیجیے کہ اب آرام فرمائیں، آپ کے مرید آپ کی خدمت کو کیا کم ہیں؟''

مخدوم زادے شیخ سلیمان نے جواب دیا۔ ''میں کسی مناسب موقع پر مولانا کو منع کر دوں گا۔''

چنانچہ ایک دن شیخ سلیمان نے مولانا بدر الدین اسحاق سے کہا۔ ''مولانا! میرا خیال ہے اب آپ پوری طرح رجوع الی اللہ ہو جائیں۔''

مولانا کا دل دھک سے رہ گیا، پوچھا۔ ''کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی صحبت سے چلا جاؤں؟''

شیخ سلیمان نے جواب دیا۔ ''ہاں، لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اس مجلس سے دور ہوں لیکن میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کو آرام اور اپنے کاموں کا وقت نہیں ملتا۔''

مولانا بدر الدین اسحاق وہاں سے چلے آئے اور بابا فرید کے ایک نامی گرامی ذی علم مرید سید محمد کرمانی سے مشورتاً پوچھا۔ ''ان حالات میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟''

سید محمد کرمانی نے جواب دیا۔ ''بابا! جس مجلس میں انسان کی قدر نہ ہو اس سے تنہائی بہتر ہے۔''

مولانا نے سید کرمانی کا مشورہ قبول کرلیا اور اجودھن کی قدیم جامع مسجد چلے گئے۔
جب اس تلخی کی اطلاع حضرت محبوب الٰہی کو پہنچائی گئی تو آپ نے فرمایا۔'' حالانکہ میں نے مولانا کا اتنا احترام کیا ہے کہ میں ان کی زندگی میں کسی کو اپنا مرید نہیں بنا سکتا۔''
مولانا کو شاعری سے بھی شغف تھا۔ ان کی نظم تصریف بدری بہت مشہور ہے، اس کے بعض اشعار بہت پُراثر ہیں۔

انی بسطت یدی الیک یا الٰہی
و یسیل سیل الدمع من ماٰنی

(اے اللہ میں اپنے دونوں ہاتھ تیری طرف پھیلا رہا ہوں اور میرے گوشۂ چشم سے آنسو رواں ہیں)
پوری نظم عربی میں ہے، اس کے چند اشعار کا ترجمہ:
میرے دل کی مشغولیتوں کو دیکھ اور میری سختیوں کو دیکھ، اے وہ جو عالم کے عیب چھپانے والا ہے۔
جن مصیبتوں کی امید نہیں رکھتا تھا ان سے آزمایا گیا ہوں۔ خدایا مجھے ان مصیبتوں سے نجات دے کہ میرے پاس ان کا کوئی علاج نہیں۔
اس زمانے میں دین یا تو کم ہو چکا ہے یا بالکل ہی رخصت ہو گیا کیونکہ میں اخلاق کی جگہ نفاق دیکھتا ہوں۔
آج کل ظاہری اور پوشیدہ دشمنی کا دور دورہ ہے، اس سے اس زمانے کے دوست اور دشمن کا اندازہ کرو۔
عیش و آرام میں وہ ہے جو بے دینی اختیار کرے۔ یہ فسق اور مکاری کے دن ہیں۔
اس دور کے وہ حاکم جن کے ذمے عدل و انصاف ہے، لوگوں کا گوشت کھا رہے ہیں اور پرندوں کی طرح انسانوں کی تکا بوٹی کر رہے ہیں۔
مصیبتوں کے خوف اور جلانے والوں کے ڈر نے عقلمندوں کو کمیاب کر دیا ہے۔

☆☆☆

جب مولانا کا آخری وقت آیا تو آپ نے اللہ سے اور زیادہ لو لگائی۔ آپ کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی۔ مریدوں نے مشورہ دیا۔
''اگر آپ اجازت دیں تو طبیب کو بلوا لیا جائے۔''
مولانا نے فرمایا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔''
پوری رات بے چینی میں گزارنے کے بعد فجر کی نماز آپ نے باجماعت ادا کی اور اپنے معمول کے اوراد و وظائف پورے کیے پھر اشراق کا وقت آیا تو اشراق کی نماز پڑھی اور اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔
کچھ دیر بعد آپ نے پوچھا۔ ''کیا چاشت کا وقت ہو گیا ہے؟''
لوگوں نے جواب دیا۔ ''ہو گیا۔''
آپ چاشت کی نماز پڑھنے لگے۔ لوگوں نے آپ کو سجدے میں جاتے تو دیکھا لیکن سجدے سے سر اٹھاتے نہیں دیکھا۔ لوگوں کو تشویش ہوئی اور انہوں نے آگے بڑھ کر آپ کو آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا پھر انہیں سجدے کی حالت سے اٹھایا گیا تو پتا چلا کہ آپ واصل بحق ہو چکے ہیں۔ آپ کے مرید اور ارادت مند رونے لگے۔
مولانا کی وفات پر حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ ''میں نے مولانا کے احترام میں آج تک کسی کو بیعت نہیں کیا تھا لیکن اب بیعت کروں گا۔'' پھر آپ نے ان بزرگ کا قصہ دہرایا جن کے آخری ایام میں تین دن کی نمازیں قضا ہو گئی تھیں۔ حضرت محبوب الٰہی نے کہا۔
''جب میں نے یہ افسوس ناک واقعہ بابا فرید کے سامنے بیان کیا تھا تو بابا فرید خاموش رہے تھے مگر مولانا نے فرمایا تھا...... یہ اچھا نہیں ہوا۔ مولانا کے آخری لمحات جس طرح خدا کی حضوری میں گزرے، ان سے اندازہ ہوا کہ یہ بات مولانا ہی کہہ سکتے تھے۔''
آپ کو اجودھن (پاک پتن) کی جامع مسجد قدیم میں دفن کیا گیا کیونکہ آپ نے اسی مسجد میں اپنی زندگی کا بڑا وقت گزارا تھا۔ اللہ کے عشق اور خشیت میں سب سے زیادہ رونے والا اللہ کے گھر میں رہا اور اللہ سے راز و نیاز کی حالت میں اپنی جان دے دی۔ آپ کی وفات پر سید محمد کرمانی کے پوتے سید محمد مبارک علوی کرمانی نے اظہار کرتے ہوئے کہا۔
''مردانِ خدائے تعالیٰ مرتے دم تک عبادت الٰہی میں اس سے توفیقِ استقامت حاصل کرتے ہیں اور اپنے پیرووں کی راہنمائی میں اس بلند مقام کو پہنچتے ہیں کہ ان کا شہرہ قیامت تک باقی رہتا ہے۔''

ماخذات

اخبار الاخیار۔ عبدالحق محدث دہلوی۔ سیر الاولیا۔ امیر خورد۔ سیر العارفین۔ حامد بن فضل اللہ جمالی۔
فوائد الفواد۔ خواجہ حسن سنجری۔ گلزار ابرار۔ محمد صغرٰی شطاری

میری بیوی نے گاڑی رکوا کر ہی دم لیا، اس دن بھی وہ بندر روڈ پر نہاری کی شاپ کے سامنے فٹ پاتھ پر بہت سارے بچوں کے ساتھ بیٹھا نہاری روٹی کھا رہا تھا۔ سرخ وسفید رنگ کے بہت سارے افغانی بچے ایک لائن میں فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے اور باری آنے پر انہیں نہاری روٹی ملتی تھی۔ خدا ترس لوگ صدقہ، خیرات کرنے آتے اور صابری ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر پر پیسے دے کر چلے جاتے۔ ایک بندے کا کھانا، سو بندوں کا کھانا۔ کھانا ہر وقت تیار تھا اور کھانے والے بھی بے شمار بیٹھے ہوتے تھے۔ یہ نظام آہستہ آہستہ خود بخود بنتا چلا گیا تھا۔

شہر میں جہاں جہاں کھانے پینے کی جگہیں تھیں، وہاں وہاں اس قسم کا نظام چل نکلا تھا۔ غریب بھکاری، بے گھر، فاقہ زدہ، کھانے سے محروم بوڑھے، پھٹے کپڑوں میں ملبوس بھکارنیں، سفید اور کالے برقعوں میں ملفوف عزت دار گھرانوں کی عورتیں بھی یہاں سے کھانا جمع کر کے اپنے گھروں میں موجود پیٹ کے جہنم کے لیے اس ایندھن کو لے جاتی تھیں۔

معما

ڈاکٹر شیر شاہ سیّد

قدرت نے انسان کے اندر احساس کا نام دے کر ایک ایسا جذبہ چھپا دیا ہے جو اگر متحرک نہ ہو تو چلتے پھرتے وجود مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جائیں اور اگر متحرک ہو جائے تو مٹی میں بھی جان پڑ جائے... کچھ ایسا ہی حال ان میاں بیوی کا بھی تھا جو ایک انجانے وجود سے اپنی تمام تر امیدیں وابستہ کر بیٹھے تھے فقط ایک خوب صورت احساس کی وجہ سے۔

ممتا سے لبریز ایک عورت کا احساس محرومی

بڑی بڑی عمارتوں، اونچے اونچے ایوانوں اور ان میں رہنے والے عظیم سیاستدانوں، مذہبی راہنماؤں، سماج کے ٹھیکیداروں کو یہ چھوٹے لوگ کبھی نظر بھی نہیں آئے۔

میں نے گاڑی نہاری کی شاپ کے سامنے بنے ہوئے چھوٹے سے پارک نما قطعۂ زمین کے ساتھ روک لی اور ہم دونوں گاڑی سے اتر کر فیملی ہال میں جاکر بیٹھ گئے۔ ابھی شام پوری طرح سے نہیں اتری تھی، ہمارا خیال تھا کہ نہاری لے کر گھر چلیں گے اور گھر پر ہی کھائیں گے مگر اس بچے کو دیکھ کر یکا یک پروگرام بدل گیا۔ بات یہ تھی کہ میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے تھے، دنیا جہان کا ہر علاج کرالیا، لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا چکے تھے مگر پھر بھی نائلہ کی گود خالی ہی تھی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ہمارے سارے ٹیسٹ ہو چکے تھے، نہ مجھ میں کوئی خرابی نکلی اور نہ نائلہ کو کسی قسم کا کوئی مسئلہ تھا۔ بظاہر ہم دونوں صحت مند تھے، دولت مند تھے، اپنا گھر، اپنا سب کچھ مگر ایک بچہ نہ ہونے کی وجہ سے زندگی میں جیسے کسی چیز کی شدید کمی تھی۔

میں تو اپنے ایڈورٹائزنگ کے کاموں میں مصروف رہتا اور اتنا مصروف رہتا کہ صبح سے شام ہو جاتی، شامیں گھر پر مہمانوں کے ساتھ اور کبھی کسی دوسرے کے گھر پر مہمان بن کر گزر جاتیں اور رات کو نیند آ ہی جاتی مگر مسئلہ نائلہ کا تھا۔ نائلہ نے شادی کے بعد بھی سینٹ جوزف کالج میں لیکچرر کی نوکری نہیں چھوڑی تھی۔ دوپہر تک تو وہ وہاں مصروف رہتی مگر اس کے بعد اسے اکیلا گھر کاٹنے کو دوڑتا، پھر اکثر و بیشتر عزیز رشتے دار، دوست احباب، کوئی ایسی بات بھی کہہ دیتے کہ وہ پریشان ہو جاتی تھی۔ مجھ سے تو کوئی کچھ کہتا نہیں تھا، کسی میں ہمت بھی نہیں تھی اور میں کسی کو اتنا موقع دیتا بھی نہیں تھا کہ وہ میرے ذاتی معاملات کو گفتگو میں لائے مگر عورتوں کی بات اور ہوتی ہے۔ دوسروں سے کی جانے والی باتوں کو بھی وہ اپنے اوپر لاگو کر لیتی ہیں۔ فلم، ڈرامے اور کہانیوں میں بولے اور لکھے جانے والے مکالموں پر وہ بے تاب سی ہو جاتی ہیں۔ یہی حال کچھ نائلہ کا بھی تھا۔

پچھلے ہفتے ہم لوگ نہاری لینے آئے تو وہ بچہ بھی نظر آیا تھا۔ میں نہاری لے کر واپس آیا تو اس نے مجھے اشارے سے وہ بچہ دکھایا تھا۔ چار پانچ سال سے زیادہ عمر نہیں تھی اس کی۔ سرخ و سفید رنگت جس پر بہت سارے کالے سے نشانات لگے ہوئے تھے اور وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھا۔

''کیوں نہ اس بچے کو لے جائیں ہم لوگ...... اسے نہلا دھلا کر، صاف ستھرا کر کے، اپنا بیٹا بنا لوں گی۔ کامران نام رکھیں گے اس کا، کیا خیال ہے؟''

میں ہنس دیا تھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے، نہ جانے کس کا بچہ ہے اور کوئی کیوں دے گا اپنا بچہ ہمیں؟ کیسی بے وقوفی کی بات کرتی ہو۔'' میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں منع کیا تھا۔ راستے بھر ہم اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ جانے کیوں اس ہفتے پھر نائلہ نے فرمائش کی تھی کہ نہاری لی جائے اور پھر نہاری لیتے لیتے ہم لوگ وہیں کھانے بیٹھ گئے تھے۔

نائلہ نے بیرے کو دروازے کے باہر اس بچے کو دکھاتے ہوئے کہا کہ اسے بلا کر لائے، اس سے کچھ بات کرنی ہے۔

تھوڑی دیر میں بیرا اس بچے کو لے کر آ گیا۔ اس کا نام فیض تھا اور وہ بڑے اعتماد سے بات چیت کر رہا تھا۔ مجھے اس کے اعتماد پر حیرت بھی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اسے کچھ پتا نہیں ہے کہ اس کے ماں باپ کہاں ہیں، وہ تو ڈیرے پر رہتا ہے جہاں اور بھی بچے رہتے ہیں۔ میں نے بیرے سے پوچھا اس کے ساتھ کوئی بڑا بچہ بھی ہے تو اسے بلا لاؤ۔ اسے بھی یہیں کھانا کھلائیں گے۔

دوسرے بچے کی عمر کوئی بارہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے بتایا کہ یہ سارے بچے ایک کالونی میں نالے کے ساتھ ایک ڈیرے پر رہتے ہیں۔ وہاں سے ہی بچوں کو صبح سوزوکی ٹرک میں بٹھا کر شہر کے مختلف علاقوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ دن بھر۔ بچے بھیک مانگتے رہتے ہیں۔ کچھ گھنٹوں کے بعد کوئی نہ کوئی آدمی آ کر جمع شدہ پیسے لے لیتا ہے۔ شام کو یہاں پر یا اسی طرح کی کسی اور جگہ کھانا کھا کر گاڑی ہمیں ڈیرے پر واپس لے جاتی ہے۔ اس بچے نے میری منگوائی ہوئی مغز نہاری اور تلی نہاری کے بڑے بڑے نوالے لیتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نائلہ نے التجا کی کہ میں اس بچے کو ساتھ لے چلوں۔ نہ جانے لمحے کی کونسی گرفت تھی کہ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ یہ بچہ اب ہمارا ہوگا۔

میں نے بڑے بچے سے کہا تھا۔ ''کھانے کے بعد ہم لوگ اس بچے کو لے جائیں گے...... ٹھیک ہے نا، اگر یہ ہمارے ساتھ رہے۔''

اس نے بچے کو غور سے دیکھا پھر مجھ سے کہا تھا۔ ''لے جاؤ بابا لیکن لالہ اسے واپس لے آئے گا۔''

''ارے، لالہ آئے گا تو اس سے بات بھی کر لیں گے، تم فکر نہ کرو۔'' میں نے کھانے کا بل دیا اور نہ جانے کیوں ساتھ ہی سو سو کے دو نوٹ بڑے بچے کی قمیص کی جیب میں ڈال دیے۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے اس گندے سے بچے کو اپنی گود میں اٹھایا اور تیزی سے اپنی گاڑی کھول کر اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا اور بہت آسانی کے ساتھ ہم اس بچے کو گھر لے کر آ گئے۔

نائلہ کی جیسے لاٹری کھل گئی۔ میری حیرت کی انتہا نہیں
ہی جب میں نے دیکھا کہ گھر میں پہلے سے ہی چھوٹے بچوں
کے کپڑے بنے رکھے ہوئے تھے۔ نائلہ نے کامران کو نہلایا،
ھلایا، کپڑے پہنائے، پیار کیا اور اس کی خاطریں کرتی رہی
یسے یہ اس کا اپنا ہی بچہ ہو۔ تین چار دنوں میں ہی وہ بچہ نائلہ اور
یرا گرویدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک سرکاری اسپتال سے
رانی تاریخوں میں کامران کا پیدائشی سرٹیفکیٹ بنوالیا تھا اور
ہاں تک کاغذ اور قانون کا تعلق تھا، کامران ہمارا ہی بیٹا تھا۔

ہماری زندگی میں خوشیاں اس طرح سے اُمڈ کر آئیں کہ
یں خود حیران رہ گیا کہ اس ایک لمحے کے فیصلے نے گھر کا ماحول
کس طرح سے بدل دیا تھا۔ کسی سلوموشن فلم کی طرح، ان لمحوں
کا ایک ایک حصہ میری آنکھوں میں قید ہو گیا تھا۔ میں نے
سے اپنی گود میں اٹھایا، تیزی سے سڑک کے کنارے کھڑی
ہوئی گاڑی کا آٹومیٹک دروازہ کھول کر اسے پچھلی سیٹ پر نائلہ
کے ساتھ بٹھایا اور پھر ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔

ایک ہفتہ تو مبارکبادیں وصول کرنے اور مٹھائیاں
کھلانے میں ختم ہو گیا۔ ہم نے سمجھا تھا کہ زندگی اسی طرح سے
حسین رہے گی۔

تین ہفتوں کے بعد یکایک اس دن دو پہلوان ٹائپ
کے آدمی گھر پر مجھ سے ملنے آئے۔ ایک نے اپنا نام لالہ گل
رحمان بتایا تھا۔

انہوں نے مجھ سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کی، صرف
یہی کہا تھا کہ وہ بچہ زمرداں کا بچہ ہے اور اس کو ہم لوگ اپنے پاس
نہیں رکھ سکتے اور انہیں زمرد یعنی کامران کو فوراً اپنے ساتھ واپس
لے جانا ہے۔ یہ اصولی بات ہے۔ یہ بچہ بغیر ان کی مرضی کے
میں نے اغوا کرلیا تھا اور اغوا کیا ہوا بچہ میں اپنے ساتھ رکھ نہیں
سکوں گا۔ ہر قیمت پر زمرد ان کے ساتھ جائے گا۔ اگر میں
شرافت سے مان لوں تو اچھا ہے ورنہ دوسرے طریقے بھی ہیں۔

میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، بتایا کہ اسے ہم
باضابطہ اپنا چکے ہیں، شہر کے سارے بڑے لوگوں سے ہمارے
تعلقات ہیں، پولیس والوں کو ہم اپنے ساتھ شامل کرلیں گے
اور کامران انہیں نہیں ملے گا۔ کامران ہمارے گھر کا فرد ہے۔
ہمارا بیٹا ہے۔ میرا جانشین ہے، مستقبل میں اس گھر کا مالک
ہے، ہمارا اولی ہمارا وارث ہے...... یہ گھر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

لالہ نے مجھے سمجھایا کہ یہ اس کا کام ہے، اس کی ذمے
داری ہے۔ اسی طرح سے لوگ اگر ان بچوں کو اٹھا اٹھا کر اپنے
گھروں میں.. سجا کر اپناتے رہے تو پھر ان کا تو کارخانہ بند ہی
ہوجائے گا۔ اس نے بڑے دھیمے لہجے میں بات کی تھی۔

"دیکھیے، میں آپ کے گھر پہنچ گیا، آخر کوئی ہمارا بھی سسٹم
ہے۔ سارے شہر میں یہ بچے کام کرتے ہیں، ان کی نگرانی ہوتی
ہے۔ کس سے مل رہے ہیں، کس سے بات کر رہے ہیں۔ ان
سے پیسے اکٹھے کیے جاتے ہیں، ان کا خیال رکھا جاتا ہے، یہ کیسے
ہوسکتا ہے کہ آپ جیسا کوئی بڑا آدمی اس طرح سے ہمارے کام
میں کھنڈت ڈال دے۔ باقی رہی پولیس وغیرہ تو اس کی ہمیں کوئی
فکر نہیں ہے۔ اگر آپ بچہ ابھی نہیں دیں گے تو پھر ہم خود ہی لے
جائیں گے اور لے جانے میں بہت کچھ ہوسکتا ہے۔"

کچھ ہوا تو نہیں لیکن وہ لوگ کامران کو لے گئے، اسی
رات لالہ کے جانے کے دس منٹ کے بعد۔ ابھی میں سوچ ہی
رہا تھا کہ کس سے بات کروں، کس طریقے سے اس مسئلے کو حل
کروں، میں نائلہ کو احتیاط کرنے کے بارے میں بتانے ہی
جارہا تھا کہ یکایک کمرے میں چوکیدار داخل ہوا اور اس کے
پیچھے کم از کم پانچ چھ افراد اپنے اپنے ہاتھوں میں اسلحہ لیے ہوئے
داخل ہوئے۔ انہوں نے سارا کام تین چار منٹ میں ختم کرلیا۔
دو میرے پاس ٹھہرے اور دو نے کامران کو جھپٹ کر اٹھایا،
نائلہ کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور باہر کھڑی ہوئی سوزوکی
پک اپ میں آناً فاناً غائب ہوگئے۔

ہمارے گھر میں جیسے میت ہوگئی۔ نائلہ کا رو رو کر برا
حال ہوگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر میں پولیس میں
رپورٹ کروں تو کیا کروں۔ بچہ تو ہم نے ایک طرح سے اغوا ہی
کیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ تین دن
سوچنے میں اور نائلہ کو سمجھانے میں گزر گئے۔ میں سمجھاتا رہا، ہر
طرح کی بات کرتا رہا مگر مجھے پتا تھا کہ سب کھوکھلی باتیں ہیں۔
وہ اس صورتِ حال کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ روتی رہی،
بلکتی رہی اور میں صرف سوچتا رہا پھر نہ جانے کیوں میں ایک بار
پھر اسی نہاری کی شاپ کے سامنے پہنچ گیا۔

میری توقع کے مطابق اس دن والا بڑا بچہ مجھے مل گیا۔
میں نے اس سے لالہ کا پتا پوچھنے کی کوشش کی تو وہ مجھے فٹ پاتھ
پر ہی بیٹھے ہوئے ایک اور آدمی کے پاس لے کر آگیا کہ یہ سب
کچھ بتا سکتا ہے۔ اس آدمی نے میری بات سنی پھر کہا کہ وہ شام
کو مجھے بتائے گا کہ لالہ مجھ سے ملے گا کہ نہیں۔

شام کو وہ مجھے میری ہی گاڑی میں ٹھکانے پر لے کر
آگیا۔ کالونی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور کچے پکے مکانوں کے
درمیان سے نکلتی ہوئی گندی نالیوں کو پھلانگتے ہوئے ہم لوگ
لالہ کے ڈیرے پر پہنچے تھے۔

وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے بھی اس سے زیادہ باتیں
نہیں کی تھیں۔ اسے صاف صاف بتا دیا کہ کامران کتنا ضروری

ہے، میرے لیے اور میری بیوی کے لیے۔ میں نے اسے بتایا کہ نائلہ پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں جیسے اس کا اپنا بچہ مر گیا ہے۔ میں اس بچے کو پالوں گا، پڑھاؤں گا، بڑا کروں گا، اس کی وجہ سے جو خوشیاں ہمارے گھر میں آئی تھیں ان کا اس طرح سے گلا نہ گھونٹے۔ میں نے اس سے کہا کہ کچھ رقم بھی دینے کو تیار ہوں......لاکھ، دولاکھ، پانچ لاکھ مگر وہ بچہ ہمیں دے دے۔

لالہ نے میرے لیے چائے منگوائی۔ وہ میری بات سنتا رہا پھر اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بہت سارے بچے ہیں مختلف قومیت کے کچھ کے ماں باپ مر چکے ہیں اور بہت سوں کے ماں باپ زندہ ہیں جنہیں ہر چھ مہینے بعد ان بچوں کی نوکری کے پیسے ان کے گھروں میں پہنچائے جاتے ہیں۔ اس کاروبار کو سمجھیں، یہ کوئی گائے بکری گھوڑا بیچنے خریدنے کا دھندا تھوڑی ہے۔ یہ تو سارے ملک میں ہو رہا ہے، ہر بڑے شہر میں منظم طریقوں سے اور اس دھندے میں خرید و فروخت نہیں ہوتی۔

ان بچوں کے والدین نے انہیں نوکری پر بھیجا ہے، کام کرنے کے لیے۔ اس کے بدلے میں انہیں تنخواہ ملتی ہے، ایک معاہدے کے مطابق۔ اس معاہدے میں ان بچوں کی خریداری کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بچے بکاؤ مال نہیں ہیں۔ ان کا گھر ہے، ان کے والدین ہیں۔ یہ صرف کم عمری میں نوکری پر لگ گئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک لاوارث ہیں، ان کا میں دھیان رکھنے والا ہوں، ان کا نیلام نہیں کیا جا سکتا ہے۔

میں اپنے ساتھ پچاس پچاس ہزار روپوں کی دو گڈیاں لے کر آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ روپوں کے زور پر میں ان لوگوں کو خرید سکوں گا اور کوئی طریقہ نہیں تھا میرے پاس۔ میں نے دونوں گڈیاں نکال کر اس کے پیروں کے پاس رکھ دیں۔

”دیکھیں، آپ کی بات صحیح ہے لیکن صرف ایک بچے کا مسئلہ ہے......صرف ایک بچے کا۔ تھوڑی سی مدد کرلیں اپنا بھائی سمجھ کر۔ یہ لاکھ روپے ہیں اور بھی لا دوں گا۔ اس کے ماں باپ کے تو اور بھی بچے ہوں گے، انہیں دے دیں پیسے مگر کامران ہمیں دے دیں۔“ میں نے بڑی بے رحمی سے اپنے اندر کے انسان کو کچل کر اس سودے بازی میں ماں باپ کو خریدنے کی پیشکش کر دی تھی۔

لالہ نے مجھے بڑی حیرت سے دیکھا اور ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

میں نے بھی اس کی ساری باتیں سنیں اور ایک بار پھر نائلہ کی حالت، گھر کی حالت اسے سمجھائی۔ مجھے رونا بھی آ گیا تھا۔ رونا مجھے کامران کی وجہ سے نہیں بلکہ نائلہ کی حالت کا سوچ کر آیا تھا۔

وہ بار بار اپنی بات دہراتا رہا اور میں بار بار اسے اپنی حالت سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ دو گھنٹے کی تکرار کے بعد میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔ ”میں یہ روپے چھوڑ کر جا رہا ہوں اور دوبارہ آؤں گا۔ پولیس اور سرکاری وارنٹ کے ساتھ نہیں صرف نائلہ کو لے کر آؤں گا۔ لالہ! تم خود دیکھ لینا اس کی کیا حالت ہے۔ تمہارا کچھ نہیں جائے گا، مجھے میری بیوی واپس مل جائے گی، کامران کو ماں مل جائے گی، میرا گھر ویران ہے لالہ! میرے گھر میں جیسے میت ہو گئی ہے۔“ میں پھر نہ چاہتے ہوئے بھی رو دیا تھا۔ میں نے روتے روتے اس سے کہا تھا۔ ”لالہ! لگتا ہے تمہاری کوئی ماں، کوئی بہن، کوئی بیوی، بیٹی نہیں ہے، شاید تم کو پتا ہی نہیں ہے کہ رشتے کیا ہوتے ہیں، محبت کیا ہوتی ہے، قربانی کیا ہوتی ہے؟ تم تو انسانی مجبوریوں کے تاجر ہو صرف سوداگر۔ ایک بیوپاری ایک اسمگلر۔ انسانوں کے اسمگلر، خوشیوں کے قاتل۔“ میں بہت کچھ کہتا رہا تھا اسے۔

میں نہ جانے کس طرح کے ذہنی انتشار کا شکار تھا کہ لالہ مجھے لاکھ روپے واپس دینے کی کوشش کرتا رہا اور میں اس کو جھڑک کر پیسے لیے بغیر واپس آ گیا۔ میں آج تک اس ذہنی کشمکش اور اپنے اس موڈ کی تشریح نہیں کر سکا ہوں۔

واپس گھر دیر سے پہنچا تھا، تھکا ہوا اور مکمل طور پر نڈھال۔ نائلہ اپنے کمرے میں خاموش لیٹی ہوئی تھی جیسے کسی جنازے سے واپس آئی ہو۔ میں پہلی دفعہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا رہا، پہلے وہ روتی رہی تھی، اس دفعہ میں روتا رہا۔

تین دن کے بعد یکایک دو افراد مجھ سے ملنے آئے تھے۔ چوکیدار انہیں لے کر میرے پاس آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے زیادہ بات نہیں کی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے تھے اور نوٹوں کی دونوں گڈیاں مجھے دے دیں کہ یہ لالہ نے بھیجی ہیں۔ میں انہیں سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ دروازے سے ایک اور شخص کامران کو لے کر اندر آیا۔ کامران پہلے دن ہی کی طرح گندا تھا اور اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مسلسل روتا رہا ہے۔ میں نے ایک نظر میں ہی اندازہ کر لیا کہ اس کا وزن بھی بہت تیزی سے کم ہوا ہے۔

میں نے کامران کو بڑھ کر پکڑا ہی تھا کہ آنے والے شخص کی آواز آئی۔ ”لالہ نے کہا ہے پیسے بھی تمہارے ہیں اور بچہ بھی تمہارا ہے۔“

میں آج تک اس معمے کو سلجھا نہیں سکا ہوں۔ مگر میرے گھر میں جیسے زندگی دوڑنے لگی تھی۔ پھر سے خوشیاں لوٹ آئی تھیں صرف کامران کی وجہ سے۔

پرچھائیاں

سیما کمال

تصوراتی دنیا کی ایک خوبی ہے کہ انسان جب دل چاہے اور جہاں دل چاہے وقت گزار سکتا ہے اور کسی کو ذرا بھی خبر نہیں ہوسکتی... وہ بھی خواب وخیال کی دنیا میں اس قدر مگن تھی کہ حقیقی منظر کو یکسر فراموش کر بیٹھی... مگر وقت کا چابک سونے والوں کو گہری نیند سے بھی جگا دیتا ہے۔

ایک خیالی پیکر کو حقیقی وجود سمجھنے والی ایک بے وقوف دوشیزہ کا قصہ

مادام زرینہ گورمانی نے کافی کا کپ میز پر رکھ دیا اور پُرخیال نظروں سے خلا میں گھورنے لگی۔

''وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔'' اس نے صوفیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ ہم بالاخانے کے ہال کمرے میں ڈانس کیا کرتے تھے۔ ماما ہال کمرے کے فرش کو ویکس پالش سے شیشے کی طرح چمکائے رکھتی تھیں۔ میں اور ہاشم گھنٹوں ڈانس کرتے لیکن ماما کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا

کہ میں ہاشم سے بہتر ڈانس کرتی ہوں۔ لہٰذا ہاشم مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔''

اس نے قہقہہ لگایا اور کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ہاشم کا پاؤں پھسل گیا اور وہ سیڑھیوں میں گر گیا تھا۔ اس کے بعد ماما نے سیڑھیوں کے سامنے دروازہ لگوا دیا تھا۔''

صوفیہ نے بُنائی کے خانوں میں گنتی کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاشم کو میرے ساتھ رقص کرنے کا بہت شوق تھا۔'' بوڑھی گورمانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اب بھی اگر میں آنکھیں بند کرلوں تو تصور میں خود کو ہاشم کے بازوؤں میں جھولتا محسوس کرتی ہوں۔''

''اوہ ڈیئر!'' صوفیہ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں بُنائی میں کچھ غلطی کرگئی ہوں۔''

اس نے اون کی سلائیاں ایک طرف رکھ دیں اور ہمدردانہ مسکراہٹ کے ساتھ مادام گورمانی کی طرف دیکھا۔

''کیا تم اس وقت رقص کرنا پسند کروگی؟ ابھی صرف دس بجے ہیں۔ سونے سے پہلے تھوڑی سی ورزش ہوجائے گی۔'' اس نے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' مادام گورمانی نے کہا اور مسکراتی ہوئی اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف چل دی۔ صوفیہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

جس وقت وہ اوپر ہال کمرے میں داخل ہوئی، مادام گورمانی ایک پرانے ریکارڈ پر سوئی رکھ چکی تھی اور گھسی پٹی موسیقی کی لہریں فضا میں پھیل رہی تھیں۔

''آؤ صوفیہ!'' مادام نے شوخی سے کہا۔ ''شروع ہوجاؤ۔''

صوفیہ مسکرائی اور اپنی دبلی پتلی بانہیں اس کے بھاری بھرکم جسم کے گرد ڈال دیں۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہوئی فرش پر پھسلنے لگیں۔

صوفیہ کی آنکھیں بند تھیں اور ہال میں پھیلی ہوئی موسیقی اس کے حواس پر چھا رہی تھی۔ مادام کے ساتھ لگے ہوئے یکایک اس نے محسوس کیا جیسے اس کے گرد مادام نہیں بلکہ کسی نوجوان مرد کے تنومند بازو ہوں۔ اس کا رخسار کسی سخت کپڑے کو چھو رہا تھا اور چہرے کے بہت نزدیک تمباکو کی مدھم سی مہک پھیل رہی تھی کسی مرد کی مخصوص خوشبو۔

اور مادام گورمانی کی مضبوط آغوش میں اسے ایک عجیب سی شرم کا احساس ہوا۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ بوڑھی گورمانی کے نوجوان شوہر کی روح اسے پسند کرنے لگی ہے۔ یقیناً وہ اس وقت ہاشم کے بازوؤں میں تھی۔ یکایک مادام کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''کل ہم گارڈن چلیں گے صوفیہ تاکہ وہاں سے پھول لے کر ہاشم اور منے کی قبروں کو سجا سکیں۔ کیا تم میرے ساتھ وہاں جانا پسند کروگی؟''

''ہاں۔'' اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ناچنا بند کیا اور سونے کے لیے اپنے کمروں کی طرف چلی گئیں۔ بستر پر لیٹتے ہی صوفیہ کی بند آنکھوں میں ہاشم کا تصور اتر آیا۔ اگر اس نے مادام زرینہ گورمانی کے ساتھ ہی ڈانس کیا تھا اور ہاشم محض اس کا وہم تھا تو وہ تمباکو کی مردانہ خوشبو کیسی تھی؟ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ ہاشم کا وجود اس کے لیے وہم تھا...... وہ اس کے مضبوط اور توانا جسم کی قربت اس وقت بھی محسوس کرسکتی تھی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس گھر میں خوبصورت اور جوان ہاشم کی حفاظت میں ہو۔ اسے کسی مرد کے تحفظ کا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی ہاشم اس دنیا میں موجود نہیں ہے لیکن اسے یقین تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ ڈانس فلور پر ہاشم کی آغوش میں تھی۔

مضبوط بازوؤں کی گرفت اور پائپ کے تمباکو کی خوشبو اس کی موجودگی کا ثبوت تھی۔ اسے یقین تھا کہ ہاشم کی روح اس گھر میں موجود ہے اور اس سے محبت کرنے لگی ہے۔

اگر مادام کو ہاشم کے لیے میرے خیالات کا علم ہوجائے؟ صوفیہ نے سوچا۔

مادام زرینہ گورمانی سے اس کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مری ہلز پر بنے ہوئے پارسیوں کے ایک کانوینٹ میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ مادام گورمانی یہاں کی پرنسپل تھیں اور بہت پرانی تھیں۔ صوفیہ حال ہی میں وہاں آئی تھی، اس کے والدین نہیں تھے۔ وہ ہاسٹل میں رہتی تھی جبکہ زرینہ گورمانی کا آبادی سے قدرے فاصلے پر ایک کاٹیج تھا جو بقول اس کے باپ گورمانی کے زمانے کا تھا۔ اس کی وفات کے بعد زرینہ گورمانی اپنی ماں کے ساتھ وہاں رہتی رہی اور پھر ماں کے بعد ہاشم اور اپنے بچے کے ساتھ۔

اب وہ تنہا تھی۔ بس ایک جزوقتی ملازمہ تھی جو مری کے اطراف بنے ہوئے جھونپڑوں میں رہنے والے غریب لوگوں

کی بستی سے آتی تھی اور کام کر کے چلی جاتی تھی۔
بوڑھی گورمانی کا رویہ تمام اسٹاف کے ساتھ اچھا تھا۔ سارا اسٹاف اس کی عزت کرتا تھا لیکن اس سے بے تکلف کوئی نہ تھا۔ صوفیہ اور گورمانی میں خاصا فرق تھا۔ وہ ایک درمیانی عمر کی عورت تھی جبکہ صوفیہ جوان لڑکی تھی۔ ان کے بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آجانے کی سب سے بڑی وجہ ان دونوں کا تنہا ہونا تھا۔
صوفیہ جو ایک دبلی پتلی عام سی لڑکی تھی، بزدلی کی حد تک سیدھی سادی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج تک کسی لڑکے سے دوستی نہیں کر سکی تھی اور شاید اس طرح کی لڑکیوں کی شادی آسان نہیں ہوتی۔
مادام گورمانی نے جو کچھ صوفیہ کو اپنے متعلق بتایا تھا، اس لحاظ سے صوفیہ کے نزدیک وہ ایک خوش نصیب عورت تھی جس نے ایک طویل عرصہ ایک نوجوان اور خوبصورت مرد کے ساتھ گزارا تھا۔ ماں بنی لیکن بالآخر موت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں جدا کر دیا۔
مادام گورمانی اپنی عمر کا آخری دور ان خوبصورت لمحوں کی یاد کے سہارے خاموشی سے گزار رہی تھیں جو ہاشم کی محبت میں ڈوبے ہوئے پلک جھپکتے میں بیت گئے تھے۔
جس روز ان کے ہاں پہلے بچے کی ولادت ہوئی اسی روز ہاشم ایک حادثے میں مر گیا۔ اس نے ابھی اپنے بچے کا نام بھی نہیں رکھا تھا کہ قصبے میں بخار کی وبا پھیلی اور ان کا بچہ بھی مر گیا۔ ایک روز مادام گورمانی نے صوفیہ کو بتایا۔
''ہاشم مجھ سے بہت محبت کرتا تھا لیکن ماما کو میرا اس سے ملنا جلنا پسند نہ تھا۔ ماما کا خیال تھا کہ وہ کبھی مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ وہ محض وقت گزاری کے لیے مجھ سے ملتا ہے۔ لیکن جب ہاشم نے مجھ سے شادی کی درخواست کی تو وہ بہت حیران ہوئیں۔ لیکن میں جانتی تھی وہ خوش نہیں ہیں کیونکہ وہ کہتی تھیں مجھے یقین ہے کہ ہاشم بے وفا ہے اور ایک دن وہ تمہیں چھوڑ جائے گا۔'' مادام نے ایک سرد سانس خارج کی اور آہستہ سے بولیں۔
''اور یہی ہوا۔ وہ مجھے چھوڑ گیا لیکن اگر ماما زندہ ہوتیں تو انہیں ہاشم کی شدید محبت کا اعتبار رہ جاتا۔ اس نے زندگی کے آخری لمحے تک مجھ سے پیار کیا تھا۔ اسے اپنے بچے کو دیکھنے کا کتنا شوق تھا لیکن آہ...... وہ یہ حسرت دل میں لیے چلا گیا۔'' مادام نے دور خلا میں تکتے ہوئے کہا۔
''مگر اس کے چلے جانے کے بعد بھی میں نے خود کو کبھی اکیلا محسوس نہیں کیا۔ اس کی محبت ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے اور وہ مجھ سے کچھ زیادہ دور بھی تو نہیں۔ میرا جب دل چاہتا ہے میں جا کر دونوں سے مل آتی ہوں۔''
جو کچھ مادام گورمانی نے صوفیہ کو بتایا تھا، اس کے علاوہ وہ اس کے ماضی کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ مادام اکثر دو قبروں کا ذکر کیا کرتی تھی۔ جن میں سے ایک اس کے شوہر ہاشم کی قبر تھی اور دوسری اس کے بچے کی جس کا کوئی نام نہیں تھا لیکن صوفیہ نے ابھی تک ان قبروں کو نہیں دیکھا تھا۔
آج وہ مادام سے ملنے آئی تھی اور اس کی خواہش پر رات یہیں ٹھہر گئی تھی۔ صبح جس وقت صوفیہ کی آنکھ کھلی، ابھی سویرا ہی تھا۔ ہاشم کا خیال تمام رات خواب بن کر اس کے ساتھ رہا تھا۔ صوفیہ کو یقین تھا کہ ہاشم کی روح جو مرنے کے بعد اس گھر میں رہتی ہے اب بوڑھی گورمانی کو چھوڑ کر اس سے محبت کرنے لگی ہے کیونکہ وہ ہر لحاظ سے گورمانی سے بہتر ہے۔
وہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔
صبح کی سرد ہوا اس کے سیاہ بالوں کو چھیڑتی ہوئی کمرے میں آرہی تھی لیکن صوفیہ جانتی تھی کہ یہ ہوا بوڑھی گورمانی کو چھیڑ کر نہیں جگا سکتی۔ وہ جانتی تھی کہ رات دیر تک جاگنے کی بنا پر وہ تھک گئی ہو گی اور اب صبح دن چڑھے تک سوئے گی۔
ہاشم کا خوبصورت خیال صوفیہ کو اپنے گرد اب بھی سانس لیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل کر کاٹیج کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی اور مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی وہ اندازے سے اس پہاڑی کی طرف چل پڑی جس کے دامن میں مادام گورمانی کے کہنے کے مطابق ہاشم اور اس کے بے نام بچے کی قبریں تھیں۔
کچھ دیر کی کوشش کے بعد اسے وہ پہاڑی بھی مل گئی اور اس کے دامن میں بنی ہوئی دو قبریں بھی دکھائی دے گئیں۔ وہ مٹی کی معمولی قبریں تھیں جن کے ابھار اور لمبائی سے پتا چلتا تھا کہ ایک بڑی قبر ہاشم کی ہے اور دوسری بچے کی۔
ان قبروں پر بارش اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے کوئی سائبان نہیں تھا۔ صوفیہ کی نظریں ہاشم کی قبر میں جذب ہو گئیں اور یکا یک اسے اپنے دل میں ایک ٹیس سی محسوس ہوئی۔
اسے یوں محسوس ہوا جیسے درحقیقت ہاشم دھوپ میں

جھلس رہا ہو یا بارش میں بھیگ رہا ہو۔ اس نے کسی شے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ یکایک ہاشم کی قبر کے نزدیک اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ وہ جھکی اور دیکھنا چاہا کہ وہ کیا ہے۔

مٹی میں دبا ہوا اس چیز کا ایک سرا باہر نکلا ہوا تھا۔ صوفیہ نے اسے پکڑ کر پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ یہ ایک پتلی مگر لمبی شیٹ تھی۔ باہر آنے کے بعد مٹی ہٹی تو اس نے دیکھا ایسی ہی کئی شیٹیں اور بھی وہاں دبی ہوئی ہیں۔ یہ کسی تباہ شدہ جہاز کے ٹکڑے تھے۔ انہیں دیکھ کے فوراً صوفیہ کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے سامنے پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کو دیکھا اور پھر انہیں اٹھا اٹھا کر قبروں کے نزدیک لے جانا شروع کر دیا۔

کچھ دیر کی محنت کے بعد اس نے پہاڑی کے دامن میں دونوں قبروں کے اوپر شیٹوں اور پتھروں کی مدد سے ایک سائبان تیار کر دیا تھا۔

جس وقت اس نے اپنا کام ختم کیا، چھپا ہوا سورج اپنے مقام سے باہر نکل آیا تھا اور تیز دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی لیکن صوفیہ کو گرمی یا دھوپ کا احساس نہیں تھا۔ وہ اپنے جذبے کی شدت میں مگن تھی۔ جب اس نے اپنا کام ختم کیا تو وہ پسینے میں شرابور تھی اور تھکن سے نڈھال بھی۔

وہ واپس مادام گورمانی کے کاٹیج کی طرف بڑھی تو اسے احساس ہوا کہ دھوپ میں خاصی حدت آچکی ہے۔

جب وہ کاٹیج میں داخل ہوئی تو گھر کے سکوت نے اسے بتایا کہ مادام ابھی تک نہیں جاگی۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی مادام گورمانی باہر جانے کی تیاری کرنے لگی...... اپنے سر پر ہیٹ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''ہاشم کو گلاب بہت پسند تھے۔ وہ ہر رات میرے لیے سرخ گلاب لانا نہیں بھولتا تھا۔''

صوفیہ نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ دونوں قصبے سے نکل کر گارڈن کی طرف چل پڑیں، وہاں سے پھول خریدنے کے بعد وہ اس پہاڑی کے دامن کی طرف بڑھنے لگیں جہاں مادام گورمانی کے شوہر اور بچے کی قبریں تھیں۔

ابھی وہ اس مقام سے کافی دور تھیں کہ قبروں پر پھیلے ہوئے سائبان پر مادام کی نظر پڑی۔

''مادام! ان قبروں کو دیکھا۔'' صوفیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ اب یقیناً تمہارے لیے واضح ہوگئی ہیں۔''

مادام گورمانی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے پھر وہ صوفیہ کی طرف پلٹ گئی۔

''اب ہم ہاشم اور بابا کی قبروں کو زیادہ خوبصورتی سے سجا سکیں گے۔''

صوفیہ بازوؤں میں پکڑے ہوئے پھولوں کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''اب تم قبروں کی طرف سے یقیناً بے فکر ہو جاؤ گی کیونکہ دھوپ اور بارش اب پھولوں کو خراب نہیں کرے گی۔''

مادام گورمانی چند لمحے اجنبی نگاہوں سے صوفیہ کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کے لبوں پر ایک مدھم اور عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں صوفیہ...... اچھا ہوا۔'' اس نے کہا پھر دونوں قبروں کی طرف جانے والے راستے کی طرف چل پڑیں۔

اس کے بعد وہ اکثر قبروں پر پھول چڑھانے جاتیں، صوفیہ نے محسوس کیا کہ ایک پراسراری مسکراہٹ ہمیشہ مادام گورمانی کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی تھی۔

☆☆☆

سردیوں کے شروع دن تھے۔ مادام گورمانی کو جوڑوں کے درد کی شکایت رہنے لگی تھی۔ ایک روز جب ان دونوں کو قبروں پر پھول چڑھانے جانا تھا اچانک ہی مادام کی تکلیف بڑھ گئی۔

اس روز تنہا ہاشم کی قبر پر جاتے ہوئے صوفیہ کو عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے محبوب سے ملاقات کے لیے جا رہی ہو۔ سرخ گلابوں سے لدی ہوئی ہاشم کے تصور میں گم وہ پہاڑی کے دامن میں جا پہنچی۔

قبروں کو پھولوں سے سجانے کے بعد صوفیہ گھٹنوں کے بل جھک کر دعا کرنے لگی۔ یکایک پھولوں سے اٹھتی ہوئی مہک میں اس نے وہی مخصوص مردانہ خوشبو محسوس کی۔

اسے یوں لگا جیسے ہاشم آس پاس ہی کہیں موجود ہو۔ اس کے لباس سے اٹھتی ہوئی کوئی بہت ہی نفیس مہک، تمباکو کی مدھم سی خوشبو اسے اپنے بہت قریب محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ مبادا وہ سب کچھ ختم ہو جائے اس لیے کہ وہ جانتی تھی روحوں کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ سیدھی ہوئی اور آہستہ قدموں سے واپس مادام کے... کاٹیج... کی طرف بڑھنے لگی۔ سردی کے بڑھنے کے ساتھ مادام کی بیماری بھی بڑھ رہی تھی اور

صوفیہ اس کی خواہش پر کرائے کا اپارٹمنٹ چھوڑ کر اپنا سامان کاٹیج میں لے آئی تھی۔

مادام گورمانی سارا وقت اپنے مرحوم شوہر اور بچے کی باتیں کیا کرتی اور صوفیہ اس کے قریب بیٹھی سویٹر بنا کرتی مگر تنہائی میں آنکھیں بند کرتے ہی اس کے خیالوں میں ہاشم اتر آتا اور پھر وہ اس کے قرب کے احساس میں ڈوب کر اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو جاتی۔

وہ ایک کہر آلود شام تھی۔ بند کمرے کی ٹھنڈک آتش دان کی آگ سے کسی قدر کم ہوگئی تھی۔ مادام گورمانی لحاف میں اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ اس کا چہرہ جو ایک دبیز مفلر میں چھپا ہوا تھا، لحاف سے باہر تھا۔ وہ بنائی کرتی ہوئی صوفیہ سے باتوں میں مصروف تھی اور حسب معمول اس کی گفتگو کا موضوع ہاشم اور اس کا بچہ ہی تھے۔

صوفیہ جو گرم شال میں لپٹی ہوئی آتش دان کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی، سلائیاں چلاتے ہوئے مادام گورمانی کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔

پھر اس نے آخری پھندا ڈالتے ہوئے سویٹر ختم کردیا۔ سردیاں اپنے عروج پر تھیں اور اس کے سارے سویٹر پرانے ہو چکے تھے۔ جو سردی کی ٹھنڈک روکنے میں کامیاب نہیں تھے۔ اس لیے صوفیہ کو نئے سویٹر کی ضرورت تھی جو خاصے وقت پر تیار ہو گیا تھا۔

صوفیہ نے سلائیاں رکھ کے تیار شدہ سویٹر کو ہاتھ میں لے لیا اور پھر حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل کے رہ گئیں۔ اس کے ہاتھ میں اس کا اپنا کارڈیگن نہیں، ایک مردانہ سویٹر تھا جو یقیناً ہاشم کا تھا۔ اس نے چور نظروں سے مادام کی طرف دیکھا اور چپکے سے سویٹر اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے کی طرف جاتے ہوئے صوفیہ کو محسوس ہوا جیسے ہاشم اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی نہیں تھا مگر وہ اسے محسوس کر سکتی تھی۔ اس کے کپڑوں کی نفیس مہک اور اس کے پائپ کے تمباکو کی مخصوص خوشبو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ ایک عجب سے سرور میں ڈوبی ہوئی صوفیہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور سویٹر کو سینے سے لگائے ہوئے آنکھیں بند کر کے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن مادام گورمانی کی ملازمہ مسز میک صفائی کے لیے آگئی۔ وہ ہفتے کا وہ دن تھا جب وہ سارے گھر کی صفائی کیا کرتی تھی۔ جس وقت وہ مادام کے کمرے میں تھی، مادام کاٹیج کے اگلے حصے میں دھوپ سینک رہی تھی اور صوفیہ جس نے اب ایک نیا سویٹر شروع کردیا تھا، اس کے نزدیک ہی موجود تھی۔

اچانک انہوں نے اندر ایک شور سنا۔

''شاید مسز میک نے کچھ گرادیا ہے۔'' مادام گورمانی نے کہا۔ صوفیہ ہاتھ سے نٹنگ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں دیکھتی ہوں۔'' اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی مادام کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی مسز میک فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

... مادام گورمانی کے بہت سے خطوط اور تصویریں کھلی ہوئی الماری سے نکل کر فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ شاید مسز میک کرسی پر چڑھ کر الماری درست کر رہی تھی کہ کسی طرح پھسل کر گر پڑی۔ صوفیہ نے پہلے مسز میک کو اٹھنے میں مدد دی پھر جھک کر بکھرے ہوئے خطوط اور تصویریں سمیٹنے لگی۔ مسز میک نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ اپنا کام کرتی رہی۔

''تم کمرے کی صفائی کرو مسز میک۔ میں گورمانی کی الماری درست کرتی ہوں۔''

صوفیہ نے کہا اور پھر تصویروں اور خطوط میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ دراصل وہ چاہتی تھی کہ اسے ہاشم کی تصویر اور اس کے خطوط مل جائیں۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے تصور میں بسنے والے ہاشم سے اس کا موازنہ کر سکے۔

لیکن ان خطوط میں زیادہ تر خطوط سارہ نامی ایک عورت کے تھے۔ جو اس کی کوئی رشتے دار یا دوست تھی اور شہر میں رہتی تھی۔ اس کے علاوہ چند خطوط مادام کے وکیل کے تھے لیکن ہاشم کا کوئی خط اسے نہیں ملا۔ پھر اس نے اسے تصویروں میں تلاش کیا، ان میں چند تصویریں اس کے خاندان کی تھیں جن کے نیچے مادام کی تحریر میں سب کے نام لکھے ہوئے تھے۔ کچھ تصویریں ایسی بھی تھیں جو مادام کے دوستوں کی تھیں۔ سارہ نامی عورت کی کئی تصویریں تھیں مگر ہاشم کی کوئی تصویر صوفیہ کو نظر نہیں آئی۔

اس نے افسردگی سے تمام خطوط اور تصویریں سمیٹ کر الماری میں رکھ دیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہاشم اس سے ملاقات کے لیے آنے والا تھا لیکن نہیں آیا۔

صوفیہ کو تعجب بھی تھا کہ آخر مادام کے پاس اپنے

محبوب شوہر کا کوئی خط یا تصویر کیوں نہیں ہے؟ یقیناً اس نے ہاشم کے خطوط اور تصاویر کسی مخصوص جگہ رکھی ہوں گی اور اسی امید پر صوفیہ نے ساری الماری دیکھ ڈالی مگر اسے ناکامی ہوئی۔

اگلے ہفتے کے دوران مادام گورمانی کے جوڑوں کے درد کی شکایت میں خاصی کمی رہی کیونکہ اس کا خاندانی ڈاکٹر اس کا باقاعدگی سے علاج کررہا تھا لیکن اس نے بھی مادام کو گھر سے باہر جانے اور چلنے پھرنے سے منع کیا تھا۔ اس دوران میں صوفیہ مادام کی لاعلمی میں اکثر گلاب کے تازہ پھولوں سے ہاشم اور اس کے بچے کی قبروں کو سجاتی رہی۔

ایک روز ڈاکٹر مادام کو دیکھ کر واپس ہوا تو اس نے صوفیہ کو بتایا کہ چند دن میں مادام دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہوجائے گی۔

''ہاں۔'' صوفیہ نے سرد سانس چھوڑ کے کہا۔ ''پھر وہ یقیناً قبروں پر پھول چڑھانے بھی جائیں گی۔''

''قبریں؟'' ڈاکٹر...... نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاشم اور اس کے بچے کی قبریں۔'' صوفیہ نے تعجب سے کہا۔ ''کیا آپ نہیں جانتے؟''

''ہاں'' ڈاکٹر نے افسردگی سے سر ہلایا۔ ''اکیلا انسان مردہ لوگوں کے کچھ اور قریب ہوجاتا ہے۔'' ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔

''مادام گورمانی نے شادی نہیں کی تھی، اپنی ماں کے مرنے کے بعد وہ ہمیشہ تنہا رہی ہے اور اب جبکہ اس کے تمام رشتے داروں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو وہ مردہ لوگوں کے درمیان زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ شاید اس کے رشتے داروں میں سے کسی کی قبریں ہوں گی۔'' اس نے کہا اور سر جھکائے کاٹیج سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے کتنی دیر بعد تک صوفیہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اسے مادام گورمانی قابلِ رحم حد تک مظلوم دکھائی دے رہی تھی۔

ہاشم نے یقیناً اس سے بے وفائی کی تھی اور وہ بچہ جس کا کوئی نام نہیں تھا، وہ اس کی بے وفائی کا تحفہ تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ہاشم اور اس کے بچے کی موت کس طرح واقع ہوئی۔

یہ بھی ہوسکتا تھا کہ مادام نے خود اپنے بچے کو ہلاک کیا ہو۔ صوفیہ کے ذہن میں شک ابھرا۔ اس طرح وہ ہاشم کو بھی بے وفائی کے الزام میں قتل کرسکتی ہے۔

کرشمہ

ہم نے کراچی کے ایک قدیم باشندے سے پوچھا کہ یہاں مانسون کا موسم کب آتا ہے؟ اس بزرگ باراں دیدہ نے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے جواب دیا کہ چار سال پہلے تو بدھ کو آیا تھا!

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ کراچی میں بارش نہیں ہوتی۔ البتہ اس کا کوئی وقت اور پیمانہ معین نہیں ہے لیکن جب ہوتی ہے تو اس انداز سے گویا کسی مست ہاتھی کو زکام ہوگیا ہے۔ سال کے بیشتر حصے میں بادلوں سے ریت برستی رہتی ہے۔ لیکن جب چھٹے چھماہے دو چار چھینٹے پڑجاتے ہیں تو چٹیل میدانوں میں بیر بہوٹیاں اور بہو بیٹیاں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے نکل پڑتی ہیں۔ اس قسم کا موسم بے تحاشا ''رش'' لیتا ہے۔

مغربی پاکستان میں برکھا رت اور کراچی میں جولائی کا مہینا تھا۔ سمت کیاڑی سے مکھیوں کے دل بادل امنڈ امنڈ کر آرہے تھے۔ چنانچہ میں مچھر دانی میں بیٹھا آم چوس رہا تھا کہ مرزا عبدالودود بیگ آنکلے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ لاحول ولاقوۃ! یہ بھی کوئی موسم ہے...... جیسے کسی اقبالی مجرم کو ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے ہوں! ادھر کمبخت مکھیاں اس قدر لدھڑ ہوگئی ہیں کہ اڑنے کا نام نہیں لیتیں! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ واقعہ ہے کہ صبح قسائی نے میرے سامنے آدھ سیر ران کا گوشت تول کر قیمہ کوٹا۔ میں برابر پنکھا جھلتا رہا لیکن گھر پر بیگم نے تولا تو پورا تین پاؤ نکلا!

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے اقتباس

کا میج... کے اندرونی حصے کی طرف واپس آتے ہوئے صوفیہ نے سوچا۔

ہاشم، مادام گورمانی کی ماما کے خیال میں ایک بے وفا نوجوان تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ہاشم اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ اب مرنے کے بعد بھی اس کی روح مادام کو چھوڑ کر اس سے محبت کر رہی تھی۔ صوفیہ کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔

اور مادام اپنے دل کی تسلی کو اس کی محبت اور وفا کے گن گاتی رہتی ہے۔

مادام اس سے ہمیشہ جھوٹ بولتی رہی تھی اس لیے کہ وہ اس کے ماضی کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی مگر اب صوفیہ بہت کچھ جان گئی تھی۔

سردیوں کی شدت کم ہونے کے ساتھ مادام گورمانی بستر سے اٹھ کر چلنے پھرنے لگی تھی اور وہ دونوں مل کر ایک بار پھر ہاشم اور بچے کی قبروں پر پھول سجانے کے لیے جانے لگی تھیں۔

لیکن یہ سب کچھ اب صوفیہ کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے ہاشم اپنی حقیقت آشکار ہوجانے کے بعد اس سے ناراض رہنے لگا ہے۔ اب وہ اس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ مادام کے صحت یاب ہوجانے کے بعد اس نے گلاب کے تازہ پھولوں کی مہک میں ہاشم کی مخصوص خوشبو محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن وہ مجبور تھی، مادام کی موجودگی میں وہ اکیلے پھول چڑھانے کس طرح آسکتی تھی۔

☆☆☆

وہ جاتی ہوئی سردیوں کی ایک خوشگوار شام تھی۔ ہلکی خنک ہوائیں طبیعت میں ایک سرور پیدا کر رہی تھیں۔ صوفیہ کا دل بے اختیار ہاشم کی قربت کو چاہنے لگا۔ اس نے مادام کی طرف دیکھا جو حسب معمول ہاشم کی محبت کے قصے سنا رہی تھی۔ اوپر مسز میک ہال کا فرش چمکا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ویکس پالش کی صفائی سے فرش شیشے کی طرح چمک رہا ہوگا۔

یکا یک اسے مادام کی وہ تمام باتیں یاد آنے لگیں جو وہ ہاشم کے متعلق بیان کیا کرتی تھی۔ بقول مادام کے اس کی ماں ہاشم کو پسند نہیں کرتی تھی اور وہ ہال کے فرش کو شیشے کی طرح چمکائے رکھتی تھی۔

ایک بار ہاشم ڈانس کرتے ہوئے اس فرش سے پھسل کر سیڑھیوں سے گر پڑا تھا۔ اس کے بعد مادام کی ماں نے سیڑھیوں پر دروازہ لگوادیا تھا۔

صوفیہ کو خیال آیا کہ اتنی اونچائی سے گرنے کے بعد کسی شخص کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔

یقیناً مادام جھوٹ بول رہی ہے۔ ہاشم قدرتی موت نہیں مرا بلکہ ہاشم کو مادام کی ماما نے قتل کیا ہوگا۔ ایک سرد سی لہر صوفیہ کے بدن میں دوڑ گئی۔

اس نے سوچا۔ 'بچے کی پیدائش ضرور ہاشم کی موت کے بعد ہوئی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مادام نے ماں کے خوف سے خود ہی بچے کا گلا گھونٹ دیا ہو یا پھر اسے بھی اس کی ماما نے قتل کیا ہو۔'

صوفیہ کے ذہن میں عجیب و غریب خیالات جنم لے رہے تھے اور پھر وہ یکا یک اٹھی اور اوپر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ مسز میک فرش صاف کر کے جا چکی تھی اور اب شاید نیچے کہیں صفائی کر رہی ہوگی۔ صوفیہ دروازے کے قریب جا کر رک گئی اور ان پیچوں کا جائزہ لینے لگی جو دیوار میں سوراخ کر کے دروازے کے ساتھ لگائے گئے تھے۔ دروازہ چونکہ بہت پرانا ہو چکا تھا اس لیے یہ پیچ خاصے ڈھیلے تھے۔

صوفیہ کی ذرا سی کوشش کے بعد دروازہ دیوار سے الگ ہوگیا لیکن فوراً ہی صوفیہ نے اسے دوبارہ لگا دیا۔

مادام کی بیماری کے دوران ہاشم اس سے کچھ زیادہ ہی نزدیک ہوگیا تھا مگر اس کے صحت یاب ہونے کے بعد وہ مخصوص فاصلہ پھر ان کے درمیان حائل ہوگیا تھا۔

یکا یک صوفیہ کے دل میں مادام کے ساتھ ڈانس کرنے کی خواہش ابھری۔ اس کے تصور میں ہاشم کا مضبوط سراپا اور تنومند بازو تھے۔ وہ ہاشم کے تصور میں کھوئی ہوئی آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کے مادام کے قریب آگئی۔

''مادام! کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرنا پسند کرو گی؟'' اس نے کہا تو مادام خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ہال کمرے کے فرش پر پھسلتی ہوئی ناچ رہی تھیں۔ صوفیہ کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا سر مادام کے شانے پر تھا اور بازو اس کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔

یکا یک صوفیہ کو اس مخصوص خوشبو کا احساس ہوا، جو ہاشم کی موجودگی کا ثبوت تھی۔ اس نے مادام کے وجود میں ایک جانی پہچانی تبدیلی محسوس کی اور پھر مادام نے ہاشم کا روپ اختیار کر لیا۔ اس کی گرفت میں ایک نئی گرمجوشی تھی۔ صوفیہ کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ اس کی بند آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار اترنے لگا۔ وہ ناچتی ہوئی فرش پر پھسلتی

رہیں۔ صوفیہ کو محسوس ہوا جیسے ہاشم اسے اپنی مضبوط آغوش میں لیے ہوئے آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف کھسک رہا ہے اور پھر یکایک مادام گورمانی کا وجود اس سے الگ ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے ایک تیز نسوانی چیخ ہال میں گونجی اور پورے کاٹیج میں پھیل گئی۔ صوفیہ کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا، سیڑھیوں پر لگا ہوا دروازہ غائب تھا۔ نیچے نگاہ ڈالی تو کانپ کر رہ گئی۔ دروازہ نیچے فرش پر پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی مادام گورمانی بھی بے ترتیب اور بے حس و حرکت پڑی تھیں۔

اس کے سر کی پشت سے خون نکل کر فرش پر بہہ رہا تھا۔ چیخ کی آواز اور شور سن کر مسز میک گھبرائی ہوئی دوڑی آئی اور جھک کر فرش پر گری ہوئی مادام کو دیکھنے لگی۔ صوفیہ نے ایک جھرجھری سی لی اور سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آئی۔ پھر مادام کے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے صوفیہ کو محسوس ہوا کہ اس کی روح اپنے شوہر اور بچے سے ملنے کے لیے جسم کی دیواریں توڑ کر جا چکی ہے۔

لیکن صوفیہ کو یقین تھا کہ ہاشم اس کا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو اس کے پاس اسی گھر میں تھا۔

مادام زرینہ گورمانی کو ان کے آبائی قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ مادام کی موت کے بعد اس کا وکیل صوفیہ سے ملنے آیا اور اس نے بتایا کہ مادام گورمانی اپنے بعد اپنی املاک کا وارث اسے بنا گئی تھی۔ صوفیہ کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔ یقیناً وہ ہاشم کو بھی اس کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

صوفیہ خوش تھی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہاشم اس کے نزدیک رہتا تھا۔ وہ ہر شام ہاشم کی قبر پر تازہ گلاب لے کر جاتی اور گھنٹوں وہاں بیٹھی اس سے باتیں کیا کرتی۔

ایک روز وہ ہاشم کی قبر پر پھول چڑھانے کے بعد واپس کاٹیج کی طرف آ رہی تھی کہ اسے دروازے پر ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ وہ قریب گئی تو پوچھنے پر اس آدمی نے بتایا کہ وہ اسٹیٹ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ کا آدمی ہے۔ ان کا ادارہ .. بڑکیں چوڑی کرنے کی اسکیم پر عمل درآمد کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح پہاڑی کے دامن کا وہ حصہ بھی سڑک کی چوڑائی میں آ رہا تھا جہاں ہاشم اور بچے کی قبریں تھیں۔

یہ سن کر صوفیہ پریشان ہو گئی۔

''آپ اس بارے میں پریشان مت ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ ہمارے لیے مشکل نہیں کہ ہم قبروں سے تابوت نکال کر دوسری جگہ دفنا دیں اور اس طرح ہم انہیں دوبارہ کچھ زیادہ بہتر بنا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' صوفیہ نے جواباً آمادگی کا اظہار کیا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

تھوڑے ہی عرصے بعد ہائی وے ڈیپارٹمنٹ نے اپنا کام شروع کر دیا۔

ایک شام صوفیہ نے اپنا پسندیدہ لباس پہنا۔ بال بنائے اور ہاشم کے پسندیدہ سرخ گلاب بالوں میں لگا کر اس کے تصور میں ڈوبی ہوئی اپنے کمرے کی تنہائی میں چلی آئی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہاں ہاشم اس کا منتظر ہوگا۔

پچھلی کھڑکی سے نم آلود ہوائیں اندر آ رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے ہاشم کی مخصوص خوشبو اس کے گرد پھیلنے لگی۔

کمرے میں کسی مرد کے وجود کا احساس ہوا۔ تمباکو کی مدھم خوشبو اور اس کے ساتھ ملی جلی کوئی نفیس مردانہ خوشبو...... تب ہی اچانک کال بیل چیخ اٹھی۔

صوفیہ نے ہاشم سے معذرت کی اور کمرے سے باہر نکل کے کاٹیج کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ کھولا تو ہائی وے ڈیپارٹمنٹ کا آدمی باہر کھڑا تھا۔

''میڈم! ہم نے تابوت نکلوائے تھے۔'' اس نے صوفیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کی لکڑی بہت بوسیدہ ہو چکی تھی اس لیے ٹوٹے ہوئے حصوں سے ہڈیاں نکل کر باہر گر گئیں اور...... اور ہمیں تعجب ہے کہ وہ...... ہڈیاں انسانی نہیں بلکہ کتے یا بلی کی ہڈیاں ہیں۔''

صوفیہ کے ذہن کو دھچکا سا لگا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہاشم کی مخصوص نفیس خوشبو کی مہک...... کتے اور بلی کے گوشت کی سڑاند میں تبدیل ہو گئی ہو۔

اس کا سر چکرایا اور اس سے پہلے کہ وہ نیچے گرتی، دروازے پر کھڑے ہوئے نوجوان نے اسے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ صوفیہ کا ڈوبتا ہوا ذہن یکایک ٹھہر گیا۔ نوجوان کے تنومند بازوؤں میں اسے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔

اور اس کا رخسار کسی سخت کپڑے سے مس ہو رہا تھا اور...... اس کے گرد ایک بہت ہی نفیس مردانہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

ایثار و قربانی کے جذبے سے گندھی اور محبت کی قدر سکھاتی ایک یادگار داستان

منقسم عورت

نشور ہادی

زندگی میں جمع، تفریق اور ضرب، تقسیم کا فلسفہ بھی بڑا عجیب ہے۔ بھلا سانسیں بھی کوئی شمار کرسکا ہے مگر... یہ طے ہے کہ انسانی زندگی کا نہ صرف ایک ایک لمحہ بلکہ ہر ایک سانس کی غرض و غایت تک اس کاتبِ تقدیر کے پاس درج ہے... انسان چاہے جتنی بھی کوشش کرلے زندگی کے حالات و واقعات میں ردوبدل نہیں کرسکتا اور اگر... کچھ تبدیلی آبھی جاتی ہے تو وہ یقیناً کسی کی آنسوئوں میں بھیگی دعائوں کا ہی نتیجہ ہوتا ہے... وہ جو پھولوں کی مہک، موسم کی رنگینی اور آسمان پر بکھرتی قوسِ قزح کی دیوانی تھی، محبت کے گداز میں ڈوبی جس کی آنکھیں ہمیشہ خوب صورت خوابوں کا احاطہ کیے رہتی تھیں... جانے آگہی کے کون سے لمحے میں حالات کی سنگینی کا احساس ہوا اور پھر محبت کے ان سارے رنگوں کو سمیٹ کر اس نے چولا بدلا اور اپنے مجازی خدا کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی کہ جیون کی یہی بات تو اس کے شعور نے اسے سمجھائی تھی۔ یہ اور بات کہ اب اس کی آنکھوں میں نہ تو اس گداز جذبے کی رمق تھی اور نہ خوابوں کی دلکشی... اس کے باوجود رشتے کی سچائی اسے ڈگمگانے نہیں دیتی تھی... شاید قدرت کو اس کی یہی ادا پسند آئی تھی کہ اچانک اپنی مہربانیوں کے در اس پر وا کردیے اور پھر سارے رنگ پلٹ کر اس کے گرد پھیل گئے۔

طارق کی شادی کو مشکل سے ایک مہینا گزرا تھا کہ وہ کمزوری محسوس کرنے لگا۔ شروع میں اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی، سوچا تھا کہ اچھی غذاؤں سے کمزوری ختم ہوجائے گی۔ اس نے غذا پر توجہ دی لیکن کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ کمزوری میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔

وہ اپنی بیوی رفعت کے ساتھ جس شہر میں رہتا تھا، وہاں اس کا کوئی قریبی عزیز تو کیا، دور کا بھی نہیں تھا۔ اپنی ملازمت کی وجہ سے اسے سب لوگوں سے دوری اختیار کرنا پڑی تھی۔ جب ملازمتیں عنقا ہوجائیں تو کسی ملازمت کے لیے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ملازمت بھی نئی تھی اس لیے دفتری شناسا تو تھے لیکن کوئی ایسا دوست نہیں تھا جس سے وہ اس سلسلے میں مشورہ کرتا۔ اس نے رفعت کو بھی اپنی اس کیفیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کے خیال میں وہ پریشان ہونے کے علاوہ کیا کرسکتی تھی۔

ڈاکٹروں سے طارق کو بہت چڑ تھی۔ وہ اپنے دور کے ڈاکٹروں کو قصاب کہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ڈیڑھ مہینے میں بھی کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں کیا تھا۔ اسے کبھی کوئی بڑی بیماری نہیں ہوئی تھی۔ نزلہ، بخار اور کھانسی کا علاج وہ معروف پیٹنٹ دواؤں سے خود ہی کرلیا کرتا تھا کبھی بد پرہیزی کی وجہ سے معدے میں کچھ گڑبڑ ہوجاتی تھی، اسے بھی وہ مختلف دواؤں سے خود ہی ٹھیک کرلیا کرتا تھا۔

پریشانی کی وجہ سے اس کی راتوں کی نیند بھی اڑگئی تھی۔ وہ بہ مشکل چند گھنٹے سو پاتا۔ اس شب بےداری کا اثر دفتر میں اس کی کارکردگی پر بھی پڑتا تھا جسے اس کے افسران بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ رات کو بستر پر پڑا وہ سوچتا رہتا تھا کہ اس طرح تو ملازمت بھی ہاتھ سے جاسکتی ہے۔

''ڈاکٹر۔'' ایک رات وہ لیٹے لیٹے بے اختیار زیر لب بڑبڑایا۔ ''یہ قصاب! جب ڈاکٹر بنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ قوم کی خدمت کے لیے......''

''کیا کہہ رہے ہو؟''

رفعت بھی اس وقت سوئی نہیں تھی، غنودگی میں تھی، وہ چونک پڑی۔

ان دونوں کی شادی رفعت سے طارق کی محبت کے باعث ہوئی تھی۔ ان کا اندازِ گفتگو بے تکلفانہ ہوتا تھا۔

طارق نے ایک طویل سانس لی۔ ''ڈاکٹروں کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگا تھا۔ بزعمِ خود قوم کی خدمت کے لیے ڈاکٹر بنتے ہیں اور پھر قوم کی کھال اتارنا شروع کرتے ہیں۔ چلیں کھال اتاریں مگر ٹھیک تو کردیں۔ اس کے برعکس ان کی بے پروائی یا غلط دواؤں کی وجہ سے مریض مر بھی جاتے ہیں۔ اخبارات میں اور ٹی وی وغیرہ پر آئے دن ان کی خبریں آتی رہتی ہیں لیکن نہ ان کے کان پر جوں رینگتی ہے، نہ حکومت ان کی گوشمالی کرتی ہے۔''

''میں ڈاکٹروں کے بارے میں تمہارے ان خیالات سے واقف ہوں لیکن اس وقت بارہ بجے رات کو تمہیں یہ قصیدہ پڑھنے کی کیا سوجھی۔'' وہ آہستہ سے ہنسی۔

اس وقت پہلی مرتبہ طارق کو خیال آیا کہ رفعت کو بتا ہی دینا چاہیے۔ آخر وہ اس کی شریکِ حیات تھی۔ آگے چل کر اس کی صحت نہ جانے کیا رنگ اختیار کرے اور بات رفعت سے چھپی نہ رہ سکے۔ پریشان تو وہ ہوتی ہی لیکن اچانک معلوم ہونے پر اس کے دماغ کو جھٹکا بھی لگتا۔

''ڈیڑھ مہینے سے میری کمزوری بڑھتی چلی جارہی ہے رفعت!'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بتایا۔

''کیوں مذاق کررہے ہو؟'' رفعت پھر ہنسی۔ ''اچھے خاصے تو ہو۔''

یہ حقیقت تھی کہ طارق بہ ظاہر تندرست ہی نظر آتا تھا۔

''میں جانتا تھا، تم یہی کہو گی لیکن میں مذاق نہیں کررہا ہوں رفعت! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شے اندر ہی اندر مجھے گھن کی طرح کھائے جارہی ہے جبکہ بظاہر میں بالکل ٹھیک نظر آتا ہوں۔ اس کمزوری کی وجہ سے دفتر میں میری کارکردگی بھی متاثر ہورہی ہے۔''

طارق کو اتنا سنجیدہ دیکھنے کے بعد رفعت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ وہ اٹھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور غور سے طارق کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''واقعی طارق؟'' وہ اب سنجیدہ تھی۔

''ایسا سنگین مذاق میں تم سے کیوں کروں گا رفعت؟''

''اور مجھے تم اتنے دن بعد بتارہے ہو؟''

''میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پریشان ہو۔ اس وقت تو اس خیال سے بتادیا کہ اچانک مجھے کچھ ہوگیا تو......''

''خدا نہ کرے۔'' رفعت نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''مگر اس حالت میں تم ڈاکٹروں کے بارے میں اپنے خیالات کو جہنم میں جھونکو، کسی اچھے ڈاکٹر سے رابطہ کرو۔''

''اچھا ڈاکٹر!'' طارق تلخی سے مسکرایا۔ ''اچھا ڈاکٹر کیسا ہوتا ہے رفعت؟''

''میں نے ابھی کہا نا کہ ان خیالات کو اپنے دماغ سے نکال پھینکو۔'' رفعت نے کہا۔ ''میں کل ہی یہاں کے

سب سے اچھے ہاسپٹل سے معلوم کروں گی کہ تمہیں کس ڈاکٹر کو دکھایا جاسکتا ہے۔ ممکن ہوتو اس سے کل ہی کا کوئی وقت لے لوں گی۔''

''اچھے ہاسپٹل کا ڈاکٹر!...... کل ہی کا وقت!'' طارق کے لہجے میں طنز تھا۔

''کل کا نہیں تو پرسوں کا سہی! ڈاکٹر کو دکھانا بہر حال ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' طارق نے شکست کھا جانے والے انداز میں کہا۔ ''جو چاہو، کرو۔''

دوسرے دن طارق اپنے دفتر پہنچا ہی تھا کہ اس کے آفیسر نے اسے اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔ وہ نہایت سخت مزاج شخص تھا۔

''مسٹر طارق!'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آپ کی میز پر فائلوں کا مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ مجھے رپورٹ تو ملتی رہی ہے لیکن اب نوبت یہ آگئی ہے کہ کمپنی کو نقصان پہنچنا شروع ہوجائے گا۔''

''میں معافی چاہتا ہوں سر!'' طارق نے کہا۔ ''دراصل کچھ دن سے میں خاصی کمزوری محسوس کررہا ہوں۔ اسی کی وجہ سے......''

''کمزوری محسوس کررہے ہیں تو ڈاکٹر کو دکھایئے!'' آفیسر نے اس کی بات کاٹی۔ ''پرسوں شام تک مجھے یہ رپورٹ مل جانی چاہیے کہ اب آپ کی میز پر کوئی فائل نہیں ہے۔''

''میں پوری کوشش کروں گا سر!''

''مجھے بس رپورٹ ملنی چاہیے کہ پرسوں شام کو آپ کی میز پر کوئی کام پینڈنگ میں نہ ہو۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔''

طارق واپس آگیا۔ چہرے سے فکرمندی صاف ظاہر تھی۔ گزشتہ دنوں میں اسے تجربہ ہوچکا تھا کہ دو گھنٹے سے زائد کام کرنے میں اس پر غشی طاری ہونے لگتی تھی جس سے بچنے کے لیے وہ تیس چالیس منٹ آرام کرلیتا تھا۔ اس دن بھی اس نے زیادہ کام کرنے کی کوشش کی لیکن غشی کے آثار دیکھ کر کام روک دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ ملازمت گئی اب ہاتھ سے......

اس کی تنخواہ بس اتنی تھی کہ گھر کا کرایہ، گھریلو اخراجات، کار کی ضروریات اور بوڑھے والدین کو کچھ رقم بھیجنے کے بعد کم پس انداز کر پاتا تھا۔ تین سال کی ملازمت میں اس نے جو رقم پس انداز کی تھی، وہ چند ماہ سے زیادہ ساتھ نہ دیتی اور ڈاکٹروں کا علاج شروع ہوجاتا تو چند مہینے بھی نہیں گزر پاتے۔

دفتری وقت ختم ہونے سے آدھے گھنٹے پہلے اس نے کام چھوڑ دیا۔ تھکن ختم کرنے کے لیے اتنا آرام کرنا ضروری تھا ورنہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس سے کوئی ایکسیڈنٹ ہوجاتا۔

جب وہ گھر لوٹا تو حسب معمول اسے آرام کی ضرورت تھی۔ اس روز رفعت نے چائے کے ساتھ کچھ زیادہ ہی اہتمام کرڈالا تھا۔ وہ اتنی ہی فکرمند ہوگئی تھی کہ طارق کے غذائی معاملے میں پہلے سے زیادہ خیال رکھنا چاہتی تھی۔

دونوں نے چائے پی لی تو رفعت نے کہا۔ ''ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر کے پاس چلنا ہے۔''

''ارے!'' طارق طنزیہ سے انداز میں ہنس دیا۔ ''آج ہی کا ٹائم مل گیا؟ اب تو ٹائم لینے کے لیے بھی تاریخ دی جاتی ہے۔''

''میری ایک دوست ڈاکٹر ہے۔ آج کل امریکا میں ہے۔ میں نے اس سے فون کرکے مشورہ کیا تھا۔ اسی نے ایک ڈاکٹر کا نام بتایا جس کو اس نے فون بھی کردیا تھا۔ اسی لیے آج کا وقت مل گیا۔''

☆☆☆

ساڑھے آٹھ بجے دونوں میاں بیوی ڈاکٹر کے کمرے میں تھے۔ طارق نے وضاحت سے اپنی کیفیت بیان کردی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے مختلف طریقوں سے پندرہ بیس منٹ تک اس کا معائنہ کیا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا، تاہم وہ نسخہ لکھنے لگا۔ نسخہ لکھ کر اس نے طارق کی طرف بڑھایا۔

''یہ ایک ہفتے تک استعمال کرکے دیکھیے، پھر بتایئے گا مجھے!''

طارق نے نسخہ لے کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے کہا۔ ''یہ صرف وٹامنز ہیں اور میں ان میں سے ایک کے علاوہ سب استعمال کرچکا ہوں۔''

''اوہ! کتنے دن استعمال کیا ہے؟''

''قریب قریب ایک مہینا ہوچکا۔''

ڈاکٹر کے چہرے سے سوچ بچار کا اظہار ہوا، پھر اس نے دوبارہ کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تین ٹیسٹ لکھ کردے رہا ہوں۔ ان کی رپورٹ دیکھنے کے بعد فیصلہ کرسکوں گا کہ کیا معاملہ ہے۔''

لیکن وہ تینوں ٹیسٹ کروانے کے بعد صرف یہ معلوم ہوسکا کہ اس کا خون بننا رک گیا ہے۔

''عجیب بات ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ کی عمر کے کسی شخص کا ایسا کیس میرے پاس نہیں آیا۔ خیر، ایک ٹیسٹ اور کروایئے۔ اس سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ خون نہ بننے کا سبب کیا ہے۔''

وہ ٹیسٹ بھی کروایا گیا لیکن سبب معلوم نہیں ہوسکا۔

''بہت ہی عجیب کیس ہے آپ کا!...... جسمانی طور پر تو کوئی ایسی علامت ہی نہیں ہے کہ آپ کے جسم میں خون کی کمی ہوگئی ہے اور اس رپورٹ نے تو معاملہ اور زیادہ پیچیدہ کردیا ہے۔''

طارق سنجیدگی سے بولا۔ ''خون کے کم ہونے کی رفتار سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ میں کتنے دن میں مرجاؤں گا۔''

''طارق!'' رفعت بول پڑی۔ ''پلیز!'' وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

''اتنے مایوس نہ ہوں طارق صاحب!'' ڈاکٹر بولا۔ ''میں تو خیر یہ کیس سمجھنے سے قاصر ہوں لیکن آپ ڈاکٹر کاشف سے مل لیں۔ وہ مجھ سے پندرہ سال سینئر ہیں۔ میرے استاد بھی ہیں۔ میں انہیں فون کردیتا ہوں کہ وہ آپ کو کل ہی دیکھ لیں۔''

ڈاکٹر کاشف شہر کا سب سے مشہور فزیشن تھا۔

طارق اور رفعت اس سے بھی ملے۔ اس نے تمام رپورٹس دیکھیں۔ طارق سے بھی اس کی نہ صرف کیفیت معلوم کی بلکہ اس کے ماضی کے بارے میں بھی سوالات کیے۔ اس کے بعد خود بھی معائنہ کیا۔

''ایک ٹیسٹ اور کروا لیجیے!'' اس نے لکھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ خون بننا تو بند ہوگیا ہے لیکن جو خون آپ کے جسم میں ہے، اس میں تو کمی نہیں ہو رہی ہے اور اگر ہو رہی ہے تو اس کی رفتار کیا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب!'' رفعت بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کسی نے ان پر جادو تو نہیں کردیا ہے؟''

ڈاکٹر کاشف دھیرے سے ہنس پڑا۔ ''یہ اکیسویں صدی ہے مسز طارق!...... اور آپ...... میرا خیال ہے کہ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔''

''گریجویٹ۔'' طارق نے مرجھائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کھل کر مسکرانا یا ہنسنا تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ ''ان کا تعلق بھی ایک ماڈرن گھرانے سے ہے لیکن توہم پرستی ان کے خاندان میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی ماحول میں انہوں نے بائیس سال گزارے ہیں۔''

رفعت کے چہرے سے صاف ظاہر ہوگیا کہ اسے طارق کا یہ سب کچھ بیان کرنا اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس کا ردِعمل الفاظ کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا۔

ڈاکٹر کاشف سے ملنے کے بعد واپسی پر طارق نے کہا۔ ''آئی ایم ویری سوری رفعت!''

''کس بات کی سوری؟'' رفعت نے تعجب سے پوچھا۔

''مجھے ڈاکٹر سے تمہارے گھر والوں کے بارے میں اتنی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ نہ جانے کیوں بکتا ہی چلا گیا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ تمہیں بُرا لگا ہوگا۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ تم نے کہا، وہ غلط بھی تو نہیں۔ اس ماحول کا اثر تو ہے مجھ پر۔'' رفعت ہی کار ڈرائیو کررہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ کی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''ابھی وقت تو ہے۔ تمہارا یہ ٹیسٹ بھی کروالیا جائے۔''

''جو چاہو کرواؤ۔ ان دنوں میری لگام تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔''

طارق نے یہ سب اتنی سنجیدگی سے کہا تھا کہ رفعت نے اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اسی رات طارق کا وہ ٹیسٹ بھی ہوگیا۔ رپورٹ اگلی شام ملنا تھی۔

دوسری صبح دفتر جانے کی تیاری میں طارق کچھ سست رہا۔

''آج تو لیٹ ہوجاؤ گے تم!'' رفعت بولی۔ ''تم مجھے یہ بھی بتا چکے ہو کہ تمہارا آفیسر بہت سخت مزاج ہے۔''

''لیٹ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ملازمت تو ہاتھ سے جانے ہی والی ہے۔''

''کیوں؟'' رفعت چونکی۔

اس وقت تک طارق نے اسے نہیں بتایا تھا کہ اس کا آفیسر اس سے کیا کچھ کہہ چکا ہے۔ اب رفعت نے سوال کیا تو اس نے وہ سب بتا ہی دیا۔

''یہ تو ایک اور پریشانی والی بات ہوجائے گی۔'' رفعت نے بے اختیار کہا۔

''مجبوری ہے، میں زیادہ دیر کام کر ہی نہیں سکتا۔'' طارق نے کہا۔ ''دو گھنٹے کا کوئی پارٹ ٹائم جاب تلاش کرنا پڑے گا۔ اگر دو جاب مل گئے تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''اس کے باوجود اتنے پیسے تو نہیں آئیں گے جو اس ملازمت کی وجہ سے آجاتے ہیں۔''

''مجبوری ہے۔'' طارق نے دوبارہ کہا۔ ''اخراجات میں کمی کرنی پڑے گی۔ کار بیچ دیں گے۔ گھر بھی کوئی دوسرا لینا پڑے گا جس کا کرایہ کم ہو۔ اس کے علاوہ بھی جو

اخراجات کم کیے جاسکے، کریں گے۔''
رفعت چپ رہ گئی۔
''میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے رفعت!'' طارق پھر بولا۔ ''تمہاری شادی کسی مالدار گھرانے میں آسانی سے ہوسکتی تھی۔ تم مجھے پسند آگئی تھیں کالج میں، اس لیے رشتہ بھجوادیا۔ نہ جانے تمہارے والدین کو مجھ میں کیا چیز اچھی لگی کہ انہوں نے رشتہ قبول بھی کرلیا۔''
''کیوں فضول باتیں کرنے لگے۔ اس طرح اور لیٹ ہوجائیں گے دفتر پہنچنے میں!''
''میں نے ابھی کہا تھا نا کہ لیٹ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''
''تو تم خود ہی جو استعفا دے دو۔''
''نہیں۔'' طارق نے کہا۔ ''وہ مجھے الگ کریں گے تو کمپنی کے قانون کے مطابق وہ مجھے تین مہینے کی تنخواہ بھی دیں گے۔''
''تو ٹھیک ہے۔ خیر، اب جاؤ۔''

☆☆☆

طارق کے جانے کے بعد رفعت گھر کے کام کاج میں مصروف ہوجاتی تھی۔ اکیلے رہنے کی وجہ سے ملازم یا ملازمہ رکھنا انہوں نے شروع ہی سے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود رفعت گھر کے سب کام کاج جانتی تھی جو اس کی والدہ نے اسے سکھائے تھے۔ وہ بھی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں جب ان کی شادی رفعت کے والد سے ہوئی تھی۔

رفعت بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا دل بہت بھاری ہوگیا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی آگئی تھی۔ بہت سی یادیں اس کے ذہن میں چکرانے لگی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ اپنا موبائل اٹھایا۔ نمبر ملاتے وقت اس کی انگلیوں میں لرزش تھی۔ رابطہ ہوا۔ دوسری طرف تیسری گھنٹی بجنے کی نوبت نہیں آئی اور کال ریسیو کرلی گئی تھی۔

''ہیلو رفعت!'' دوسری طرف سے آنے والی مردانہ آواز میں جذباتیت تھی۔ ''اسکرین پر تمہارا نام دیکھ کر میں پل بھر کے لیے تو سکتے ہی میں رہ گیا تھا۔''
''کیسے ہو شفیق!'' رفعت کی آواز کچھ بھرائی ہوئی تھی۔
''شاید اس وقت تو بہت اچھا ہوں، تمہاری آواز سن کر!'' جواب آیا۔ ''کئی ماہ بعد تمہاری آواز سنی ہے لیکن محسوس ہورہا ہے جیسے صدیوں بعد سن رہا ہوں۔ آج کیسے خیال آگیا میرا؟...... میں تو اپنے وعدے پر قائم رہا کہ اب تم سے کبھی رابطہ نہیں کروں گا۔''
''میں اپنا وعدہ اس طرح توڑ رہی ہوں کہ تم سے رابطہ کیا ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکی شفیق...... اور شاید بھول بھی نہیں سکتی لیکن اپنی ماں کی تربیت کے باعث ایک اچھی مشرقی بیوی کا کردار نبھانے کی کوشش کرتی رہی ہوں اور آخری سانس تک کرتی رہوں گی۔ اس وقت میں نے بہت پریشانی کے عالم میں فون کیا ہے تمہیں۔''
''خیریت؟'' شفیق نے کچھ گھبرا کر پوچھا۔
''طارق ایک ایسی عجیب بیماری کا شکار ہوگئے ہیں کہ اس کا سراغ ہی نہیں مل رہا ہے۔''
''کیا مطلب؟''
رفعت تفصیل سے سب کچھ بتانے لگی۔
''ارے! یہ تو عجیب بیماری ہے۔ میرا خیال ہے کہ طارق کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں۔ یہ معاملہ کچھ نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔''
''مجھے بھی کچھ یہی شبہ ہونے لگا ہے اب۔ کل جو ٹیسٹ کروایا ہے، اس کی رپورٹ ملے گی آج۔ اس کے بعد ہی سوچوں گی کہ کیا کرنا چاہیے...... ابھی تو میں تمہیں دوسری بات بتاؤں، کیونکہ اب وہ دو گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر پاتے اس لیے ان کو زبانی نوٹس تو مل چکا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ملازمت ہی سے ہاتھ دھونے پڑیں۔''
''اوہ! یعنی مالی مشکلات بھی؟''
''ظاہر ہے۔ طارق کہہ رہے تھے کہ اخراجات کم کرنا پڑیں گے۔'' رفعت نے وہ سب کچھ بتا دیا جو طارق نے کہا تھا۔
''اوہ!'' شفیق کے منہ سے پھر نکلا۔
''ان حالات میں میرے لیے تو سانس لینا بھی مشکل ہوجائے گا۔'' رفعت کی آواز بھرا گئی۔ ''موجودہ حالات سے تو میں نے سمجھوتا کرلیا تھا لیکن اب مستقبل میں جو کچھ ہونے والا ہے، اس میں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔''
''وہ تو ظاہر ہے۔ موجودہ حالات سے سمجھوتا کرکے ہی تم نے کمال کیا ہے۔ اس سے زیادہ تو تمہارے لیے سوہانِ روح ہوگا۔''
''یہ مجھے ابھی ذرا دیر پہلے ہی معلوم ہوا ہے لیکن سوچ سوچ کر اتنی سی دیر میں مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔''
''تمہارے ساتھ طارق کا برتاؤ کیسا ہے؟''
''محبت تو وہ مجھ سے کرتے ہیں، بہت کرتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔ کم از کم تم عدم توجہی کا شکار تو نہیں ہوئیں۔''

''اب میرے سامنے دو مسئلے ہیں۔'' رفعت نے کہا۔

''ان کی بیماری اور مالی مشکلات! اگر میں ڈیڈی سے بات کروں تو مالی معاملہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا لیکن میں طارق کا مزاج جانتی ہوں۔ ڈیڈی کا مالی تعاون ان کے لیے ناقابلِ قبول ہوگا۔''

''صاف صاف بات کرو رفعت! تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ تم نے غلط سمجھا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے فون نہیں کیا کہ تم سے مالی تعاون چاہوں۔''

''تمہارا حق ہے مجھ پر۔'' شفیق نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''تم میری نہ بن سکیں لیکن میرے لیے اب بھی تم ہی سب کچھ ہو۔''

''میں اپنا کوئی حق استعمال نہیں کرنا چاہتی۔ دوسرے یہ کہ اگر میں تم سے مالی تعاون لے بھی لوں تو طارق کو کیا بتاؤں گی۔ وہ پوچھیں گے تو ضرور کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''میں تم سے صرف مشورہ چاہتی ہوں۔ میں ان حالات میں کیا کرسکتی ہوں۔ خود میرا دماغ تو تھک گیا ہے سوچ سوچ کر۔''

''سوچنا تو مجھے بھی پڑے گا کہ تمہاری مدد کس طرح کی جائے۔''

''سوچنا شفیق پلیز!''

''مجھ سے بات کرتے ہوئے تمہیں پلیز نہیں کہنا چاہیے۔''

''چلو میں سوری کرلیتی ہوں۔'' رفعت بے دلی سے مسکرائی۔ پھر بولی۔ ''ایک بات اور بھی ہے میرے ذہن میں۔ وہاں آکر شاہ جی سے ملوں۔ وہ کوئی ایسا وظیفہ بتاسکتے ہیں کہ طارق کی جان چھوٹ جائے اس بیماری سے۔''

''کب آؤ گی؟''

''موقع دیکھنا پڑے گا۔ بس دن میں کسی وقت جلد از جلد آؤں گی اور اسی دن جلد از جلد واپس بھی لوٹوں گی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کا تو فاصلہ ہے۔'' رفعت نے کہا پھر بولی۔ ''موقع نہ جانے پھر کب ملے۔''

''پہلے کسی سائیکاٹرسٹ......''

''ابھی کہہ تو چکی ہوں کہ آج رپورٹ ملنے کے بعد کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کے بارے میں معلوم کروں گی۔ مالی بحران کے سلسلے میں کوئی مشورہ دو۔''

''ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے میرے ذہن میں۔''

شفیق نے کہا۔ ''تمہارے پاس پرائز بونڈ ہیں؟''

''ہیں کوئی بیس ہزار کے لیکن اس سے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''

''میرے ذہن میں کوئی اور بات ہے۔ پہلے میں اس کا بندوبست کرلوں، پھر بتاؤں گا۔''

''جلدی بتانا۔ دماغ بہت الجھا ہوا ہے..... اور ہاں! فی الحال ڈیڈی سے اس کا ذکر نہ کرنا بلکہ گھر میں کسی سے بھی نہیں۔''

''جب تم نے مجھے فون کیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم اپنے گھر والوں کو ابھی اس سے بے خبر ہی رکھنا چاہتی ہو۔''

''ہاں۔ اچھا اب میں فون بند کررہی ہوں۔ گھر کا کام کاج دیکھنا ہے۔ تم سے کل بات کروں گی۔ تم مجھے فون مت کرنا کیونکہ ملازمت چھوڑنے کے بعد طارق اب گھر پر ہی رہیں گے۔''

''مجھے خیال ہے۔''

''اچھا خدا حافظ۔''

رفعت نے رابطہ منقطع کیا اور گھر کا کام کاج دیکھنے کے لیے کمرے سے نکلی۔

شفیق اس کا چچازاد بھائی تھا۔ ان دونوں ہی نے نہیں بلکہ طارق نے بھی ایک ہی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ رفعت اور شفیق ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس معاملے میں انہوں نے اتنی احتیاط برتی تھی کہ گھر یا کالج میں بھی کسی کو اس کا شبہ نہ ہو۔ طارق اس سے بے تکلف تو تھا لیکن رفعت کی دانست میں وہ بے تکلفی دوستانہ فضا میں تھی۔ اسے کبھی ایک پل کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ طارق اسے پسند کرنے لگا ہے یا اس سے محبت کرنے لگا ہے۔

شفیق اور طارق کالج میں رفعت سے سینئر تھے۔ رفعت نے ان کے دو سال بعد گریجویشن کیا تھا۔ وہ اور شفیق طے کرچکے تھے کہ جب وہ بی اے کرلے گی تو وہ اپنے گھر والوں کو اس کے رشتے کے لیے بھیجے گا۔

لیکن طارق بازی لے گیا۔ رفعت کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا کہ اس کا رشتہ آگیا۔ رفعت کے والد نے طارق سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اسے چائے پر بلایا۔ رفعت کو اس صورتِ حال کا علم نہ ہو، یہ ممکن ہی نہ تھا۔ اسے توقع تھی کہ اس کے والد نے محض تکلفاً طارق کو چائے پر بلایا تھا۔ وہ یقینی طور پر رشتے سے انکار کا کوئی جواز بنالیتے۔ ایک جواز تو یہی تھا کہ ابھی رفعت کا رزلٹ نہیں آیا تھا۔ اسی بہانے بات ٹالی جاسکتی

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔
MEDICAM
SHAMPOO
مہینے بھر کا شیمپو
MEDICAM
SHAMPOO
MEDICAM
MEDICAM
MEDICAM
MEDICAM
KALONJI
3 Plus SHAMPOO
SHIKAKAI
ANTI
DANDRUFF
AMLA
HERBAL
ANTI-LICE
EGG
KALONJI
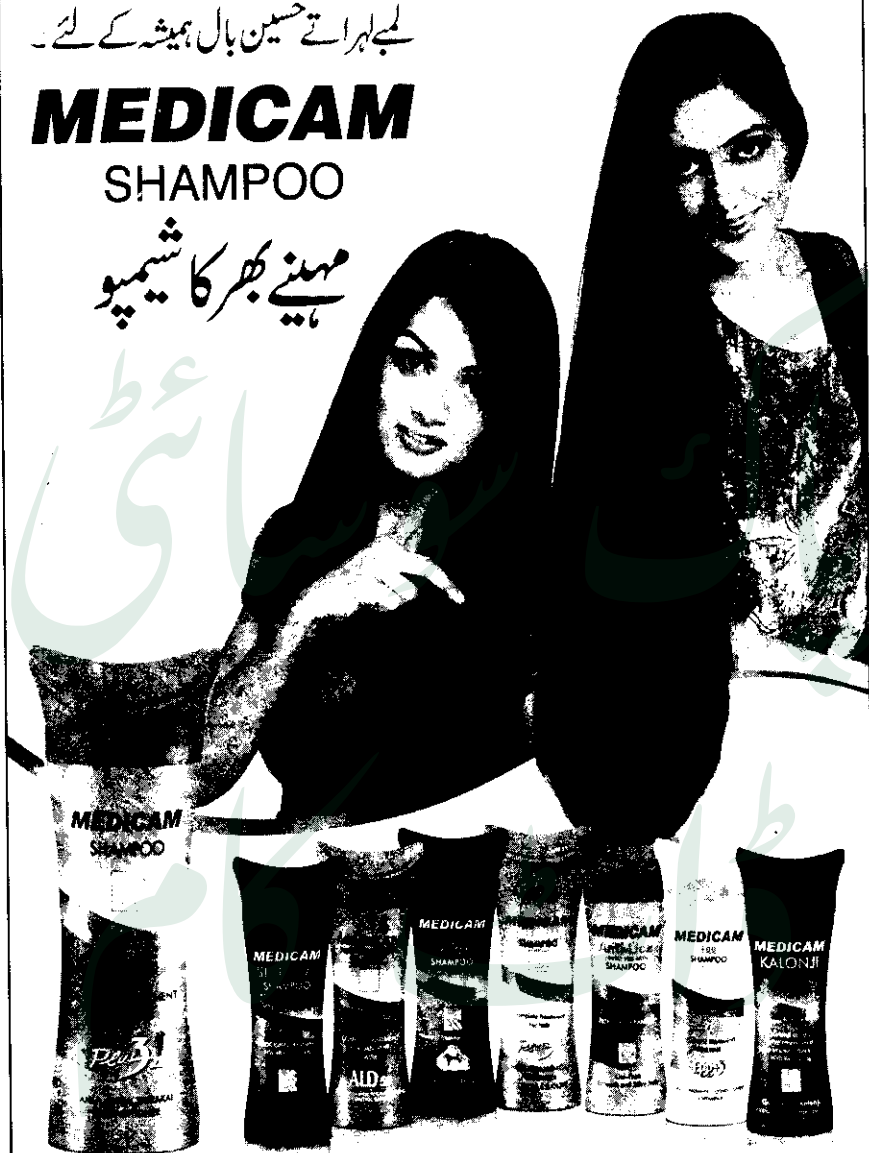
تھی۔ وہ اپنی نازوں میں پلی بیٹی کو ایک متوسط گھرانے میں ہرگز نہ دیتے۔ رفعت نے اسی انداز میں سوچا تھا۔

گفتگو میں یہ بات آئی بھی کہ ابھی رفعت کا رزلٹ نہیں آیا۔ اس پر طارق کا جواب تھا کہ رفعت اس کے ساتھ کالج میں پڑھ چکی ہے اس لیے وہ جانتا ہے کہ فیل ہونے کا تو کوئی امکان دور دور تک نہیں کیونکہ رفعت بہت ذہین ہے۔ نیز اسے یہ عجلت بھی نہیں کہ فوری طور پر شادی ہو۔ فی الحال نکاح کر دیا جائے، رخصتی رزلٹ آنے کے بعد ہو۔

رفعت کو ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس سے پوچھے بغیر رشتہ قبول نہیں کیا جائے گا، لیکن ہوا اس کے برخلاف!

طارق نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا قائل ہے اس لیے اس کی ایک گزارش یہ بھی ہوگی کہ رشتہ قبول ہونے کی صورت میں رفعت کو اتنا جہیز نہ دیا جائے جو اس کے گھر میں سا بھی نہیں سکے۔

رفعت کے والد کو طارق کی شخصیت میں شاید کوئی اور بات بھی اچھی لگی ہو لیکن یہ بات انہیں بہت پسند آئی کہ طارق بڑے جہیز کا لالچی نہیں تھا۔

اس موقع پر رفعت کی والدہ نے بھی دخل اندازی کی۔ وہ خود ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے ٹہوکا دینے پر رفعت کے والد نے فوری نکاح کی تجویز نہ صرف منظور کرلی بلکہ اسی نشست میں تاریخ بھی طے کر دی گئی جو صرف پندرہ دن کے بعد کی تھی۔

رفعت نے سنا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اپنے باپ کے مزاج سے بھی واقف تھی۔ وہ کسی بات کی ہامی بھر لیتے تھے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ٹس سے مس نہیں کر سکتی تھی۔

ماں نے رفعت کو بتاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سمجھ لیا تھا کہ کالج ہی کے زمانے سے تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہو۔''

رفعت چپ رہ گئی۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی قوتِ گویائی ختم ہوگئی ہو۔

والدہ اس کی خاموشی کو ''شرم'' سمجھیں اور مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ اگر وہ پلٹ کر دیکھ لیتیں تو انہیں رفعت کی آنکھوں میں آنسو نظر آ جاتے۔

رات گئے اس نے دل گرفتگی کی حالت میں شفیق کو فون کیا۔

''ارے!'' شفیق کی ہنسی سنائی دی۔ ''اتنی رات کو فون؟ کیا نیند نہیں آ رہی آج؟''

''ایک خبر دینی ہے تمہیں!'' رفعت کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

''خیریت؟'' شفیق اس کا لہجہ محسوس کر کے سنجیدہ ہوگیا۔

''مجھے تو وہ بری خبر ملی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں کیسے بتاؤں۔'' رفعت نے کہا۔

''یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی تھا کہ طارق کے گھر والے اس کے لیے میرا رشتہ مانگنے آئے تھے۔''

''ہاں بتایا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ تمہارے والد ٹال جائیں گے۔''

''غلط فہمی تھی میری۔''

''تم میرے پیروں تلے سے زمین نکال رہی ہو۔ کھل کر بتاؤ!''

''ڈیڈی نے رشتہ قبول کرلیا ہے۔'' رفعت رو پڑی۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر کہا گیا۔ ''تم ایک سنگین مذاق تو نہیں کر رہی ہو رفعت!''

''کاش یہ مذاق ہوتا!''

''یہ کیسے ممکن ہے رفعت؟ کیا چچا جان اتنا بھی نہیں سوچ سکے کہ طارق تمہیں اتنا جیب خرچ بھی نہیں دے سکے گا جو چچا جان تمہیں دیتے ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے کیا سوچا تھا۔'' رفعت سسکیاں لینے لگی۔

''تم سے پوچھا بھی نہیں؟''

''میرا دم گھٹ رہا ہے شفیق!...... بولا نہیں جا رہا ہے۔ پھر کسی وقت بات کروں گی۔'' رفعت کی آواز واقعی اس کے گلے میں پھنس رہی تھی۔

''ڈیڈی تو چچا جان سے سخت ناراض ہوں گے۔ میرے اور تمہارے معاملے سے تو خیر وہ بے خبر ہیں لیکن انہیں جھنجلاہٹ اس بات پر بھی ہوگی کہ اتنے بڑے معاملے میں انہوں نے بھائی سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔''

رفعت کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ گلا رندھا ہوا تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس نے موبائل آف کیا اور تکیے میں منہ چھپا کر سسکیاں لیتی ہوئی رونے لگی۔

چند لمحے گزرے تھے کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال شفیق ہی کی تھی جو رفعت نے ریسیو نہیں کی۔ اس سے اس وقت بولا ہی نہیں جا سکتا تھا تو کال ریسیو کر کے کیا کرتی۔

شفیق نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا، وہ ہو کر رہا۔

اس کے والد رفعت کے والد کے بڑے بھائی تھے۔ انہیں اسی دن اطلاع مل چکی تھی اور وہ شدید برہم ہوئے تھے۔ ان دونوں میں جو باتیں ہوئی تھیں، وہ ایک دن بعد رفعت کو شفیق ہی سے معلوم ہوئیں۔ رفعت کے والد کو خیال آیا تھا کہ اس کے بڑے اس رشتے کی مخالفت کریں گے جبکہ یہ رشتہ انہیں بھا گیا تھا، اسی لیے انہوں نے خود ہی بات طے کرلی۔ انہوں نے سوچا یہ تھا کہ بعد میں بڑے بھائی کو سمجھا بجھا کر انہیں منالیں گے اگر وہ ناراض ہوئے، مگر ان کی خفگی بہت شدید تھی۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جس شادی کے بارے میں ان سے بات کرنی بھی مناسب نہیں سمجھی گئی، وہ اس شادی میں شرکت بھی نہیں کریں گے۔

لیکن رشتے میں پڑتی ہوئی یہ دراڑ بھی رفعت کے والد کو ان کا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کرسکی۔ ان کا مزاج ہی یہ تھا کہ جو کہہ دیا، اس سے وہ ایک قدم پیچھے ہٹنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے تھے۔

''اب میری زندگی کیسے گزرے گی رفعت؟'' فون پر شفیق نے کہا تھا۔

رفعت کی آنکھیں رو رو کر خشک ہوچکی تھیں۔ ''جیسی زندگی میں گزاروں گی، ویسی ہی زندگی تم گزارنا اور کیا ہوسکتا ہے۔''

''تم کیسی زندگی گزاروگی؟''

''ایک مشرقی لڑکی کو اپنے شوہر کے ساتھ جیسی زندگی گزارنی چاہیے، ویسی ہی زندگی گزارنے کی کوشش کروں گی۔'' رفعت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ''یہ میں ابھی نہیں کہہ سکتی کہ میں اس میں کتنی کامیاب رہوں گی، اور تم بھی کسی اچھی لڑکی سے شادی کرلینا۔ ہمارے مقدر میں یہی لکھا تھا شفیق!'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''یہ مجھ سے نہ کہو کہ میں کیا کروں گا اور کیسی زندگی گزاروں گا۔ بہرحال، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم خود کو مشرق کی بیٹی ثابت کررہی ہو۔''

''شادی کرلینا شفیق...... پلیز! ورنہ میں خود کو ہمیشہ تمہارا مجرم سمجھتی رہوں گی۔''

''یہ سب مقدر کے کھیل ہیں کوئی کسی کا مجرم نہیں ہوتا۔''

رفعت نے دکھی دل کے ساتھ رابطہ منقطع کردیا۔ اس کا خیال تھا کہ شفیق شادی نہیں کرے گا۔ وہ اسے شدت سے چاہتا تھا۔

اور پھر مقررہ تاریخ پر اس کا طارق سے نکاح ہوگیا۔ رزلٹ آیا، وہ اچھی پوزیشن سے پاس ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ بابل کے گھر سے وداع بھی ہوگئی۔

شادی کے بعد اس نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ اب طارق ہی اس کا سب کچھ ہے۔ اس میں وہ...... .... بڑی حد تک کامیاب شاید اس لیے بھی رہی کہ طارق اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ اس کے سر میں درد بھی ہوجائے تو اس کی پریشانی دیدنی ہوتی تھی مگر اس کے بعد بھی رفعت کے دل میں شفیق کی یادیں چٹکیاں تو لیتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے شفیق کو فون نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح شفیق اسے بھول جائے گا لیکن وہ یہ بھی سوچتی تھی کہ شفیق بھی شاید اسی طرح سوچتا ہو۔ فون اس نے بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بھی چاہتا ہوگا کہ رفعت ایک خوش گوار زندگی گزارے، اس میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔

ان کے والدین میں ابھی تک صلح نہیں ہوئی تھی۔ رفعت کو خاندان کے دوسرے لوگوں سے شفیق کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اب اس نے ایم اے کی تیاری شروع کردی تھی۔ رفعت کا خیال تھا کہ اسی طرح شفیق بھی اس کی خیریت معلوم کرتا رہتا ہوگا۔

یہ شادی کے بعد پہلا موقع تھا کہ فون پر ان دونوں کی بات ہوئی تھی۔

☆☆☆

پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ طارق نے گھر واپس آکر اپنی برخاستگی کے خط کے ساتھ تین ماہ کا چیک رفعت کے ہاتھ میں تھمادیا۔

''آج رپورٹ کب ملے گی؟'' اس نے پوچھا۔

رفعت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم یہ دونوں چیزیں مجھے دے کر ایسے مطمئن نظر آرہے ہو جیسے کوئی خاص بات نہ ہو۔''

''یہ خاص بات کہاں ہے رفعت؟ ہوا تو وہی ہے جس کا علم تھا۔''

رفعت نے آہستگی سے سر ہلایا پھر بولی۔ ''شاور لے لو۔ میں چائے بناتی ہوں۔ رپورٹ لینے کے لیے سات بجے جانا ہے لیکن ہم ساڑھے سات بجے چلیں گے تاکہ اسی وقت رپورٹ دکھانے ڈاکٹر صاحب کے پاس چلے جائیں۔''

''بیڈروم میں ہی لے آنا چائے۔'' طارق نے رفعت کی کسی بات کا جواب دینے کے بجائے قدم آگے بڑھادیے۔

رفعت نے ٹھنڈی سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اندازہ لگایا تھا کہ طارق اس وقت ذہنی طور پر خاصا منتشر تھا لیکن اس نے اپنے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں آنے دیے تھے۔

چائے بنا کر وہ ٹرے لیے ہوئے بیڈروم میں داخل ہوئی۔ طارق گھریلو لباس پہن کر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں طارق بولا۔ ”میرے موبائل میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔ ٹھیک کروانا پڑے گا۔ ابھی مجھے ایک فون کرنے کا خیال آیا تو میں نے سائڈ ٹیبل پر نظر ڈالی۔ عموماً تو تم اپنا موبائل یہیں پڑا رہنے دیتی ہو۔“

”وہ کالج کی ایک دوست کی کال آئی تھی۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے میں ٹی وی لاؤنج میں چلی گئی تھی کہ خبریں بھی سن لوں۔ فون پر بات ختم ہوئی ہی تھی کہ کال بیل بجا دی آپ نے۔“ رفعت نے اپنے بلاؤز سے موبائل نکالا۔ ”بس میں سیدھی دروازہ کھولنے چلی گئی تھی۔ کسے فون کرنا ہے؟“ اس نے موبائل طارق کی طرف بڑھایا۔

”دفتر ہی کے ایک شناسا ہیں۔ بس دفتری قسم کے تعلقات رہے ہیں ان سے۔ وہ دل کے اچھے معلوم ہوتے ہیں، جب میں دفتر سے رخصت ہو رہا تھا تو انہوں نے میرے پاس آکر بڑی ہمدردانہ باتیں کیں۔“ طارق موبائل ہاتھ میں لے کر رفعت کو بتانے لگا۔ ”کہہ رہے تھے کہ گھر آکر کچھ بات کریں گے مجھ سے اور فون کر کے آئیں گے۔ میں نے انہیں اپنا نمبر بتا دیا تھا۔ پھر گھر واپس آتے ہوئے خیال آیا کہ والد صاحب کو اپنی ملازمت چھوٹنے کے بارے میں بتا دوں تو موبائل کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ ابھی مجھے خیال آیا کہ وہ فون کریں گے اور رابطہ نہیں ہوگا تو سوچیں گے کہ میں نے انہیں غلط نمبر کیوں بتایا۔ اب انہی کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ کہہ دوں گا کہ اب وہ مجھ سے اس نمبر پر بات کر سکتے ہیں۔“ وہ خفیف سا مسکرایا۔ ”اب ہم دونوں کو ساتھ ہی تو رہنا ہے۔ ایک موبائل سے بھی کام چل جائے گا جب تک میرا موبائل ٹھیک نہیں ہو جاتا۔“ خاموش ہو کر اس نے نمبر ملانا چاہا۔

”باتوں میں تمہیں چائے کا خیال ہی نہیں رہا۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”اوہ، ہاں۔“ طارق نے رک کر چائے کے دو گھونٹ لیے، پھر نمبر ملانے لگا۔

رابطہ قائم ہوا اور آواز آئی۔ ”ہیلو!“

”مشکور صاحب؟“

”جی بول رہا ہوں۔ اوہ! پہچان گیا۔ آپ طارق صاحب ہیں!“

”جی۔“ طارق نے کہا۔ ”یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میرا موبائل کچھ خراب ہو گیا ہے۔ فون کیجیے گا تو اب اسی نمبر پر کیجیے گا جس سے میں بات کر رہا ہوں۔“

”اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔ میں تو اسی نمبر پر کوشش کرتا۔“

”اب یہ نمبر محفوظ کر لیجیے گا۔“

بات ختم کرنے کے بعد طارق نے موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور چائے کی پیالی اٹھائی جس میں اب ایک ہی گھونٹ رہ گیا تھا۔

رفعت نے اس کے انتظار میں چائے کے آخری دو گھونٹ نہیں لیے تھے۔

دونوں نے چائے پی لی تو رفعت نے ٹرے اٹھانے کے ساتھ ہی سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل بھی اٹھایا۔

”پھر وہی حرکت!“ طارق بولا۔ ”اب میرا فون بھی آ سکتا ہے رفعت! اگر تمہاری کال آئی تو میں موبائل تمہیں پہنچا دوں گا۔ گھر میں جہاں بھی تم ہوگی۔“

”سوری۔“ رفعت نے زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور موبائل واپس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور چائے کی ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف آگئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئی تھیں۔ اس نے موبائل بلاؤز میں رکھنے کا جو جواز دیا تھا، وہ بھی جھوٹ تھا۔ دراصل اسے ڈر تھا کہ طارق اتفاقیہ طور پر اس کا موبائل اٹھا کر اس کال سے واقف نہ ہو جائے جو اس نے شفیق کو کی تھی۔ اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ موبائل کے سلسلے میں اس کا بدلا ہوا رویہ طارق نے نوٹ کر لیا اور اس کے بارے میں پوچھا تو کیا جواب دے گی۔ اب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تھی تو اسے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اس کال کو ہی نہیں بلکہ شفیق کا نمبر بھی ڈیلیٹ کر دیتی جو اس کے موبائل میں فیڈ تھا۔

وہ جلدی سے ٹرے رکھ کر واپس لوٹتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اب پہلی فرصت میں وہ سب کچھ ڈیلیٹ کر دے گی جو اس کے موبائل میں شفیق کے حوالے سے تھا۔ اس نے کالج کے زمانے میں شفیق کے وہ میسیجز بھی ”سیو“ کر رکھے تھے جو اسے اچھے لگے تھے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ طارق سپاٹ چہرے کے ساتھ چھت کو تک رہا تھا۔ رفعت نے موبائل کی طرف دیکھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ موبائل اسی طرح رکھا ہے یا نہیں جس طرح اس نے رکھا تھا لیکن اسے یہی یاد نہیں آیا کہ اس نے کس طرح رکھا تھا۔

”کس سوچ میں ہو!“ رفعت بولی۔

طارق نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا؟ کچھ کہا تم نے؟“

''ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم نے میرے قدموں کی آہٹ تک نہیں سنی۔ میں نے پوچھا تھا، کس سوچ میں ہو۔''

''سوچ۔'' طارق کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ ''اب زندگی بھر بس سوچنا ہی تو ہے۔ کچھ کرنے کے قابل تو شاید ہو نہ سکوں۔''

''اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

''جلدی۔'' طارق سوچتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ انسان کو کسی کام میں بھی جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ تم سے شادی کرنے میں بھی جلدی کی تھی میں نے۔''

رفعت کے دل میں چور تھا۔ وہ گھبرا گئی۔ ''مجھ سے شادی کو، تم کیا غلط سمجھ رہے ہو اب؟''

''کیا تمہیں محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ اگر میں تم سے شادی نہ کرتا تو......'' وہ چپ ہو گیا۔

''تو؟'' رفعت کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس کے دماغ میں سوال ابھرا تھا۔ ''کیا طارق نے موبائل میں اس کی وہ کال دیکھ لی ہے جو اس نے شفیق کو کی تھی؟''

''تو......'' طارق پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''تو آج تم خود کو بیوگی کے قریب محسوس نہ کر رہی ہوتیں۔''

''ایسی باتیں نہ کرو طارق!'' رفعت روہانسی ہو گئی۔

''دیکھو رفعت!'' طارق نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بلی کو دیکھ کر کبوتر اگر آنکھیں بند کر لے تو بلی غائب نہیں ہوتی، کبوتر ہی غائب ہو جاتا ہے۔''

''پلیز طارق! پلیز!'' رفعت کے لیے اب طارق ہی سب کچھ تھا۔ شفیق سے اس کی محبت تاریخ کا حصہ بن چکی تھی لیکن اس تاریخ کو بھولنا بھی رفعت کے اختیار میں نہیں تھا۔

''رو نہیں رفعت!'' طارق جیسے تڑپ گیا۔ اس نے رفعت کو اپنے قریب کر لیا اور اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیے۔ ''چلو وعدہ کرتا ہوں۔ اب اپنے دماغ کے خیالات اپنے ہونٹوں پر کبھی نہیں لاؤں گا۔''

''دماغ میں بھی مت لاؤ!'' رفعت نے سسکاری لی۔

''کیا دماغ پر انسان کا اختیار ممکن ہے؟''

''کوشش کی جائے تو...... سب کچھ ممکن ہے۔''

''چلو یہ وعدہ بھی کر لیتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ ایسی باتوں کو دماغ میں جگہ نہ دوں۔ بس اب مسکرا دو۔ یہ آنسو بہاتی آنکھیں تو میرا دل چیر دیتی ہیں۔ ہنسو...... ہنسو رفعت!'' اس نے رفعت کے گدگدی کی۔

رفعت کو ہنسی تو آئی لیکن روتی ہوئی سی، بے بس سی!

''منہ دھو جا کر!'' طارق نے کہا۔ ''گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں بن گئی ہیں۔'' اس نے بستر سے اٹھ کر رفعت کو باتھ روم کی طرف دھکیلا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں، رپورٹ لینے کے لیے لیبارٹری روانہ ہوئے۔ رفعت اس سوچ میں رہی کہ طارق کو کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا؟...... اس سوچ کے ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی شدت سے رہا کہ طارق کو اس سے محبت تو بہت شدید تھی۔

رپورٹ لینے کے بعد وہ ڈاکٹر سے ملنے روانہ ہوئے۔

ڈاکٹر کاشف نے رپورٹ دیکھی اور چہرے پر الجھے ہوئے تاثرات کے ساتھ اپنے شانوں کو اس طرح ہلکی سی جنبش دی جیسے بات سمجھ میں نہ آئی ہو پھر وہ رپورٹ دوبارہ پڑھنے لگا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر؟'' رفعت نے بے چینی سے پوچھا۔

''دراصل میں جو کچھ سمجھ رہا ہوں، مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ درست ہو گا، اس لیے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ بہتر ہو گا کہ آپ لیڈی ڈاکٹر شی سے مل لیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہیں، وہ ہر اس معاملے کو سمجھ لیتی ہیں جو دوسرے ڈاکٹر نہیں سمجھ پاتے۔''

''ڈاکٹر شی کا نام تو خاصا مشہور ہے۔'' طارق بول پڑا۔ ''میرے علم میں آج یہ پہلی بار آیا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر ہیں۔''

''جی ہاں، لیڈی ڈاکٹر ہیں۔''

''ان کا اسپتال بھی ہے۔ شی ہاسپٹل۔''

''جی ہاں۔ وہیں جانا ہو گا آپ کو۔ ڈاکٹر شی سے وقت لینے میں بھی آپ کو دیر لگے گی۔ بہت ہجوم ہے ان کے مریضوں کا۔ اگر میں بھی انہیں فون کروں تو شاید دو چار دن بعد دیکھ سکیں وہ آپ کو۔''

''کیا چینی طریقہ علاج ہے ان کا؟'' رفعت پوچھ بیٹھی۔

''یہ خیال آپ کو ان کے نام کی وجہ سے آیا!''

''جی ہاں۔ شی چن قسم کے نام چینیوں ہی کے ہوتے ہیں۔''

''ان کی شہرت صرف شی کے نام سے ہے۔ ان کے کارڈ پر بھی صرف شی لکھا ہوتا ہے۔ مجھے ایک تقریب میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ جب وہ ڈاکٹر بنی تھیں، اس وقت تک ان کا نام کچھ اور تھا جو انہوں نے قانونی طریقے سے تبدیل کروا لیا۔ نسلاً فرانسیسی ہیں۔ آٹھ سال پہلے انہوں نے یہاں کی شہریت حاصل کر لی تھی۔ یہ مجھے علم نہیں کہ کیسے حاصل کی تھی۔'' ڈاکٹر کاشف نے اب براہِ راست طارق کی طرف دیکھا۔ ''انہیں برداشت کرنا

پڑے گا آپ کو۔‘‘

’’کیوں؟ کیا مطلب؟‘‘

’’سنکی قسم کی خاتون ہیں۔‘‘

’’زیادہ عمر ہوجائے تو شاید ہر شخص تھوڑا بہت سنکی ہوجاتا ہے۔‘‘

’’آپ ان سے ملیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ بتیس سے پینتیس سال کے درمیان ہوسکتی ہیں۔ اس سے زیادہ کی نہیں لیکن سنکی حد درجہ ہیں۔ آپ نے اگر ان کی کسی بات کو، کسی خیال کو رد کیا یا مخالفت کی تو وہ آپ سے بھڑک جائیں گی۔ آپ کا علاج نہیں کریں گی۔‘‘

’’ان کے شوہر انہیں کیسے برداشت کرتے ہوں گے؟‘‘

’’شادی نہیں کی انہوں نے۔‘‘

’’اوہ! تو پھر ان کے سنکی ہونے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے۔‘‘

’’ممکن ہے۔‘‘ ڈاکٹر کاشف نے اپنی گھڑی دیکھی، پھر بولا۔ ’’ایک اور مریض سے اپائنٹمنٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ میں اب ڈاکٹر شی کو فون کرکے آپ کے لیے وقت لیتا ہوں۔‘‘ اس نے موبائل فون اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔

ابتدائی دو ایک رسمی جملوں کے بعد اس نے کہا۔ ’’ایک پیچیدہ کیس آیا ہے میرے پاس ڈاکٹر شی۔ میں کچھ سمجھ نہیں پارہا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ آپ انہیں دیکھ لیں۔ میری خاطر ذرا جلدی وقت دے دیں۔‘‘ پھر اس نے کہا۔ ’’جی میں ہولڈ کرتا ہوں۔‘‘ پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر طارق اور رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’وہ اپنی اسسٹنٹ سے پوچھ کر بتائے گی۔‘‘

رفعت اور طارق خاموش رہے۔

ذرا ہی دیر بعد ڈاکٹر کاشف ماؤتھ پیس میں بولا۔ ’’جی ڈاکٹر...... اوہ...... چلیں خیر، شکریہ۔‘‘ اس نے موبائل بند کرتے ہوئے طارق سے کہا۔ ’’آج بدھ ہے۔ سنیچر کی رات ساڑھے نو بجے آپ ان سے مل لیجیے گا۔‘‘

’’آپ نے انہیں میرا نام تو بتایا ہی نہیں۔‘‘

’’موصوفہ نے پوچھا بھی نہیں۔ میرا جواب سننے کے بعد فوراً ہی فون بند کردیا۔‘‘

’’یہ تو غیر اخلاقی سی حرکت ہے۔‘‘ رفعت بول پڑی۔

’’فون تو وہ بند کرتا ہے جس نے فون کیا ہو۔‘‘

’’میں ابھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ سنکی ہیں۔‘‘ ڈاکٹر کاشف نے جواب دیتے ہوئے اپنا لیٹر پیڈ اٹھایا۔ ’’میں چند سطریں لکھ دیتا ہوں۔ آپ وہی دے دیجیے گا ان کی اسسٹنٹ کو۔ وہاں آپ کے نام کی جگہ لکھا گیا ہوگا، مریض معرفت ڈاکٹر کاشف!‘‘ یہ سب کچھ کہتے ہوئے ڈاکٹر کاشف نے چند سطریں بھی لکھ لی تھیں۔ وہ کاغذ اس نے لیٹر پیڈ سے الگ کرکے ایک لفافے میں رکھا اور لفافہ طارق کی طرف بڑھا دیا۔ ’’آپ اکیلے ملیں گے ڈاکٹر شی سے۔‘‘ پھر اس نے رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’آپ ان کے ساتھ تو جائیں گی لیکن آپ کو بیرونی کمرے میں بیٹھنا ہوگا۔ مریض کے کسی ساتھی کو وہ اپنے کمرے میں نہیں بلاتی۔‘‘

’’عجیب بات ہے۔‘‘ طارق نے کہا۔ ’’بعض مریض ایسے بھی ہوتے ہوں گے جو سہارے کے بغیر چل بھی نہیں سکتے۔ اپنی حالت کے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتے۔‘‘

’’جو چل نہیں سکتے، ان کے لیے اسٹریچر یا وھیل چیئر کے ساتھ اسپتال کا کوئی ملازم ہوتا ہے۔ اگر بول بھی نہیں سکتا تو ساتھ جانے والے کو تفصیلات لکھ کر دینی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی بات پوچھنی ہو تو فون پر اس کی ڈاکٹر سے بات کرادی جاتی ہے۔‘‘

طارق اور رفعت ڈاکٹر شی کے سلسلے میں خاصے متجسس ہوگئے تھے۔ وہ اس کے بارے میں کوئی اور سوال بھی کرتے اگر ڈاکٹر کاشف نے دوبارہ اپنی گھڑی میں وقت نہ دیکھا ہوتا۔ یہ وہ بتا ہی چکا تھا کہ اب کسی اور مریض کے اپائنٹمنٹ کا وقت ہے۔

’’ہم معذرت خواہ ہیں ڈاکٹر!‘‘ طارق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’خاصا وقت لے لیا آپ کا۔‘‘

اس کے ساتھ ہی رفعت بھی اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

واپسی پر رفعت بولی۔ ’’عجیب و غریب ہے یہ ڈاکٹر شی۔‘‘

’’ایسے ہوتے ہیں بعض لوگ۔ یہ کچھ زیادہ ہے۔‘‘

گھر پہنچ کر انہوں نے ٹی وی لاؤنج میں کھانا کھایا اور ٹی وی بھی دیکھتے رہے لیکن یہ دیکھنا بس بظاہر تھا۔ دونوں ہی کے دماغوں میں مختلف النوع خیالات کا پھیلاؤ تھا۔

کھانے کے بعد بھی انہوں نے کچھ دیر ٹی وی دیکھا پھر سونے کی غرض سے خواب گاہ میں آگئے۔

’’میں کسی روز گھر جاؤں گی۔‘‘ رفعت بولی۔ ’’چند گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔‘‘

’’کس سے ملنا ہے؟‘‘

دل میں چور ہونے کی وجہ سے وہ فوراً کچھ نہیں بولی، طارق کی طرف دیکھتی رہی۔ طارق چھت کو تکے جارہا تھا۔ رفعت نے کچھ توقف سے کہا۔ ’’گھر جانے کا مطلب یہی ہے کہ والدین وغیرہ سے ملوں گی۔ ڈیڈی بیمار بھی ہیں۔‘‘

''اپنے بھائی سے تمہارے والد کے تعلقات ابھی تک استوار نہیں ہوئے؟''

''خاندان کے کچھ لوگ بیچ میں پڑے تو تھے لیکن بات نہیں بنی۔''

''یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، ان سے ملوں اس سلسلے میں۔''

''کن سے؟''

''تم اپنے والد کو تو ڈیڈی کہتی ہو، انہیں شاید ڈیڈ کہتی ہو۔ بڑے ہیں وہ تمہارے والد سے۔ شادی سے پہلے ان سے ایک بار مل بھی چکا ہوں۔ شفیق لے گیا تھا مجھے اپنے گھر۔''

کالج کے زمانے میں ہی شفیق اور طارق کے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ طارق کے منہ سے اس کا نام سن کر رفعت کا دل دھک سے رہ گیا۔

طارق پھر بولا۔ ''میں نے اپنی شادی کا دعوت نامہ بھی بھیجا تھا اسے، آیا نہیں۔ مجھ سے تمہاری شادی کا تنازعہ ہی اس کا سبب ہو سکتا ہے۔''

''تم ڈیڈ سے مل کر کیا کرو گے؟''

''یہ میں نے ابھی نہیں سوچا لیکن یہ ضروری سمجھ رہا ہوں۔''

''تم کیوں ضروری سمجھ رہے ہو؟''

''تمہارے ڈیڈی کی علالت کے باعث۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''ان حالات میں تو دونوں بھائیوں کے معاملات ٹھیک ہو جانا بہتر ہوگا۔''

''ڈیڈی خدانخواستہ ایسے بیمار تو نہیں ہیں کہ......''

رفعت نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''خدا نہ کرے کہ وہ ایسے بیمار ہوں۔'' طارق نے کہا۔ ''تاہم ایسی صورت میں تعلقات ٹھیک رہنے چاہئیں۔ میں اپنی سی کوشش کر دیکھوں گا۔ تم کب جانا چاہتی ہو؟''

''کم از کم اس دن سے پہلے تو نہیں جب تم اس لیڈی ڈاکٹر سے ملو گے۔ الجھن رہتی ہے۔ کوئی بات صاف طور سے سمجھ میں تو آئے۔''

''اگر وہ بھی نہ سمجھ سکی؟''

''کیوں ایسی باتیں پہلے سے فرض کر لی جائیں۔''

''خیر چھوڑو۔ جس دن تم جانا چاہو، بتا دینا۔ میں بھی چلا چلوں گا۔''

''بہتر۔'' رفعت نے مجبوراً کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ طارق بھی اس کے ساتھ جائے۔ اسے شفیق سے ملنے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ طارق بھی جاتا تو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔

''چلو اب سو جائیں۔'' طارق نے جماہی لی۔

رفعت نے کوئی جواب دیے بغیر آنکھیں بند کر لیں مگر وہ ابھی سونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ طارق کے سونے کے بعد وہ اپنے موبائل سے وہ سب کچھ ڈیلیٹ کرے گی جو شفیق سے اس کے تعلقات کو آشکار کر سکتا تھا۔

اس رات اس نے اپنا یہ کام کر بھی لیا۔ دوسرے دن وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ رفعت کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ رفعت نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ مشکور کا نام چمک رہا تھا۔

''تم نے اپنے دفتر کے دوست کا نمبر فیڈ کر لیا ہے۔ انہی کی کال ہے۔'' رفعت نے موبائل طارق کی طرف بڑھا دیا۔

طارق نے موبائل آن کرتے ہوئے اپنے کان سے لگایا۔

''جی مشکور صاحب!'' اس نے کہا۔

''سوچ رہا ہوں کہ آج آپ سے ملوں۔''

''مجھے تعجب ہے کہ آپ کو مجھ سے اتنی دلچسپی ہو گئی۔ خیر!...... آپ تشریف لائیں۔ گھر کا پتا آپ کو دے چکا ہوں اور میں دو تین روز تو گھر پر ہی رہوں گا۔ کس وقت آئیں گے آپ؟''

''دفتر کے بعد...... جس وقت آپ کہیں!''

''ساڑھے پانچ بجے چائے میرے ساتھ پئیں۔''

''میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

''میں منتظر رہوں گا۔'' طارق نے کہا اور موبائل آف کر دیا۔ ''چائے پر تم بھی ساتھ رہنا۔'' اس نے رفعت سے کہا۔ ''اچھا انسان ہے مشکور۔''

''اس لیے کہ تم میں دلچسپی لے رہا ہے؟'' رفعت خفیف سی مسکرائی۔

''نہیں۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''دفتر میں اس کا رکھ رکھاؤ دیکھا ہے۔ سبھی سے بہت انکسار سے ملتا ہے۔''

''چائے پر کچھ خاص چیزیں بنا لوں؟''

''ہاں، روزمرہ سے کچھ مختلف۔''

اس موضوع پر بات ختم ہو گئی۔ پانچ بجے رفعت کچن میں مصروف تھی۔ طارق بستر پر لیٹا چھت کو تکتا ہوا نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ رفعت کمرے میں آئی تو اس کی آہٹ سن کر طارق نے اس کی طرف دیکھا۔

''موبائل لینے آئی ہوں۔'' رفعت نے کہا۔ ''میری ایک دوست کی کال آ سکتی ہے۔ میں کچن میں تمہارے دوست کے لیے گاجر کا حلوا بنا رہی ہوں۔ اگر تمہارے لیے کوئی کال آئی تو آ کر دے جاؤں گی موبائل۔''

''تمہاری کال آتی تو میں دے جاتا۔'' طارق نے ہنس کر کہا۔ ''خیر، لے جاؤ۔ میرے لیے تو کوئی کال شاید آئے گی بھی نہیں اور مجھے بھی کسی کو کال نہیں کرنی۔''

رفعت موبائل لے کر کچن میں آگئی۔ حلوا تو وہ بنا بھی چکی تھی، محض موبائل لانے کے لیے بہانہ بنایا تھا۔ اس نے شفیق سے رابطہ کیا اور احتیاطاً باہر کا جائزہ بھی لیتی رہی کہ اتفاقاً طارق کسی وجہ سے ادھر نہ نکل آئے۔

''مجھے انتظار تھا تمہارے فون کا۔'' شفیق نے کال ریسیو کی۔

''تمہیں فون کرتے ہوئے مجھے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔'' رفعت نے کہا۔ ''اگر طارق کو معلوم ہوجائے تو بہت صدمہ ہوگا انہیں۔ مختصر گفتگو کروں گی۔''

''تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟ بندوبست تو ہوجائے گا۔''

''ابھی فوری طور پر تو ضرورت ہے بھی نہیں۔ جب ہوگی تو بتادوں گی۔''

''تمہارے پاس پرائز بونڈ تو ہیں نا؟''

''بتایا تو تھا میں نے تمہیں۔''

''بعض لوگ اپنا پرائز بونڈ...... اگر انعام نکل آئے تو خود کیش نہیں کراتے، مارکیٹ میں... بلیک کردیتے ہیں۔ خریدتے وہ لوگ ہیں جو اپنی بلیک منی کو وہائٹ کرتے ہیں اس طرح...... میں بلیک سے اتنی ہی رقم کا بونڈ خرید کر تمہیں دے دوں گا جتنے کی تمہیں ضرورت ہوگی۔ تم طارق پر ظاہر کرسکتی ہو کہ تمہارا بونڈ نکل آیا ہے۔''

''یہ تدبیر تو اچھی ہے لیکن یہ رقم میں ایک شرط پر لوں گی۔''

''شرط؟ کیا مطلب؟''

''وہ رقم مجھ پر تمہارا قرض ہوگی۔ میں کسی مناسب وقت پر ڈیڈی سے لے کر تمہیں واپس کردوں گی۔ فی الحال میں ان سے اس لیے نہیں لوں گی کہ میرا سب سے چھوٹا بھائی بہت لاابالی ہے۔ تم جانتے ہی ہو اس کو۔ اگر اسے معلوم ہوگیا اور اس نے کسی کے سامنے کچھ کہہ دیا اور طارق کے علم میں بھی آگیا تو انہیں یہ صدمہ بھی ہوگا کہ میں نے ان سے جھوٹ بولا۔ دوسرے وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ اپنی سسرال سے کسی قسم کی مدد لیں۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم نے قرض اور واپس کرنے کی جو بات کی ہے، اس کا مجھے افسوس ہوا ہے۔ تم سے میری شادی نہیں ہوسکی، ہم ایک دوسرے کے نہ ہوسکے لیکن کیا اس وجہ سے ہم ایک دوسرے کے لیے کچھ نہیں رہے؟ مجھے تم پر یا تمہیں مجھ پر کوئی حق نہیں رہا۔''

''میں نے ایک اصولی بات کی ہے شفیق! تمہیں یہ بات اپنے دل پر نہیں لینی چاہیے۔ اچھا مزید باتیں بعد میں کریں گے۔ میں دو تین روز میں آرہی ہوں وہاں۔ فون بند کررہی ہوں۔ خدا حافظ۔''

طارق اس طرف آیا تو نہیں تھا لیکن رفعت کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔ رابطہ منقطع کرنے کے بعد اس نے فوری طور پر کال ''ڈیلیٹ'' کردی۔

☆☆☆

مشکور تقریباً ہم عمر ہی تھا طارق کا! قبول صورت، مہذب اور خوش گفتار۔ چائے پینے کے دوران میں اس نے بتایا کہ طارق کو اس کے پسند کرنے کا سبب طارق کی اپنے کام میں غیر معمولی صلاحیت تھی اور اسے اس کا افسوس ہوا تھا کہ اتنے باصلاحیت شخص کو ایک خرانٹ افسر نے بہ یک جنبش قلم کمپنی سے الگ کردیا تھا یا اپنے افسران کے کان بھر کر الگ کروادیا تھا۔

''طارق صاحب!'' اس نے کہا۔ ''کوئی اچھا افسر ہوتا تو یہ نظر انداز نہیں کرتا کہ جب آپ تندرست تھے تو اپنا کام وقت سے پہلے ختم کردیتے تھے اور آپ کی بعض تجاویز سے کمپنی کو فائدہ بھی پہنچتا رہتا تھا۔ خیر! بس ظرف ہوتا ہے لوگوں کا۔ جو ہونا تھا، وہ تو ہوگیا۔ میں آپ سے اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ ملازمت کے سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کرسکوں۔''

''مدد؟ میں سمجھا نہیں۔''

رفعت بھی سوالیہ نظروں سے مشکور کی طرف دیکھنے لگی۔ چائے پیتے ہوئے وہ بھی ان دونوں کے ساتھ تھی۔

''دراصل......'' مشکور نے کہا۔ ''یہ ملازمت حاصل کرنا میرے لیے ذرا بھی دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ یہاں تو کیا، مجھے کہیں بھی ملازمت مل سکتی ہے۔ میرے والد اتنے ہی بارسوخ ہیں۔ میں بس آپ کی اجازت چاہتا ہوں۔ والد صاحب سے بات کرلوں گا۔ وہ آپ کو کہیں بھی ایک اچھی ملازمت دلاسکتے ہیں۔''

''میں نے آپ کو اپنی ساری کیفیت بتادی ہے مشکور صاحب!'' طارق نے کہا۔ ''میں جب تک تندرست نہ ہوجاؤں، کوئی باقاعدہ ملازمت نہیں کرسکتا۔ دو گھنٹے ہی میں میری حالت غیر ہوجاتی ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ کوئی پارٹ ٹائم جاب مل جائے۔ دو گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔ دو جاب مل جائیں تو اور اچھا ہے۔ ایک صبح کو اور ایک شام کو۔''

''اس قسم کے جاب میں مناسب تنخواہ نہیں ملتی۔'' مشکور نے کہا۔

''کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔''

اس وقت رفعت بول پڑی۔ ''انہوں نے خود ہی سوچ لیا ہے پارٹ ٹائم جاب کے بارے میں۔ جب تک یہ پوری طرح صحت مند نہ ہو جائیں، میں انہیں کوئی کام بھی نہیں کرنے دوں گی۔''

مشکور نے سوالیہ انداز میں طارق کی طرف دیکھا۔

''یہ بہت جذباتی ہیں میرے معاملے میں۔'' طارق نے مسکرا کر کہا۔ ''میں کسی وقت انہیں سمجھا بجھا لوں گا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' رفعت کا انداز فیصلہ کن تھا۔

ان باتوں کے دوران میں طارق کو ایک الجھن لاحق رہی۔ اس نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ مشکور نے کئی مرتبہ چور نظروں سے رفعت کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی کوشش یہ بھی تھی کہ رفعت یا طارق اس کی یہ حرکت بھانپ نہ لیں لیکن طارق نے بھانپ ہی لیا تھا۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا تھا کہ مشکور کی نگاہوں میں کسی گندگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بس ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس نے رفعت کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہو اور اب اسے پہچاننے کی یا یاد کرنے میں کوشاں ہو کہ اس نے رفعت کو پہلے کہاں اور کب دیکھا تھا۔

چائے پر ہی طارق کی عجیب وغریب بیماری کے بارے میں بھی باتیں ہوئیں۔ چائے پینے کے بعد ان تینوں نے کچھ وقت ٹی وی لاؤنج میں بھی گزارا۔

روانگی کے وقت مشکور نے رفعت کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے چائے کے لیے اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔

اس کے جانے کے بعد رفعت نے طارق سے کہا۔

''اچھا خاصا شریف دوست بنا ہے تمہارا۔''

''مردوں کے بارے میں عورتوں کی رائے مستند ہوتی ہے۔'' طارق نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا یہ خیال تو تم اپنے ذہن سے نکال دو کہ پارٹ ٹائم جاب کرو گے۔ جب تک پوری طرح صحت مند نہیں ہو جاتے، میں تمہیں کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔''

''اس طرح تو جلدی وہ وقت آجائے گا جب گھر کی چیزیں فروخت کرنی پڑ جائیں گی رفعت!''

''خدانخواستہ اگر اس کی نوبت آئی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو تمہیں تین ماہ کی تنخواہ بھی ملی ہے۔ بینک میں بھی کچھ رقم جمع ہے۔''

طارق نے یہ بحث آگے نہیں بڑھائی۔

☆☆☆

مقررہ دن اور مقررہ وقت پر طارق اور رفعت ڈاکٹر شی کے اسپتال پہنچے۔ طارق سے ڈاکٹر کاشف کا خط لینے والی ایک ادھیڑ عمر خاتون تھی۔ اس نے کمپیوٹر میں طارق کا نام لکھا اور بولی۔

''آپ اندر جا سکتے ہیں طارق صاحب۔ بالکل صحیح وقت پر آئے ہیں آپ!'' پھر اس نے رفعت سے کہا۔ ''آپ یہیں بیٹھیے...... ڈاکٹر صاحبہ مریض کے ساتھ کسی اور کا ہونا پسند نہیں کرتیں۔'' وہ انٹرکام اٹھا کر غالباً ڈاکٹر شی کو اطلاع دینے لگی۔

''ہمیں بتا دیا تھا ڈاکٹر کاشف نے۔'' طارق نے کہا پھر رفعت سے بولا۔ ''بیٹھو رفعت! میں آتا ہوں ڈاکٹر سے مل کر۔''

کمرے میں کئی صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے۔ رفعت کو وہاں چھوڑ کر طارق ڈاکٹر شی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کمرے میں اپنی میز پر سر جھکائے کوئی فائل دیکھ رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔ ''بیٹھیں!''

طارق اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر شی نے ''بیٹھیں'' نہایت شفاف لہجے میں کہا تھا۔ اس کا لباس بھی مغربی نہیں تھا۔ وہ ساڑی باندھے ہوئے تھی۔ صرف اس کے چہرے کے نقش ونگار سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ مغربی ہے۔ طارق کو یہ خیال بھی آیا کہ اس نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت عورت کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

جلد ہی اس نے فائل ایک طرف سرکاتے ہوئے سر اٹھا کر طارق کی طرف دیکھا اور پھر اس کا منہ اس طرح خفیف سا کھلا جیسے وہ طارق کو دیکھ کر چونک گئی ہو یا حیران ہوئی ہو۔ ''تم!'' اس کے منہ سے نکلا۔ لہجے میں بھی حیرت تھی اور پھر اس کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا جیسے وہ طارق کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہو۔

طارق نے اس کے بے تکلفانہ انداز گفتگو کو نظر انداز کر کے کہا۔ ''کیا آپ مجھے پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہیں؟''

ڈاکٹر شی نے اس طرح اپنی کرسی پر پہلو بدلا جیسے کچھ بے چین ہو گئی ہو۔

''اپنی فائل دو۔'' اس نے کہا۔ ''سب رپورٹس ہیں نا؟''

''جی۔'' طارق نے فائل اس کی طرف بڑھا دی۔

ڈاکٹر شی نہایت مناسب الاعضا تھی اور اس کی آواز میں بھی ایسی کھنک تھی جس میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔ کوئی زاہد خشک بھی اسے دیکھ اور سن کر جھرجھری لیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

''جھوٹ۔'' ڈاکٹر شی فائل دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''جی!'' طارق کا انداز سوالیہ تھا۔

جواب میں ڈاکٹر شی نے کچھ نہیں کہا، رپورٹس دیکھتی رہی۔ آخر اس نے سر اٹھا کر اپنی خوب صورت نیلگوں آنکھوں سے طارق کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بالکل جھوٹ لکھا ہے کہ تمہاری عمر تیس سال ہے۔ تمہاری عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہوسکتی۔''

''جی۔'' طارق نے کہا۔ اسے ڈاکٹر کاشف کی بات یاد تھی کہ اپنی کسی بات سے اختلاف کرنے والے سے وہ بری طرح بدک جاتی ہے۔ طارق کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ اتنی خوب صورت عورت اتنی سنکی ہے کہ اسے ساٹھ سال کا بتا رہی ہے۔ کوئی بھی اس کی عمر کا اندازہ لگاتا تو وہ زیادہ سے زیادہ پینتیس سال کہہ سکتا تھا۔

''خیر!'' وہ پھر بولی۔ ''بہت انتظار کرایا تم نے مجھے۔ بھول نہیں سکتی میں وہ تاریخ جب ہم آخری بار ملے تھے۔ پانچ جنوری انیس سو چھیالیس کی وہ شام مجھے اس طرح یاد ہے جیسے...... '' وہ ہنس دی۔

طارق کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ اسے جواب میں کیا کہنا چاہیے...... وہ ڈاکٹر شی کی اس بات کو تو ''سنکی پن'' سے زیادہ ''پاگل پن'' سمجھا تھا۔

''تمہیں کچھ یاد ہے؟'' وہ پھر بولی۔ ''ضرور کچھ تو یاد ہوگا۔''

''جی! کچھ گمان سا ہے۔'' طارق نے احتیاط سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہاری کمزوری نے تمہاری یادداشت پر بھی اثر ڈالا ہے۔'' ڈاکٹر شی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خیر! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں انہی رپورٹس سے معاملہ سمجھ تو گئی ہوں لیکن ایک بہت ضروری ٹیسٹ ڈاکٹروں نے نہیں کروایا۔ وہ ٹیسٹ کروالو تو میں نے جو کچھ سمجھا ہے، اس کی تصدیق ہوجائے گی۔'' وہ ہاسپٹل کے لیٹر پیڈ پر کچھ لکھنے لگی۔ کہتے ہوئے ہی اس نے کہا۔ ''وائلن تو اب بھی بجاتے ہونا؟''

''اب کچھ یاد نہیں۔'' طارق نے بے بسی سے کہا۔ ڈاکٹر شی کی باتیں اس کے دماغ میں انتشار پیدا کررہی تھیں۔

''سب یاد آجائے گا۔'' ڈاکٹر شی نے لیٹر پیڈ سے کاغذ پھاڑ کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ ٹیسٹ آج ہی کروالو، اس کی رپورٹ پرسوں ملے گی لیکن تم کل بھی اسی وقت آجانا۔''

''اب اجازت؟'' طارق نے کرسی کے ہتھوں پر اس طرح ہاتھ رکھے جیسے اٹھنا چاہتا ہو۔

''کچھ دیر تو بیٹھو! تیس سال بعد تو ملے ہو۔'' ڈاکٹر شی نے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

طارق کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر ڈھیلے پڑ گئے۔ پھر وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔ ''آپ کی عمر کتنی ہے؟''

''تمہارا کیا اندازہ ہے؟''

''تیس پینتیس سال کے درمیان۔''

ڈاکٹر شی ہنس پڑی۔ ''میں اتنی کم عمر کیسے ہوسکتی ہوں طارق؟ ہم جب آخری بار ملے تھے، ابھی کو بھی تیس سال گزر چکے ہیں۔''

''تو پھر آپ کی عمر کتنی ہے؟''

''اتنی زیادہ کہ اب یاد بھی نہیں۔''

''لیکن آپ اتنی ہی عمر کی نظر آتی ہیں جو میں نے بتائی ہے۔''

''ہاں۔ نظر تو یہی آتا ہے اور اس کی وجہ ہے۔ کیا تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں اس کی وجہ بتائی تھی؟''

''مجھے یاد نہیں۔'' طارق بہت پریشان ہوگیا تھا۔

''میں نے بتایا تھا کہ میرا نام شی کیوں ہے۔'' وہ بولی۔ ''پہلے میرا نام کچھ اور تھا۔ تم نے رائیڈر ہیگرڈ کا ناول پڑھا ہے جو اسی نام سے ہے؟''

''شی۔'' طارق نے کہا۔ ''جی ہاں، پڑھا ہے، بہت مشہور ناول ہے یہ۔''

''میں اس وقت بھی ڈاکٹر تھی جب ہیگرڈ کچھ بیمار ہوا تھا اور میرے پاس آیا تھا۔ اسے بھی میری اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ میری عمر بہت زیادہ ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ اسے سنادی تھی۔ یہ تو میں نہیں جانتی کہ اس نے یقین کیا تھا یا نہیں لیکن وہ سب کچھ اس نے اپنے ناول میں لکھ ڈالا تھا۔ اس ناول کے واقعات فرضی نہیں ہیں۔ وہ میری ہی زندگی کی کہانی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اس نے میرے اصل نام کی جگہ ''شی'' لکھا تھا۔ مجھے یہ نام اتنا پسند آیا کہ میں نے وہی اختیار کرلیا۔ جب سے اب تک میں ڈاکٹر شی ہی کہلاتی ہوں۔''

طارق سحرزدہ سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ مسکرائی۔ ''یقین نہیں آیا نا

میری باتوں پر؟''

''آپ بہت خوب صورت ہیں۔'' طارق نے بے ساختہ کہا۔ ''کسی کو پاگل کر دینے کی حد تک۔''

''اپنے ہر جنم میں تم نے یہی کہا ہے۔''

''جنم میں؟ کیا مطلب؟''

''تم آواگون کے قائل ہو؟''

''میں نے پڑھا ضرور ہے اس کے بارے میں، یقین نہیں کیا۔''

''کر لینا چاہیے تمہیں! اب یہ تمہارا چوتھا جنم ہے۔ یہ اتفاق بڑا عجیب ہے کہ ہر جنم میں تمہارا نام طارق ہی تھا۔ ابتدائی دو جنموں میں ہم دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔ تیسرے جنم میں جب تمہاری عمر تیس سال تھی، اس وقت بھی میں تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ انیس سو چھیالیس کی بات ہے۔ پانچ جنوری کی شام تم مجھ سے ملے تھے تو تم نے مجھے بتایا تھا کہ کسی کام سے ساؤتھ امریکا جا رہے ہو اور ایک ہفتے میں لوٹ آؤ گے لیکن تم ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہیں آئے۔ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا، تب مجھے معلوم ہوا کہ تم ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ میں تمہارے فراق میں بہت روئی تھی۔ بہر حال مجھے تمہارا انتظار رہا۔ مجھے یقین تھا کہ تم پھر جنم لو گے اور مجھ سے ملو گے۔ کچھ سال پہلے میں فرانس میں تھی۔ وہاں میں نے خواب میں دیکھا کہ تم مجھے یہاں..... اس ملک میں ملو گے۔ میرے خواب ہمیشہ سچے ہوتے ہیں، اسی لیے میں یہاں آ گئی۔ سالوں سے میں منتظر تھی کہ تم کسی نہ کسی دن مجھ سے ملو گے اور آخر یہی ہوا۔ آج تم میرے سامنے ہو۔ میرا یہ خواب بھی سچا ثابت ہوا۔''

اس وقت طارق کچھ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی ناول کا کردار ہے اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا کردار اسے ایک ناقابلِ یقین کہانی سنا رہا ہے۔

''خیر!'' وہ پھر بولی۔ ''تم میرے حسن اور میری عمر کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اب تو تم اس کا سبب سمجھ گئے ہو گے۔ رائیڈر ہیگرڈ کا ناول تم نے پڑھا ہی ہے۔''

''تو تم آگ میں غسل کرتی ہو؟'' طارق یہ سوال کرتے ہوئے خود کو بالکل احمق سمجھ رہا تھا۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر شی نے کہا۔ ''میں نے بتایا نا کہ اس ناول کے وہ واقعات بالکل سچے ہیں جو میرے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔''

''میرے لیے بہت حیرت انگیز ہے یہ سب کچھ۔''

اچانک ڈاکٹر شی نے پوچھا۔ ''تمہارے ساتھ جو صاحبہ آئی ہیں، وہ تمہاری بیوی ہیں؟''

ڈاکٹر شی کے رویتے کی وجہ سے طارق نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''جی۔''

ڈاکٹر شی ایک آہ بھر کر بولی۔ ''بھول گئے کہ تمہیں شدت سے چاہنے والا بھی کوئی ہے اس دنیا میں اور اس دنیا میں کیا، اسی شہر میں، لیکن میں اس معاملے میں تم سے کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔ نئے جنم میں آدمی کو پچھلے جنم کی کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ دوسرے جنم میں بھی میں نے تمہیں پہلے جنم کی باتیں یاد دلائی تھیں، پھر تیسرے جنم میں بھی پچھلے دونوں جنم یاد دلائے تھے۔ اب پھر تمہیں پچھلے جنموں کی یاد دلاؤں گی۔ یقین کرو، سب یاد آ جائے گا تمہیں! تم پھر مجھ سے اسی طرح محبت کرنے لگو گے جیسے پچھلے جنموں میں کرتے رہے ہو۔ ایک بات میں کہہ دوں۔ تمہاری بیوی کے لیے میرے دل میں کوئی عناد پیدا نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''رفعت۔''

''اچھا نام ہے۔ یہ تمہاری پسند کی شادی ہے؟''

''ہاں۔''

''تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے نام ہی کی طرح خوب صورت ہو گی۔ تم کسی معمولی لڑکی کو پسند کر ہی نہیں سکتے۔''

''کافی دیر ہو گئی۔ کیا اب مجھے اجازت ہے؟'' طارق بہت پریشان اور گھبرایا ہوا سا تھا۔

''ہاں اب تمہیں جانا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔ رفعت پریشان ہو گی۔''

طارق کرسی سے اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی اپنی کرسی سے کھڑی ہوئی اور میز کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس وقت طارق نے اس کے پورے جسم کا تناسب دیکھا اور جھرجھری سی لی۔ بلا کا دلکش جسم تھا اس کا......

''میں ابھی اپنا ٹیسٹ کروا لوں گا۔ رپورٹ لے کر اسی وقت آؤں گا۔''

طارق نے دروازے کی طرف مڑنا چاہا لیکن اسی وقت ڈاکٹر شی بول پڑی۔ ''تیس سال بعد ملے ہو۔ ایسے ہی چلے جاؤ گے؟''

''میں..... میں سمجھا نہیں۔'' طارق کچھ سمجھ کر ٹپٹا گیا۔

''میں سمجھاتی ہوں تمہیں۔'' وہ طارق کے قریب آئی اور اپنی بانہیں طارق کی گردن میں حمائل کر دیں۔ طارق کانپ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی ہر رگ میں خون اچھلنے لگا ہو۔ شی کا جسمانی لمس جیسے کوئی انگارہ تھا۔

"بہت پیاسی ہوں میں طارق!" یہ ڈاکٹر شی نے اپنی زبان سے بھی کہا اور اپنی آنکھوں سے بھی۔

ادھر طارق کا یہ حال تھا کہ اسے اپنے ہونٹ خشک محسوس ہونے لگے تھے۔ جب وہ کمرے سے نکلا تو رومال سے اپنے ہونٹ صاف کر رہا تھا۔

رفعت اسے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔

"یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری؟" وہ حیرت سے بولی۔ "چہرہ سفید ہو رہا ہے۔"

"آؤ!" وہ رفعت کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر شی کی اسسٹنٹ وہیں موجود تھی جس کے سامنے طارق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کار میں بیٹھنے کے بعد طارق ایسے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا جیسے بہت زیادہ بلندی پر دوڑ کر چڑھا ہو۔

"بتاؤ تو، آخر بات کیا ہے؟" رفعت نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے خون کے مسئلے میں یہاں آئے تھے لیکن چہرہ ایسا ہو رہا ہے جیسے اس ڈاکٹر نے تمہارا خون اور نچوڑ لیا ہے۔"

"وہ سنکی نہیں، پاگل ہے، پاگل۔" طارق نے کہا۔ "شی نامی ناول شاید تم نے بھی پڑھا ہوگا۔ وہ خود کو رائیڈر ہیگرڈ کی شی سمجھتی ہے۔"

"ارے!"

"دماغ خراب کر دیا اس کی باتوں نے۔ نہ جانے کیا کیا بکتی رہی۔"

"یہ سب تو ڈاکٹر کاشف نے بتا ہی دیا تھا کہ وہ سنکی ہے۔ تمہارے مرض کے سلسلے میں بھی تو کچھ کہا ہوگا اس نے۔ رپورٹس دیکھی تھیں؟"

"دیکھی تھیں۔ بڑے اعتماد سے کہہ رہی تھی کہ میرا مرض اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ٹھیک کر دے گی۔ ایک ٹیسٹ اور کروایا ہے۔" طارق نے پرچہ نکال کر رفعت کو دیا۔ "لیکن میں تو اب اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"دماغ خراب کر دیا اس نے میرا۔"

"ارے علاج تو کر دے گی...... جانا پڑے گا تمہیں اس کے پاس۔" رفعت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "یہ ٹیسٹ ابھی کرواتے ہیں۔"

کار اب ایک سڑک پر رواں تھی۔ "مگر اس کے سنکی پن سے تمہارا چہرہ کیوں اتنا پھیکا پڑ گیا؟"

"ارے بڑی خوفناک باتیں کی تھیں۔ اب تو مجھے اس کے الفاظ بھی یاد نہیں۔" طارق نے رفعت کے سوال کا جواب دینے سے گریز کیا۔ یہ مناسب ہی نہیں تھا کہ وہ شی کی محبت کی کہانی بیان کرتا یا آواگون اور اپنے چوتھے جنم کا قصہ چھیڑتا اور یہ تو کسی قیمت پر بھی نہیں بتایا جاسکتا تھا کہ اس نے طارق کو کس طرح اپنے کمرے سے رخصت کیا تھا۔ یہ بات بھی نہیں بتائی جاسکتی تھی کہ وہ اس کے حسن و جمال اور اس کی جسمانی دل کشی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"کچھ بھی ہو۔" رفعت بولی۔ "علاج تو تم اسی سے کراؤ گے۔ یوں سمجھو کہ یہ آخری امید بندھی ہے۔"

"بڑا صبر آزما وقت گزارا ہے میں نے اس کے ساتھ۔"

"اور گزار لینا۔ علاج تو کروانا ہے اس سے۔"

نہ جانے کس خیال کے تحت طارق بول پڑا۔ "کبھی مجھے ہی نہ کھو دینا تم!"

"کیا مطلب؟"

"اس علاج کے بہانے میرا خاتمہ ہی نہ ہو جائے۔"

"پھر فضول باتیں کرنے لگے۔" رفعت ناراض ہوگئی۔

طارق چپ ہوگیا۔ رفعت بھی خاموشی سے کار ڈرائیو کرتی رہی۔ پھر کچھ دیر بعد کار ایک لیبارٹری کے سامنے رکی تاکہ طارق وہاں سے اپنا وہ ٹیسٹ کروا سکے جو ڈاکٹر شی چاہتی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر شی؟

طارق کے دماغ میں ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا جس کے باعث رات کو اس کی نیند اڑی رہی۔

"آج شاید نیند نہیں آئے گی۔" وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔

"نیند تو اڑے گی ہی۔" رفعت نے کہا۔ "ہر وقت اپنی بیماری کے بارے میں مایوسانہ انداز سے سوچنے لگے ہو۔ دھیان بٹاؤ گے تو آئے گی نیند۔ کچھ پڑھو تو دھیان بٹے گا۔ پہلے تمہارا معمول تھا کہ سوتے وقت کچھ پڑھتے ضرور تھے۔"

طارق کے پاس کئی سو کتابیں تھیں جن میں فکشن کم اور سنجیدہ موضوعات زیادہ تھے۔ اس کا معمول رہا تھا کہ سونے سے پہلے ایک ڈیڑھ گھنٹے کچھ نہ کچھ پڑھتا ضرور تھا۔ رفعت نے یہ بات چھیڑی تو اسے یاد آیا کہ اس کے پاس ایک کتاب "آواگون" پر بھی تھی جس پر وہ ایک مرتبہ جستہ جستہ نظر ڈال چکا تھا۔

وہ اٹھا اور کتاب نکال کر پھر بستر پر لیٹ گیا۔ کتاب زیادہ ضخیم نہیں تھی۔ طارق نے وہ پوری ہی پڑھ ڈالی۔ اس طرح طارق نے جانا کہ یہ فلسفیانہ مذہبی عقیدہ تھا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی روح کم یا زیادہ عرصے کے بعد کسی دوسرے کے جسم میں حلول کر جاتی ہے اور یہ عقیدہ ہندومت، بدھ مت، جین مت اور سکھ مت میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے ڈانڈے سقراط اور افلاطون جیسے فلسفیوں سے بھی ملتے ہیں اور بہت سے قبائلی معاشروں میں بھی یہ سوچ موجود ہے۔ ان قبائل کا تعلق مشرقِ ایشیا کے علاوہ آسٹریلیا، جنوبی امریکا اور سائبیریا سے ہے۔

طارق نے جتنی دیر میں کتاب ختم کی، اتنی دیر میں رفعت سو چکی تھی۔ طارق اس کے بعد بھی جاگتا رہا۔ کتاب نے اس کے دماغ میں ایک اور سوال کھڑا کر دیا تھا۔ اس عقیدے کے مطابق انسان کے مرنے کے بعد روح کسی دوسرے جسم میں چلی جاتی تھی لیکن ڈاکٹر شی کے مطابق طارق کا جسم بھی نہیں بدلا تھا۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے جنم میں بھی وہ ویسا ہی رہا جیسا پہلے جنم میں تھا۔

کچھ دیر تک طارق کے ذہن میں یہ باتیں چکراتی رہیں، پھر اس نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا کہ اسے ان خرافات پر یقین نہیں کرنا چاہیے لیکن پھر اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ تناسخ کے اس معاملے کو یکسر نظر انداز کیسے کیا جاسکتا ہے جبکہ عظیم فلسفی سقراط اور افلاطون کے نام بھی سامنے آرہے تھے۔ اسے خیال تھا کہ شاید فیثا غورث کا نام بھی ہے، اس نے دوبارہ کتاب اٹھائی لیکن جستہ جستہ دیکھنے کے باعث وہ فیثا غورث کا نام تلاش نہیں کرسکا۔ اس نے کتاب رکھ دی اور سونے کی کوشش کرنے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی اس کے تصور میں ڈاکٹر شی کا سراپا ابھر آیا جس کے نہایت متناسب اعضا اور حسن میں بلا کی جنسی کشش تھی۔ وہ جب طارق سے لپٹی تھی تو اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک آگ کا ایندھن بن جائے گا۔ محض اپنے بلند کردار اور قوتِ ارادی کے باعث وہ ڈاکٹر شی سے الگ ہو کر اس کمرے سے اس طرح نکلا تھا جیسے بھاگ نکلا ہو۔

ڈاکٹر شی کی دوسری باتیں بھی طارق کی نظر میں سراسر جھوٹ تھیں۔ یہ قطعی لغو تھا کہ رائیڈر ہیگرڈ کے ناول کے واقعات دراصل اس کی زندگی کے واقعات تھے اور وہ صدیوں سے زندہ تھی۔

خاصا وقت گزرنے کے بعد طارق کو آخر نیند آہی گئی۔ دوسرے دن وہ خلافِ معمول بہت دیر سے اٹھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔

رفعت بولی۔ ”میں نے تمہیں اس لیے نہیں جگایا کہ رات کو تم یقیناً بہت دیر سے سوئے تھے۔ جگانے کی ضرورت اس لیے بھی نہیں تھی کہ دفتر تو جانا نہیں تھا تمہیں۔“

پھر ناشتے کے بعد رفعت کچن میں جاکر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ طارق اپنے بستر پر لیٹا سوچ میں غرق رہا۔ وہ کوشش کے باوجود ڈاکٹر شی کے خیال سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے جھوٹا سمجھنے اور آوا گون کے معاملے میں متذبذب ہونے کے باوجود اس کے دماغ میں انہی خیالات کے بادل منڈلاتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے رفعت کا خیال بھی تھا جو اسے بہت چاہتی تھی جبکہ......

”جبکہ“ پر آکر اس کے خیال کا سلسلہ اس طرح رکتا تھا جیسے ریکارڈ پر کسی جگہ سوئی اٹک جائے اور پھر بڑی مشکل سے آگے نکلے۔

یہ صرف طارق کو کسی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ رفعت کے والد کو کینسر ہو گیا تھا۔ رفعت سے یہ بات اس لیے چھپائی گئی تھی کہ وہ اپنے والد کو بہت شدت سے چاہتی تھی۔ ایک آدھ دن چھوڑ کر وہ فون تو کرتی ہی تھی۔ اسے بس اتنا بتایا گیا تھا کہ وہ کچھ بیمار تھے اور ان کا علاج جاری تھا۔

طارق کے خیال کے مطابق وہ کسی وقت بھی دنیا چھوڑ کر جاسکتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ رفعت پر کسی اور بزرگ کا سایہ تو ہو۔ اسی لیے وہ ان دونوں بھائیوں کے معاملات درست کروانا چاہتا تھا۔ ان بھائیوں کی کشیدگی کے باعث رفعت اپنے ڈیڈ سے ملنے اس لیے نہیں جاتی تھی کہ والد کے ناراض ہونے کا خوف تھا۔

موجودہ حالات میں ضروری تھا کہ وہ کشیدگی ختم کی جائے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود طارق کے خیالات کا زیادہ ارتکاز ڈاکٹر شی پر تھا۔ اس نے طارق کو اس دن بھی بلایا تھا جبکہ ٹیسٹ کی رپورٹ اگلے دن ملنا تھی۔

طارق ذہنی طور پر ڈاکٹر شی کے خلاف تھا لیکن اس کے دل کی شدید خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر شی سے ملنے جائے۔ اس میں کچھ ایسی ہی کشش تھی جو طارق کو اس طرح کھینچ لینا چاہتی تھی جیسے مقناطیس، لوہے کو کھینچتا ہے۔

طارق یکایک بستر سے اٹھا اور کچن میں پہنچ گیا۔

”خیریت؟“ رفعت نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا چائے کی خواہش ہے؟“

”نہیں۔“ طارق نے کہا۔ ”کھانے کی تیاری

چھوڑو۔ چلتے ہیں تمہارے گھر۔ ڈیڈی کو دیکھنے کی خواہش ہو رہی ہے۔'' وہ بھی رفعت کے والد کو ڈیڈی اور ان کے بڑے بھائی کو ڈیڈ کہتا تھا۔

''یوں اچانک۔'' رفعت بولی۔ ''وقت تو دیکھو۔ دوپہر ہو چکی ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ دو گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔''

''یہاں تو ہم دو بجے بھی کھانا کھا سکتے ہیں۔ وہاں جائیں گے تو بھوکا رہنا پڑے گا۔ وہ لوگ تو کھانا کھا چکے ہوں گے اور یہ کہنا اچھا نہیں لگے گا کہ وہ ہمارے لیے کھانے کا بندوبست کریں۔''

''راستے میں کہیں سے برگر وغیرہ لے لیں گے۔ کھاتے ہوئے چلے جائیں گے۔ تمہیں کلب سینڈوچ بہت پسند ہے۔ ایک دن کا کھانا یوں بھی سہی۔''

رفعت نے نہ جانے کا ایک آدھ جواز اور تراشا لیکن طارق نے اسے آمادہ کر ہی لیا۔ ڈاکٹر شی سے اس دن نہ ملنے کی یہ تدبیر اس کے ذہن میں اچانک آئی تھی اور وہ مزید کچھ سوچے بغیر کچن میں پہنچ گیا تھا۔ اگر وہ سوچتا تو اس کی اس تدبیر پر ڈاکٹر شی سے ملنے کی خواہش غالب آجاتی۔ وہ جانتا تھا کہ آدھی رات سے پہلے واپسی نہیں ہوگی۔ رفعت کے والد انہیں رات کا کھانا کھلائے بغیر ہرگز رخصت نہ کرتے۔ اس طرح وہ وقت نکل جاتا جب اسے ڈاکٹر شی سے ملنا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ دونوں گھر سے روانہ ہوگئے۔ ڈرائیونگ سیٹ رفعت ہی نے سنبھالی تھی۔ جب سے طارق کی پراسرار بیماری کا معاملہ سامنے آیا تھا، اس نے یہ ذمے داری اس لیے سنبھال لی تھی کہ جس حد تک بھی ممکن ہو، طارق کو جسمانی تھکان سے بچایا جائے۔

راستے ہی میں ایک ہوٹل سے انہوں نے کلب سینڈوچ وغیرہ پیک کروا لیے تھے۔

رفعت کم رفتار سے کار چلاتے ہوئے ایک ہاتھ سے سینڈوچ کھاتی رہی۔ اس کے بعد انہوں نے چائے بھی پی۔ چائے کے لیے تھرماس وہ گھر سے لے کر چلے تھے۔

''تم وہاں فون تو کرتی ہی رہتی ہو۔'' طارق نے کہا۔ ''میری ملازمت چھوٹنے کے بارے میں تو کسی کو نہیں بتایا؟''

''تمہاری اجازت کے بغیر کیسے بتا دیتی۔''

''ٹھیک ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''اب بھی یہ بھنک کسی کے کان میں نہ پڑے۔''

رفعت نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ گھر سے فون کر کے روانہ ہوئے تھے اس لیے وہاں رفعت کے والدین اور دونوں بھائی ان کے منتظر ہی تھے۔ رفعت اور طارق کو گلے لگایا گیا۔

''چلو اب سب سے پہلے تو کھانے کی میز پر چلو۔'' رفعت کے والد نے کہا۔ ''تم دونوں وہاں سے بارہ بجے روانہ ہوئے ہو گے۔ کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ اسی لیے ہم لوگوں نے بھی نہیں کھایا۔ سوچا کہ تم دونوں کے ساتھ ہی سہی۔ کسی دن دیر سے کھانا کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

رفعت اور طارق نے ان کی بات کاٹنا ادب کی وجہ سے مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن جب وہ خاموش ہوگئے تو طارق نے کہا۔ ''یہ تو ٹھیک ہے ڈیڈی کہ ہم وہاں سے کھانا کھا کر نہیں چلے تھے لیکن راستے میں سینڈوچ وغیرہ کھا لیے تھے۔ اب بھوک نہیں ہے۔''

''واہ! یہ کیسے ہوسکتا ہے!'' رفعت کی والدہ بول پڑیں۔ ''سینڈوچ جیسی چیزوں سے کہیں پیٹ بھرتا ہے...... اور پھر وہ سب کچھ کھائے ہوئے اب دیر بھی ہو چکی ہوگی۔''

ایسا محبت آمیز اصرار کیا گیا کہ ان دونوں کو کھانے میں، برائے نام ہی شریک تو ہونا پڑا۔

☆☆☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی جب طارق، شفیق کے والد سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ وہ صرف ایک مرتبہ کالج کے زمانے میں شفیق کے ساتھ اس کے گھر آیا تھا اور پھر کوئی ملازم بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ رفعت کا شوہر ہے۔ انہوں نے اسے روک کر اس سے آنے کی وجہ پوچھی۔ طارق نے ایک ملازم کو اپنا کارڈ دیا اور اس سے کہا کہ وہ فیضان صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔

فیضان، شفیق کے والد کا نام تھا۔ جلد ہی ملازم نے واپس آکر اسے ڈرائنگ روم میں لے جاکر بٹھایا۔

''ابھی آتے ہیں صاحب!'' اس نے کہا۔

طارق کو ایک منٹ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ فیضان صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ وہ چھوٹی موری کا پاجامہ، کڑھا ہوا لیکن سادہ کرتہ اور اس پر واسکٹ پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں سفید چپل تھی۔ عمر پینسٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی۔

طارق نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ فیضان صاحب نے قریب آکر شفقت سے اس کا شانہ تھپکا۔ ''بیٹھو!...... یہ تم نے اچھا کیا کہ کارڈ پر ہاتھ سے 'رفعت کا شوہر' بھی لکھ دیا تھا ورنہ میں ٹال جاتا۔ بعض لوگ ملازمت کے لیے گھر پر ہی آدھمکتے ہیں۔''

فیضان صاحب ایک بڑی کمپنی کے مالک تھے۔

طارق بولا۔ ”مجھے اندازہ تھا کہ آپ مجھے نہیں پہچانیں گے۔ بس ایک بار بہت سرسری سی ملاقات ہوچکی ہے آپ سے۔ بہت عرصے پہلے میں شفیق کے ساتھ آیا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔“

”اچھا اچھا...... لیکن مجھے نام یاد نہیں رہا تھا۔“

”شفیق کہاں ہے؟“

”ذرا دیر پہلے ہی کہیں گیا ہے۔“ فیضان صاحب نے کہا پھر بولے۔ ”مجھے حیرت ہے۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو؟“

”آپ کا مجرم ہوں۔ آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔“

”مجرم؟...... میرے؟...... وہ کیسے؟“

”رفعت سے شادی کی ہے نا میں نے!“

”اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں کہ تم خود کو میرا مجرم سمجھو۔ میں تو اپنے چھوٹے بھائی سے ناراض ہوں جس نے رشتہ طے کرنے سے قبل مجھ سے اس بارے میں کوئی مشورہ تک نہیں کیا تھا، بس فون پر بتایا تھا، جیسے میں کوئی غیر ہوں لہٰذا...... تم جان ہی چکے ہوگے کہ میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔“

”ڈیڈی نے واقعی غلطی کی تھی۔ ان سے آپ کا خفا ہونا بجا ہے لیکن آپ شاید مجھے اور رفعت کو بھی اب پسند نہیں کرتے؟“

”یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟“

”آپ نے بھی ہماری خیریت نہیں پوچھی۔“

”خیریت نہیں پوچھی؟ یعنی فون نہیں کیا؟...... تمہارے گھر نہیں آیا لیکن کیا رفعت نے کبھی فون کیا مجھے؟...... وہ بچی ہے میری۔ اسے پہل کرنی چاہیے تھی۔“

”جی بے شک! یہ رفعت کی غلطی ہے۔ دراصل اسے خوف ہوگا کہ اگر اس نے آپ کو فون کیا اور بات کھل گئی تو......“

فیضان صاحب نے اس کی بات کاٹی۔ طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تو اس کے والد صاحب قبلہ اس سے ناراض ہوجائیں گے۔“

”جی۔“ طارق نے کہا۔ ”یہی بات ہوسکتی ہے۔“

”رفعت کے ساتھ ہی آئے ہوگے؟“

”جی ہاں۔ اسے گھر پر ہی چھوڑ آیا ہوں۔ بتایا بھی یہ تھا کہ اپنے کسی دوست سے ملنے جارہا ہوں۔“ طارق نے کہا۔ ”اسے میں اپنے ساتھ لا بھی نہیں سکتا تھا مگر اس لیے نہیں کہ ڈیڈی اس پر ناراض ہوتے بلکہ اس لیے کہ مجھے آپ سے جو بات کرنی ہے، وہ میں اس کے سامنے نہیں کرسکتا تھا۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“

”آپ دونوں بھائیوں کے تعلقات کی کشیدگی......“

”اس موضوع پر بات نہ کرو تو بہتر ہے۔“ فیضان صاحب بول پڑے۔ ”خاندان کے کئی افراد کوشش کرچکے ہیں لیکن میں نے کسی کی بات نہیں سنی۔ دل پر جو داغ لگایا ہے رضوان نے، وہ مٹ نہیں سکتا۔“

”آپ ان سے خفا ہوسکتے ہیں، دشمن تو نہیں ہوں گے ان کے۔“

”دشمن تو میں کسی کا بھی نہیں ہوں۔“

”اب آپ دونوں کے حالات کی کشیدگی میرے

لیے بھی فکر کا سبب بن گئی ہے۔"
"وہ کیسے؟"
"میں ایک عجیب وغریب بیماری میں مبتلا ہوں۔ مجھے امید نہیں کہ میں زندہ بچوں گا۔"
"کیا ہوا ہے تمہیں؟" فیضان صاحب نے جلدی سے پوچھا۔ "دیکھنے میں تو بالکل ٹھیک نظر آرہے ہو۔"
"اسی لیے تو میں نے اپنی بیماری کو عجیب وغریب کہا۔" طارق نے جواب دیا پھر اس نے مختصر طور پر اپنی بیماری کے بارے میں بھی بتایا۔
"علاج کروا رہے ہو؟"
طارق نے اثبات میں جواب دیا پھر کہا۔ "اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد کوئی بزرگ تو ہو جو رفعت کے سر پر ہاتھ رکھ سکے۔"
"اول تو تمہیں اپنی زندگی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ رفعت کے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے اس کا باپ تو ہے نا!"
"وہ بھی بیمار ہیں۔"
"اس کا مجھے علم ہے کہ وہ بیمار ہے۔ خود میں بھی کبھی کبھی بیمار پڑ جاتا ہوں۔"
"آپ اگر ایک بات راز میں رکھنے کا وعدہ کریں تو عرض کروں۔"
"ایسی کیا بات ہے؟"
"ڈیڈی نے یہ بات رفعت سے چھپائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب تک ممکن ہو، یہ بات اس سے چھپی ہی رہے۔"
"ایسی کیا بات ہے؟" فیضان صاحب نے اپنا جملہ دہرایا۔
"ایک بار پھر کہوں گا کہ کسی کو بتائیے گا نہیں۔ مجھے اپنے کسی ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ انہیں کینسر ہو گیا ہے۔"
"کیا!" فیضان صاحب ایک جھٹکے سے کھڑے ہو گئے۔ "کینسر؟"
"جی۔" طارق نے کہا۔ "اگرچہ معاملہ ابھی زیادہ آگے نہیں بڑھا لیکن ظاہر ہے کہ بڑھے گا۔ نہ جانے کب وہ دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ اسی لیے میری خواہش ہے کہ رفعت کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی تو ہو۔"
فیضان صاحب ٹہلنے لگے۔ ان کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ وہ اپنے بھائی سے ناراض سہی لیکن دشمن بہرحال نہیں تھے۔ کینسر کا نام سن کر ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔
"کچھ دن ہوئے۔" طارق پھر بولا۔ "میں نے ان سے اس کشیدگی کو ختم کرنے کی بات کی تھی۔ یقین کیجیے کہ وہ اپنی غلطی پر پشیمان ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ آپ سے معافی مانگنے کے لیے بھی تیار ہیں لیکن وہ جانتے ہیں آپ کا مزاج۔ کہہ رہے تھے کہ آپ انہیں معاف نہیں کریں گے۔"
"وہ مجھ سے دس سال چھوٹا ہے۔" فیضان صاحب ٹہلتے ٹہلتے رک کر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "اور مجھ سے پہلے دنیا چھوڑ جانا چاہتا ہے۔" آخر میں ان کی آواز رندھ سی گئی تھی۔
"اسی لیے میں چاہتا تھا کہ آپ دونوں کے تعلقات استوار ہو جائیں۔ میں ابھی جا کر انہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ آپ سے معافی مانگیں گے تو آپ انہیں معاف کر دیں گے۔"
"نہیں۔" فیضان صاحب کی آواز سے ظاہر ہوا کہ وہ جذبات کے بھنور سے نکلنے کے لیے کوشاں تھے۔ "اب میں خود جاؤں گا اس کے پاس۔ گلے لگاؤں گا اسے۔ شاید ایک پیار بھرا تھپڑ بھی مار دوں کہ اس نے مجھے اس صورتِ حال سے بھی بے خبر رکھا۔ یہ اس کی دوسری غلطی ہے لیکن میں اس کی دونوں غلطیاں معاف کر دوں گا۔ آخر بھائی ہے وہ میرا۔" پھر انہوں نے ایک ملازم کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا۔ "شوفر سے کہو، میری گاڑی نکالے۔"
طارق خوش ہوا کہ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تھی۔ وہ شدت سے چاہتا تھا کہ رفعت کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی تو ہو۔ وہ اپنا علاج تو کروا رہا تھا لیکن ڈاکٹر شی کی اس بات پر اسے اعتبار نہیں تھا کہ وہ اس کا علاج کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔
ذرا دیر بعد ہی دو گاڑیاں فیضان ہاؤس سے نکلیں۔ طارق نے دانستہ اپنی کار، فیضان صاحب کی کار کے پیچھے رکھی۔ ادب کا تقاضا یہی تھا۔
فیضان صاحب بذاتِ خود رضوان صاحب کے گھر پہنچے تو وہاں ہلچل مچ گئی۔ وہاں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔
رضوان صاحب بے قراری سے اپنے بڑے بھائی کے قدموں میں جھکنے لگے لیکن فیضان صاحب نے انہیں شانوں سے پکڑ کر جھکنے نہیں دیا اور اپنے سینے سے لگا کر بولے۔ "میں تمہاری یہ دوسری غلطی بھی معاف کرتا ہوں کہ تم نے مجھے اپنی بیماری کی اطلاع بھی خود نہیں دی۔"
رضوان صاحب اس وقت آب دیدہ تھے۔ ان کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن شدتِ جذبات کے باعث کچھ کہہ نہیں سکے۔

فیضان صاحب نے رفعت کے دونوں بھائیوں کو بھی
رکیا، رضوان صاحب کی اہلیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں بھی
ائیں دیں، پھر رضوان صاحب سے کہا۔ ''مجھے تم سے
ائی میں کچھ بات کرنی ہے۔''
''جی...... جی...... آیئے!''
''تم بھی آؤ ہمارے ساتھ۔'' فیضان صاحب نے
رق سے کہا پھر بولے۔ ''رفعت دکھائی نہیں دی؟''
یہی سوال طارق بھی کرنے والا تھا۔
''تم چلے گئے تو وہ شاہ جی سے ملنے چلی گئی۔ ان سے
ہارے لیے دعا کروائے گی۔''
دونوں بھائی ڈرائنگ روم سے اندر جانے کے لیے
ڑ گئے تھے۔ فیضان صاحب نے سر گھما کر پیچھے دیکھتے
ئے کہا۔ ''آؤ طارق!''
''جی آرہا ہوں۔'' طارق نے جلدی سے ان کے
چھے قدم بڑھائے۔
رضوان صاحب ان دونوں کو ایک کمرے میں لے گئے۔
''بیٹھیے!'' رضوان صاحب نے بڑے بھائی سے کہا۔
''بیٹھنے سے پہلے تمہارے تھپڑ مارنا چاہتا ہوں۔''
''آپ جتنا چاہیں ماریے مجھے۔ بڑی غلطی ہوئی تھی
ھ سے۔''
''اس غلطی کی وجہ سے نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ مجھے
رق سے علم ہوا ہے تمہاری بیماری کا۔''
''علاج ہو رہا ہے بھائی صاحب! ٹھیک ہو جاؤں گا۔''
''اتنی آسانی سے ٹھیک ہو جاؤ گے جتنی آسانی سے کہہ
ہے ہو؟ کینسر ہے تمہیں۔'' رضوان صاحب چونک پڑے۔
''طارق نے بتایا ہے مجھے!''
اب رضوان صاحب نے طارق کی طرف دیکھا۔
''جی۔'' طارق بولا۔ ''آپ جس ہاسپٹل میں علاج
مرا رہے ہیں، وہیں کے ایک صاحب نے مجھے بتایا تھا۔''
''کیا رفعت کو بھی بتا دیا تم نے؟'' رضوان صاحب
نے بے قراری سے پوچھا۔
''جی نہیں۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''میں یہ حماقت کیسے
رتا!...... اندازہ ہے مجھے کہ یہ سن کر رفعت کی کیا حالت ہوتی۔''
''تم اپنے علاج کے لیے امریکا چلے جاؤ۔'' فیضان
احب نے کہا۔ ''اخراجات میں برداشت کروں گا۔''
''پیسے کی کمی کا شکار تو میں بھی نہیں ہوں بھائی
احب!'' رضوان صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بھی
انتا ہوں کہ وہاں بہتر علاج ہو جاتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں سنا
کہ اس مرض میں کوئی زندہ بچا ہو۔ ان ڈاکٹروں کی وجہ سے
زندگی کچھ بڑھ تو جاتی ہے لیکن وہاں سال چھ ماہ کے بعد پھر
جانا پڑتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب وہاں جاؤں تو روح
ساتھ چھوڑ جائے۔ میں اپنے وطن میں مرنا چاہتا ہوں۔''
رضوان صاحب بہت سنجیدہ تھے۔

☆☆☆

''طارق اپنے کالج کے زمانے کے کسی دوست سے
ملنے چلے گئے تھے اس لیے میں نے تم سے ملنے کے لیے یہ
موقع غنیمت جانا۔'' رفعت نے شفیق سے کہا تھا۔
وہ دونوں اس وقت ایک ریسٹورنٹ کے کیبن میں
بیٹھے ہوئے تھے۔
شفیق بولا۔ ''فون پر یہ سن کر میں بہت خوش ہوا تھا
کہ تم یہاں آئی ہو۔ تمہاری شادی کے بعد یہ ہماری پہلی
ملاقات ہے۔''
''میں تم سے ایک شکایت کرنے کے لیے ملی ہوں۔''
''کوئی شکایت بھی ہے مجھ سے؟''
''ہاں۔'' رفعت نے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم
شادی کر لوگے۔''
''تم نے کہا تھا۔'' شفیق افسردگی سے بولا۔ ''میں
نے تو ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔''
''میری بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی تمہاری نظر میں۔''
''یہ تو تمہارا دل اب بھی جانتا ہے کہ میرے لیے
تمہاری کیا اہمیت ہے۔''
''میں اپنی ذات کے بارے میں نہیں، تمہاری بات
کے بارے میں کہہ رہی ہوں شفیق!''
''اچھا!'' شفیق نے طویل سانس لی۔ ''چلو وعدہ کرتا
ہوں کہ جب میرا دل چاہے گا تو کر لوں گا شادی۔''
''یہ کیسا وعدہ ہوا؟ جب دل چاہے گا کا کیا مطلب؟''
''جب میں محسوس کروں گا کہ میں کسی لڑکی کو اپنی
بیوی بنا کر اس سے انصاف کر سکوں گا۔''
''شادی کر لوگے تو انصاف بھی کرو گے۔ میں جانتی
ہوں تمہارا مزاج۔''
''میں تمہیں ہرگز نہیں بھول سکتا رفعت!'' شفیق
جذباتی ہو گیا۔
''بھولی تو میں بھی نہیں ہوں تمہیں لیکن ایک فرض
شناس بیوی بن چکی ہوں۔ طارق کی بیماری کی وجہ سے
پریشان ہوں۔ ابھی شاہ جی سے بھی مل کر آئی ہوں۔ وہ دعا
کریں گے طارق کے لیے۔ انہوں نے مجھے اس کے لیے

ایک تعویذ بھی دیا ہے جو میں طارق کے بازو پر باندھوں گی۔ میں جب تم کو نہ بھولنے کے باوجود اس کے لیے اتنی فکر مند ہوں تو تم اپنی بیوی کے لیے کیوں نہ ہو گے۔ جب میں نے شادی کی تھی تو اپنے دعوے کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا کہ میں ایک اچھی مشرقی بیوی ثابت ہو سکوں گی لیکن طارق کی بے تحاشا محبت نے میرے دل میں اپنی جگہ بنالی۔"

"مجھے اس سے محبت کیسے ہو جائے گی رفعت!" وہ بے بسی سے بولا۔

"میں کچھ اور نہیں کہوں گی۔" رفعت نے خفگی سے کہا۔ "تمہیں شادی کرنی پڑے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک خوشگوار زندگی گزارتا ہوا دیکھوں۔"

"اور اگر وہ ناخوشگوار ہوئی تو؟"

"میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ پہلے سے وسوسوں کا شکار نہ ہو۔"

شفیق کچھ نہیں بولا، بے بسی سے رفعت کی طرف دیکھتا رہا۔

رفعت مسکرائی۔ "میں آج کے بعد تم سے تمہاری شادی کے موقع پر ملوں گی۔ امید ہے کہ دونوں بھائیوں کے تعلقات استوار ہو جائیں گے۔ طارق ابھی گھر والوں سے تو یہی کہہ کر گئے تھے کہ وہ کسی دوست سے ملنے جا رہے ہیں لیکن مجھے انہوں نے بتا دیا تھا کہ وہ ڈیڈ سے ملنے جائیں گے اور دونوں بھائیوں کے تعلقات ٹھیک کر کے دم لیں گے۔ طارق کے لہجے میں یقین تھا اس لیے مجھے بھی یقین ہے۔ جب دونوں بھائیوں کے تعلقات ٹھیک ہو جائیں گے تو تمہاری شادی میں شرکت کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

"لیکن......"

"لیکن نہیں شفیق!" رفعت نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اگر تم نے شادی نہیں کی تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔ فون پر بھی تم سے بات نہیں کروں گی۔ تڑپتے رہنا ساری زندگی میری آواز سننے کے لیے۔"

"تم مجھے بڑے امتحان میں ڈالنا چاہتی ہو رفعت!"

"اس امتحان سے تم کو بھی گزرنا ہوگا۔" رفعت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اور اب اس موضوع پر بات ختم!......کوئی بحث نہیں۔ بس بل ادا کرو اور چلو یہاں سے۔ میں چاہتی ہوں کہ جب طارق لوٹیں تو میں گھر پر ہوں۔"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو رفعت!"

"میں نے ابھی کہا ہے کہ اس موضوع پر بات ختم!...... میں اب اس فون کا انتظار کروں گی کہ تمہاری شادی طے ہو گئی ہے۔"

"تمہارے مالی مسئلے کا کیا رہے گا؟"

"اس کا جواب بھی دے چکی ہوں۔ جب میں ضرورت محسوس کروں گی، تم سے کہہ دوں گی لیکن اگر جلد ہی میں نے تمہاری شادی کی خبر نہیں سنی تو مالی مسئلے میں بھی تمہیں فون نہیں کروں گی۔"

"اتنا تڑپاؤ گی مجھے!" شفیق کی مسکراہٹ نڈھال سی تھی۔

"خود میں بھی تو تڑپوں گی۔ میری تڑپ ہی کا خیال ہوگا تمہیں تو تم شادی ضرور کرو گے۔"

رفعت نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

"میں نے تمہیں ٹیکسی سے اترتے دیکھا تھا۔"

"ہاں، کار تو طارق لے گئے تھے۔"

"اب میں اپنی گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں تمہیں۔"

"ایسی احمقانہ بات تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہیے تھی۔ اگر کسی نے ہمیں ساتھ دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ میں ٹیکسی ہی میں جاؤں۔"

بل ادا کر کے دونوں اٹھے۔

☆☆☆

رفعت جب گھر پہنچی تو اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ فیضان صاحب، رضوان صاحب سے ملنے آ گئے تھے۔

"اور انہیں لانے کا یہ معجزہ طارق میاں نے دکھایا ہے۔" رفعت کی والدہ نے کہا۔

"وہ ہیں کہاں؟" رفعت نے بے تابی سے پوچھا۔

"تنہائی میں بھائی سے کچھ بات کرنے کے لیے گئے ہیں۔ طارق میاں کو بھی ساتھ لے لیا ہے۔"

"کس کمرے میں؟" رفعت کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔

والدہ نے بتا دیا۔ رفعت تقریباً بھاگتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ وہ لوگ علیحدگی میں کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ اس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ تینوں چونک پڑے۔ رفعت دوڑ کر فیضان صاحب کے قریب گئی اور خوشی سے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ان سے لپٹ گئی۔

فیضان صاحب نے اسے سینے سے لگایا، اس کی پیشانی چومی اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔ "جیتی رہو، خوش رہو۔ تمہاری شادی کے بعد آج طارق سے پہلی بار ملا۔ اچھا شوہر ملا ہے تمہیں۔"

طارق نے چچا بھتیجی کو اتنی چاہت کے ساتھ ملتے دیکھا تو ایک خیال کے تحت اسے بے حد خوشی ہوئی۔

رفعت اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں خشک کرتے ہوئے

بولی۔ ''مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ لوگ علیحدگی میں کوئی بات کرنا چاہتے ہیں لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا، دوڑی چلی آئی۔ اب جاتی ہوں۔ جب آپ لوگ فارغ ہو جائیں تو......''

''فارغ ہو چکے۔'' فیضان صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جو باتیں کرنی تھیں، کرلیں۔ چلو اب ڈرائنگ روم میں سب ساتھ بیٹھتے ہیں۔''

''چلیے۔''

''تمہاری چچی اپنے والدین سے ملنے امریکا گئی ہوئی ہیں۔ انہیں فون پر بتاؤں گا تو بہت خوش ہوں گی۔''

''شفیق بھی ان کے ساتھ......''

''نہیں۔'' فیضان صاحب نے طارق کی بات کاٹی۔ ''وہ یہیں ہے۔''

''تو آج کی خوشیوں میں اسے بھی شریک کیجیے نا!''

''فون کرتا ہوں اسے۔ نہ جانے کہاں ہوگا۔''

باتیں کرتے ہوئے وہ چاروں ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔ رفعت کی والدہ اور دونوں بھائی وہیں تھے۔

فون کرنے کے بعد فیضان صاحب نے کہا۔ ''وہ بھی یہ جان کر بہت خوش ہوا ہے کہ میں اس وقت یہاں ہوں۔ بلایا ہے اسے میں نے۔ بیس پچیس منٹ میں آ جائے گا۔''

شفیق بیس منٹ میں ہی آ گیا۔ اتنے دن بعد ان سب کا یکجا ہونا اس منظر میں جذبات کے رنگ بھر رہا تھا۔ رفعت بھی اس سے بہت اچھے انداز میں ملی۔ وہ شفیق سے گریزاں رہ کر لوگوں کو یہ شک ہونے نہیں دینا چاہتی تھی کہ شفیق کے معاملے میں اس کے دل میں کوئی چور ہے۔

طارق بھی شفیق سے بہت اچھی طرح ملا۔ اس نے شکوہ بھی کیا کہ شفیق اس کی شادی میں نہیں آیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا۔ ''میں بھی تمہاری شادی میں نہیں آؤں گا۔''

شفیق ہنسنے لگا۔ ''تم جانتے ہو، اس وقت کیا حالات تھے۔''

''کب کر رہے ہو شادی؟''

''بھئی زور تو بہت ڈالا جا رہا ہے۔'' شفیق نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ہی گریز کرتا رہا ہوں۔ والدہ امریکا گئی ہیں تو دباؤ کچھ کم ہوا ہے۔ وہ آ جائیں گی تو پھر بڑھے گا۔''

''اب آپ کی شادی میں کرواؤں گی۔'' رفعت بول پڑی۔ ''میں خود بھی دیکھوں گی کوئی پیاری سی لڑکی۔''

شفیق مسکرا کر رہ گیا۔

رضوان صاحب کی بیوی کے اصرار پر فیضان صاحب اور شفیق کو رات کے کھانے تک وہیں رکنا پڑا۔ طارق سے پہلے ہی کہا جا چکا تھا کہ وہ میاں بیوی رات کا کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔

رات کے دس بج چکے تھے جب طارق اور رفعت اپنے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈرائیونگ حسبِ معمول رفعت ہی کر رہی تھی۔

''میں بھی تم سے علیحدگی میں بات کرنے کے لیے بے چین رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''بزرگوں کے سامنے یہ کہنے کی ہمت نہیں کر سکی۔''

''تمہیں بھی علیحدگی میں بات کرنے کی ضرورت ہے؟'' طارق نے ہنس کر کہا۔

''آج تو تم گزشتہ دنوں کی نسبت خاصے خوش نظر آ رہے ہو۔''

''ہاں، آج میں نے اپنی ایک مہم کا ابتدائی مرحلہ طے کر لیا ہے۔''

''مہم؟''

''ہاں، دونوں بھائیوں کو ملا دیا ہے میں نے۔''

''لیکن یہ تمہاری مہم کا ابتدائی حصہ کیسے ہے؟ ابھی اور کیا باقی ہے؟''

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے علیحدگی میں کیا بات کرنا چاہتی تھیں؟''

''یہی پوچھنا تھا کہ ڈیڈ اور ڈیڈی کو الگ کمرے میں جا کر کیا باتیں کرنی تھیں اور تم کو ان باتوں میں کیوں شریک کیا گیا تھا؟''

''یہ تو ان کی محبت ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ دراصل ڈیڈ کو ڈیڈی کی بیماری کے سلسلے میں تشویش تھی۔ وہ سب کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بس محبت کی بات ہے کہ انہیں ڈیڈی کی بیماری کے بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ڈیڈی علاج کے لیے امریکا چلے جائیں۔''

''ایسی تو تشویش کی کوئی بات نہیں ہے کہ ڈیڈی کو علاج کے لیے امریکا جانا پڑے۔ اچھا خیر، ڈیڈی نے کیا جواب دیا؟''

''ڈیڈی بڑے بھائی کو صاف صاف جواب تو نہ دے سکے لیکن اشاروں کنایوں میں کہہ دیا کہ وہ زندگی بھر اپنے وطن سے باہر نہیں گئے تو اب اپنا یہ ریکارڈ کیوں خراب کریں۔'' خاموش ہو کر طارق دھیرے سے ہنس دیا۔

موضوع اس طرح بدلا تھا کہ پھر رفعت کو طارق کی ''مہم'' کے بارے میں بات کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

آدھی رات کو وہ گھر پہنچے۔ طارق شب خوابی کا لباس پہن چکا تھا جب رفعت نے اس سے کہا۔ ''تم اپنی شرٹ کے دائیں بازو کی آستین اتارو!''

''دائیں آستین؟ خیریت؟''

''میں وہاں شاہ جی سے بھی ملی تھی۔ وہ تمہاری بیماری کے سلسلے میں دعا کریں گے۔ تمہارے لیے ایک تعویذ بھی دیا ہے انہوں نے۔ وہی باندھنا ہے تمہارے بازو پر۔''

''چھوڑو بھی رفعت! مجھے ان باتوں پر بالکل اعتقاد نہیں ہے۔''

''مجھے تو ہے۔ چلو آستین اتارو۔''

''اچھا بھئی!'' طارق نے آستین اتارتے ہوئے طویل سانس لے کر کہا۔ ''تمہاری خاطر یہ بوجھ بھی برداشت کرلوں گا۔''

''بری بات ہے طارق! تعویذ کو بوجھ نہیں کہنا چاہیے۔ اس میں قرآن کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔''

طارق چپ رہ گیا۔ رفعت نے اس کے بازو پر تعویذ باندھ دیا۔ طارق نے آستین پہنتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''اب اگر میری یہ پُراسرار بیماری ختم ہوئی تو میں فیصلہ نہیں کرسکوں گا کہ اس کا سبب ڈاکٹر کا علاج ہے یا تعویذ!''

''بس اچھا ہونا چاہیے تمہیں۔ سبب کچھ بھی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تعویذ کی طاقت ڈاکٹر کے علاج معالجے میں مددگار ثابت ہوگی۔'' پھر اس نے کہا۔ ''کل جانا ہے نا ڈاکٹر کے پاس؟''

''ہاں۔'' طارق نے جواب دیا۔ اس وقت اس کے دماغ میں یہ خیال چکرا گیا تھا کہ اس کے نہ آنے پر ڈاکٹر شی نے کیا سوچا ہوگا۔

دوسرے دن مشکور کا فون آگیا۔ اس مرتبہ اس نے طارق اور رفعت کو اپنے گھر پر چائے کی دعوت دی تھی۔

''مشکور مجھ سے تعلقات بڑھانا چاہتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟'' طارق نے رفعت سے کہا۔

''اس طرح نہیں سوچنا چاہیے تمہیں! ملنسار انسان ہیں وہ۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوگی۔''

طارق نے اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھائی۔ مقررہ وقت پر وہ دونوں مشکور کے گھر پہنچ گئے۔

''آپ کو ایک زحمت کرنی ہوگی بھابی!'' مشکور نے کہا۔ ''آپ یوں سمجھ لیں کہ ہمارا خاندان فرسودہ خیالات رکھتا ہے۔ ہماری اہلیہ بھی پردہ کرتی ہیں۔ وہ طارق صاحب کے سامنے نہیں آئیں گی۔ چائے آپ کو ان کے ساتھ پینی ہوگی۔ ہم چاروں ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' رفعت نے مسکرا کر کہا۔ ''پردہ کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ شادی سے پہلے میری والدہ بھی پردہ کیا کرتی تھیں۔''

یہ معاملہ سامنے آنے کے باعث چائے کی میز پر مشکور کے ساتھ صرف طارق ہی تھا۔

''اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟'' مشکور نے پوچھا۔

''جوں کی توں ہے۔ ٹیسٹ کروایا ہے ڈاکٹر نے۔ آج رپورٹ دکھانی ہے۔''

''آپ نے ڈاکٹر شی کا نام بتایا تھا۔''

''ہاں۔''

''نہ جانے کیوں آپ کی طرف میرا دل بہت کھنچتا ہے اور یہ کوئی اچانک بات نہیں ہے۔ دفتر ہی کے زمانے سے یہ کیفیت ہے۔ ہمارا ربط ضبط تو بعد میں بڑھا ہے۔ اسی باعث میں نے لوگوں سے پوچھ گچھ کی تھی ڈاکٹر شی کے بارے میں۔''

''کیا معلوم ہوا؟''

''وہی بتانا چاہ رہا ہوں۔ لوگوں کے خیال کے مطابق وہ بہت کامیاب ڈاکٹر ہے لیکن سنکی ہے۔''

''ڈاکٹر کاشف نے بھیجا تھا مجھے ان کے پاس۔ انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ ڈاکٹر شی ذرا سنکی ہے لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ پاگل ہے۔''

''کیوں؟'' مشکور نے ہنس کر پوچھا۔

''اس کی باتیں سنکی پن سے بہت آگے کی ہیں۔''

''وضاحت سے بتائیں، اگر کوئی حرج نہ ہو تو۔''

''حرج کیا ہوگا۔ بتائے دیتا ہوں آپ کو۔''

طارق نے مشکور کو ڈاکٹر شی سے ملاقات کے آخری لمحوں کے علاوہ سب کچھ بتا دیا۔

مشکور نے سب کچھ سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہت دلچسپ ہے یہ سب۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بچپن ہی سے اس قسم کے ناول پڑھ پڑھ کر دوہری شخصیت کی مالک بن گئی ہو۔''

''شاید۔''

''آپ نے بتایا ہے کہ وہ نہ صرف نہایت خوب صورت بلکہ جسمانی طور پر بھی بہت پُرکشش ہے۔''

''جی ہاں۔''

''تو پھر۔'' مشکور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کہیں وہ ہماری بھابی رفعت کے حقوق پر ڈاکا ڈالنے کا ارادہ نہ کر بیٹھے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوسکتا۔'' طارق نے جواب دیا۔

ساتھ ہی اسے گزشتہ دن بھی یاد آ گیا جب اس کا دل اسے ڈاکٹر شی کے پاس جانے کے لیے اکسا رہا تھا لیکن اس کے دماغ نے ایک تدبیر سجھا دی جس پر اس نے فوری طور پر عمل بھی کر ڈالا۔ دوسرے شہر کا رخ کرنے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر شی سے ملنے جا سکتا۔

وہ پھر بولا۔ ''میں تو دوبارہ اس پاگل ڈاکٹر کے پاس جانا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن رفعت بضد ہو گئی ہے کہ میں اسی سے اپنا علاج کراؤں کیونکہ بظاہر وہ آخری امید ہے۔ ڈاکٹر کاشف نے بڑے اعتماد سے اس کا نام تجویز کیا تھا۔''

''بات تو درست ہے بھابی کی لیکن معذرت کے ساتھ پوچھوں گا، کیا آپ کی قوتِ ارادی مضبوط رہ سکے گی؟''

''امید تو ہے۔''

اس جواب کے ساتھ ہی طارق کو یاد آیا تھا کہ ڈاکٹر شی سے ملاقات کے الوداعی لمحات میں اس کی قوتِ ارادی مفلوج ہو گئی تھی۔

مشکور بولا۔ ''رفعت بھابی جیسی محبت کرنے والی کوئی دوسری ہو بھی نہیں سکتی۔ یہ میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''یہ تو بکواس ہے کہ وہ رائیڈر ہیگرڈ کے ناول کی کردار ''شی'' ہے۔''

''میں اسے ڈاکٹر شی ہی کی فکشن اسٹوری سمجھ رہا ہوں۔''

چائے ختم ہونے تک ان دونوں کا موضوعِ گفتگو ڈاکٹر شی ہی رہی۔ پھر وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ مشکور نے بتایا تھا کہ اس کی بیوی نے رفعت کو اپنی خواب گاہ میں بٹھا لیا تھا۔

مزید نصف گھنٹا گزارنے کے بعد رفعت اور طارق واپس اپنے گھر روانہ ہوئے۔ اس وقت سات بج رہے تھے۔ ڈھائی گھنٹے بعد طارق کو ڈاکٹر شی کے پاس جانا تھا۔ گویا اچھا خاصا وقت باقی تھا لیکن طارق بے چینی محسوس کرنے لگا اور جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، اس کی بے چینی بڑھتی ہی رہی۔ وہ بے چینی ڈاکٹر شی سے ملنے کی نہیں، اس کی تھی کہ اسے بادل ناخواستہ ڈاکٹر شی سے ملنا ہی تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے رفعت نے طارق سے کہا۔ ''اتنی جلدی کھانے کی خواہش تو ممکن ہی نہیں۔ واپس آ کر ہی کھائیں گے۔ اب جلدی سے تیار ہو جائیے۔ لیبارٹری راستے ہی میں ہے۔ وہاں سے رپورٹ لیتے ہوئے چلیں گے۔''

طارق تیار ہوا اور دونوں گھر سے روانہ ہوئے۔ راستے سے رپورٹ لی اور مقررہ وقت پر ڈاکٹر شی کے اسپتال پہنچ گئے۔ گزشتہ کی طرح اس وقت بھی رفعت کو باہر ہی بیٹھنا پڑا۔ صرف طارق ہی ڈاکٹر شی کے کمرے میں داخل ہوا۔

ڈاکٹر شی کو اس کے آنے کا علم فون پر اپنی سیکریٹری سے ہو چکا تھا۔ وہ طارق کے استقبال کے لیے دروازے تک آ گئی تھی۔ سرخ ساڑی میں شعلہ جوالا بنی ہوئی اس حسنِ بے پناہ نے فوراً ہی طارق کے گلے میں اپنی باہنیں حمائل کر دیں۔

''کل نہیں آئے تم! بہت ناراض تھی تم سے لیکن اب آئے ہو تو میری ساری ناراضگی جیسے ہوا ہو گئی ہے۔ اطلاع ملتے ہی جی چاہا تھا کہ ایک لمحہ بھی نہ گزرے اور میں تمہارے سینے سے لگ جاؤں۔''

اس کے لمس سے طارق کی وہی حالت ہوئی جو پہلے بھی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر شی نے اپنی گزشتہ ملاقات کے آخری لمحوں کا وظیفہ دہرایا تو طارق کی حالت بالکل ہی غیر ہو گئی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ بہر حال وہ ایک مرد تھا۔

''بہت اچھا لگا آج تمہارا یہ انداز۔'' ڈاکٹر شی نے اپنے بھیگے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر میز کی طرف لے جانے کے بجائے ایک جانب لگے ہوئے صوفے کی طرف لے گئی۔

''میں جب تھکن محسوس کرتی ہوں تو ذرا دیر کے لیے یہیں آرام کر لیتی ہوں۔ تم نے بھی اس وقت مجھے اتنا ہی تھکا دیا ہے جتنا اپنے پچھلے جنم میں تھکایا کرتے تھے۔''

اس وقت طارق کے تنفس کی رفتار بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر شی صوفے پر نہ صرف خود بیٹھی بلکہ طارق کو بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ ''رپورٹ لائے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

طارق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جیب سے رپورٹ کا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

ڈاکٹر شی رپورٹ پڑھ کر دھیرے سے ہنسی۔ ''وہی بات ہے جس کا اندازہ میں نے لگا لیا تھا۔''

''کیا اندازہ لگایا تھا؟'' طارق اس وقت جذباتی طور پر اتنا ''زخمی'' تھا کہ بہ مشکل بول سکا۔

''یہی کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''کب تک؟''

''یہ تمہاری جسمانی کیمسٹری پر منحصر ہے۔ دس دن بھی لگ سکتے ہیں اور بیس دن بھی لیکن بیس دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ تمہارا خون بننا شروع ہو جائے گا طارق!''

"میں اس وقت بھی اچانک بہت تکان محسوس کرنے لگا ہوں۔"

"پوری طاقت سے پیس کر جور کھ دیا تھا مجھے۔" ڈاکٹر شی نے اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر فوراً ہی کھڑی ہوئی۔ "ایک منٹ۔"

طارق نے دیکھا، وہ اپنی میز کی طرف گئی تھی۔ اس نے دراز سے کسی قسم کی ٹیبلٹس کا ایک پتا نکالا۔ اس میں سے ایک ٹیبلٹ نکالی اور کمرے کے ایک گوشے میں موجود واٹر ڈسپنسر کی طرف گئی۔ گلاس میں پانی بھر کر وہ طارق کی طرف لوٹی۔ "لو یہ ٹیبلٹ کھالو، کچھ سنبھالا مل جائے گا۔ پانی رک رک کر پینا۔ چار مرتبہ میں۔"

طارق نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ نہ جانے کون سی دوا تھی لیکن تھی جادو اثر! پانی کا آخری گھونٹ پیتے پیتے طارق نے محسوس کیا کہ اس کی تکان میں کمی آرہی تھی۔

ڈاکٹر شی نے اس سے گلاس لے کر تپائی پر رکھ دیا اور بولی۔ "کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"کچھ بہتر ہوا ہوں۔"

"میں نے ٹیبلٹ ہی ایسی دی تھی۔ میں سمجھ چکی ہوں نا تمہاری بیماری۔ آج ہی سے علاج شروع کروں گی۔ اچھا یہ بتاؤ، پرسوں سے اب تک تم نے میرے بارے میں کچھ سوچا تو ہوگا۔"

"بہت سوچا ہے۔" طارق نے جواب دیا۔ "آواگون پر یقین نہیں ہے مجھے۔"

"میں تمہیں تمہارا ہر جنم یاد دلا سکتی ہوں۔ ہر جنم کی ہر بات یاد آجائے گی تمہیں۔ پھر تو یقین کرلو گے تم اپنے پچھلے جنموں پر؟"

"پھر تو یقین آہی جائے گا۔"

"میں تمہیں پچھلے جنم کے کچھ منظر یاد دلاتی ہوں۔ تم اپنی آنکھیں بند کرلو۔"

طارق نے آنکھیں بند کرلیں۔

ڈاکٹر شی نے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور پھر کچھ بولنا شروع کیا۔ وہ اتنی تیزی سے بول رہی تھی کہ طارق کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ یکایک وہ جیسے ایک خواب دیکھنے لگا۔ وہ اور ڈاکٹر شی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک باغ میں ٹہل رہے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے دونوں کا انداز والہانہ تھا۔

ڈاکٹر شی کی آواز اس کے کانوں میں اب بھی آرہی تھی لیکن ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے اب وہ بہت دور سے بول رہی ہو۔

باغ طارق کے لیے اجنبی تھا۔ وہاں ٹہلتے ہوئے اس کی ہلکی سی مونچھیں بھی تھیں جبکہ اب وہ ہمیشہ ہی کلین شیو رہا تھا۔

باغ کا منظر دھندلایا۔ اس کی جگہ دوسرا منظر ابھر آیا۔ وہ ایک نہایت خوب صورت کمرا تھا، حجلۂ عروسی کی طرح آراستہ۔ وہ اور ڈاکٹر شی بستر پر اس طرح لیٹے ہوئے تھے جیسے ایک جان، دو قالب ہوں۔

طارق نے یکلخت آنکھیں کھول دیں۔ اس نے خود کو پسینے میں ڈوبا ہوا پایا۔ وہ اتنی بے طاقتی محسوس کر رہا تھا کہ صوفے پر لیٹ ہی گیا۔ ڈاکٹر شی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"دماغ پر زیادہ زور پڑنے سے تھک گئے ہو۔" ڈاکٹر شی نے کہا۔ "لیکن وہ ٹیبلٹ اتنی جلدی دوبارہ نہیں دی جاسکتی۔ کچھ دیر لیٹے رہو۔ سنبھل جاؤ گے۔"

طارق نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

"اب میں دوبارہ تمہیں کچھ یاد نہیں دلاؤں گی۔" ڈاکٹر شی نے کہا۔ "بہت کمزور ہوگئے ہو۔ جب تم ٹھیک ہوجاؤ گے تو میں پچھلے سبھی جنموں کی ہر بات یاد دلا دوں گی۔ اس وقت تو میں نے تمہیں صرف دو باتیں یاد دلائی ہیں۔ دوسرا منظر ہماری شادی کی پہلی رات کا تھا۔ میں تمہیں بہت کچھ اور بھی یاد دلاتی لیکن اس لیے رک گئی کہ تم پسینے پسینے ہوچکے تھے۔"

طارق خاموش رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ تکان کے باعث بولنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے بڑھے ہوئے تنفس کی رفتار بتدریج کم ہوتی جارہی تھی۔

"تم آرام کرو۔ میں تمہارے لیے دوا تیار کرتی ہوں۔ یہ صرف ایک دن کی ہوگی۔ تم جب تک ٹھیک نہ ہوجاؤ، تمہیں روزانہ ہی آنا پڑے گا۔ مجھے روزانہ ہی دیکھنا پڑے گا کہ تم پر کیا اثر ہورہا ہے۔"

طارق اب بھی خاموش ہی رہا۔

ڈاکٹر شی اپنی میز کے قریب رکھی ہوئی ایک الماری کی طرف گئی۔ اس نے کئی مکسچر ناپ ناپ کر ایک شیشی میں ڈالے۔ پھر شیشی کو بند کرکے اسے پندرہ بیس سیکنڈ تک جھٹکے دیے۔ پھر الماری بند کی۔ شیشی میز پر رکھی اور صوفے پر آگئی۔

"تم بہتر ہوتے جارہے ہو۔" اس نے کہا۔

طارق نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ پھر بولی۔ ''اب تم جب تک ٹھیک نہیں ہوجاتے، میں تم سے اس طرح نہیں ملوں گی جیسے پہلی بار تمہیں رخصت کرتے ہوئے اور آج تمہارے آنے پر ملی تھی۔ ابھی تم میرا قرب برداشت نہیں کرسکتے۔''

پانچ سات منٹ میں طارق اس قابل ہوگیا کہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔

''گڈ۔'' ڈاکٹر شی نے کہا۔ ''مزید پانچ منٹ بعد بالکل نارمل ہوجاؤ گے۔ اچھا اب تو تمہیں یقین آگیا کہ تم پہلے بھی جنم لے چکے ہو؟''

طارق نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن اب اس کے دماغ میں کچھ اور ہی باتیں چکرانے لگی تھیں۔ ڈاکٹر شی پھر بولی۔

''ذرا دیر پہلے پوچھ چکے ہو اور میں بتا چکی ہوں کہ تمہارے ٹھیک ہونے میں دس سے بیس دن لگ سکتے ہیں لیکن میری خواہش تو یہ ہے کہ تم آج ہی ٹھیک ہوجاؤ۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ ہماری شادی ہوسکے۔ تم ہر جنم میں مجھ سے شادی کرچکے ہو۔ میں تمہیں وہ سب شادیاں یاد کراؤں گی۔''

طارق اب بھی خاموش رہا۔

''کرو گے نا مجھ سے شادی؟'' ڈاکٹر شی کے لہجے میں بڑی محبت تھی۔ ''اس میں رفعت تو رکاوٹ نہیں بنے گی؟''

''میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔'' طارق نے آہستہ سے کہا۔

''میں عیسائی سہی لیکن مسلمانوں کو غیر مسلم اہلِ کتاب سے شادی کرنے کی اجازت ہے اور پھر مسلمان تو چار شادیاں بھی کرسکتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انتہائی مذہبی ہونے کے باوجود مسلمان عورتیں اپنے شوہر کی دوسری شادی بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔''

''کچھ ایسا ہی مزاج بن چکا ہے ہماری عورتوں کا مگر ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بیوی کی رضامندی سے دوسری شادی کی گئی۔''

''رفعت بھی رضامند ہوجائے گی نا؟'' ڈاکٹر شی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''ابھی کہہ چکا ہوں، اسے منانے کی کوشش کروں گا۔''

''اگر وہ رضامند نہ ہوئی تو؟''

''میں اسی الجھن میں گرفتار ہوں۔''

''خیر چھوڑو۔ ابھی اس معاملے میں اپنے دماغ پر زیادہ زور نہ دینا۔ دماغی تھکن جسمانی تھکن کا سبب بھی بنتی ہے۔ پہلے تم ٹھیک ہوجاؤ۔''

☆☆☆

ڈاکٹر شی کے اسپتال سے واپسی پر رفعت نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ''آج تو کل سے بھی زیادہ دیر لگ گئی۔''

''وہ طرح طرح سے میرا چیک اپ کرتی رہی۔'' طارق نے بات بنائی۔ ''رپورٹ پڑھ کر تو وہ بہت ہی مطمئن ہوئی تھی۔ میری بیماری کے بارے میں اس نے جو اندازہ لگایا تھا، رپورٹ سے اس کی تائید ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں دس سے بیس دن کے اندر ٹھیک ہوجاؤں گا۔ وہ ایک ہی دن کی دوا دیا کرے گی۔''

''تو روز آنا پڑے گا؟''

''ہاں۔'' طارق نے کہا۔ ''چلتے وقت اس نے بتایا تھا کہ میرا چیک اپ کرنے کے بعد دوا میں کچھ تبدیلی بھی ممکن ہے۔''

''خیر! تم بس ٹھیک ہوجاؤ۔ بیس دن کی یہ ڈیوٹی کوئی مہنگا سودا نہیں تمہاری تندرستی کے لیے۔ دوا کی کتنی خوراکیں ہیں؟''

''چار۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''چار چار گھنٹے سے پانی ملائے بغیر پینی ہوگی۔ دوا کڑوی بھی نہیں، میٹھی ہوگی۔''

''دوا تو دوا ہے، کڑوی بھی ہو تو پینی پڑتی ہے۔''

''ہوں۔''

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھا، پھر خواب گاہ کا رخ کیا۔ رفعت پر اس نے ظاہر تو نہیں کیا کہ وہ جاگ رہا ہے لیکن اسے خاصی دیر سے نیند آئی۔ ڈاکٹر شی کے پاس سے آنے کے بعد جو خیالات اس کے ذہن میں مسلسل رہے تھے، وہی اس کی نیند اڑانے کا سبب بھی بنے رہے۔

طارق کو یقین تھا کہ ڈاکٹر شی نے اسے پچھلے جنم کے جو منظر دکھائے تھے، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ڈاکٹر شی نے اسے ہپناٹائز کیا تھا۔ ہپناٹزم میں بلا کی مہارت تھی اسے۔ اس نے جو کچھ دکھانا چاہا تھا، وہی طارق نے دیکھا۔ طارق کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ ڈاکٹر شی یہ کھیل کیوں کھیل رہی تھی لیکن طارق نے یہ بھی سوچا کہ اس کھیل کو وہ اپنے مقصد کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔

رفعت اسے دوسرے دن بھی ڈاکٹر شی کے پاس لے گئی اور روزانہ لے جاتی رہی۔ چوتھے دن وہ طارق سے یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ وہ بہتری محسوس کررہا ہے۔

ڈاکٹر شی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ورزش کیا کرے لیکن جیسے ہی تکان کا احساس شروع ہو، ویسے ہی

ورزش چھوڑ دے۔ چوتھے دن اسے تکان کا احساس روزانہ کی نسبت پندرہ منٹ زیادہ گزرنے کے بعد ہوا تھا۔

اس بات نے ڈاکٹر شی کو بھی خوش کیا۔ اس نے طارق کا ایک اور ٹیسٹ کروایا اور رپورٹ وہی آئی جس کی اسے توقع تھی۔

چار دن اور گزرے۔ طارق کو تھکن کا احساس ہونے میں اور زیادہ دیر لگی۔ رفعت نے شکریہ ادا کرنے کے لیے ڈاکٹر کاشف کو فون کیا اور اس سے ہونے والی مختصر گفتگو طارق کو بھی سنوائی۔

رفعت سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد وہ بولا۔ ''معجزانہ شفا ہے ڈاکٹر شی کے ہاتھ میں۔ پہلے بھی اس نے کئی ایسے مریضوں کو ٹھیک کیا ہے جنہیں دوسرے ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ کچھ دن سے تو یہ سلسلہ ہی چل پڑا ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر اپنے کسی مریض کے سلسلے میں بے بس ہوتا ہے تو اسے ڈاکٹر شی ہی سے ملنے کا مشورہ دیتا ہے۔ یہی میں نے بھی کیا تھا۔ کیا آپ مجھے ان دواؤں کے نام بتائیں گی جو ڈاکٹر شی دے رہی ہے؟''

''پیٹنٹ دوائیں نہیں ہیں۔ وہ خود ہی کوئی مکسچر بنا کر ایک شیشی میں دیتی ہیں۔''

طارق نے پہلی بار محسوس کیا کہ ڈاکٹر شی کے لیے رفعت کے دل میں احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کاشف کو یہ جان کر مایوسی ہوئی تھی کہ اسے دواؤں کے بارے میں علم نہیں ہو سکتا تھا۔

ساتویں دن ڈاکٹر شی نے کہا۔ ''اب میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ سولہ سترہ دن بعد تم بالکل ٹھیک ہو گے۔ سولہویں دن تم آٹھ گھنٹے تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے جسمانی تھکن ہو سکے لیکن آٹھویں گھنٹے سے پہلے ہی تھکن کا احساس ہو تو وہ کام فوراً چھوڑ دینا۔''

ڈاکٹر شی کے پاس طارق کا جتنا وقت گزرتا تھا، اس میں بیماری کی بات کم اور محبت کی باتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر شی یہ خیال ضرور رکھتی تھی کہ اتنی زیادہ قربت نہ ہو جو طارق کو جذباتی کر دے۔

آٹھویں دن طارق نے اس سے کہا۔ ''تم نے مجھ پر کیسا جادو کیا ہے کہ زیادہ تر وقت تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے گزرتا ہے۔''

''رفعت سے اشارتاً کوئی بات کی؟''

''ابھی نہیں۔''

''لیکن اگر وہ رضامند نہیں ہوئی تو؟''

''تو بھی تم سے شادی کروں گا۔'' طارق نے کہا۔

''پھر اسے صبر کرنا ہی پڑے گا۔''

''رفعت سے تمہارے تعلقات خراب ہونے کا اندیشہ ہے لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ میں بات کروں گی شادی کے بعد رفعت سے۔''

''دیکھا جائے گا۔''

تھوڑی دیر بعد جب طارق ڈاکٹر شی کے کمرے سے نکلا تو رفعت موبائل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

''اچھا کیا تم نے جو ڈیڈ کی بات مان لی۔'' پھر وہ طارق کو دیکھ کر بولی۔ ''اچھا پھر کسی وقت مزید باتیں پوچھوں گی، بلکہ آنٹی ہی سے پوچھ لوں گی۔ اب بند کر رہی ہوں فون۔ طارق باہر آ گئے ہیں ڈاکٹر کے کمرے سے۔''

وہ فون بند کر کے کھڑی ہو گئی۔ طارق کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شفیق کا فون تھا۔

''میں نے بھی ایک بار کہا تھا اس سے۔'' رفعت نے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اسے مان لینی چاہیے ڈیڈ... اور آنٹی کی بات۔ ماں باپ کی خواہش ہوتی ہی ہے کہ بیٹے کے سر پر سہرا دیکھیں۔ آنٹی آ گئی ہیں امریکا سے۔ پھر دباؤ پڑا ہو گا اس پر ماں باپ کا۔''

''شادی؟'' طارق نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں۔'' رفعت ہنسی۔ ''کہہ رہا تھا کہ تمہاری بات مان لی میں نے، حالانکہ ڈیڈ اور آنٹی کا دباؤ پڑا ہو گا۔''

''ہوں۔'' طارق نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اس کے دماغ میں کچھ خیالات چکرانے لگے تھے۔

کار کے قریب پہنچنے تک رفعت اس معاملے میں خوشی کا اظہار کرتی رہی۔ کار روانہ ہو گئی تھی جب طارق نے پوچھا۔

''خاندان ہی میں کہیں طے ہوئی ہے شادی؟''

''نہیں۔'' رفعت نے جواب دیا۔ ''شاید تمہیں یاد ہو۔ کالج کے زمانے میں ایک لڑکی اپنی شاعری کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔''

''غزالہ؟''

''ہاں۔''

''اپنا تخلص اس نے غزل رکھا تھا۔''

''وہی۔'' رفعت نے جواب دیا۔ ''اسی سے طے ہوئی ہے شادی۔''

''شفیق نے اب تک شادی سے گریز کیوں کیا تھا؟''

''مجھے علم نہیں۔'' رفعت نے جواب دیا۔ ''لیکن ایک مرتبہ اس کی باتوں سے کچھ شبہ ہوا تھا مجھے کہ وہ کسی اور

لڑکی سے محبت کرتا تھا، اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔''
''تو کیوں نہیں کی؟''
''یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے اس لڑکی کی شادی کہیں اور ہوگئی ہو۔''
''اور غزالہ کی شادی اب تک کیوں نہیں ہوئی تھی؟''
رفعت ہنسی۔''ہوسکتا ہے کہ وہ بھی کسی سے محبت کرتی ہو جس سے اس کی شادی نہ ہوسکی ہو۔ اب شفیق نے جس طرح مان لیا ہے، شاید اسی طرح وہ بھی مان گئی ہو۔''
''اس کے باپ تو خاصے مشہور بزنس مین ہیں۔''
''ہاں۔ تاج الدین رفیقی۔ دو شوگر ملز ہیں شاید ان کی۔''
طارق چپ ہوکر سامنے سڑک کا منظر دیکھنے لگا۔ اس کے دماغ میں اب صرف دو لفظ گونج رہے تھے، مجبوری اور شادی!
رفعت چہکتی رہی۔''چٹ منگنی پٹ بیاہ کا معاملہ ہوا ہے۔ دس دن بعد کی تاریخ طے ہوچکی ہے۔ انشاء اللہ اس وقت تک تم بھی بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے۔ بھرپور تیاریاں کریں گے اس کی شادی میں شرکت کی۔''
''اگر وہ شادی ہوسکی۔'' طارق نے اپنے دل میں کہا۔''جو ہونی نہیں چاہیے۔''
''تمہارے بارے میں تو میں پوچھنا بھول ہی گئی ان باتوں میں۔ بھولی بھی اس لیے کہ اب تشویش نہیں رہی۔ تم بہتر ہوتے جارہے ہو۔ کیا کہا آج ڈاکٹر شی نے؟''
''وہ بھی مطمئن ہے کہ علاج بالکل ٹھیک ہورہا ہے۔''
''میرا دل چاہتا ہے کہ اسے دیکھوں۔''
طارق ہنس کر بولا۔''اپنا کوئی فرضی مرض بتانے چلی جاؤ اس سے ملنے!''
''ترکیب تو اچھی بتارہے ہو۔'' رفعت ہنسی۔
طارق مسکرا کر پھر سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال چکراتا رہا کہ غزالہ اور شفیق کی شادی کس طرح رکوائی جاسکتی ہے۔ یہی خیال اسے رات کو بھی جگاتا رہا۔ خاصی رات گئے اسے نیند آئی۔

☆☆☆

چھ دن گزر گئے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ طارق کی پریشانی بڑھتی رہی۔ جو شادی وہ رکوانا چاہتا تھا، اس کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس دن اس نے رفعت کو بھی کچھ الجھا الجھا سا پایا۔
''کس سوچ میں پڑی ہوئی ہو؟'' طارق نے اس سے پوچھا۔
رفعت چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔
''میں ڈاکٹر شی سے ملی تھی۔''
''کب؟'' طارق نے چونک کر پوچھا۔
''آج صبح میں تم سے کہہ کر گئی تھی کہ اپنی کسی دوست سے ملنے جارہی ہوں لیکن دراصل میں ڈاکٹر شی کے پاس گئی تھی۔ اس نے مجھے گیارہ بجے کا وقت دیا تھا۔ وہ دوپہر کو گیارہ بجے سے دو بجے تک ہی مریضوں کو دیکھتی ہے۔''
''اوہ!''
''تم نے جو ترکیب بتائی تھی اسے دیکھنے کی، اس پر میں نے فوراً ہی عمل کیا تھا۔ دوسرے ہی دن فون کرکے وقت لے لیا تھا۔ آج کا وقت ملا تھا۔''
''مجھ سے چھپ کر ملنے کی کیا ضرورت تھی؟''
''اچانک بتا کر تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔''
''اب شام ہورہی ہے۔ تم ساڑھے بارہ بجے واپس آگئی تھیں لیکن بتایا اب ہے جب میں نے تم سے پوچھا۔''
''میں الجھن میں پڑ گئی تھی ڈاکٹر شی سے ملنے کے بعد۔''
''کیوں؟''
''وہ خطرناک حد تک حسین اور خطرناک حد تک ذہین ہے۔''
''خطرناک حد تک حسین؟ کیا مطلب؟''
''وہ کسی بھی شادی شدہ عورت کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔''
''اچھا!'' طارق خفیف سا مسکرایا۔''اور خطرناک حد تک ذہین؟''
''میں ایک فرضی نام سے ملی تھی لیکن اس نے فوراً ہی مجھے میرے ہی نام سے مخاطب کیا۔''
''اس میں ذہانت کی تو کوئی بات نہیں۔ اس نے دیکھا ہوگا تمہیں۔ بہت سے ڈاکٹر اپنے کمرے کے باہر، یعنی جہاں تم میرے انتظار میں بیٹھا کرتی ہو، وہاں خفیہ طور پر کلوز سرکٹ کیمرا لگا یا گیا ہوگا۔''
''شاید یہی بات ہو لیکن اس نے مجھ سے باتیں بڑی عجیب کیں۔''
''وہ کیا؟''
''میرا معائنہ کیے بغیر ہی اس نے کہہ دیا کہ تمہیں کوئی مرض نہیں ہے۔ تم صرف مجھے دیکھنے آئی ہو۔ اگر تم واقعی مریض ہو تو فرضی نام سے وقت نہ لیتیں۔'' رفعت نے جواب دیا پھر بولی۔''کیا تم نے اسے میری کوئی تصویر دکھائی تھی؟''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کلوز سرکٹ کیمرے ہی کا کرشمہ ہے۔''

''اس نے مجھ سے کچھ اور باتیں بھی کیں جو بڑی معنی خیز ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے شوہر کو دیر تک اپنے کمرے میں روکتی ہوں۔ مقصد معائنہ ہی ہوتا ہے لیکن تمہارے دل میں کچھ اور خیالات پیدا ہوئے۔ اسی لیے تم مجھے دیکھنے کے لیے متجسس ہوگئیں۔''

''کیا واقعی تمہارے دل میں کچھ دوسرے خیالات آئے تھے؟''

''ایک مرتبہ آیا تھا یہ خیال کہ آخر اتنی دیر کیوں، لیکن مجھے تم پر اتنا اعتماد ہے کہ میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔''

''لیکن وہ خیال تمہارے لاشعور میں ضرور چلا گیا ہوگا۔ اسی لیے تم اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوئی تھیں۔ خیر چھوڑو یہ بات! کچھ اور بھی کہا اس نے؟''

''ہاں، اس نے پوچھا تھا، اگر تمہارا شوہر دوسری شادی کرلے تو تمہارا کیا ردعمل ہوگا۔ میں نے اسے یہ جواب دیا کہ میرے........ شوہر ایسے نہیں ہیں۔ مجھے ان پر مکمل اعتماد ہے، بھروسا ہے۔ اس پر وہ بولی کہ بھروسے ٹوٹتے بھی ہیں۔ اس کی ان باتوں نے مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ میں کہہ بیٹھی کہ اگر میرا بھروسا ٹوٹا تو میں نہ جانے کیا کر گزروں، شاید اس عورت کو قتل ہی کردوں۔ اس پر وہ کہنے لگی کہ تمہارے مذہب میں تو مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے۔ اس کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کر اس کے کمرے سے نکل آئی۔ مجھے بتاؤ طارق! اس نے مجھ سے شادی والی بات کیوں کی؟''

''یہ سوال تو تمہیں اسی سے کرنا چاہیے تھا۔ آج بھی مجھے جانا تو ہے اس کے پاس۔ میں بھی پوچھوں گا۔''

''تم اکیلے ہی جانا۔ میں نہیں جاؤں گی اب وہاں۔ اب تو تمہاری طبیعت خاصی ٹھیک ہے۔ تم نے تو اس دن بھی ڈرائیونگ کی تھی جب ڈیڈ سے ملنے گئے تھے۔''

''اب کیوں نہیں جانا چاہتیں میرے ساتھ؟''

''مجھے چڑ ہوگئی ہے اس عورت سے۔''

''مجھ پر اگر تمہارا بھروسا ٹوٹا نہیں ہے تو بھی لرز تو گیا ہے۔ اسی لیے تم اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہوگئی تھیں۔''

اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھ سکی کیونکہ اسی وقت طارق کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ مشکور کا نام دکھائی دیا۔

''اس وقت کیوں فون کیا ہے اس نے!'' طارق نے بڑبڑاتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو! خیریت تو ہے مشکور صاحب؟ اس وقت آپ کی کال میرے لیے بہت غیر متوقع ہے۔''

''ایک بہت ہی ضروری بات ہے۔ ڈاکٹر کے پاس آپ جس وقت جاتے ہیں، اس میں ابھی کچھ دیر ہے۔ آپ مجھ سے فوری طور پر مل لیں۔''

''آجایئے۔''

''نہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ آپ میرے گھر آجائیں۔''

''کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں آپ؟''

''بات کچھ ایسی ہی ہے۔''

''اچھا میں آتا ہوں۔''

''فوراً چل پڑیے۔''

''بس روانہ ہوتا ہوں۔'' طارق نے کہا اور رابطہ منقطع کرکے رفعت سے بولا۔ ''نہ جانے کیا بات ہے۔ وہ فوراً مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ مجھے بلایا ہے اپنے گھر۔'' وہ کھڑا بھی ہوگیا۔ ''اگر اس سے باتوں میں کچھ دیر ہوئی تو پھر وہیں سے ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں گا۔ تم کہہ بھی چکی ہو کہ میرے ساتھ نہیں جاؤ گی۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی کہ اچانک ملاقات......''

''سب تو اس سے مل کر معلوم ہوگا۔'' طارق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''بس اب چلتا ہوں میں۔''

بہ مشکل بیس پچیس منٹ بعد وہ مشکور کے گھر پر تھا۔

''کون سی قیامت ٹوٹ پڑی مشکور صاحب؟'' طارق بولا۔

''ابھی تو شاید نہیں ٹوٹی لیکن ٹوٹ سکتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ نے ڈاکٹر شی کی تعریف تو بہت کی ہے۔ اگر اس سے واقعی متاثر نہیں ہوئے ہیں تو بہت اچھا ہوگا۔''

''آخر بات کیا ہے؟''

''جب آپ نے مجھے پہلی بار بتایا تھا کہ وہ خود کو رائیڈر ہیگرڈ کے ایک ناول کا کردار کہتی ہے، تبھی میرے دل میں آیا تھا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ میرا ایک بھائی جرنلسٹ ہے۔ یہاں نیویارک ٹائمز کا نمائندہ ہے۔ کئی ملکوں کے سفارت خانوں میں اس کا آنا جانا ہے۔ خاصے بڑے سفارتی لوگوں سے اس کے تعلقات بھی بہت اچھے ہیں۔ اسی سے میں نے کہا تھا کہ وہ فرانسیسی سفارت خانے کے ذریعے اس کے بارے میں چھان بین کرکے مجھے بتائے۔ میں اس سلسلے میں اسے روزانہ ہی ٹوکتا رہتا تھا۔ آج اس نے مجھے تفصیلی رپورٹ دی ہے۔ ڈاکٹر شی یہاں کی شہریت لے چکی ہے لیکن فرانس

کی شہریت بھی چھوڑی نہیں ہے۔ اسی لیے فرانسیسی سفارت خانہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ باخبر رہنے کی ایک خاص وجہ اور بھی ہے۔''

''اصل بات نہیں بتا رہے ہیں آپ! کیا کوئی غیر متوقع رپورٹ ہے؟''

''غیر متوقع تو میں اس لیے نہیں کہوں گا کہ میں نے پہلے ہی رائیڈر ہیگرڈ والی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔''

''تو اصل بات معلوم ہو گئی ہے آپ کو؟''

''جی ہاں۔ سب سے پہلے تو میں یہ بتاؤں گا کہ اس کی عمر سیکڑوں یا ہزاروں سال نہیں ہے۔ وہ پیرس میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی ہوگا اس کے پاس۔ اس نے جس اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی ہے، ان کے نام بھی معلوم ہو گئے ہیں۔ اس کا اصل نام فلورا تھا جو اس نے ڈاکٹر بننے سے پہلے ہی تبدیل کروالیا تھا۔ برتھ سرٹیفکیٹ کے مطابق اس کی عمر بتیس سال ہے۔ چند دن میں فرانسیسی سفارت خانہ اس کی اسکول اور کالج کی تصویریں بھی مہیا کردے گا۔ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے ڈاکٹر بننے سے ایک سال پہلے ہی وہ ایک حادثے میں مر گئے تھے۔ کالج کی فلورا ایک بوالہوس لڑکی تھی۔ کالج میں اس کے کئی اسکینڈل مشہور بھی ہوئے لیکن کوئی ثبوت نہ ملے بعد میں وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکی۔''

طارق بڑی توجہ سے مشکور کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ بات تو اس کے تجربے میں بھی آچکی تھی کہ ڈاکٹر شی کا مزاج حد درجہ گرم تھا۔

مشکور نے پانی کے دو گھونٹ لے کر پھر بولنا شروع کیا۔ ''ڈاکٹر بننے کے بعد وہ پیرس ہی میں ایک سنکی ڈاکٹر کی حیثیت سے مشہور ہو گئی تھی۔ بہت سے مردوں سے تعلقات کے علاوہ اس نے تین شادیاں بھی کیں لیکن سال چھ مہینے میں ان سے طلاق بھی لے لی۔ وہ کسی ایک مرد پر اکتفا کر ہی نہیں سکتی۔ اس کی حیرت انگیز طبی صلاحیت وہاں بھی مشہور ہو گئی تھی لیکن وہ بدنام بھی بہت زیادہ ہوئی۔ اسی لیے وہ آٹھ سال پہلے یہاں آگئی تھی۔ قوی امکان ہے کہ یہاں بھی اس کے کچھ نہ کچھ لوگوں سے تعلقات رہے ہوں گے۔ ان میں کوئی ایسی بڑی شخصیت بھی ہو سکتی ہے جس نے اسے یہاں کے شہری حقوق بھی دلوا دیے۔''

''بہت پائے کے جرنلسٹ ہیں آپ کے بھائی۔'' طارق نے کہا۔ ''اتنی مکمل معلومات نکال لائے۔''

''میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ وہ بہت با رسوخ ہے جس کا ایک سبب اس کی صلاحیت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی شہرت یافتہ اخبار کا نمائندہ ہے۔''

''یہ باتیں رفعت کو نہ بتایئے گا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے آپ کو یہاں بلایا ہی اس لیے تھا کہ میں رفعت بھابی کے سامنے یہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو اس لیے بتایا کہ آپ اس عورت سے ذرا چوکنا رہیں۔ ابھی جانا ہے نا آپ کو اس کے پاس؟''

''ہاں، تھوڑی دیر بعد جانا ہے۔ علاج تو مکمل کروانا ہی ہے۔ اس کے خیال کے مطابق میں دو دن بعد بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''اس کے بعد کبھی اس کی طرف رخ نہ کیجیے گا۔ اوہ! ان باتوں میں آپ سے چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔''

''ضرورت کیا ہے اس تکلف کی۔''

''ابھی کچھ دیر ہے ڈاکٹر شی کے پاس جانے میں۔ اتنا وقت چائے پی کر گزار لیجیے...... کار تو آپ لائے ہیں۔ رفعت بھابی......''

''آج میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ رفعت کو گھر پر کچھ کام ہے۔ وہ اب میری بیماری کی طرف سے مطمئن بھی ہو گئی ہے نا۔''

طارق نے مشکور کو وہ سب باتیں بتانا مناسب نہیں سمجھا جو ڈاکٹر شی کے بارے میں رفعت سے ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزرا ہوگا کہ طارق صوفے پر ڈاکٹر شی کی گود میں لیٹا ہوا تھا اور وہ اسے اس کی بیوی کی آمد کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''اس کے اس طرح آنے کا مطلب یہ ہوا کہ اسے کچھ شبہ ہو گیا ہے۔''

''مجھے بتایا تھا اس نے۔ اس کے دماغ میں کچھ ہلچل تو ہے۔''

''وہ مجھ سے کہہ چکی ہے کہ وہ تمہاری دوسری بیوی کو برداشت نہیں کر سکتی۔''

''کرنا تو پڑے گا۔'' طارق نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتا ڈیئر!...... میں تو بہت بے تاب ہوں۔ تم ہی اس وقت کا انتظار کرنا چاہتی ہو جب میں بالکل فٹ ہو جاؤں گا۔''

''شاید تم سے کہیں زیادہ بے تاب تو میں خود ہوں لیکن جب تک تم فٹ نہ ہو جاؤ، شادی برداشت نہیں کر سکتے۔ اب اس میں کچھ زیادہ وقت بھی نہیں رہ گیا ہے۔ کل تم آٹھ گھنٹے سے کچھ زیادہ دیر تک ایسا کام کرنا کہ

جسمانی تھکن ہو لیکن یہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اگر آٹھ گھنٹے سے پہلے ہی تھکن محسوس کرو تو کام چھوڑ دینا۔''

''اگر تھکن نہ ہو تو؟ میں اب خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

''جس دن بھی تم آٹھ گھنٹے کام کرنے کے باوجود زیادہ تھکن کا شکار نہیں ہو گے، میں اپنا اطمینان کرنے کے لیے تمہارا ایک خاص قسم کا بلڈ ٹیسٹ کرواؤں گی۔ اگر وہ اطمینان بخش ثابت ہوا تو احتیاطاً بس تین دن اور پی لینا دوا۔ اس کے بعد ہم شادی کر لیں گے۔''

طارق سوچنے لگا۔ اسے ایک خاص وقت کا انتظار تھا اور اس کی یہ پریشانی بدستور تھی کہ وہ وقت کیسے آسکے گا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوا لے کر ڈاکٹر شی کے کمرے سے نکلا۔ گھر کی طرف کار ڈرائیو کرتے ہوئے بھی وہ اسی سوچ میں غرق تھا کہ شفیق اور غزالہ کی شادی آخر کس طرح رکوائی جائے؟

موبائل فون کی گھنٹی نے اس کے خیالات میں رخنہ ڈالا۔ اس وقت دور دور تک کوئی کانسٹیبل نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے اس نے ایک ہاتھ سے موبائل نکالنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ کال رفعت کی ہو گی لیکن وہ حیران رہ گیا، کال مشکور کی تھی۔

''ہیلو!'' وہ طویل سانس لے کر ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''اب کوئی اور انکشاف؟''

''ہاں، انکشاف تو ہے لیکن وہ ڈاکٹر شی کے بارے میں نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟''

''ڈاکٹر شی کے پاس سے روانہ ہو چکا ہوں، کار کا رخ گھر کی طرف ہے۔''

''میرے گھر آجائیے۔ یہ انکشاف بھی میں رفعت بھابی کے سامنے نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں اگر آپ مناسب سمجھیں تو بتا دیجیے گا انہیں۔''

''ایسی بات ہے؟''

''جی۔''

''اچھا، آتا ہوں۔''

طارق نے رابطہ منقطع کر کے کار اس راستے پر موڑ دی جو مشکور کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ مشکور کو اس نے بے چین پایا۔

''سنائیے صاحب! اب کیا انکشاف ہے؟'' طارق نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔

''آپ کے جانے کے پانچ منٹ بعد ہی میرا بھائی آ گیا تھا۔ وہ دن بھر اور رات گئے تک مصروف رہتا ہے لیکن کھانے کے وقت گھر ضرور آتا ہے۔''

''کیا شادی نہیں ہوئی اس کی؟''

''نہیں، جبھی تو میرے ساتھ رہتا ہے۔ خیر، پہلے تو میں آپ کو یہ بات کہہ کر چونکاؤں کہ میں رفعت بھابی کو پہلے سے جانتا ہوں۔''

''پہلے سے؟ یعنی کب سے؟''

''جب آپ دونوں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ آج میں آپ کو پہلی مرتبہ بتا رہا ہوں کہ میں شفیق کو بھی جانتا ہوں۔''

''اوہو! انکشاف پر انکشاف!''

''دراصل میں پہلے اسی شہر میں ملازمت کرتا تھا۔ ایک تقریب میں شفیق سے ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں تعلقات خاصے گہرے ہو گئے۔ میرا اس کے گھر اور اس کا میرے گھر آنا جانا ہو گیا تھا۔ رفعت بھابی کو میں نے ایک بار وہیں دیکھا تھا۔ جب میں نے انہیں آپ کے ساتھ دیکھا تو فوری طور پر پہچان نہیں سکا۔ بس یہ خیال رہا تھا کہ انہیں پہلے کہیں دیکھ چکا ہوں۔''

''مجھے یاد ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''میں نے محسوس کر لیا تھا آپ کو اور یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ آپ رفعت کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔'' مشکور نے کہا۔ ''لیکن جب میں آپ کے گھر سے روانہ ہوا تھا، تو مجھے راستے میں یاد آ گیا تھا۔''

''بس یہ انکشاف کرنا تھا؟'' طارق خفیف سا مسکرایا۔

''جی نہیں۔ یہ تو صرف تمہید تھی۔ اس تمہید کے بغیر میں آپ پر وہ انکشاف نہیں کر سکتا تھا جو اب کرنے والا ہوں۔'' طارق پھر سنجیدہ ہو گیا اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اس تمہید کا مقصد یہ تھا کہ اس معاملے سے میری دلچسپی کا سبب آپ کی سمجھ میں آ جائے۔''

''میں اب اصل بات سننے کے لیے بہت بے چین ہو گیا ہوں۔''

''اصل معاملہ بھی آپ کی سمجھ میں اس وقت آئے گا جب آپ اس کی بھی تھوڑی سی تمہید سن لیں گے۔''

''وہ بھی سنائیے۔'' طارق نے طویل سانس لی۔

''اس وقت ہمارے ملک میں لوگ غریب سے غریب تر اور امیر طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے بلکہ امیر ترین، لیکن اس امارت کی بنیاد ایمان داری پر نہیں رکھی گئی۔ تقریباً سبھی نے ناجائز طریقے اختیار کیے ہیں۔ سیاسی

اثر رسوخ کے ذریعے بینکوں سے بڑے بڑے قرض معاف کرائے جارہے ہیں۔ مختصر یہ کہ کوئی ایسا ناجائز طریقہ نہیں جو اختیار نہ کیا جارہا ہو۔"

"یہ تو سارا ملک جانتا ہے بھائی۔" طارق نے کچھ اکتاہٹ محسوس کی۔

"اس کے باوجود ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہورہی ہے۔"

"کیسے ہوگی کارروائی۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔"

"اسی لیے چند ماہ قبل میرے بھائی نے صحافیوں کا ایک ایسا گروپ بنانا چاہا تھا جوان ڈاکو امراء کے بارے میں تحقیقات کرے اوران کے ثبوت حاصل کرکے نہ صرف اخبارات وغیرہ میں لائے بلکہ عدالتوں سے بھی رجوع کیا جائے لیکن وہ گروپ بنانے میں ناکام رہا۔"

"ان کے منہ پر بھی سنہری مہریں لگائی جاچکی ہیں۔"

"اسی لیے میرے بھائی نے تن تنہا یہ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بیک وقت دو بڑے امراء کے بارے میں تحقیقات شروع کیں۔ ان میں سے ایک صاحب کے بارے میں نہ صرف تحقیقات زیادہ آگے بڑھ چکی ہیں بلکہ خاصے ثبوت بھی جمع کرلیے ہیں تاہم ابھی وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ وہ ثبوت عام لوگوں کے لیے تو کافی ہیں لیکن عدالت کے لیے ابھی کچھ اور کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے بھائی کا خیال ہے کہ چند دن میں وہ ایسا ثبوت بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔"

"اچھی بات ہے، کوئی تو پہلا پتھر مارے۔"

"اب اصل بات سنیں جو میں بتانا چاہتا ہوں، یعنی یہ کہ وہ پہلا پتھر کسے لگنے والا ہے۔"

طارق اب توجہ سے مشکور کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرے علم میں یہ تو آہی چکا ہے کہ شفیق کی شادی غزالہ نامی کسی لڑکی سے طے ہوچکی ہے جس کے والد مشہور بزنس مین تاج الدین رفیقی ہیں۔ وہ پہلا پتھر تاج الدین رفیقی ہی کو لگے گا۔"

"اوہ!" طارق بے اختیار آگے جھک گیا۔ "معاملہ کیا ہے؟"

"اب لی آپ نے اس میں دلچسپی۔" مشکور کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ "تاج الدین کے معاملات تو میرے بھائی کے خیال کے مطابق کئی ہیں لیکن جس معاملے کے اس نے ثبوت حاصل کیے ہیں، وہ اسّی کروڑ کا اسکینڈل ہے۔"

"تاج الدین رفیقی کا اسکینڈل!" طارق کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔

"ہاں۔" مشکور نے کہا۔ "اب مسئلہ یہ ہے کہ تاج الدین رفیقی کی بیٹی سے شادی کے نتیجے میں کیا شفیق اور فیضان صاحب بھی اگر بدنام نہیں تو لوگوں کی نظر میں مشکوک تو ہوجائیں گے۔"

طارق جو دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اس شادی میں رکاوٹ ڈالے، قدرت ہی ایک تدبیر اس کے سامنے لے آئی تھی۔

مشکور بولتا رہا۔ "پہلے تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اپنے بھائی کو یہ کام کرنے سے روکوں لیکن پھر خیال آیا کہ یہ اس کی فرض شناسی پر ایک ضرب ہوگی جبکہ میں نے اسے ہمیشہ یہی نصیحت کی ہے کہ انسان کو اپنے پیشے کے تقدس پر حرف نہیں آنے دینا چاہیے۔ اب میں اس سے کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ وہ تاج الدین رفیقی کے معاملے میں جو کچھ کرچکا ہے، اسے ضائع کردے۔"

"تمہیں اسے فرض شناسی کے راستے سے ہٹانے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔" طارق نے بظاہر سکون لیکن دراصل بڑے جوش سے کہا۔

"ایک بات اور بھی بتاؤں۔" مشکور بولا۔ "تاج رفیقی کو بھی کسی وجہ سے شبہ ہوگیا تھا کہ میرے بھائی نے اس کا اسّی کروڑ کا اسکینڈل پکڑلیا ہے اور خاصے ثبوت بھی حاصل کرلیے ہیں۔ اس نے میرے بھائی سے رابطہ کرنے کے لیے اپنے خریدے ہوئے ایک صحافی ہی کو ذریعہ بنایا تھا۔ اس صحافی نے یہ پیشکش کی کہ جو کام اس نے کیا ہے، وہ اسے ختم کردے تو اسے اتنی کثیر رقم مل سکتی ہے جو بھی اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔"

"رشوت؟"

"ہاں، لیکن وہ پیشکش ٹھکرادی گئی۔ آخر میں نے بھی تربیت کی ہے اس کی۔ اسے زندگی کے اصول سمجھائے ہیں۔ اب میں دراصل آپ سے یہ مشورہ کرنا چاہتا ہوں کہ شفیق کو یہ سب کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔"

"بتانا چاہیے آپ کو۔" طارق نے زور دے کر کہا۔ "اپنے دوست کو گڑھے میں گرنے سے بچانا آپ کا فرض ہے۔"

"مشورے ہی کے لیے آپ سے ملا تھا۔" مشکور نے کہا۔ "ذہن میں یہ خیال تھا کہ اس بات کے سامنے آنے سے شادی رک سکتی ہے۔"

"رکنی چاہیے۔" طارق نے زور دے کر کہا۔ "آپ شفیق کو سب کچھ بتادیں۔ میری سمجھ میں اب یہ بھی آگیا ہے کہ شادی میں اتنی عجلت کیوں کی گئی۔ یہ عجلت تاج الدین

رفیقی ہی کی طرف سے کی گئی ہوگی۔ وہ چاہتا ہوگا کہ اس کا اسکینڈل سامنے آنے سے اس کی بیٹی کی شادی رک سکتی ہے۔ آپ کے بھائی نے اسکینڈل کے بارے میں جو ثبوت حاصل کیے ہیں، ان کی فوٹو اسٹیٹ بھی لے جایئے شفیق کے پاس۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ شفیق مجھے جھوٹا نہیں سمجھ سکتا۔''

''احتیاط کرلیں تو اچھا ہے۔''

''اپنے بھائی کو بتانا پڑے گا کہ میں ان دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ کیوں چاہتا ہوں۔ ابھی تو میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میرے ایک دوست کی شادی تاج الدین کی لڑکی سے ہونے والی ہے اور شاید دو تین ہی دن رہ گئے ہیں اس میں۔ دعوت نامہ تو میرے پاس آچکا ہے۔ اس پر جو تاریخ ہے، وہ مجھے یاد نہیں رہی۔''

''آپ کل ہی ملیے شفیق سے۔ اپنے بھائی کو آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ اپنے دوست کو شرمندگی سے بچانا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ کل میں دفتر سے چھٹی لے کر چلا ہی جاؤں گا اس سے ملنے۔'' مشکور نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ''رفعت بھابی نے فون نہیں کیا آپ کو؟''

''کس سلسلے میں؟''

''پہلے تو آپ میرے پاس آئے تھے۔ یہیں سے ڈاکٹر شی کے پاس چلے گئے تھے۔ وہاں سے نکلے تو میں نے بلا لیا۔ خاصی دیر نہیں ہوگئی آپ کو؟''

''ہاں، فون تو آنا چاہیے تھا اس کا۔ خیر، اب میں چلتا ہوں۔''

''بتا دیجیے گا انہیں کہ ڈاکٹر شی سے ملاقات کے بعد آپ کو میں نے پھر بلا لیا تھا۔ اسی لیے اتنی دیر ہوئی۔''

طارق نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ جانے کے ارادے سے اٹھا ہی تھا کہ مشکور نے اسے بتایا کہ کمپنی ایک کام کے سلسلے میں کچھ دنوں کے لیے اسے بیرونِ ملک بھیج رہی ہے۔

☆☆☆

رفعت طارق کے انتظار میں خاصی بے چین تھی۔ وہ چھوٹتے ہی بولی۔ ''میں اب پریشان ہوگئی تھی۔ اگر تم کو کچھ اور دیر ہوجاتی تو فون کرتی۔''

طارق نے اچانک ہی وہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا جو مشکور کے گھر سے چلتے وقت اسے آیا تھا۔ اس نے جھوٹ بولا۔ ''فون تو دراصل مجھے کرنا چاہیے تھا کہ تم پریشان نہ ہو۔ دراصل ڈاکٹر کے پاس سے موبائل والے کے پاس چلا گیا تھا جس نے اس کی خرابی دور کی تھی۔ وہ خرابی پھر پیدا ہوگئی تھی۔''

''تو ٹھیک ہونے کے لیے دے کر آئے ہو؟''

''نہیں۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''اسی وقت وہ ٹھیک کرنے میں لگ گیا تھا۔ ٹھیک کر کے دے دیا تھا۔ اسی کی وجہ سے دیر ہوئی۔''

دراصل طارق ان باتوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا جو اسے مشکور سے معلوم ہوئی تھیں۔

''ڈاکٹر سے پہلے آپ مشکور صاحب کے پاس بھی تو گئے تھے...... ایسی کیا بات تھی کہ انہوں نے اچانک آپ سے ملنا چاہا؟''

''اس کا اپنے بھائی سے کچھ اختلاف ہوگیا ہے۔ وہ غصے میں ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کے بھائی کو سمجھاؤں۔ خیر چھوڑو، یہ لمبی کہانی ہے۔ ایک خوشی کی خبر سنو۔ ڈاکٹر اب میرے مرض کی طرف سے بہت مطمئن ہوگئی ہے۔ اس نے کہا کہ کل میں آٹھ گھنٹے تک کوئی محنت کا کام کر کے دیکھوں۔''

''کیا کام کرو گے؟''

''راستے میں یہی سوچتا رہا تھا۔ ایک بات یہ آئی ذہن میں کہ آٹھ گھنٹے تک شطرنج کھیلی جائے کمپیوٹر پر۔''

''پہلے بھی کھیلا تو کرتے تھے۔''

''اچھی شطرنج نہیں آتی مجھے۔ لیول ایک سے تو میں خیر مسلسل جیتا تھا مگر دوسرا لیول میرے قابو میں نہیں آیا۔ زیادہ تر ہارتا تھا۔ اسی سے اکتا کر میں نے کھیلنا چھوڑا تھا۔ اب اسی لیول سے کھیلوں گا۔ کوشش کرتا رہوں گا کہ اسے زیادہ ہرا سکوں۔ دماغ پر بہت زیادہ زور ڈالوں گا۔ مسلسل آٹھ گھنٹے تک کھیلوں گا۔ کرسی سے اٹھوں گا بھی نہیں۔ اس طرح جسمانی تھکن بھی ہوگی اور ذہنی تھکن بھی...... اس طرح معلوم ہوجائے گا کہ اب وہ میرے لیے قابلِ برداشت ہے یا نہیں۔''

''اگر آٹھ گھنٹے سے پہلے ہی کچھ گڑبڑ ہوئی تو؟''

''ایسی صورت میں فوراً چھوڑ دوں گا۔ ڈاکٹر نے ہدایت بھی یہی کی ہے۔ اچھا، اب کھانے کی بات کرو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

کھانا کھا کر انہوں نے حسبِ معمول کچھ وقت ٹی وی لاؤنج میں گزارا، پھر خواب گاہ کا رخ کیا۔ دوسری صبح طارق ناشتے کے بعد ہی کمپیوٹر سے شطرنج کھیلنے بیٹھ گیا۔ رفعت نے بھی ایک کرسی اس کے قریب گھسیٹ لی۔

طارق نے آٹھ گھنٹے سے بھی دس منٹ زیادہ دیر تک

شطرنج کھیلی۔ اس دوران میں رفعت نے اسے کئی مرتبہ چائے بھی پلائی۔ طارق نے دوپہر کا کھانا بھی باقاعدہ نہیں کھایا۔ کھیلنے کے دوران میں ہی بس ایک برگر کھالیا۔

آٹھ گھنٹے دس منٹ بعد اس نے کمپیوٹر بند کرتے ہوئے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں رفعت!''

''بالکل تھکن نہیں ہوئی؟''

''تھکن نہ ہوتا تو غیر فطری بات ہے۔ کام سے تھکن تو ہوتی ہے لیکن وہ کیفیت نہیں ہوئی جو دفتر میں ہوا کرتی تھی۔ غشی سی طاری ہونے لگتی تھی مجھ پر!...... اس طرح شطرنج کھیل کر تو میں نے دفتر سے زیادہ محنت کی ہے لیکن غشی جیسا کوئی احساس نہیں ہوا۔ کمال کی ڈاکٹر ہے یہ ڈاکٹر شی۔''

''شکر ہے خدا کا۔'' رفعت نے مسکرا کر کہا۔ ''تو اب آپ کو اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے؟''

''ابھی جانا تو پڑے گا۔ اسے بتانا تو ہوگی اپنی کیفیت۔ وہ میرا ایک ٹیسٹ اور کروائے گی۔ اس کے بعد احتیاطاً تین دن اور پینی ہوگی اس کی دوا۔''

رفعت کے چہرے سے جو خوشی ظاہر ہوئی تھی، وہ کافور ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ بس اب طارق ڈاکٹر شی سے نجات حاصل کرلے۔

شام ہوتے ہوتے طارق کی بے چینی خاصی بڑھ گئی کیونکہ اس وقت تک مشکور نے اسے فون کرکے نہیں بتایا تھا کہ اس نے آج جو کام کیا ہوگا، اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ رفعت کیونکہ مسلسل اس کے ساتھ رہی تھی، اس لیے وہ خود مشکور کو فون نہیں کرسکا تھا۔

پھر جب ڈاکٹر کے پاس جانے کا وقت ہوگیا تو اس نے رفعت سے کہا۔ ''آج میں ڈاکٹر شی کے پاس سے ہوکر مشکور کے بھائی کو سمجھانے جاؤں گا۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ واپسی آج بھی کچھ دیر سے ہوگی۔ پریشان نہ ہونا۔''

''اچھا کیا کہ تم نے مجھے بتادیا۔ کل سے دماغ تمہارے ہی معاملے میں الجھا رہا تھا۔ یہ پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ مشکور صاحب کا اپنے بھائی سے کیا اختلاف ہوگیا ہے۔''

''واپس آکر بتاؤں گا۔ اب تو مجھے ڈاکٹر شی کے پاس جانا ہے۔'' طارق کھڑا ہوگیا۔

''یہ بات پہلی بار علم میں آئی ہے کہ مشکور صاحب کا کوئی بھائی بھی ہے۔''

''مجھے بھی معلوم نہیں تھا اور اتنی باتوں کے باوجود مجھے اس کے بھائی کا نام پوچھنے کا خیال بھی نہیں آیا اور نہ اس نے مجھے بتایا۔''

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں برآمدے تک آگئے تھے۔ طارق ڈاکٹر شی سے ملنے کے لیے روانہ ہوا اور اپنی بے چینی کی وجہ سے اس نے گھر سے کچھ دور نکل آنے کے بعد ایک جگہ کار روک کر مشکور سے موبائل پر رابطہ کیا۔

''ہاں طارق صاحب!'' مشکور نے کہا۔ ''مجھے اندازہ تھا کہ آپ نتیجہ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے۔ میں آپ کو فون کرتا لیکن میں وہاں سے آیا ہی ابھی ہوں۔ شفیق نے مجھے بڑے اصرار سے روک کے رکھا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ میں رات کا کھانا بھی اسی کے ساتھ کھا کر وہاں سے آؤں۔ کوئی بہانہ کرکے میں وہاں نہیں رکا۔ اب کھانا کھا کر آپ کو فون کرتا۔''

''نتیجہ بتائیے مشکور صاحب!''

''میں تاج الدین کے خلاف دستاویز کی فوٹو اسٹیٹ ہی لے کر گیا تھا۔ وہ دیکھ کر شاید شفیق کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہوگی۔ اس نے اسی وقت اپنے والد کو بھی بلالیا۔ ساری دستاویزات ان کے سامنے بھی رکھ دی گئیں۔ سب کچھ جان کر انہوں نے فوراً کہا، یہ بدنامی تو ہرگز مول نہیں لی جاسکتی۔ انہوں نے بدنامی ہی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ آج ہی رات کسی وقت تاج الدین کو فون کرکے اپنے بیٹے کی ان کی بیٹی سے شادی کو منسوخ کردیں گے۔''

''یہ بہت اچھا ہوا مشکور صاحب!'' طارق نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ ضروری تھا کہ شفیق کی شادی غزالہ سے نہ ہو۔ بدنامی تو خیر کیا ہوتی البتہ فیضان صاحب کا کردار بھی لوگوں کی نظر میں مشکوک ہوجاتا۔''

''لیکن میں نے کہا نا کہ فیضان صاحب نے بدنامی ہی کا لفظ استعمال کیا تھا۔''

''چلیں خیر! میں اب ڈاکٹر شی کے پاس جارہا ہوں۔ اس موضوع پر زیادہ بات نہیں ہوسکتی۔ دیر ہوجائے گی مجھے۔''

''ڈاکٹر شی کے بارے میں بھی آپ کو کچھ اور بتانا ہے۔ کچھ اور معلومات حاصل ہوئی ہیں میرے بھائی کو۔ ذرا تفصیلی بات ہے۔ ڈاکٹر شی سے ملنے کے بعد میرے پاس سے ہوتے جائیے گا۔''

''مزید انکشافات؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا میں آتا ہوں اس سے مل کر آپ کے پاس۔''

اگرچہ طارق اس معاملے میں متجسس ہوگیا تھا لیکن اس نے مناسب یہی سمجھا کہ ڈاکٹر شی تک پہنچنے میں اسے دیر نہ ہو۔ وہ صرف دو تین منٹ کی تاخیر سے ڈاکٹر شی کے پاس پہنچا۔

''آؤ طارق!'' وہ بولی۔ ''میں بے چینی سے انتظار کر رہی تھی تمہارا۔ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا نتیجہ نکلا۔''

''بہت ہی اچھا۔ ایسا کوئی امکان پیدا نہیں ہوا کہ مجھ پر غشی طاری ہو جاتی۔''

''مجھے اس کی توقع تھی لیکن پھر بھی تمہارا ایک ٹیسٹ اور کروانا ہوگا۔ سو فیصد سے زیادہ مطمئن ہونا چاہتی ہوں میں۔'' اس نے کاغذ پر کچھ لکھ کر طارق کے حوالے کیا۔

اس کے بعد معمول کے مطابق ڈاکٹر شی نے پیار محبت کی باتیں کیں۔ انہی باتوں میں یہ بھی کہا گیا کہ تیسرے دن کی دوا پینے کے بعد طارق کو اس سے شادی کر لینی چاہیے۔

ڈاکٹر شی کے پاس سے طارق مشکور کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اتفاق ہی تھا کہ اس رات اس کی ملاقات مشکور کے بھائی سے بھی ہو گئی۔ اس کا نام منظور تھا۔

''آج صبح۔'' مشکور نے ابتدائی رسمی جملوں کے بعد کہا۔ ''ناشتے کے بعد منظور نے مجھے ڈاکٹر شی کے بارے میں کچھ باتیں اور بھی بتائی ہیں۔'' پھر وہ منظور سے بولا۔ ''تم ہی بتا دو طارق صاحب کو۔''

طارق سوالیہ نظروں سے منظور کی طرف دیکھنے لگا۔

''کل مجھے سفارت خانے کے ایک اور شخص سے فلورا کے بارے میں چند باتیں اور معلوم ہوئیں۔ ڈاکٹر شی کا پہلا نام فلورا ہے۔'' منظور نے کہا۔

''یہ تو مجھے مشکور صاحب سے معلوم ہو چکا ہے۔''

''جی۔'' منظور نے کہا۔ ''فلورا یا ڈاکٹر شی، اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا لیکن اب اس کے فرانس کے دو بینکوں میں خاصی دولت جمع ہے۔ یقین کیجیے کہ یہاں اس کا جو اسپتال ہے، وہ اس کی دولت کا بہ مشکل دسواں حصہ ہے۔''

''اتنی دولت اسے کہاں سے حاصل ہو گئی؟''

''وہی تو اصل بات ہے جو آپ کے علم میں آ جانا چاہیے۔'' منظور نے کہا۔ ''ڈاکٹر شی بہت متحمل مزاج نظر آتی ہے لیکن جب اسے غصہ آ جاتا ہے تو وہ بالکل پاگل ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت کے اسی پہلو سے تنگ آ کر اس کے پہلے شوہر نے اسے خود طلاق دی تھی۔ طلاق کے باعث اسے خاصا پیسا بھی ڈاکٹر شی کو دینا پڑا تھا لیکن وہ بہت زیادہ دولت مند، اپنے بعد کے دو شوہروں کے قتل کی وجہ سے ہوئی۔''

''قتل؟'' طارق چونکا۔

''جی۔'' منظور نے کہا۔ ''قتل ہی کہا جا سکتا ہے۔ دونوں کو ایک ہی انداز میں مارا گیا۔ کسی نے ان کی گردنوں میں دانت گاڑ کر ان کا سارا خون پی لیا تھا۔ دونوں ہی کا یہ حشر ان کی خواب گاہوں میں ہوا۔ انہی کی ساری دولت ڈاکٹر شی کے حصے میں آئی۔''

طارق نہ صرف دلچسپی سے بلکہ حیرت سے یہ باتیں سن رہا تھا، وہ بولا۔ ''کیا ممکن ہے کہ یہ حرکت ڈاکٹر شی ہی کی ہو؟ اسی کو بہت زیادہ دولت ان دونوں کے ختم ہونے سے ملی۔''

''پولیس نے اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا۔ ڈی سی پی جے نے تو......''

''ڈی سی پی جے؟'' طارق بول پڑا۔

''فرانس کی ایک خاص پولیس کا نام ہے یہ۔ یہ کن الفاظ کا مخفف ہے، یہ مجھے بتایا تو گیا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ اس پولیس نے سر توڑ کوشش کی تھی لیکن ڈاکٹر شی کو اس کا ذمے دار ثابت نہیں کیا جا سکا۔ ان دونوں ہی کی موت کے وقت وہ اپنے کلینک میں تھی۔ گھر پہنچ کر اسی نے پولیس کو اس کی اطلاع دی تھی۔ دوسرے شوہر کی اس طرح ہلاکت وہاں خاصی مشہور ہوئی تھی مگر چونکہ اس کا ذمے دار اسے ثابت نہیں کیا جا سکا تھا اسی لیے وہ کچھ ہی عرصے بعد دوسری شادی

کرنے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ اس موقع پر بھی ڈاکٹر شی کسی بھی طرح اس کی ذمے دار قرار نہیں دی جاسکی لیکن اس کے بارے میں عمومی رائے خراب ہوگئی تھی۔ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ پولیس ثابت نہیں کرسکی لیکن اس کی ذمے دار ڈاکٹر شی ہی ہوگی۔ لوگوں کے ان خیالات کی وجہ سے اس کی پریکٹس بھی متاثر ہوئی۔ کئی دن تک اس کے کلینک میں ایک مریض بھی نہیں آیا تو اس نے کلینک بند کردیا۔ اس کے ایک ماہ بعد ہی وہ یہاں، ہمارے ملک میں آگئی تھی اور اس نے یہاں کے شہری حقوق بھی حاصل کرلیے تھے۔ فرانس کی شہریت بھی چھوڑی نہیں ہے اس نے۔''

''یہ تو میں نے بتایا تھا طارق صاحب کو۔'' مشکور بول پڑا۔

طارق نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ منظور ہی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس کی ذمے دار ڈاکٹر شی ہی تھی؟''

''تو پھر یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ وہ عورت نہیں بلکہ ویمپائر ہے۔'' منظور نے کہا۔ ''دانتوں کے جو نشانات ان دونوں آدمیوں کی گردنوں پر پائے گئے تھے، ان میں دو بڑے دانتوں کے نشانات بھی تھے۔ طبی رپورٹ کے مطابق وہ دونوں دانت مصنوعی بھی نہیں تھے لیکن ڈاکٹر شی کے منہ میں ایسے دانت نہیں ہیں۔''

''معما ہے یہ تو۔'' طارق کے منہ سے نکلا۔

اس وقت مشکور پھر بول پڑا۔ ''رائیڈر ہیگرڈ کے بعد ڈریکولا بھی یاد آگیا جو برام اسٹوکر نے لکھا تھا۔''

''میں نے فرض کرنے کی بات کی تھی۔'' طارق بولا۔

''یہ فرض کیا نہیں جاسکتا کہ ڈاکٹر شی ویمپائر ہوگی۔''

''مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ میں نے بھائی جان کو بتا دیا تھا۔ انہوں نے ہی کہا تھا کہ یہ باتیں آپ کے علم میں لانا ضروری ہیں۔''

''ہوں۔'' طارق نے سر ہلایا۔ ''اور کوئی بات؟''

''مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ سب بتا چکا ہوں۔''

طارق نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور کھڑا ہوگیا۔ اس نے مشکور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شفیق کے معاملے پر نظر رکھنا اور مجھے باخبر کرتے رہنا۔''

''وہ تو خیر مجھے خیال ہے لیکن آپ بھی ذرا احتیاط رہیں۔''

''کس معاملے میں؟''

''میرا اشارہ ڈاکٹر شی کی طرف ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آیا ہے کہ وہ ایسی ہوگی۔'' طارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایسی باتوں کو کہانیوں ہی تک محدود رکھا جاسکتا ہے۔''

لیکن اس جواب کے باوجود اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے طارق کے ذہن میں لفظ ''ویمپائر'' چکراتا رہا۔

ویمپائر کے بارے میں کئی روایات مشہور تھیں۔ ایک روایت یہ بھی تھی کہ وہ کوئی جن ہے جو رات کے وقت انسانوں کا خون پیتا ہے، پھر جب انیسویں صدی کے آخر میں برام اسٹوکر کا ناول ڈریکولا منظر عام پر آیا تو یہ لفظ خون آشام چمگادڑوں سے منسوب کیا جانے لگا۔

ذہن میں چکراتی ہوئی ان باتوں کے ساتھ طارق گھر پہنچا۔ رفعت گم صم سی نظر آئی۔

''کس سوچ میں ہو؟'' طارق نے پوچھا۔ ''میں تو بتا کر گیا تھا کہ آج بھی کچھ دیر تو ہوگی مجھے۔''

''یہ بات نہیں۔'' رفعت نے کہا۔ ''دراصل ابھی شفیق کا فون آیا تھا۔ ڈیڈ نے غزالہ سے اس کی شادی منسوخ کردی ہے۔ ڈیڈ فون پر تاج الدین رفیقی سے صاف صاف بات کرچکے ہیں۔''

''ایسا کیوں ہوا؟'' طارق نے انجان بنتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

''تاج الدین صاحب کسی بڑے اسکینڈل میں ملوث ہیں اور جلد ہی سارا معاملہ منظرِ عام پر بھی آنے والا ہے۔''

''اسکینڈل کیا ہے؟''

اس سوال کے جواب میں رفعت نے جو کچھ بتایا، وہ سب طارق کے علم میں پہلے ہی آچکا تھا۔

''یہ تو اچھا ہوا۔'' وہ بولا۔ ''شادی سے پہلے یہ بات معلوم ہوگئی۔''

''لیکن افسوس تو ہوا ہے مجھے۔''

''شفیق کی شادی نہ ہونے کا؟'' طارق نے پوچھا۔

رفعت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس میں افسوس کی نہیں، خوشی کی بات ہے۔ وہ لوگ ایک کرپٹ گھرانے کی لڑکی سے بچ گئے۔ شفیق کی شادی کہیں اور ہوجائے گی۔''

''کہیں اور تو ہوجائے گی لیکن ابھی تو معاملہ ٹل ہی گیا۔ اب شفیق نہ جانے کب راضی ہو۔''

''ہوجائے گا کبھی۔ تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟''

''فکر کی بات نہیں۔ دراصل ہماری شادی کے بعد خاندان میں کوئی شادی ہی نہیں ہوئی۔ ذرا ہنگامہ رہتا ہے۔ شادی کی رسومات مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔''

''اچھا، اب چھوڑو یہ باتیں...... بھوک لگ رہی ہے۔''

اس رات جب وہ دونوں سونے کے لیے لیٹے تو رفعت یقیناً آنکھیں بند ہونے کے باوجود سوئی نہیں ہوگی۔ طارق تو جاگ ہی رہا تھا۔ مختلف النوع خیالات اس کے دماغ میں چکرا رہے تھے۔ وہ خیالات ایک دوسرے سے حد درجہ مختلف تھے جس کی وجہ سے طارق کے چہرے پر کبھی خوشی کا تاثر ابھرتا اور کبھی وہ افسردہ دکھائی دیتا۔ اس عالم میں اسے بہت دیر سے نیند آئی۔

☆☆☆

دوسری صبح ناشتا کرتے ہوئے رفعت نے کہا۔

''کیوں نہ آج ڈیڈ کے گھر چلا جائے۔''

''کیوں؟''

''کچھ اور معلومات حاصل ہو جائیں گی اس بارے میں۔''

''تمہیں اس معاملے میں اتنا تجسس کیوں ہے رفعت؟ پھر دوسری بات یہ کہ ڈیڈ کے گھر جائیں گے تو ڈیڈی سے ملنے بھی جانا پڑے گا۔''

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

''وہ رات کا کھانا کھلا کر ہی واپس آنے دیتے ہیں۔ اتنی دیر ہو جائے گی کہ میں ڈاکٹر شی سے نہیں مل سکوں گا۔''

''تو کیا فرق پڑتا ہے اب!...... تم ٹھیک تو ہو گئے ہو۔''

''تین دن دوا اور پینی ہے۔''

''یہ اب مجھے رسمی سی بات لگتی ہے۔ ایک دن نہیں پیو گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''کیا تم یہ بات ڈاکٹر سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہو؟''

رفعت فوراً کچھ نہیں بولی۔ وہ خاصی سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ کچھ رک کر اس نے کہا۔ ''شروع میں تم ڈاکٹر شی سے دور بھاگنے کی فکر میں تھے۔ میرے ہی اصرار پر تم نے اس سے علاج کروایا لیکن اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ تم خود اس کے پاس جانے کے لیے بے تاب رہنے لگے ہو۔''

''اس نے مجھے متاثر تو کیا ہے۔ احسان مند ہوں میں اس کا۔ اس کی وجہ سے مجھے شاید دوسری زندگی ملی ہے۔''

طارق کے پہلے ہی جملے پر رفعت چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس بار بھی اس نے قدرے توقف سے جواب دیا۔ ''مریض کو ٹھیک کرنا ہی ڈاکٹر کا کام ہوتا ہے۔ اس میں کسی مریض کو احسان مند تو نہیں ہونا چاہیے۔ آخر اس کی خاصی بھاری فیس میں اپنے ہاتھ سے ادا کرتی رہی ہوں۔''

''مت بھولو کہ دوسرے تمام ڈاکٹر میرے معاملے میں بے بس ہو گئے تھے۔''

''وہ ایک الگ بات ہے۔''

''لیکن اسی بات کے سبب میں اس سے متاثر ہوا ہوں۔''

''معاف کرنا طارق! مجھے تو اب ایسا لگنے لگا ہے کہ تمہارے متاثر ہونے کی وجہ کچھ اور بھی ہے۔'' رفعت نے کہتے ہوئے بڑے غور سے طارق کی طرف دیکھا تھا۔

''اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' طارق نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو۔''

''فضول باتیں کر رہی ہو۔ میں بہر حال علاج مکمل کرائے بغیر ڈاکٹر شی سے رابطہ نہیں توڑوں گا۔''

یہ شادی کے بعد پہلا موقع تھا جب ان دونوں میں قدرے تلخ لہجے میں گفتگو ہوئی تھی۔

طارق پھر بولا۔ ''اگر تمہیں زیادہ خواہش ہے تو اکیلی چلی جاؤ۔''

''کیا میں شادی کے بعد کبھی اکیلی کہیں گئی ہوں؟''

''کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی بھی نیا کام پہلی بار ہی ہوتا ہے۔''

رفعت کچھ نہیں بولی۔ اس روز شام تک دونوں کے انداز میں کھنچاؤ رہا۔ شام کے بعد مقررہ وقت پر طارق ڈاکٹر شی کے پاس پہنچ گیا۔

کچھ باتوں کے بعد ڈاکٹر شی نے کہا۔ ''میں اب شادی کے لیے بہت بے چین ہوں طارق!''

''تم نے کہا تھا کہ تیسرے دن کی دوا کے بعد ہم شادی کریں گے۔''

''ہاں۔'' ڈاکٹر شی نے کہا۔ ''کل تمہاری اس دوا کا آخری دن ہوگا۔ میں اس معاملے میں کوئی دھوم دھام نہیں چاہتی۔ ہم کورٹ میں جا کر سول میرج کرلیں گے لیکن پرسوں اتوار ہے۔ کورٹس بند ہوں گے۔ کیوں نہ ہم کل ہی سول میرج کرلیں۔''

''ہاں یہ ہو تو سکتا ہے۔'' طارق نے کہا پھر بولا۔ ''ایک بات کہوں تم سے؟''

''تمہیں مجھ سے سب کچھ کہنے کا حق ہے۔''

''یہ جو تم نے روزانہ دوا دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس بارے میں مجھے یہ شبہ ہے کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تم نے صرف اس لیے کیا کہ مجھ سے تمہاری ملاقات ہوتی رہے۔''

ڈاکٹر شی ہنسی، پھر اس نے کہا۔ ''نہیں طارق! تمہارا خیال سو فیصد درست نہیں ہے۔ پچھلے دنوں میں تم کو جو دوا

دیتی رہی ہوں، ان میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور ہوتی تھی۔ ہاں ان تین دنوں کی جو دوا ہے، اس میں مجھے کوئی تبدیلی نہیں کرنی تھی۔"

"یعنی ان تین دنوں کی دوا تم مجھے کل بھی دے سکتی تھیں۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر شی ہنسی۔

"تو پھر کل کی دوا بھی تم مجھے آج ہی دے دینا۔"

"میں نے اعتراف کر ہی لیا ہے تو پھر اب اس میں کوئی حرج نہیں کہ میں آج ہی تمہیں دو شیشیاں دے دوں گی لیکن یہ نہ ہو کہ کل سول میرج کے بعد تم رات کو میرے پاس نہ آؤ۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا بھی میرے لیے بہت سکون بخش ہوتا ہے۔"

"کیا تمہیں مجھ پر...... میری محبت پر اب بھی اعتماد نہیں؟"

"ایسا نہیں ہے۔" ڈاکٹر شی نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر تمہیں مجھ سے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"چلو نہیں کرتی۔ خود ہی یقین کر لیتی ہوں کہ تم کل بھی آؤ گے۔ میرا مطلب ہے رات کو۔ دن میں تو آنا ہوگا ہی۔ صبح دس بجے یہیں آجاؤ۔ یہیں سے ہم کورٹ چلے چلیں گے۔"

"دوا تو تیار کر دو۔ میں آج جلدی جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"رفعت سے آج ہی بات کر لینا چاہتا ہوں۔"

"کیا ردِعمل ہو سکتا ہے اس کا؟"

"جو بھی ہو۔ مجھے اب اس کی پروا نہیں۔"

"شادی کے بعد۔" ڈاکٹر شی مسکراتے ہوئے بولی۔ "یعنی پرسوں تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گے یا میرے گھر چلو گے؟"

"آج میں رفعت سے بات کر لوں، کل بتا دوں گا تمہیں۔ میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔ یقیناً وہ بہت شاندار ہوگا۔ میرے چھوٹے سے گھر میں تو تمہارا دم گھٹنے لگے گا۔"

"تمہارے ساتھ میں ہر جگہ رہ سکتی ہوں لیکن جو کچھ میرا ہے، شادی کے بعد وہ تمہارا ہی ہوگا۔ وہ گھر جو اب تک میرا ہے، وہ بھی شادی کے بعد تمہارا ہوگا۔ تم چاہو تو وہاں بھی آکر رہ سکتے ہو۔ رفعت اگر مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو وہ بھی وہاں رہ سکتی ہے۔ پرسوں کے بعد تم اپنے گھر کا سارا سامان بھی وہیں لے آنا۔"

"رفعت تو شاید تیار نہ ہو لیکن یہ میں تمہیں کل بتا سکوں گا۔ بات جب یہاں تک آگئی ہے تو میں اب رفعت سے فیصلہ کن بات کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ تم مجھے دوا بنا دو تو میں جاؤں۔"

"مجھ سے شادی کے خیال سے تم ہیجان میں مبتلا ہو گئے ہو۔" ڈاکٹر شی مسکرائی۔

"جو چاہو سمجھو، بس دوا بنا دو۔"

جلد ہی ڈاکٹر شی نے دو دن کی دوا کی شیشیاں بنا کر طارق کو دے دیں اور وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے رفعت سے مختصراً کہا۔ "کھانا۔"

رفعت نے غور سے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔ کھانے کے دوران میں بھی انہوں نے آپس میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ رفعت افسردہ نظر آنے لگی۔

جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو رفعت بولی۔ "تم نے کہہ تو دیا تھا کہ میں ڈیڈ وغیرہ سے ملنے اکیلی ہی چلی جاؤں لیکن میں اب جانا ہی نہیں چاہتی۔"

"ہوں۔"

"کل آخری دن ہے نا تمہاری دوا کا؟"

"ہوں۔"

رفعت نے اور بھی کئی باتیں کیں۔ وہ آپس کے تناؤ کو ختم کرنا چاہتی تھی لیکن جب طارق صرف "ہوں، ہاں" کرتا رہا تو اس نے طارق کی مخالف سمت میں کروٹ لے لی۔ اب اس کے چہرے سے جھنجلاہٹ اور افسردگی ظاہر ہو رہی تھی۔

دوسرے دن ناشتا کرتے ہوئے بھی طارق نے کوئی بات نہیں کی، ایک گھنٹے بعد جب رفعت نے دیکھا کہ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا تو بول پڑی۔

"اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک ضروری کام ہے۔"

"کل سے تمہارا رویّہ بہت بدلا ہوا ہے طارق!" رفعت نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "بات بھی نہیں کر رہے ہو۔ تم کہیں اکیلے جاتے تھے تو پہلے مجھے بتا دیتے تھے۔ آج بتائے بغیر کہیں جا رہے ہو۔"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ واپس آکر بتاؤں گا۔"

"ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟"

جواب میں طارق نے کچھ نہیں کہا، رفعت کو گھور کر دیکھا اور پھر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

رفعت خاصی دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔ آخر اس نے موبائل اٹھایا اور

شفیق سے رابطہ قائم کیا۔ اپنا دکھ وہ شفیق سے بیان نہ کرتی تو کس سے کرتی؟

''کیسی ہو رفعت؟'' شفیق نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ ''دیکھو میں نے تو تمہاری خواہش کے مطابق شادی کرنی چاہی تھی لیکن......''

''وہ تو جو کچھ ہونا تھا، ہوگیا۔ اس وقت میں نے تمہیں کچھ اور بتانے کے لیے فون کیا ہے۔''

''تمہاری آواز دل گرفتہ سی ہے۔'' شفیق سنجیدہ ہوگیا۔

''بات کچھ ایسی ہی ہے۔'' رفعت نے کہا اور پھر طارق کے رویتے کے بارے میں سب کچھ بیان کردیا۔ طارق کی بیماری اور ڈاکٹر شی کے بارے میں وہ شفیق کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکی تھی۔

''رفعت!'' سب کچھ سن کر شفیق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے طارق کو کسی وجہ سے کوئی بڑی پریشانی لاحق ہوگئی ہو۔ اسی کی وجہ سے وہ کچھ چڑچڑا ہوگیا ہوگا۔ تم تحمل سے کام لو۔ تم اب تک ایک اچھی بیوی بن کر رہی ہو۔ آئندہ بھی تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

''میرے ساتھ طارق کا رویّہ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے تھا شفیق! میں نے بہت بڑی قربانی دی ہے اس کی بیوی بن کر، مجھے ایک شبہ ہے شفیق۔''

''کس بات کا؟''

''ڈاکٹر شی بے حد حسین عورت ہے۔ شاید طارق اس کے اسیر ہوگئے ہیں۔''

شفیق نے فوراً جواب نہیں دیا۔ وہ قدرے توقف سے بولا تھا۔ ''اگر تمہارے اس شبے کی تصدیق ہوجائے تو بھی چراغ پا مت ہونا۔ تحمل سے کام لینا۔ خوب صورت عورتیں وقتی طور پر ہی متاثر کرتی ہیں۔ کچھ عرصے میں طارق کے جذبات سرد پڑ جائیں گے۔ اس قسم کے معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''مجھے یہ خیال بھی آرہا ہے کہ اب طارق کی زیادہ تر راتیں اس کے ساتھ گزرنے لگیں گی۔''

''اسے بھی برداشت کرنا۔ میں تمہیں یہی مشورہ دے سکتا ہوں۔''

''کیا قربانیاں دینا ہی میرا مقدر بن چکا ہے؟ اس سے پہلے میں اپنی محبت کی قربانی دے چکی ہوں اور اب یہ......'' رفعت کی آواز رندھ گئی۔

''رفعت...... رفعت......!'' شفیق بے چین ہوگیا۔

''سنبھالو خود کو۔ زندگی میں ہر قسم کے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ انسان کو ان سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔''

''اب میں فون بند کررہی ہوں۔ بولا نہیں جارہا ہے مجھ سے۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا، وہ کرلیا۔ اب میں پھر کسی وقت فون......'' اتنا کہتے کہتے رفعت کی آواز بالکل رندھ گئی۔ اس نے موبائل بند کیا اور سسکیاں لیتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔ اسے گھر کے کام کاج کا خیال ہی نہیں آیا۔

ایک بجنے والا تھا جب طارق واپس لوٹا۔ اس نے آتے ہی ایک لفافہ رفعت کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا ہے؟'' رفعت نے پوچھا۔

''خود دیکھ لو۔''

اور جب رفعت نے دیکھا تو اس کے دماغ کو ایسا جھٹکا لگا کہ وہ چند لمحوں کے لیے بالکل سن ہوکر رہ گئی۔ وہ طارق کی کورٹ میرج کا سرٹیفکیٹ تھا۔ اس میں بیوی کے نام کی جگہ ڈاکٹر شی کا نام لکھا ہوا تھا۔

آخر وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔''

''میں مجبور ہوں۔ اس نے میرے دل میں جگہ بنالی ہے۔''

''شبہ تو مجھے ہوگیا تھا۔ اب اس نے حقیقت کا روپ بھی دھار لیا۔'' رفعت بہت دل گرفتہ ہوگئی تھی۔

''اب وہ میرے ساتھ اسی گھر میں رہے گی۔''

''یہ تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔'' رفعت یکا یک بپھر گئی۔

''دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں اس کے گھر جا کر تو نہیں رہوں گا۔ میں اسے یہاں کیوں نہ رکھوں؟ آخر یہ میرا گھر ہے۔''

''میرا نہیں ہے؟'' رفعت کی سانس پھولنے لگی۔

''تمہارا بھی ہے۔ میں اس سے انکار تو نہیں کررہا ہوں لیکن اب یہ اس کا بھی گھر ہوگا۔''

''تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔''

''تو چلی جاؤ اپنے والدین کے گھر۔'' طارق نے بے رخی سے کہا۔ ''میں کل تک تمہیں طلاق نامہ بھیج دوں گا۔''

''کیا!'' رفعت کے منہ سے نکلا۔ ''طلاق؟''

''ہاں۔ جب تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے گلے میں دو بیویوں کا طوق لٹکاؤں۔''

''تم سے میری محبت اور میری وفاؤں کا اگر یہی صلہ

ملنا بھی میرا مقدر ہے تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔''

رفعت ایک جھٹکے سے اٹھی، الماری کھول کر اس میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔ طارق نے کپڑے تو کیا، جوتے تک نہیں اتارے اور بستر پر لیٹ کر چھت کو تکنے لگا۔

رفعت نے اپنا جو سامان ضروری سمجھا، وہ ایک بڑے اٹیچی کیس میں رکھ لیا، پھر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''کیا ٹیکسی لینے جا رہی ہو؟'' طارق نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' رفعت نے دروازہ کھولا۔

''ٹھہرو، یہ لو!''

رفعت نے مڑ کر دیکھا۔ طارق کے ہاتھ میں کار کی چابی تھی۔ وہ اس نے رفعت کی طرف اچھال دی۔ وہ رفعت کے قدموں میں آکر گری۔

''کار لے جاؤ۔'' طارق نے کہا۔ ''اس کے کاغذات بھی تمہارے نام پر ٹرانسفر کرا دوں گا۔ سمجھ لینا کہ اس طرح میں نے تمہارا مہر ادا کر دیا۔ یہ سوٹ کیس بھی تم سے نہیں اٹھے گا۔ میں پہنچا دیتا ہوں کار تک۔''

رفعت کچھ نہیں بولی۔ اس وقت اس کا جسم لرز رہا تھا۔ وہ شدید غصے میں تھی۔

ذرا دیر بعد ہی وہ طوفانی رفتار سے کار چلا رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھ رہے تھے۔ تیز رفتاری کے باعث اس نے فاصلہ کچھ کم ہی وقت میں طے کر لیا۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس کی ماں اور دونوں بھائی اسے ایسی حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں بن گئی تھیں۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران ہی میں اتنی روئی تھی کہ آنکھیں سوج گئی تھیں۔

''تم اکیلی؟'' ماں نے حیرت سے کہا۔ ''اور اس حال میں؟''

''میرا سوٹ کیس ڈکی میں ہے۔'' رفعت نے کہا۔ ''کسی ملازم سے اتروا لیجیے۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اس کمرے کی طرف بڑھی جو شادی سے پہلے اس کی خواب گاہ تھا اور شادی کے بعد بھی وہ کسی اور کے زیر استعمال نہیں رہا تھا۔ اس کی ماں ہی یہ چاہتی تھیں کہ اگر کبھی رفعت اور طارق وہاں آکر ایک دن کے لیے بھی رکے تو وہ اسی کمرے میں رات گزاریں گے لیکن اس کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ رفعت جانتی تھی کہ وہ کمرا اب بھی اسی کے لیے وقف ہے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو پیچھے پیچھے اس کی والدہ بھی تھیں۔

''بتاتی کیوں نہیں ہو؟'' وہ ڈانٹنے کے انداز میں بولیں۔ ''سامان لے کر کیوں آئی ہو؟ کیا طارق سے کچھ ان بن ہو گئی؟''

رفعت کوئی جواب دینے کے بجائے ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ اسی وقت اس کے دونوں بھائی بھی کمرے میں آ گئے۔ چھوٹا جو بہت لاابالی اور کھلنڈرا تھا، اس وقت وہ بھی سنجیدہ اور حیران نظر آ رہا تھا۔

''اپنے والد کو فون کرو۔'' رفعت کی ماں نے بڑے بیٹے سے کہا جو رفعت سے چار سال چھوٹا تھا۔

''آج جانے کہاں رہ گئے ڈیڈی۔ اس وقت تک تو وہ گھر آ جاتے ہیں۔'' بیٹے نے کہا اور پھر اپنا موبائل نکال کر نمبر ملانے لگا۔

رابطہ قائم ہونے پر رفعت کی والدہ نے خود ان سے بات کی اور بتایا کہ رفعت کس عالم میں گھر پہنچی ہے۔ ان کا ایک جملہ یہ بھی تھا۔ ''کچھ بتا بھی نہیں رہی ہے، بس روئے جا رہی ہے۔ آپ جلدی آیئے۔''

رضوان صاحب بیس منٹ میں ہی گھبرائے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

''میں دو مرتبہ طارق کو فون کر چکی ہوں۔'' رفعت کی والدہ نے انہیں بتایا۔ ''گھنٹی کی آواز تو سنائی دے رہی ہے لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہا ہے۔''

''کیا معاملہ ہے رفعت؟'' رضوان صاحب نے اس سے پوچھا۔

رفعت باپ کے مزاج سے واقف تھی۔ انہیں اپنی بات کا جواب نہیں ملتا تھا تو وہ غصے میں آ جاتے تھے۔ اس نے انہیں بتا دیا کہ طارق نے دوسری شادی کر لی ہے لیکن نہ جانے کیوں یہ بتانے سے گریز کر گئی کہ بات طلاق تک بھی پہنچ گئی تھی۔

دوسری شادی ہی کے بارے میں سن کر رفعت کے والدین پر کچھ دیر کے لیے سکتہ سا طاری ہو گیا۔

رضوان صاحب ہی کے ذریعے یہ بات ان کے بھائی فیضان صاحب تک اور فیضان صاحب سے شفیق تک بھی پہنچی۔ دونوں باپ بیٹے دوڑے چلے آئے۔ اس وقت رضوان صاحب اپنی بیوی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پریشان بیٹھے تھے۔

''رفعت کہاں ہے؟'' فیضان صاحب نے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں۔''

''اس عالم میں اکیلا چھوڑ دیا تم لوگوں نے اسے؟'' فیضان صاحب بگڑ کر بولے۔''وہ جذباتی لڑکی تنہائی میں نہ جانے کیا کر بیٹھے۔''

''میں جا کے بات کروں اس سے کچھ؟'' شفیق بول پڑا۔

''ہاں۔تم ہی جا کر بات کرو۔'' رفعت کی والدہ بول پڑیں۔''اب کیا سوچ رہی ہے وہ؟ کیسے گزارے گی ساری زندگی ماں باپ کے گھر بیٹھ کر۔ دنیا والے کیا کیا باتیں بنائیں گے۔''

شفیق تیزی سے چلتا ہوا رفعت کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اس وقت بستر پر بیٹھی اپنے گھٹنوں پر سر رکھے بالکل گم صم سی تھی۔ دونوں بھائی اس کے قریب ہی خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔

شفیق کو دیکھ کر رفعت کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

''تم دونوں جاؤ۔'' شفیق نے رفعت کے بھائیوں سے کہا۔''میں کچھ بات کروں گا رفعت سے۔''

وہ دونوں خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

''یہ کیسے ہو گیا رفعت؟'' شفیق بولا۔

''میں نے فون پر تمہیں بتایا ہی تھا۔'' رفعت ساڑی کے آنچل سے اپنی آنکھیں خشک کرتی ہوئی گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔''تم نے مجھے سمجھایا بھی تھا کہ اگر طارق کی زیادہ راتیں کہیں اور بھی گزرنے لگیں تو میں برداشت کروں لیکن یہ تو میں برداشت نہیں کر سکتی۔''

''ڈاکٹرشی؟'' شفیق نے پوچھا۔

رفعت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہاری کچھ بات تو ہوئی ہو گی طارق سے؟''

''ہاں، ہوئی تھی لیکن بات سے پہلے ہی انہوں نے اپنا میرج سرٹیفکیٹ میرے منہ پر دے مارا تھا۔''

''میرج سرٹیفکیٹ؟ کیا کورٹ میں شادی کی گئی ہے؟''

رفعت نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا طارق نے پہلے نہیں بتایا تھا کہ وہ......''

بات پوری ہونے سے پہلے ہی رفعت نے اس مرتبہ نفی میں سر ہلا دیا۔

شفیق کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔''بات تو کرنی پڑے گی طارق سے۔ ممکن ہے کہ میں اگر اسے تمہاری قربانی کے بارے میں بتاؤں تو وہ ڈاکٹرشی سے علیحدگی پر آمادہ ہو جائے۔''

''نہیں شفیق!'' رفعت نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''میرے اور اپنے بارے میں تم کچھ نہیں بتاتا۔''

''تو پھر تمہیں اس صورت حال سے بھی سمجھوتا کرنا چاہیے۔اس طرح ماں باپ کے گھر آ بیٹھنے سے تو بات نہیں بنے گی۔''

''اگر ڈیڈی ممی کے لیے میرا وجود قابلِ برداشت نہیں ہو گا تو میں کہیں اور منہ کالا کر جاؤں گی۔''

''واہ!'' شفیق بجھی بجھی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔''اس وقت تم نے ایسی بات کی ہے جیسے کوئی دیہاتی عورت ہو۔''

رفعت خاموش رہی۔

''اگر طارق دوسری بیوی سے علیحدگی پر آمادہ نہیں ہوتا تو پھر تمہیں اس صورتِ حال سے بھی سمجھوتا کرنا پڑے گا رفعت!...... اگر اس کے ساتھ نہیں رہ سکتیں تو الگ الگ رہو۔ طارق کے مالی حالات ایسے نہیں ہیں تو کیا ہوا، تمہارے والد اور چچا کیا تمہارے لیے ایک گھر کا بندوبست بھی نہیں کر سکتے؟''

''شفیق!'' رفعت نے افسردہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''تم مجھے یہ سمجھا رہے ہو کہ میں ایسی زندگی گزاروں؟''

''زندگی کبھی کبھی سانحہ بھی بن جاتی ہے۔'' شفیق نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''اور سانحات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ خیر، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ فون تو ریسیو کر نہیں رہا ہے۔ میں خود جا کر اس سے ملتا ہوں۔''

''سہ پہر ہو چکی ہے۔''

''اگر ایک دو گھنٹے بھی وہاں رکنا پڑا تو ساڑھے نو تک واپس آ جاؤں گا۔'' شفیق کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''تم اپنا وقت ضائع کرو گے۔'' رفعت نے کہا۔

''تمہاری دوسری بات میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں اور پہلی بات پر طارق کا آمادہ ہونا ممکن نہیں۔''

''دیکھتا ہوں، کیا ہوتا ہے۔ ڈیڈی وغیرہ کو بتاتا جاؤں گا۔''

رفعت چپ بیٹھی رہی اور شفیق کمرے سے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی والدہ کمرے میں آئیں اور اس کی دلجوئی کی کوشش کرنے لگیں۔

''شفیق سمجھدار ہے۔'' انہوں نے کہا۔''وہ کوئی راستہ تو نکال ہی لے گا۔''

اس قسم کی باتوں میں چپ رہنا ہی اس وقت رفعت نے اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔

جب رات ہو گئی تو رضوان صاحب اس کے کمرے

میں آئے۔ ''تمہاری والدہ نے بتایا ہے کہ تم کھانا کھانے کے لیے تیار نہیں ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کے حالات میں بھوک پیاس سب اڑ جاتی ہے لیکن چند لقمے تو زہر مار کیے ہی جاسکتے ہیں۔''

رفعت باپ کے سامنے کسی بات پر اڑتی نہیں تھی۔ اس وقت بھی نہیں اڑی۔ دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب شفیق تھکا ہارا آیا۔

''گھر پر تالا پڑا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے محلے کے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی بھی کچھ نہیں بتاسکا۔ یہ تم بتا ہی چکی ہو کہ طارق کا حلقۂ احباب تو ہے ہی نہیں ورنہ میں کسی طرح ان لوگوں تک پہنچنے کی بھی کوشش کرتا۔ ڈاکٹر شی کے کلینک بہرحال گیا تھا۔ ظاہر کیا تھا کہ میں کسی مرض میں مبتلا ہوں۔ اس پر مجھے جب پندرہ دن بعد کی تاریخ دی گئی تو میں نے صاف صاف بتادیا کہ میں اس سے طارق کے سلسلے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ مجھ سے نہیں ملی۔ اب کل پھر جاؤں گا۔ کسی نہ کسی طرح اس سے ملنا تو ہے۔''

''وقت برباد کرنے کا شوق ہوگیا ہے تمہیں۔'' رفعت بولی۔ ''کرتے رہو۔''

''شوق کی بات نہیں ہے یہ رفعت!...... مسئلے کے حل کی بات ہے۔''

رفعت نے آہستہ سے سرہلا دیا۔ اس کی وہ رات اس طرح کٹی کہ بہت دیر سے نیند آنے کے باوجود چند ہی منٹ میں ٹوٹ بھی گئی۔ پھر صبح تک یہ سلسلہ جاری ہی رہا۔ مجموعی طور پر وہ بمشکل گھنٹا بھر سوسکی۔

صبح وہ باپ کی وجہ سے ناشتے کی میز پر تھی۔

''تمہاری آنکھیں سرخ ہورہی ہیں۔'' ماں نے اس کی طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نیند نہیں آئی ہوگی رات کو۔''

رفعت تو خاموش رہی تھی لیکن رضوان صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بول پڑے۔ ''ان حالات میں...... اتنا بڑا ذہنی جھٹکا کھا کر نیند آسکتی ہے بھلا۔''

''دیکھیں، شفیق گیا تو ہے آج بھی۔'' ماں نے کہا۔ ''آدھے گھنٹے پہلے فون آیا تھا اس کا۔ بتارہا تھا کہ روانہ ہو رہا ہے۔ اب تو راستے میں ہوگا۔''

''جاگتے رہنے سے طبیعت بھی خراب ہوسکتی ہے رفعت!'' رضوان صاحب نے کہا۔ ''ناشتے کے بعد پھر جا کے سونے کی کوشش کرنا۔ ایک مسکن ٹیبلٹ بھی کھالینا۔ میں ابھی ناشتا کرکے دے دوں گا۔ میرے پاس ہے۔''

''جی۔'' رفعت کی آواز بہت دھیمی تھی۔

اسے شاید دن میں بھی نیند نہ آتی اگر رضوان صاحب اپنے ہاتھوں سے اسے ٹیبلٹ کھلا کر نہ گئے ہوتے۔

وہ ایسی سوئی کہ پانچ بجے جاگی۔ ماں نے اسے چائے پلائی کیونکہ کھانا کھانے کے خیال سے بھی اس وقت متلی ہورہی تھی اسے۔

چائے پلانے کے بعد ماں نے نظریں جھکائے ہوئے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ ذرا دیر پہلے ہی آیا ہے ٹی سی ایس سے۔''

رفعت ذرا دیر کے لیے لفافے کو تکتی رہ گئی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ لفافے میں کیا ہوگا۔ وہ طلاق نامہ ہی تھا جو گزشتہ روز ہی روانہ کیا گیا ہوگا۔ اس کے ساتھ طارق ہی کے ہاتھوں کا لکھا ہوا دوسطر کا پرچہ بھی تھا۔

''اسے مہر سمجھنا، یا جو دل چاہے۔ کار کے کاغذات آج کل میں ہی تمہارے نام کردیے جائیں گے۔''

رفعت کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں ابھرا جس کی توقع شاید اس کی ماں کو ہوگی۔ اس نے طلاق نامہ اور پرچہ، لفافے سمیت ایک طرف ڈال کر ماں سے پوچھا۔

''شفیق......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی والدہ بول پڑیں۔

''یہ لفافہ ملنے سے ذرا دیر پہلے ہی اس کا فون آیا تھا۔ آج بھی اسے گھر پر تالا ہی لگا ہوا ملا۔ اس کے بعد سے اب تک وہ ہاتھ پیر مارتا رہا ہے کہ کسی طرح طارق کا پتا چل جائے۔''

رفعت نے ماں سے کچھ کہے بغیر موبائل اٹھا کر شفیق سے رابطہ کیا۔

''آج بھی تالا ہی لگا ہوا ہے گھر پر۔'' شفیق نے اسے بتایا۔ ''میں اس کی کمپنی میں بھی گیا تھا جہاں وہ ملازم تھا۔ وہاں سے مشکور کا پتا چلا۔ پھر کمپنی ہی کے لوگوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسے کمپنی ہی نے کسی کام سے بیرونِ ملک بھیجا ہے۔ بہرحال، ابھی میں لگا ہوا ہوں، اس کا پتا لگانے میں۔''

رفعت نے تحمل سے سب کچھ سنا، پھر بولی۔ ''واپس آجاؤ شفیق! کھیل ختم ہوچکا ہے۔''

''کھیل ختم ہوچکا ہے؟ کیا مطلب؟''

''ٹی سی ایس سے طلاق نامہ آگیا ہے۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی، جیسے سکتہ ہو گیا ہو شفیق کو۔
دو گھنٹے بعد وہ کمرے میں رفعت کے سامنے تھا۔ رفعت نے لفافہ اس کے سامنے ڈال دیا تھا جس میں طلاق نامہ تھا۔ شفیق نے طلاق نامہ دیکھا اور نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔
''یہ زندگی۔'' رفعت بولی۔ ''پہاڑ سی معلوم ہونے لگی ہے مجھے۔ کیسے کاٹ سکوں گی۔''
''میرے ساتھ کاٹنا۔'' شفیق نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''زندہ ہوں میں، مر تو نہیں گیا۔'' یہ بات سن کر رفعت کے ہونٹ کپکپانے لگے اور آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

☆☆☆

دوسرا دن گزار کر تیسری رات طارق اپنے گھر میں تھا۔ دو روز تک اس نے گھر میں تالا لگایا تھا اور دونوں دن شہر کے معمولی ہوٹلوں میں رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ رفعت کے گھر والے اس سے ملنے ضرور آئیں گے اور وہ ان سے اس وقت تک نہیں ملنا چاہتا تھا جب تک رفعت کو طلاق نامہ موصول نہ ہو جائے۔
ان لوگوں کے فون تو آتے ہی رہے تھے لیکن طارق نے کسی کی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب شاید ان میں سے کوئی بھی اس سے رابطہ نہ کرے کیونکہ طلاق نامہ وصول کیا جا چکا ہوگا۔
رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم ہی میں ایک صوفے پر دراز تھا۔ چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کسی خیال میں گم ہو۔
کال بیل کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ چونکا، کیا اب بھی وہ لوگ اس سے ملنا چاہیں گے؟ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور ایک طویل سانس لی۔
''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی طارق کہ تم وعدہ خلافی کرو گے۔'' ڈاکٹر شی تیزی سے اندر آتے ہوئے بولی۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا کہ کورٹ میرج کرنے کے لیے پہلے میرے پاس آؤ گے، اس کے بعد ہم کورٹ چلیں گے۔''
طارق دروازہ بند کر کے اس کی طرف مڑا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''میرے الفاظ یاد کرو۔ میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔''
''وعدہ نہ سہی، بات تو طے ہو گئی تھی نا۔'' ڈاکٹر شی نے کہا۔ ''نہ جانے کس چکر میں پھنس گئے تھے تم...... دو دن سے تمہارے گھر بھی آتی رہی ہوں اور یہاں تالا دیکھ کر واپس جاتی رہی ہوں۔ آخر کیا پریشانی ہو گئی تھی؟ رفعت سے کوئی......''
''رفعت کا ذکر چھوڑو۔'' طارق نے اس کی بات کاٹ دی۔
''غالباً ابھی تم مجھے اپنے نجی معاملات کے بارے میں نہیں بتانا چاہتے۔ خیر!...... مجھے شبہ ہے کہ میری شادی کے سلسلے میں رفعت سے تمہارا جھگڑا ہوا ہوگا۔ میں نے تو تم سے کہا تھا کہ ایسی کوئی بات ہو تو مجھے بتانا۔ میں منا لوں گی رفعت کو۔'' وہ دو پل کے لیے رک کر بولی۔ ''وہ شاید بیڈروم میں ہو گی۔ میں جا کر اس سے بات کرتی ہوں۔'' اس نے اندرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔
''نہیں۔'' طارق جلدی سے بولا۔ ''اندر مت جاؤ۔''
''چلو نہیں جاتی۔'' ڈاکٹر شی رک گئی۔ ''اگر تم خود ہی معاملہ سنبھالنا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تم نے دو دن تک مجھے بے چین کیے رکھا ہے۔ میرا فون بھی ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ نہ جانے کیا ہوا ہے ان دنوں میں۔ خیر، اب یہ بتاؤ کل تو تم کورٹ چلو گے نا؟''
''نہیں۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''
ڈاکٹر شی چونک سی گئی۔ ''تم ہوش میں تو ہو؟'' وہ تیزی سے بولی۔
''میں پورے ہوش و حواس میں بات کر رہا ہوں تم سے۔''
''تو مجھ سے محبت کا اظہار، کیا تمہارا ڈراما تھا؟''
ڈاکٹر شی کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔
''تم مجھے کہانیوں سے بہلاتی رہی ہو ڈاکٹر شی!'' طارق نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''خود کو تم رائیڈر ہیگرڈ کا کردار ظاہر کرتی رہیں۔ اسی قسم کی پراسرار باتوں سے تم لوگوں کو اپنے دام میں لاتی رہی ہو۔ سیکڑوں یا ہزاروں سال سے زندہ نہیں ہو تم۔ میں تمہاری صحیح عمر بھی بتا سکتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تم تین شادیاں کر چکی ہو جن میں سے دو کو قتل بھی کیا جا چکا ہے۔''
''یہ افواہیں تم تک بھی پہنچ گئی ہیں۔'' ڈاکٹر شی اسے تیز نظروں سے دیکھنے لگی۔
''اس پر بحث کی ضرورت نہیں کہ یہ افواہیں ہیں یا حقیقت...... میں تمہارا پہلا نام بھی جان چکا ہوں فلورا!''
ڈاکٹر شی کا منہ تھوڑا سا کھلا۔ شاید اسے طارق کی معلومات پر حیرت ہوئی تھی۔
طارق پھر بولا۔ ''مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کسی وجہ سے ویمپائر بن چکی ہو۔ تم نے اپنے بعد کے دونوں شوہروں کو ان کا خون پی کر قتل کیا تھا۔''

''یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میری پریکٹس کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے دوسرے ڈاکٹروں نے پھیلائی تھیں۔ یہ باتیں اپنے ذہن سے جھٹک دو طارق! میں شدید محبت کرتی ہوں تم سے۔'' وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ طارق کی طرف بڑھی۔

''دور رہو مجھ سے۔'' طارق دو قدم پیچھے ہٹا۔ ''کیا تم میرا خون بھی پینا چاہتی ہو؟''

''کوئی اس کا خون پی سکتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہو؟'' ڈاکٹر شی اب بہت آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''تم ایک بوالہوس عورت ہو۔ دل بھر جانے پر تم کسی کو بھی مار سکتی ہو۔''

''طارق!'' ڈاکٹر شی کو غصہ آ گیا۔ ''تم مجھے ایک بار پھر صاف صاف جواب دو کہ مجھ سے شادی کرو گے یا نہیں؟''

''نہیں۔''

''تو......'' ڈاکٹر شی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ''میں نے اپنے دو شوہروں کو تو قتل نہیں کیا لیکن اگر تم میرے جذبات برانگیختہ کرنے کے بعد مجھ سے دور ہونا چاہتے ہو تو یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ تم زندہ نہیں رہو گے۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔''

اور پھر وہ اتنی تیزی سے طارق کے قریب آئی جیسے کوئی باز تیزی سے کسی ننھی سی چڑیا کی طرف جھپٹتا ہے۔ طارق کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ ڈاکٹر شی کی مضبوط گرفت میں تھا۔

''میں تمہاری گردن کو پیار کروں گی۔'' ڈاکٹر شی نے تیز سرگوشی کی۔

اس کی گرفت ایسی تھی کہ طارق کو اپنے ہاتھ ہلانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ یہ بات اس کے علم میں لائی جا چکی تھی کہ جب ڈاکٹر شی کو غصہ آتا ہے تو وہ بالکل پاگل ہو جاتی ہے۔ اس کے ویمپائر ہونے کا طارق کو یقین نہیں تھا لیکن یہ خیال اس کے دماغ میں اپنی کچھ جگہ ضرور بنا چکا تھا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ ڈاکٹر شی کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی وقت اس سے ملتی اس لیے اس دن طارق نے اپنا ریوالور بھی نکال کر جیب میں ڈال لیا تھا۔ وہ ریوالور اس نے کبھی حفظِ ماتقدم کے طور پر خریدا تھا جس کا اس کے پاس لائسنس بھی تھا لیکن اس ریوالور کے استعمال کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔

اپنی گردن بچانے کی کوشش کرتے ہوئے طارق نے کسی نہ کسی طرح ریوالور نکال لیا۔

''تم میرا خون تو کیا پیو گی، میں ہی تمہیں جان سے مار دوں گا۔'' اس نے ریوالور کی نال ڈاکٹر شی کی کمر سے لگا دی۔ ''چھوڑ دو مجھے ورنہ میں ٹریگر دبا دوں گا۔''

ڈاکٹر شی کے جسم میں اتنی طاقت نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی کہ اس نے طارق کو اپنی گرفت میں تقریباً بے بس کر دیا تھا لیکن جب ریوالور اس کی کمر سے لگا تو اس نے جلدی سے طارق کو چھوڑ دیا اور تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت وہ خود کو واقعی اسی ناول کا کردار سمجھ رہی تھی بلکہ ثابت بھی کر رہی تھی مگر...... کہانی تو بس کہانی ہوتی ہے۔ حقیقت سے بہت دور...... اس کے بال بکھر گئے تھے۔ چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے طارق کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھ سے محبت کا صرف ڈراما کیا تھا۔''

''تم نے ابھی مجھ پر حملہ کیا تھا۔ تمہارے ناخنوں کی خراشیں پڑ گئی ہیں میرے جسم پر۔'' طارق نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پولیس کے حوالے کروں گا۔''

''مجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ میں جا رہی ہوں۔''

''خبردار!'' طارق نے ریوالور اس کے سینے کی طرف تانا۔ ''اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔''

لیکن ڈاکٹر شی نے اس دھمکی کی پروا نہیں کی۔ وہ جیسے اڑتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ یہ شاید اس کی بوکھلاہٹ ہو کہ وہ بیرونی دروازے کے بجائے اندرونی دروازے کی طرف گئی تھی۔

''شی!'' طارق چیختا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے فائر نہیں کیا تھا۔ فائر کر کے وہ خود کو قاتل نہیں بنانا چاہتا تھا۔

وہ دروازے کی دوسری جانب نکلا۔ ڈاکٹر شی اسے دکھائی نہیں دی لیکن اس کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ کے تعاقب میں ہی وہ اپنی خواب گاہ تک پہنچ گیا۔ غالباً یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ اس کی خواب گاہ میں جا گھسی تھی۔

طارق دروازے کو ٹکر مارتا ہوا کمرے میں گھسا۔ اسی وقت اسے ایسا لگا جیسے کوئی پرندہ اڑتا ہوا کھڑکی سے نکل گیا ہو۔

نہ جانے کیوں طارق کے ذہن میں لفظ ''چمگادڑ'' گونج گیا لیکن اس نے اس فضول خیال کو فوراً ذہن سے جھٹک دیا۔ ڈاکٹر شی کمرے میں نہیں تھی۔ طارق لپک کر کھڑکی کے قریب پہنچا۔ باہر دیکھنے پر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ بس اندھیرا

ہی اندھیرا۔

دو دن سے طارق اس کمرے میں نہیں آیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں آسکا کہ اس نے کھڑکی کھلی چھوڑ دی تھی۔

ایک بار پھر اس نے کمرے میں نظر دوڑائی لیکن وہاں کوئی ایسی جگہ تھی ہی نہیں جہاں ڈاکٹر شی خود کو چھپا سکتی۔

اس بھاگ دوڑ میں طارق کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ ریوالور جیب میں رکھ کر دوبارہ کھڑکی کے پاس گیا۔ اسے بند کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں پہنچا اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے دن وہ ناشتے کا کچھ سامان خریدنے کے لیے گھر سے نکلا تو ایک پڑوسی سے سامنا ہو گیا۔

''رات آپ کے گھر میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے طارق صاحب؟'' اس نے پوچھا۔ ''کسی قسم کی چوری چکاری؟''

''نہیں تو۔''

''اوہ، تو پھر وہ میرا وہم ہی ہوگا۔''

''کیسا وہم؟''

''میں اپنے گھر کی بالکونی میں کھڑا تھا رات کو۔ شاید گیارہ ساڑھے گیارہ کا عمل ہوگا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کوئی آپ کے گھر کی کھڑکی سے کود کر باہر نکلا تھا۔ پھر وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔ میں آپ کی طرف آتا لیکن اس خیال سے نہیں آیا کہ وہاں تو تالا پڑا ہوگا۔ آپ لوگ کب آئے؟''

اسے رفعت کا خیال بھی ہوگا۔

''کل ہی آنا ہوا ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔

اور اسی شام ائرپورٹ سے فرانسیسی ایئرلائن کی ایک پرواز میں ایک نقاب پوش عورت بیٹھی تھی جس کی منزل پیرس تھی۔

اس کے اگلے دن اخبار کی ایک خبر نے طارق کو چونکا دیا۔ خبر کے مطابق ڈاکٹر شی نے اپنا اسپتال ایک ٹرسٹ کو دے دیا تھا اور خود کہیں چلی گئی تھی۔

☆☆☆

مشکور بیرونی دورے سے جب واپس لوٹا تو گھر پر ایک ایسی چیز موجود تھی جس نے اس کے دماغ میں دھما کا سا کر دیا۔

وہ شفیق کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ اس کی شادی رفعت سے ہونا تھی بلکہ تین روز پہلے ہو چکی تھی۔

''دعوت نامہ آئے تو ایک ہفتہ ہو گیا۔'' مشکور کی بیوی نے کہا۔ ''میں نے شفیق بھائی کو فون کر دیا تھا کہ آپ بیرونِ ملک ہیں اس لیے شریک نہیں ہو سکیں گے۔''

''لیکن...... لیکن......'' مشکور کا دماغ چکرا گیا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟...... یہ کوئی دوسری رفعت تو نہیں؟''
''آپ نے کارڈ غور سے نہیں پڑھا۔ رفعت کے والد کا نام رضوان احمد ہی لکھا ہے۔''
مشکور نے پھر کارڈ دیکھا۔ ''بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' وہ بدستور چکرایا ہوا تھا۔ ''یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ طارق نے رفعت کو طلاق دے دی ہو۔''
''ممکن تو یہ اسی صورت میں ہے۔''
''اچھا، میں طارق سے مل کر آتا ہوں۔ معلوم کرتا ہوں کہ یہ کیا ہوا ہے۔''
''ابھی تو آئے ہیں آپ! ذرا دیر آرام تو کرلیں۔''
''ذہن اتنا منتشر ہوگیا ہے کہ آرام کرنا ممکن ہی نہیں۔''
مشکور اسی وقت طارق کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب اس نے گھر کی کال بیل کا بٹن دبایا، اس وقت بھی وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ بار بار اس کے ذہن میں صرف یہ خیال آرہا تھا کہ جو بھی گڑبڑ ہوئی ہے اس کی وجہ ڈاکٹرشی ہی ہوگی۔
دروازہ کھولنے سے پہلے اندر سے پوچھا گیا۔ ''کون ہے؟'' آواز طارق ہی کی تھی۔
''میں ہوں، مشکور۔''
دروازہ کھلا اور مشکور طارق کو تکتا رہ گیا۔ اگر وہ کہیں اور طارق کو دیکھتا تو بادی النظر میں پہچان بھی نہ پاتا۔ الجھے ہوئے بال، میلے کپڑے، شیو اتنا بڑھا ہوا کہ اس پر ڈاڑھی کا گمان کیا جاسکتا تھا۔
''دیکھ کیا رہے ہیں مشکور صاحب!'' طارق کی مسکراہٹ نڈھال سی تھی۔ ''اندر آیئے نا!''
مشکور نے قدم آگے بڑھایا۔ طارق نے دروازہ بند کیا۔ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بستر لگا ہوا تھا۔
''یہ کیا؟'' مشکور بولا۔ ''کیا یہاں سو رہے ہو؟''
''ہاں۔'' طارق نے جواب دیا۔
''رفعت بھابی کا کیا معاملہ ہے؟''
''طلاق دے چکا ہوں میں اسے۔''
''وہ تو میں سمجھ چکا ہوں۔ دو دن ہوئے اس کی شادی شفیق سے ہوچکی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طلاق کے بعد ہی ممکن ہے۔''
''یہ میرے لیے اچھی خبر ہے کہ ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اسی لیے تو میں ان دنوں پریشان تھا جب شفیق کی شادی غزالہ سے طے ہوئی تھی۔ وہ شادی ہوجاتی تو رفعت کا مسئلہ الجھ جاتا۔ اس شادی کو رکوانے کی کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس وقت تمہارے بھائی کی وہ تفتیش کام آگئی جو تاج الدین رفیقی کے سلسلے میں کی گئی تھی۔''
''گویا آپ رفعت بھابی کو طلاق دینے کا ارادہ پہلے ہی کرچکے تھے؟''
''ہاں۔'' طارق نے نظریں جھکالیں۔
''وجہ؟ ڈاکٹرشی؟''
''اگر وہ وجہ ہوتی تو کیا آپ مجھے اس حالت میں دیکھتے؟''
''تو پھر؟''
''میں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ کیا دباؤ تھا جس کی وجہ سے رفعت نے مجھ سے شادی کی۔ اس کی منزل تو شفیق تھا۔''
''یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟''
''پہلے وہ کہتی رہی تھی کہ دونوں بھائیوں کے جھگڑے کی وجہ سے ان کی اولادیں بھی ایک دوسرے سے بچھڑ گئی ہیں، آپس میں کوئی بات بھی نہیں کرپاتا لیکن ایک دن میں نے اس کے موبائل پر شفیق کا نام اور نمبر دیکھ لیا۔ مجھے حیرت ہونا ہی چاہیے تھی۔ پھر میں نے ان دونوں کی باتیں بھی سن لیں۔ رفعت کچن میں کھڑی ہوکر اس سے باتیں کررہی تھی۔ اس نے احتیاط سے باہر بھی جھانکا تھا کہ میں کہیں قریب نہ ہوں لیکن میں نے خود کو اس طرح چھپایا تھا کہ وہ مجھے دیکھ ہی نہیں سکی۔''
''آپ کو یقین ہے کہ......''
''سو فیصد یقین!'' طارق نے جواب دیا۔ ''بعد میں رفعت کو یہ خیال بھی آیا تھا کہ میں اس کے موبائل میں شفیق کا نام نہ دیکھ لوں اس لیے اس نے وہ سب کچھ ڈیلیٹ کردیا تھا۔ ڈیلیٹ کرنے کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ مجھے اس کا علم نہ ہو۔''
''اسی لیے آپ رفعت بھابی کو طلاق دینے کا فیصلہ کرچکے تھے؟''
''ہاں۔'' طارق نے کہا۔ ''محبت کی قربانی صرف وہی کیوں دے، میں کیوں نہ دوں۔ رفعت کے بغیر میں بالکل ٹوٹ چکا ہوں مشکور صاحب!'' طارق کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔ ''اس دن کے بعد میں بیڈروم میں نہیں سویا۔ رفعت کے بغیر وہ کمرا مجھے بہت اجاڑ لگتا ہے۔''
''لیکن طلاق کی نوبت آئی کیسے؟ کیا آپ نے رفعت بھابی کو بتادیا تھا کہ آپ اس کی اور شفیق کی محبت سے واقف ہوچکے ہیں؟''
''نہیں۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی کہ میرے سامنے اس کی نظریں جھک جاتیں۔ وہ بہت اچھی

بیوی ثابت ہوئی تھی۔ مجھ سے بھی محبت کرنے لگی تھی۔ یہ میں نے اس لیے بھی کیا کہ انسان اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھول سکتا۔ رفعت کے بارے میں بھی میں نے یہی سوچا تھا۔ شفیق کی محبت اس کے دل کی گہرائی میں، دماغ کے کسی تاریک گوشے میں لازمی طور پر زندہ ہوگی۔''

''تو ڈاکٹر شی کا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں؟''

''نہیں، لیکن میں ایک اعتراف ضرور کروں گا۔ ڈاکٹر شی کی وجہ سے میرے جذبات تو بھڑکے تھے۔ لغزش تو آئی تھی میرے پیروں میں۔ متاثر تو ہوا تھا میں اس سے لیکن میں نے یہ فیصلہ بھی کرلیا تھا کہ اس سے شادی کر کے میں رفعت سے بے وفائی نہیں کروں گا۔''

''لیکن جب آپ نے رفعت بھابی سے شفیق کی بات بھی نہیں کی اور ڈاکٹر شی کا بھی اس میں کوئی ہاتھ نہیں تو طلاق کی نوبت آئی کیسے؟''

''میں نے ایک جعلی میرج سرٹیفکیٹ بنوا کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ بس اسی کو دیکھ کر رفعت میں تلخی آتی چلی گئی۔ میں نے بھی اس وقت اداکاری کی اور ڈاکٹر شی سے اپنی شدید محبت کا اظہار کیا۔''

طارق نے رک رک کر سارا واقعہ سنا دیا۔

سب کچھ سن کر مشکور فوراً کچھ نہیں بولا، پھر اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''دنیا میں اس قسم کے واقعے کی مثال شاید ہی ملے اور وہ...... ڈاکٹر شی کا کیا رہا؟''

طارق نے وہ سارا واقعہ بھی سنا دیا۔ وہ مشکور کے لیے حیرت انگیز تھا۔

''تو کیا واقعی وہ...... ویمپائر......''

''میں اس کی کسی بات پر بھی اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نے پرندے یا چمگادڑ...... جو کچھ بھی کہو...... اس کے پروں کی جو پھڑ پھڑاہٹ سنی تھی، وہ میرا واہمہ ہی ہوگی یا شاید وہ کسی اور قسم کی آواز ہو جس کو میں نے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سمجھا۔ مجھے اپنے پڑوسی کی اس بات پر یقین ہے کہ کسی کو کھڑکی سے کودتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ میرے ریوالور یا گرفتاری کے خوف سے بھاگ نکلی۔ بس! اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''اور اپنا اسپتال ٹرسٹ کو دے کر وہ غائب ہوگئی۔'' مشکور نے پرخیال انداز میں کہا۔

''غائب کہاں، وہ واپس فرانس ہی گئی ہوگی۔''

''آپ نے کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''میں کیوں اس بدبخت عورت کے لیے اپنا وقت ضائع کروں۔''

''خیر!'' مشکور نے سر ہلا کر کہا۔ ''جو ہونا تھا، ہوگیا۔ اب آپ خود کو سنبھالنے کی کوشش کیجیے۔ آپ نے اپنے آپ کو خود ہی ایک گہرا زخم لگایا ہے لیکن کوئی زخم ایسا نہیں ہوتا جس کا مداوا نہ ہو سکے۔ بس کوشش شرط ہے۔''

طارق کچھ نہیں بولا۔ مشکور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ طارق کا چہرہ خاصا بڑھا ہوا شیو ہونے کے باوجود ستا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

شادی کا چوتھا دن تھا۔ رفعت اور شفیق نے اس رات اپنے ایک پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان کی کار اسی طرف جا رہی تھی کہ شفیق کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔

طارق کی خاطر کار ڈرائیو کرتے کرتے رفعت کو ڈرائیونگ کا شوق ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی کار وہی چلا رہی تھی۔ شفیق نے موبائل نکالا۔ ''اوہ!...... اوہ!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''مشکور واپس آگیا۔'' پھر اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہاں مشکور کب آئے؟''

''وطن تو کل آگیا تھا۔'' جواب آیا۔ ''تم سے ملنے آج یہاں پہنچا تو تمہارے گھر سے معلوم ہوا کہ تم لوگ کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے نکل گئے ہو۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہے کہ تم ہمارے شہر آئے ہوئے ہو۔ اسی ریسٹورنٹ میں آجاؤ۔ کھانے ہمارے ساتھ ہی کھانا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میرا پسندیدہ ریسٹورنٹ......''

''معلوم ہے۔'' مشکور نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔

''بس تو وہیں آجاؤ۔''

''آ رہا ہوں۔'' مشکور نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''مشکور بھائی کو سب کچھ معلوم تو ہو چکا ہوگا۔''

''ظاہر ہے۔ میں نے اسے شادی کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔ وہ اس نے دیکھ لیا ہوگا اور چونکا بھی ہوگا تمہارا نام دیکھ کر۔''

''طارق اور ڈاکٹر شی سے بھی ملاقات کر لی ہوگی۔''

''امکان تو ہے، بلکہ...... یقیناً ملا ہوگا۔''

''میں اس وقت ان کا سامنا ہونے پر بڑا عجیب سا محسوس کروں گی۔''

''کیوں محسوس کروگی؟ تم نے تو کوئی غلطی نہیں کی۔ ڈاکٹر شی کو دیکھ کر وہ حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا ہوگا۔''

وہ دونوں ریسٹورنٹ پہنچے۔ دس منٹ بعد مشکور بھی

آ گیا۔ رفعت نے اسے سلام کر کے نظریں جھکا لیں۔

"تمہیں معلوم تو ہو گیا ہو گا سب کچھ؟" شفیق بولا۔

"اس سے زیادہ معلوم ہو گیا جتنا تم دونوں سمجھ رہے ہو گے۔"

"اس کا گھٹیا پن زیادہ واضح طور پر نظر آ گیا تمہیں؟"

"طارق کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہ کرو۔" مشکور نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس نے تو بہت بڑی قربانی دی ہے۔"

"ڈاکٹر شی سے شادی کر کے۔" شفیق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو شاید اپنے وطن ہی واپس چلی گئی ہے۔"

رفعت اور شفیق دونوں ہی چونکے۔

مشکور کہتا رہا۔ "اس نے اپنا اسپتال کسی ٹرسٹ کے حوالے کر دیا ہے۔ اخبار میں اس کی خبر بھی آئی تھی۔ شاید تمہاری نظر سے نہیں گزری۔"

"اسے جانا تھا تو اس نے شادی کیوں کی؟"

"شادی نہیں ہوئی تھی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مشکور بھائی!" رفعت بول پڑی۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے ان کا میرج سرٹیفکیٹ دیکھا تھا۔"

"جعلی سرٹیفکیٹ۔"

"کیا مطلب؟" شفیق تیزی سے بولا۔

"میں کل سے طارق کے سلسلے میں بہت جذباتی ہوں۔" مشکور نے کہا۔ "وہ سب ایک ڈراما تھا۔ میں اپنے جذباتی ہونے ہی کے باعث اس وقت بڑی صاف گوئی سے بات کروں گا۔ کیوں رفعت بھابی! کیا شادی سے پہلے آپ اور شفیق ایک دوسرے سے شادی کرنے کے خواہش مند نہیں تھے؟"

رفعت سٹپٹا کر شفیق کی طرف دیکھنے لگی۔ شفیق کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔

مشکور نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم دونوں کی محبت کا علم ہونے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ وہ نادانستگی میں رفعت بھابی سے زیادتی کر بیٹھا ہے۔ جس طرح رفعت بھابی نے اپنی محبت کی قربانی دی تھی، اسی طرح اس نے بھی اپنی محبت کی قربانی دے دی اور تم دونوں کے بیچ سے ہٹ گیا۔"

"کیا کہہ رہے ہو مشکور!" شفیق کے لہجے میں الجھن تھی۔

"وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔ مجھے جو کچھ طارق سے معلوم ہوا ہے، وہ میں تم دونوں کو بھی سنا دیتا ہوں۔"

پھر وہ سب کچھ ان دونوں نے سنا اور دونوں ہی کے چہروں کا رنگ اتر گیا۔

مشکور بولا۔ "اسی لیے میں نے تمہیں ٹوکا تھا کہ طارق جیسے شخص کے لیے گھٹیا کا لفظ استعمال نہ کرو۔ میں تو اسے آج کے دور کا ایک عظیم انسان کہوں گا۔"

رفعت اور شفیق جیسے گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے، کبھی مشکور کو اور کبھی نظریں جھکا لیتے۔

"مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں پھر بیمار نہ پڑ جائے۔" مشکور بولا۔ "یہ میں نے ابھی نہیں بتایا کہ جب میں اس سے ملا تھا تو اس کی حالت کیا تھی۔"

رفعت اور شفیق کے استفسار کے بغیر ہی اس نے یہ بھی بیان کر دیا کہ اس نے طارق کو کس عالم میں پایا تھا، پھر اس نے کہا۔ "اس نے ڈرائنگ روم کے صوفے پر ہی اپنا بستر بچھا لیا ہے۔ بیڈ روم میں ایک دن بھی نہیں سویا۔ رفعت بھابی کے بغیر وہ کمرا اسے بہت اجڑا ہوا، ویران سا لگتا ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ یہ گھر ہی چھوڑ دے۔ جواب اس نے یہ دیا کہ اس گھر کے در و دیوار پر اسے رفعت بھابی کے سائے نظر آتے ہیں۔ اب کیا وہ ان سایوں سے بھی جدا ہو جائے۔"

رفعت اور شفیق کے چہروں کی رنگت مزید پھیکی پڑ گئی۔ رفعت کی تو نظریں ہی نہیں اٹھ رہی تھیں۔

مشکور نے بات جاری رکھی۔ "میں اسے بہت سمجھا بجھا کر اپنے گھر لوٹا تھا مگر آج جب یہاں آنے سے پہلے اس سے ملنے گیا تو بھی وہ اسی حالت میں تھا۔"

رفعت آبدیدہ ہو گئی۔ شفیق سے محبت کے باوجود وہ بھول تو نہیں سکتی تھی کہ طارق نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا اور اب اس کی یاد میں شاید اپنی زندگی ہی ختم کر لینا چاہتا تھا لیکن اب اس کے لیے نہ رفعت کچھ کر سکتی تھی اور نہ شفیق۔ حد درجہ محبت کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔

"کھانا کھانے کو تو اب دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔" شفیق بولا۔ "کیوں رفعت؟" رفعت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مشکور بولا۔ "یہ باتیں کرنے کے بعد تو میری بھی یہی حالت ہے۔"

"تو بس پھر اٹھو۔ تمہارے ساتھ ہم بھی چلتے ہیں طارق کو دیکھنے۔"

"ہم؟" رفعت بول پڑی۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"یعنی میں اور تم۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"نہیں۔" رفعت نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ میں اس کا سامنا نہیں کرسکتی۔"

"رفعت بھابی!" مشکور بولا۔ "مجھے شفیق سے اتفاق ہے، بلکہ میں اس میں کچھ اضافہ بھی کروں گا۔ ہمیں صرف دیکھنے کے لیے نہیں جانا طارق کو۔ اسے سمجھانا بھی ہے کہ وہ اپنی موت کو بلاوا نہ دے اور یہ بات اگر وہ سمجھ سکتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ کسی کی بات مان سکتا ہے، تو وہ صرف آپ ہیں۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔" رفعت نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور میز پر جھک گئی۔

"اب میں کہوں گا کہ مجھے مشکور سے اتفاق ہے۔" شفیق بولا۔ "تمہیں ہمارے ساتھ جانا چاہیے رفعت!...... مشکور نے بالکل ٹھیک کہا۔ اس کی جو کیفیت ہمیں معلوم ہوئی ہے، اس کے باعث یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گا۔"

"میں کیسے بات کروں گی اس سے۔" رفعت روہانسی ہوگئی۔

"اگر بات نہیں کریں گی آپ!" مشکور بولا۔ "تو کچھ دن بعد سن لیجیے گا کہ وہ ہاسپٹالائز ہوگیا اور اس کے کچھ عرصے بعد......"

"نہیں۔" رفعت نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا اور شاید پوری طاقت سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ "اس کے آگے کچھ نہ کہیے گا مشکور بھائی!"

"اگر آپ وہ سب کچھ نہیں سننا چاہتیں تو آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہی چاہیے۔"

"بہت بڑا امتحان ہوگا یہ میرے لیے۔" رفعت کی آواز بھرا گئی۔

"کسی کی جان بچانے کے لیے انسان کو بڑے سے بڑا امتحان دینے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔" اس مرتبہ شفیق بول پڑا تھا۔

ان دونوں کی باتوں نے رفعت کو یہ امتحان دینے کے لیے مجبور کردیا۔ رات کے گیارہ بجے وہ تینوں طارق کے گھر کے دروازے پر تھے۔ رفعت کے چہرے سے ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔

کال بیل کی آواز کے بعد مشکور کی آواز سن کر طارق نے دروازہ کھولا۔ رفعت اور شفیق کو دیکھ کر وہ شدت سے چونکا اور خصوصاً رفعت کو دیکھ کر۔ پھر فوراً ہی اس کی نظر مشکور پر پڑ گئی۔ اس کی نگاہوں میں سوال تھا جو مشکور نے سمجھ لیا۔

"جی ہاں طارق صاحب! ان لوگوں کو بتادیا ہے سب کچھ۔ آپ نے مجھ سے کہا تو نہیں تھا کہ میں ان کو نہ بتاؤں۔"

"ہوں۔" طارق نے گم صم سے انداز میں سر ہلایا۔

"خیال نہیں رہا تھا کہ منع کردوں۔ بہتر ہوتا کہ...... خیر!...... آپ لوگ اندر آجائیے نا۔" وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

تینوں کمرے میں داخل ہوئے۔ رفعت نے ڈرائنگ روم کو بھی اجاڑ سا دیکھا۔ ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ رفعت کے دل میں ہوک سی اٹھ کر رہ گئی۔ وہ گھر کو بہت صاف ستھرا اور قرینے سے رکھتی تھی۔

طارق کا حلیہ بھی وہی تھا جو مشکور نے بتایا تھا۔

"آؤ، بیٹھو شفیق!" طارق نے صوفے پر بچھا ہوا گدا اور چادر وغیرہ لپیٹ کر ایک طرف پھینک دیے۔

ایک منٹ تک ڈرائنگ روم میں ایسا سکوت طاری رہا جیسے وہاں ایک بھی ذی روح نہ ہو۔ رفعت کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ شفیق بھی اس سے آنکھیں چرا رہا تھا۔

سکوت کو طارق ہی نے توڑا۔ "معاف کرنا شفیق! ذہن کچھ ایسا ہی ہوگیا ہے کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ شادی مبارک ہو۔"

"میں تمہارا ممنون ہوں۔" شفیق نے صدقِ دل سے کہا۔ "لیکن جو کچھ جس طرح ہوا، وہ خوشگوار نہیں تھا۔"

طارق خاموش رہا۔

مشکور بولا۔ "آپ کو کچھ کہنا تھا نا رفعت بھابی!"

حالانکہ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ راستے بھر شفیق ہی اسے سمجھاتا رہا تھا کہ وہ طارق سے کس طرح بات کرے گی۔

اب رفعت نے نظریں اٹھائیں۔ "یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے طارق!" وہ مردہ سی آواز میں بولی۔

"ٹھیک تو ہوں۔" طارق کے ہونٹوں پر پژمردہ سی مسکراہٹ آئی۔

"اپنے آپ سے جھوٹ بول رہے ہیں آپ...... گھر میں اسی طرح رہتے تھے آپ؟"

"بس دل ہی کچھ مردہ ہوگیا ہے۔"

"نہیں ہونا چاہیے۔" شفیق بول پڑا۔ "زندگی میں انسان کو بہت کچھ ملتا ہے تو کچھ کھو بھی جاتا ہے اور بعض اوقات انسان خود بھی کھو دیتا ہے لیکن ساری زندگی اپنے آپ کو اس کوتاہی کی سزا تو نہیں دی جاتی۔"

"مجھ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی۔" طارق نظریں جھکا کر بولا۔ "جو کچھ میں نے کھویا، وہ مجھے کھونا ہی چاہیے تھا۔ انسانیت کا تقاضا تھا۔"

''انسانیت کے تقاضے اور بھی ہوتے ہیں۔'' شفیق ہی نے بات جاری رکھی کیونکہ رفعت سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ''انسانیت یہ بھی ہے کہ گھر آئے ہوئے مہمانوں کو اپنی قلبی واردات سے دکھ نہ پہنچائے۔''

''میں نے کیا دکھ پہنچایا تم لوگوں کو؟''

''تمہاری یہ حالت! ...... اس سے کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ تم کسی سانحے سے گزرے ہو۔''

طارق خاموش رہا۔ نظریں پھر جھک گئی تھیں۔

''تم بھی بولو رفعت!'' شفیق اس سے مخاطب ہوا۔

''راستے میں تو کہہ رہی تھیں کہ میں طارق سے کچھ بھی کروا سکتی ہوں۔''

طارق رفعت کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں طارق!'' رفعت نے ہمت کی۔ ''اپنا حلیہ درست کیجیے۔ باتھ روم میں جا کر شیو بنائیے۔ منہ ہاتھ دھوئیے، کپڑے بدلیے۔ اتنی دیر میں شفیق کہیں قریب سے کھانا لے آئیں گے۔ ہم لوگ بھی کھانا کھائے بغیر چل پڑے تھے۔''

''پہلے میں تم لوگوں کی خاطر مدارات کے لیے تو کچھ کروں، چائے یا......''

''فضول بات۔'' رفعت کی زبان کھلنے لگی۔ ''میں نے جو کہا ہے، پہلے وہ کیجیے۔''

طارق نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آب دیدہ ہو گیا تھا۔ ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ رفعت کبھی کبھی اس سے ایسے ہی حاکمانہ انداز میں کچھ منوالیا کرتی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک جاتے، وہ جلدی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

''دیکھا!'' مشکور نے مسکرا کر رفعت سے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا! آپ کی بات وہ اب بھی نہیں ٹال سکتا۔''

رفعت اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ بیس منٹ بعد ہی طارق صحیح حلیے میں ان کے سامنے تھا۔

''میں نے فون کر دیا ہے ایک ریسٹورنٹ کو۔'' مشکور بولا۔ ''کھانا ذرا دیر میں یہیں آ جائے گا۔ آپ کی عدم موجودگی میں ہم آپس میں کچھ باتیں کرتے رہے تھے۔ زندگی میں انسانوں کے رشتے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ تو کیوں نہ آج سے آپ اور رفعت بھابی ایک دوسرے کے دوست بن جائیں۔''

''بہترین تجویز تھی یہ تمہاری۔'' شفیق بول پڑا۔

طارق نے رفعت کی طرف دیکھا۔ رفعت بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے طارق سے ''ہاں'' کہلوانا چاہتی ہو۔

شفیق پھر بولا۔ ''ایک اچھا دوست ملنا، بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔ دوسرے رشتوں سے بہت بلند ہے یہ رشتہ۔''

''میں طارق کی بہترین دوست ثابت ہوں گی۔''

''لوگ دوستی کے رشتے کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔'' یہ بات طارق نے شفیق پر نظر جما کر کہی تھی۔

''طارق!'' شفیق مسکرا کر بولا۔ ''تم نے یہ بات دراصل ...... میرا مطلب ہے، تمہارا اشارہ میری طرف ہے۔ یقین کرو۔ مجھ سے زیادہ گھٹیا شخص کوئی نہ ہوگا اگر میں نے کبھی تم دونوں کی دوستی کو کسی اور نظر سے دیکھا۔''

''شفیق ...... شفیق!'' طارق کی آواز جذبات سے لرز رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شفیق کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی ٹپک گئے تھے مگر ان آنسوؤں میں صرف درد نہیں تھا، ایک عجیب سی کیفیت تھی جسے درد اور خوشی کے درمیان کی کوئی کیفیت کہا جا سکتا تھا۔

پھر اس کے بعد ماحول بتدریج بدلتا گیا۔ طارق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آنے لگی، ایک جیتی جاگتی مسکراہٹ!

کھانا آیا، کھایا گیا، پھر رفعت اٹھی اور ڈرائنگ روم کی بے ترتیبی کو درست کرنے لگی۔ پھر بولی۔ ''میں ذرا بیڈ روم دیکھ آؤں۔ شاید اس کی بھی یہی حالت ہو۔'' وہ جلد ہی واپس آ گئی۔ ''نہیں، وہاں سب ٹھیک ہے۔''

''یہ حضرت سوئے ہی نہیں ہیں وہاں۔'' مشکور بے تکلفی سے بولا۔ ''وہاں گڑبڑ کیسے ہوگی۔''

اسی وقت یہ بھی طے پایا کہ اگلے دن رفعت اور شفیق پھر آئیں گے اور مشکور بھی ساتھ ہوگا۔ سب مل کر ساحلِ سمندر کی تفریح کرنے چلیں گے۔

اس رات جب وہ لوگ طارق کے گھر سے رخصت ہوئے تو دو بج چکے تھے۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد طارق اپنی خواب گاہ میں گیا تو اسے تکیے پر سفید گلاب کا ایک پھول اور ایک پرچہ ملا۔ پرچے پر لکھا تھا۔ ''اپنے نئے اور بہت پیارے دوست طارق کے لیے، ان کا پسندیدہ پھول، سفید گلاب!'' اپنے دوست کو ایک مشورہ اور نصیحت بھی کی تھی۔ ''اب آپ کی بیماری بھی خدا کے فضل سے ختم ہو گئی ہے۔ لہٰذا کسی اچھی خاتون کا انتخاب کریں اور گھر بسا لیں۔ اللہ آپ کو ڈاکٹر شی جیسی عورتوں سے محفوظ رکھے، آمین۔''

اس تحریر کے نیچے رفعت کا نام تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY